خدا بخش لائبریری

جرنل

پٹنہ

۸۴-۸۶

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

خدابخش لائبریری

جرنل

۸۴ تا ۸۶

پٹنہ

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر:	۳۳۴۴۴/۷۷	سالانہ :	۳۰۰ رُپے (ہند)
شمارہ :	چوراسی تا چھیاسی	۶۰ ڈالر	(ایشیا)
قیمت :	پچھتر رُپے	۱۲۰ ڈالر	(دیگر ممالک)

۱۹۹۳ء

مصطفٰے کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دہلی میں چھپوا کر خدا بخش لائبریری پٹنہ سے شائع کیا

فہرست

ہندستان اپنے حصار میں

مصنف

جناب ایم۔ جے۔ اکبر

مترجم

جناب مسعود الحق

حرفِ چند

اس کتاب میں جا بجا ضمیر کی آواز ملے گی:

میرے ضمیر کی!

تمھارے ضمیر کی !!

تمھارے ضمیر کی !!!

اور ایک حصّہ (تیسرا حصّہ: آخری دو باب) تو بہت دن تک یاد رہے گا

یاد رہے گا۔ تازہ رہے گا

اور دلوں کو گرمی اور روشنی بخشتا رہے گا۔

—— شعرب



"ایم جے۔ اکبر" ایک ہندوستانی مسلمان ہیں۔ انکی پیدائش جنوری ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ انکے نانا میر حبیب اللہ نے کشمیری شالوں کا اپنا کاروبار امرتسر میں شروع کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی افراتفری میں امرتسر مسلمانوں سے خالی ہوگیا، اور یہ خاندان بے یار و مددگار پناہ گزینوں کی حیثیت سے پاکستان چلا گیا۔ انکے دادا کم عمری ہی میں یتیم ہوگئے تھے۔ انہوں نے بہار کے اپنے گاؤں کے افلاس اور اپنی تنگدستی سے عاجز آکر کلکتہ کے صنعتی نواح کا رخ کیا۔ یہ ایک ہندو تھے، انکا نام پریاگ تھا۔ بعد کو یہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور اپنا نام رحمت اللہ رکھ لیا۔ انھوں نے کانگریس پارٹی سے پیمانِ وفا باندھا تھا، اسی لیے یہ ہمیشہ ہندوستان میں رہے۔

اکبر کی اسکول کی تعلیم کلکتہ بوائز اسکول میں ہوئی۔ انگریزی میں آنرز کی ڈگری انھوں نے ۱۹۷۰ء میں پریسیڈنسی کالج کلکتہ سے لی۔ بعد ازاں انھوں نے "ٹائمس آف انڈیا" کی تنظیم میں ایک زیرِ تربیت سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ انکا تقرر خشونت سنگھ کی ماتحتی میں "السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا" میں ہوا۔ ۱۹۷۴ء میں فری پریس جرنل گروپ کے پندرہ روزہ رسالے "آن لکر" کی ادارت کا کام انکے سپرد کیا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں اکبر کلکتہ میں آنند بازار گروپ آف پبلی کیشنز میں شامل ہوئے۔ یہاں انھوں نے مقبول ہفتہ وار رسالے "سنڈے" کی تشکیل بھی کی اور اس کی ادارت بھی۔ ۱۹۸۲ء میں انہوں نے انگریزی روزنامے "ڈیلی ٹیلی گراف" کا منصوبہ بنایا، اور پھر اسکی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ یہ اخبار جلدی ہی کامیابی کی اعلیٰ منزلوں پر پہنچ گیا۔

زیرِ نظر کتاب کے علاوہ ۱۹۸۸ء میں پینگوئن بکس انڈیا نے انکی ایک کتاب "رائٹ آفٹر رائٹ" شائع کی۔ اس کتاب میں ہندوستان میں یکے بعد دیگرے ہونے والے ان فسادات کی چشم دید رپورٹیں ہیں جو یہاں ذات پات، زبان اور مذہب اور تہذیب اور ثقافت کے نام پر ہوتے رہتے ہیں۔ یہ رپورٹیں اپنی صاف گوئی اور صحافتی معروضیت کے لیے معروف ہیں۔

انکی ایک اور کتاب "نہرو۔ دی میکنگ آف انڈیا" منظرِ عام پر آئی ہے۔ یہ ضخیم کتاب نہرو کی صرف سوانح حیات ہی نہیں ہے، بلکہ نئے ہندوستان کی تشکیل و تعمیر، اور اس جد و جہد میں پیش آنے والے نشیب و فراز کا غیر جانبدارانہ تجزیہ بھی ہے۔

ہندوستان

اپنے حصار میں

محبت اور شکر گذاری کیساتھ

اُمّی جی ــــ اور ــــ ابّا جی

کے نام

فہرست

صفحہ نمبر

پیشگفتار

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو　　　　تو بستنِ در و من فتحِ باب می شنوم

چھ سال قبل "انڈیا۔ دی ینگ وِ د اِن" کے آخری باب کا اختتام غیر یقینی رجائیت اور خوش امیدی کی انھیں سطروں پر ہوا تھا۔ اس وقت بھی دور افق کی گرج چمک پنجاب پر گہرے کالے بادلوں کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ تاریخ کا مبصر ان واقعات کو اب ایک منطقی سلسلے میں رکھ سکتا ہے۔ ایک بیج بویا جاتا ہے کچھ مدت تک کوئی کلا نہیں پھوٹتا، بیج جڑیں نہیں پکڑ پاتا پھر وہ لمحہ آتا ہے جب خون سے اس کی آبیاری کی جاتی ہے۔ پودا پروان چڑھنے لگتا ہے، شاخیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ پودے کے محافظین اس کے مالی، پودے کی نگہداشت کرتے ہیں، احتیاط اور بڑی لگن کے ساتھ۔ دیکھتے دیکھتے بغاوت کی ایک تحریک شروع ہوتی ہے جسے کوئی بھی روک نہیں پاتا۔ حکومت متحرک ہوتی ہے اور ایک مجبور اور جھنجھلائی ہوئی گورنمنٹ کے ہاتھوں ایمان اور عقیدے کی ایک علامت مسمار ہو جاتی ہے۔ ایک وزیر اعظم کا خون ہوتا ہے اور خونریزی کی نفسیات قومی ذہن پر حاوی ہوتی نظر آتی ہے۔

ان چھ برسوں میں اس آگ نے کشمیر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، تفصیلات ظاہر ہے کہ مختلف ہیں مگر علامتیں وہی ہیں۔ "انڈیا دِی ینگ وِ د اِن" کی صحیح مگر منحوس پیش گوئی کی صحت اور صداقت کو دیکھ کر گہرا دکھ ہوتا ہے۔ کوئی بات اگر غلط تھی تو بس یہ کہ اس وقت اس کتاب میں ہمارے خواب امید کی ایک ڈور سے بندھے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس وقت بھی جب میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں مذہبی مجنون ایودھیا کے شہر میں تین ہزار دو سو مربع فٹ مٹی کے ایک ٹکڑے کے نام پر ہندستان کو آگ لگا رہے ہیں۔ فتح و کامیابی کے پرچم چار سو سال پرانی ایک مسجد کے تین بوسیدہ گنبدوں پر لہرائے جا رہے ہیں۔ ہر گاؤں اور ہر قصبہ بھیانک خوف و ہراس سے لرز رہا ہے اور لوگوں کے ہجوم ندیوں کے پانی کو بے گناہ بچوں کے خون سے لال کر رہے ہیں۔ دل تھکے ہوئے ہیں اور احساس فرار کی راہیں ڈھونڈتا ہے۔

اس محاصرے کے سامنے ہتھیار ڈالنا اور ہندستان کو چھوڑ دینا آسان ہے بلکہ بہت ہی آسان۔ اب لگتا ہے کہ لڑائی عروج پر پہنچ چکی ہے۔ اس وقت میدان سے ہٹنے کا مطلب ان لوگوں کو ایک نہایت آسان فتح سے سرفراز کر دینا ہوگا جو ہندستان کی رنگا رنگ تہذیب اور متنوع روایات پر ایک واحد عقیدے کو تھوپ دیں گے۔ حقائق تو یہ ہیں کہ ہندستان

ایک خیال اور عقیدے کی ڈکٹیٹر شپ کا ہمنوا نہیں ہے. مگر ایسے لمحے ہوتے ہیں جب ذرا سی تحریک کو اتنی توانائی مل جاتی ہے کہ وہ ایک زبردست چیلنج کا روپ اختیار کرلیتی ہے اور ہم اس وقت کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہیں۔

بہت دنوں سے یہ کہا جاتا رہا ہے کہ میں موجودہ کتاب میں دو ایک باب اور شامل کر کے کہانی کو آگے بڑھاؤں۔ "دی سیج وِد اِن" ہندستان کی سیاست یا یہاں کے واقعات کا بیانیہ نہیں ہے یہ ایک سیاسی اور سماجی نظریے کو سمجھنے اور استعماری خلجان کے عذاب سے نکلے ہوئے ایک ملک کی بنیادی حقیقتوں پر اس نظریے کے اطلاق کی ایک کوشش ہے۔ اس میں مزید کوئی تبدیلی کسی کے علم میں کوئی اضافہ نہیں کرے گی، بلکہ شاید ایسا کرنا کتاب کے ربط کے لیے زیاں کا سبب بن جائے گا۔ اس سب کے بجائے آیئے ہم اس پر اپنی توجہ مرکوز کریں جو میں اور آپ سنتے ہیں اور توقع کریں کہ یہ آواز ان دروازوں کی ہوگی جو کھل رہے ہیں۔

ایم۔ جے۔ اکبر

••

تعارف

۱۹۵۹ء میں مولانا آزاد میموریل لیکچر دیتے ہوئے پنڈت نہرو نے کہا تھا "آج کے ہندوستان کو سمجھنے کی کوشش کرنا کسی ہمت والے ہی کا کام ہے۔ اور کل کے ہندوستان کا بیان ایک پاگل پن" مسئلے کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھنے والا، آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم سے بہتر کون ہو سکتا ہے۔ تاریخ داں، مقرر، ادیب، ماہر سیاست داں، تخیل پرست، سربراہ حکومت، کبھی فاتح، کبھی ناکام، "ڈیموکریٹ، خواب دیکھنے والا نہرو" اپنے ملک کی آزادی کو ملک کے منقسم ہونے کے بعد ہی دیکھ سکا۔ مہاتما گاندھی، ان کے تمام ساتھی بشمول نہرو، ایک ایسے ہندوستان کی یک جہتی اور سالمیت کے قائل تھے جو درّہ خیبر سے آسام اور کشمیر سے کیرالا تک پھیلا ہوا تھا۔ جیسا کہ پنڈت نہرو نے ۱۹۳۶ء میں اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا تھا کہ غالباً دنیا کا کوئی ملک جغرافیائی اعتبار سے یکجہتی اور سالمیت کے لیے ہندوستان سے زیادہ موزوں وجود میں نہیں آیا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھیں یہ بھی احساس تھا کہ عدم اتحاد در افتراقی کی صلاحیت رکھنے والے ملکوں میں بھی یہی ملک سر فہرست ہو سکتا ہے۔ یہ خیال دین ہے ہندوستان کی تاریخ کے غلط تاویلات کی۔ واضح اور ثقافتی طور پر مربوط و منسلک قطعہ اراضی اور جدید ملک و قوم کی پیدائش کے مابین نہ جانے کیسے نشیب و فراز ہوں گے۔

'تقسیم' کے لفظ ہی میں کسی کل کا منقسم ہونا مضمر ہے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم کا یہ عمل گاندھی، نہرو اور مولانا آزاد کے لیے ایک شکست تھا۔ مولانا وہ مسلمان قائد تھے جو جناح صاحب کے دو قومی نظریے کی حمایت کرنے کی بجائے مہاتما گاندھی کے ساتھ رہے۔ بہر حال پاکستان کے وجود کو تسلیم کرنے کے بعد بھی مختلف مذاہب، مختلف نسلوں اور مختلف زبانوں اور بھاشاؤں کے ہندوستان کا ایک معتد بہ حصہ ایک جھنڈے اور ایک سیکولر اور جمہوری آئین کا ماننے والا رہا۔ لیکن ملک کو تقسیم کرانے والے نظریات اور قوتیں ابھی بھی مطمئن نہیں تھیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ گاندھی ور جناح کے پیش کیے ہوئے جوازمیں سے تاریخ کسی ایک ہی کو صحیح ثابت کر سکتی تھی۔ دونوں نظریات کی بقائے باہمی

کا تصور مشکل تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا برصغیر کے ارتقا میں ایک وقفے کی حیثیت رکھتا ہے مستقل قیام کی نہیں مسلم فرقہ پرستی نے دریائے سندھ کو ہندوستان سے نکال کر پاکستان میں رکھ دیا۔ اب بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں سکھ فرقہ پرست خالصتان کی تخلیق کرنے پر مصر ہیں۔ مگر اس سے جو سوال سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے کے ایک حصے کی فرقہ پرستی گنگا کو تقسیم کر کے ملک کو تباہ کر دے گی؟ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ کو بدھ کے دن صبح کے نو بج کر اڑتیس منٹ پر اس وقت ملک بھر میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی جب دو سکھ محافظین نے مسز اندرا گاندھی کو گولیاں مار کر اپنی کمیونٹی کی انتقام کی بھوک کو مطمئن کر دیا۔ اور ہندوؤں نے ملک گیر پیمانے پر سکھوں کے خلاف تشدد کی آگ بھڑکا دی۔ اندیشہ یہ تھا کہ کہیں اکثر ملتوی ہونے والا بھیانک خواب واقعی حقیقت تو نہیں بن گیا ہے۔ مسز اندرا گاندھی نے شہادت کا درجہ حاصل کر لیا، اپنی جان کی قربانی دے دی لیکن کیا ابھی مزید کوئی قیمت دینا باقی ہے؟

۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو گھڑیال نے جب نصف شب ہونے کا اعلان کیا تھا تو پنڈت نہرو نے کہا تھا:

"بہت دنوں کی بات ہے ہم نے اپنے مقدر سے ایک عہد کیا تھا۔ آج وہ وقت آگیا ہے جب ہمیں اپنا عہد پورا کرنا ہوگا، مکمل طور پر ہی نہیں بلکہ مستحکم طور پر بھی۔ تاریخ انسانی کی ابھی صبح ہی تھی، جب ہندوستان نے کبھی نہ ختم ہونے والا سفر شروع کیا تھا۔ پچھلی بے نشان صدیاں اس کی جدوجہد کے نقوش اور اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی پرشکوہ علامتوں سے پُر ہیں..... آزادی کے جنم سے پہلے، جنم کے عمل کے تمام مصائب کو ہم نے جھیلا ہے اور ہمارے دل اس تکلیف کی یادوں سے بوجھل ہیں۔ ان مصائب میں سے کچھ تو آج بھی موجود ہیں...." بلکہ ان مصائب نے بیسویں صدی کی اس آٹھویں دہائی میں خوف ناک قوت و توانائی حاصل کر لی ہے۔

مگر ۱۹۴۷ میں کس کا خیال کس کا تصور صحیح تھا؟ گاندھی کا؟ جناح کا؟ مصنف کے لیے اس سوال کے جواب کی تلاش ایک ذاتی پہلو بھی رکھتی تھی۔ میں ایک ہندوستانی مسلمان ہوں۔ میرے نانا میر حبیب اللہ ایک کشمیری تھے جنھوں نے امرت سر میں شالوں کا کاروبار شروع کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی افراتفری میں امرتسر مسلمانوں سے خالی ہوگیا۔ اور میری ماں کا خاندان، خالی ہاتھ پناہ گزینوں کی حیثیت سے پاکستان چلا گیا۔ میرے دادا بڑی کم عمری ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ وہ بہار کے اپنے گاؤں کی غربت اور افلاس سے گھبرا کر بھاگے اور معاش کی تلاش میں کلکتہ کے صنعتی قرب و جوار کا رخ کیا۔ وہ ایک ہندو تھے جن کا نام پریاگ تھا۔ مگر بعد میں وہاں جمنے کے بعد وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور اپنا نام شیخ رحمت اللہ رکھ لیا۔ میرے والدین کی شادی ملک کی اس تقسیم سے پہلے

ہو چکی تھی جس نے خاندان کے دونوں حصوں کو دو الگ الگ ملکوں میں پہنچا دیا تھا۔ میرے والدین پر پاکستان چلے جانے کے لیے بہت زور ڈالا گیا، اس تحریک کو ترک کرنے پر راضی نہ ہوئے جس سے وہ ہمیشہ وابستہ رہے تھے۔ یہ تحریک تھی کانگریس۔ وہ فسادات کے دوران آنے والے ناگزیر دکھ اور مصائب کے باوجود ہندوستان میں بسے

ایک لحاظ سے ۱۹۴۷، ان لوگوں کی زندگیوں میں ایک اہم نقطہ یا مرکز تھا۔ میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی تاریخی نصف شب کے تین سال سے کچھ بعد ہی پیدا ہوا تھا۔ اور حقیقت کی تلاش و جستجو اور اس سے واقفیت اپنے حال کے لیے بھی اتنی ہی ضروری تھی جتنی مستقبل کے لیے۔ جستجو کے اس سفر میں میں نے اردو کے مشہور شاعر فیض احمد فیض کے ایک شعر کو جو انھوں نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کے بارے میں کہا تھا، اپنا راہ نما بنایا ہے

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

واقفیت حاصل کرنے اور سیکھنے کی ہر سعی دوستوں اور ساتھیوں کی اس غیر معمولی محبت اور اعانت کے بغیر ایک سعی لاحاصل رہتی جو مجھے ان سب سے بڑی فیاضی سے ملی۔ یہ تذکرہ خدا کرے رسمی نہ لگے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں کو کسی اور طریقے سے کیسے کہوں۔ خود میں نہیں جانتا۔ اَویک اور اروپ سرکار کو میں نے پہلی بار اس وقت جانا جب انھوں نے دیکلی سنڈے کے ایڈیٹر کی حیثیت سے مجھے ملازم رکھا۔ آج یہ دونوں میرے دوست بھی ہیں۔ ان دونوں نے اس کام میں میری جتنی مدد کی ہے اس کی عام حالت میں نہ تو کوئی توقع کر سکتا ہے نہ وہ اتنی مل سکتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شکر گزاری کا اظہار کیوں کر کروں؟ پچھلی دو دہائیوں میں تین افراد نے مجھے وہ تعلیم دی ہے جس نے اس کام کو ممکن بنا دیا۔ پروفیسر ارون کمار داس گپتا، پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں میرے استاد، السٹریٹیڈ ویکلی میں میرے ایڈیٹر خشونت سنگھ، جن کی محبت کا نقش مٹایا نہیں جا سکتا اور لائق تحسین کلدیپ، خشونت سنگھ کا شکر گزار میں ان کے اس تنقیدی جائزے کے لیے بھی ہوں جو انھوں نے کتاب کے پنجاب سے متعلق باب کا کیا تھا۔ اور کلدیپ نیر کا ممنون ان ضروری اور اہم دستاویزات کے لیے ہوں جو ان کے پاس تھیں اور انھوں نے مجھے دیں۔

اپنے ساتھی شجا برآتا بھٹا چاریہ کا بھی خصوصی شکریہ مجھ پر واجب ہے جنھوں نے نہ صرف یہ کہ کتاب کے کشمیر سے متعلق باب کی تیاری میں میری مدد کی بلکہ اس بات کا بھی شکریہ کہ انھوں نے میرا بہت خیال رکھا۔ مانتی چیٹرجی تو ہیرا تھیں۔ تحقیق اور تصحیح میں ان کی مدد، وقت دینے میں ان کی بے تکلف فیاضی کا بدلہ دیا ہی نہیں جا سکتا۔

اپنے دوست فہیم انصاری اور سونی مہتا کا بھی شکر گزار ہوں، ان کے مشوروں کے لیے جو ان دونوں نے کتاب کے پہلے اور مشکل باب سے متعلق دیئے۔ تیکھو بھاٹیا (اور یقیناً پاکھی بھی) ببیر رائے، توشور پنڈت، اشیش رائے اور ٹیلی گراف اور سنڈے کے میرے تمام دوستوں اور ساتھیوں نے آزمایش کے ان مہینوں میں میری دلجوئی اور ہمت افزائی میں کمی نہیں کی جب میں صحافت سے زیادہ اس کتاب پر توجہ دے رہا تھا۔ میرے خصوصی شکریے کے مستحق فاروق عبداللہ اور وجے دھر بھی ہیں جنھوں نے ماضی کے بارے میں مجھے ایسی معلومات فراہم کیں جسے صرف وہی فراہم کر سکتے تھے۔ انتظامی معاملات میں امداد دینے کے لیے میں بسوارنجن سرکار اور شرن کمار کا بھی مشکور ہوں۔ آنند بازار لائبریری میں توشور، سانیال، اور دوسرے دوستوں کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اس سلسلے میں بے پناہ تعاون دیا۔ اس کتاب کا خیال میرے ایک دوست پیٹر میئر کا مرہون منت ہے جنھوں نے مجھ پر اس وقت اعتماد کا اظہار کیا جب کہ میں نے ایک حرف بھی نہیں لکھا تھا۔ لکھنے کے فن کی نزاکتوں اور مدلل انداز میں بات کہنے کے سلسلے میں پیٹر کارمن نے جو دست گیری اور راہ نمائی کی اس سے میں نے ادارتی کاٹ چھانٹ کے بہت سے سبق سیکھے۔

میری زندگی میں ایک غیر معمولی شخصیت ہے جس کا شکریہ میں شاید کبھی ادا نہ کر سکوں گا اور وہ ہے میری بیوی ملکہ۔ ملکہ نے مجھے اتنی محبت دی ہے جس کا میں کسی طرح بھی مستحق نہیں تھا۔ اس نے اپنی محبت اور خبر گیری سے گھر میں ایک ایسا ماحول بنا دیا جس نے ایک خشک شوہر کی پرورش کر دی۔ کتاب سے متعلق اس کے مشورے اور ہدایتیں بڑی دامنع اور اہم تھیں۔ میری بیٹی موکولیکا اور بیٹے پریاگ کا ساتھ میری زندگی کی سب سے بڑی مسرت ہے۔ اور یہی مسرت میری زندگی اور کام کا عجیب و غریب جواز بھی بن گئی ہے۔ یہ کتاب ایک باپ کی اپنے بچوں کو یہ بتانے کی بھی ایک کوشش ہے کہ اس نے کیا کچھ دیکھا اور کیا کچھ سیکھا ہے۔



پہلا حصہ

پاکستان کا جنم

اور

ہندوستان کی بقا

۱

۱۹۴۷ کی منطقی بنیاد

ہندوستان نے اپنا نام انڈس نام کے اُس عظیم دریا سے لیا ہے جو ہمالیہ سے نکلتا ہے اور شمال مغرب سے بہتا ہوا بحیرۂ عرب میں مل جاتا ہے۔ انڈس خود سنسکرت لفظ سندھو کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ سندھو کا مطلب ہے دریا۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری نے یہ بتاتے ہوئے کہ کنگ الفرڈ نے اپنے مسودوں میں انڈیا کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ اس نام سے مراد حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے قبل بھی جنوبی ایشیا کے ایک بڑے ملک یا بڑے علاقے سے تھی جو دریائے انڈس کے مشرق میں اور ہمالیہ پہاڑ کے جنوب میں واقع تھا۔ ۱۹۴۷ء میں انگریزوں نے اس بڑے ملک کو آزاد کیا مگر منقسم۔ اور ستم ظریفی دیکھیے کہ انڈس جس نے اس ملک کو یہ نام دیا تھا آج ایک نئے ملک پاکستان میں ہے۔

بعض مورخین نے اس خیال کو فروغ دینے میں فخر محسوس کیا کہ ہندوستان کے ایک ملک ہونے کا تصور برطانوی شان خسروی کا عطا کیا ہوا ایک تحفہ ہے۔ اس نظریے کا مطلب یہ ہے کہ یہ یک جہتی محض کچھ مدت کی بات ہے۔ سلطنت برطانیہ کے اتحاد و یک جہتی کے اثرات ختم ہوئے اور ملک کے لسانی گروہوں نے ماضی کے تباہ کن جنگ و جدال کا پھر آغاز کیا۔ موجودہ نظریہ سازوں میں ایک David Page بھی ہے جس نے اپنی کتاب Prelude to Partition (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۸۲ء) میں لکھا ہے "انڈین نیشنل کانگریس یا مسلم لیگ کے قیام سے پہلے ہندوستان میں ایک قومی تنظیم موجود تھی اور جس کا اثر و رسوخ دور افتادہ گاؤں تک پھیلا ہوا تھا۔ اور یہ تنظیم تھی خود امپیریل قوت۔

دہلی پر انگریزوں کا تسلط ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ۱۸۸۵ء میں عمل میں آیا۔ یہ یقیناً ایک غیر معمولی حکومت ہوگی جس نے محض تین دہائیوں کی مدت میں برصغیر جیسے بڑے علاقے کو متحد و مربوط کر دیا۔ اور اس کا یہ

عمل ایک ایسے علاقے میں ہوا جس میں ایسا لگتا ہے کہ ہزاروں برس سے نہ تو کوئی قدر مشترک تھی اور نہ ہی ایک دوسرے کو قریب لانے کا کوئی عنصر۔ حضرت عیسیٰ سے ڈھائی سو سال پہلے اشوک کی حکومت نے بدھ مت کو حکومت کے کونے کونے تک پہنچا دیا مگر بظاہر اس نے مشترکہ پہچان کے کسی احساس کو پروان نہیں چڑھایا۔ برھسپتی کے وضع کردہ فطری انصاف کے اصول صدیوں سے عوامی عقیدوں کا حصہ رہے ہیں مگر کہا یہ جاتا ہے کہ ہندوستان میں قانون کا احساس برطانوی عدالتوں کی دین ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں مغل بادشاہ اکبر کے انتظامی ڈھانچے نے اس کی عظیم سلطنت کو یکجا اور مستحکم رکھا۔ مگر ہمیں یہ یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ ضلع کا انگریز کلکٹر تھا جس نے ہندوستانیوں کو خود حکومت کرنے کے سبق یاد کرائے۔ شنکر نے ہندو مذہب کی تبلیغ کی اور ولیم آف نارمنڈی کے برطانیہ پہنچنے سے پہلے کیرالا سے کشمیر تک کی مسافت طے کر ڈالی۔ مگر یہ سہرا برطانوی ریلوں کے سر باندھا جاتا ہے جنھوں نے نقل و حمل اور رسل و رسائل کا ایک جال سا بچھا کر ہندوستانیوں کو متحد کر دیا۔ برطانوی حکومت کی مہربانیوں سے ملک کے اتحاد کا یہ نظریہ متعدد طریقوں سے رد کیا جا سکتا ہے۔ مگر سب سے آسان دلیل یہ حقیقت ہوگی کہ خود ۱۹۴۷ء میں بھی اس ملک کا تقریباً نصف حصہ برطانوی حکومت کے تحت نہیں تھا، بلکہ اس پر اس کے دیسی اتحادی راج کرتے تھے جن کے کارندے ہندوستانی ہوتے تھے۔ مدرسوں میں استعمال ہونے والے نقشوں میں سارا ہندوستان لال رنگ کا ضرور دکھایا جاتا تھا مگر اصولی اور تکنیکی لحاظ سے ریاستیں برطانوی ہند کا حصہ نہیں تھیں۔ حصول آزادی کے وقت ان ۵۶۵ ریاستوں میں سے ہر ایک سے الحاق کا ایک الگ الگ معاہدہ کرنا پڑا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان جاگیردارانہ ریاستوں اور حکومتوں میں منقسم رہ چکا ہے اور اس کا نقشہ مختلف حکمرانوں کی شکست و فتح کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے لیکن یہ بات کسی ایسے یورپین کو جس کو جرمنی یا اٹلی کے بارے میں ذرا سا بھی علم ہو، کسی طرح بھی زیب نہیں دیتی کہ وہ یہ کہے کہ جاگیردارانہ حصے بخرے الگ الگ حکومتوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ زبانوں اور بھاشاؤں کے تنوع کے باوجود، شمال مغرب میں، کوہ سلیمان اور ہندوکش سے لے کر شمال میں ہمالیہ تک اور مغرب، جنوب اور مشرق کے سمندروں تک ہمیں ایک جغرافیائی اور ثقافتی یک جہتی کا احساس بیدار نظر آتا ہے۔ لاتعداد بادشاہوں اور حکومتوں کی موجودگی کے باوجود، ہردوار، یا بنارس جانے کے لیے کسی ہندو کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی طرح بعد کے زمانے میں کسی مسلمان کو خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر حاضری دینے کے لیے اجمیر میں داخل ہونے کے واسطے کوئی درخواست نہیں گزارنی پڑتی تھی۔ غرض اس سرزمین پر عقائد و خیالات کی لہریں،

حکومتوں کی تبدیلیوں سے بے نیاز رواں دواں تھیں۔ ریلوں اور سڑکوں کا فرق حقیقتاً صرف رفتار کی سستی اور تیزی کا فرق تھا۔ جدید اور قدیم ٹکنالوجی کا فرق تھا۔ اسے کسی طرح بھی ایک نئے ملک اور پرانی افراتفری کا باہمی فرق نہیں قرار دیا جاسکتا۔

حقیقتاً انگریز جو کچھ لائے وہ تھے سیاسی نظام، علم قانون اور سائنس کے جدید رُجحانات۔ سب سے اہم سرمایہ جو ہندوستان کو انگریزوں سے ملا، انگریزوں کا دیا ہوا نہیں بلکہ ان سے ہندوستانیوں کا حاصل کیا ہوا سرمایہ تھا یعنی ایک جمہوری طرزِ حکومت۔ یہی وہ خیال اور ڈھانچہ تھا جو مہاتما گاندھی اور کانگریس کو ایسا لگا جس میں قدیم ورثے اور جدید آرزوؤں کو یکجا کیا جاسکتا تھا۔ اور اس میں وہ سکت بھی نظر آتی تھی جو ان غیر معمولی کشمکشوں اور اختلاف کا مقابلہ کرسکتی تھی جو نوعِ انسانی اپنے مابین تخلیق کرنے میں کبھی پیچھے نہیں رہتی۔ گاندھی جی کو اس بات کا یقین تھا کہ طبقاتی بنیادوں پر مبنی تشدد آمیز انقلاب یا جاگیردارانہ مذہبی فاشزم کے بجائے باہمی تعاون پر مبنی کامیابیاں ہی ہندوستان کو خوش حالی کا مژدہ سنا سکتی ہیں۔ اجمالی طور پر یہی فلسفہ تھا کانگریسی قوم پرستوں کا۔ اسی نظریے کے مقابلے میں دوسرا نظریہ وہ سامنے آیا، جو نظریۂ فرقہ پرستی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سیدھے سادے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نظریے کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ ہندوستان میں بسنے والی مختلف قومیں، باہمی مفاد کی خاطر بقائے باہمی کی حامل نہیں ہوسکتی ہیں۔ اقلیتیں ہندوؤں کی غلامی اور ماتحتی کا شکار ہوں گی اور اس صورت حال میں نہ تو تاریخ ہی اور نہ ہی ثقافت، باہمی تعاون کی اجازت دے گی۔ تین بڑے مذاہب ہندو دھرم، اسلام اور سکھ مذہب، تینوں کی نمایندگی کرنے والی فرقہ پرست جماعتیں تھیں۔ جمہوریت کو ایک اچھا سرمایہ سمجھنے کی بجائے ایک بوجھ قرار دیا گیا۔ مسلم لیگ کا کہنا تھا کہ ایک فرد ایک ووٹ کا طریقہ اقلیتوں کو حکمراں طبقے تک کبھی پہنچنے ہی نہیں دے گا کیوں کہ ہندوؤں کی زبردست اکثریت انھیں یہاں تک پہنچنے سے ہمیشہ باز رکھے گی۔ متحدہ ہندوستان میں آبادی کے اختلاط کا سرسری جائزہ بھی اس دلیل کی قلعی کھول سکتا تھا۔ مگر ظاہر ہے کہ پراگینڈے کے لیے یہ ایک مفید اور نہایت آسان نعرہ تھا۔ اسی لیے اس صدی کی پہلی دہائی میں، لیگی سیاست دانوں کا اولین مطالبہ علیحدہ انتخابی حلقوں کا تھا جس میں مُسلمان، مُسلمان کو اور ہندو، ہندو کو ووٹ دیتا۔ انگریزوں نے اس مطالبے کو آسانی سے مان لیا۔ ان کی یہ منظوری کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کیوں کہ یہ صورت حال ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دست و گریباں رکھنے کی ان کی پالیسی کے عین مطابق تھی۔ اور یہی طریقہ تھا کہ یہ لوگ خود انگریز کے خلاف یکجا نہیں ہوسکتے تھے۔ مسلمان لیڈر محمد علی جناح نے نومبر ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس کے صدر لارڈ سینکی سے کہا تھا:

"مائی لارڈ، ڈیوائڈ اینڈ رول' آج کا عام طریقہ ہے مگر ہندوستان میں ہم تقسیم ہوتے ہیں اور آپ حکومت کرتے ہیں۔' کٹر ہندوؤں نے ہندو برتری اور اقتدار کے فضول تذکرے سے شکوک وشبہات اور تعصبات کو مزید تقویت پہنچائی۔ ایسے ہندو خود اپنی ایک ایسی مذہبی ریاست بنانا چاہتے تھے جہاں وہ مسلمانوں اور عیسائیوں سے تاریخ کی ایک عجیب وغریب بے ربطی کا بدلہ لیتے۔ ساڑھے سات سو سال کے عرصے میں کسی ہندو نے دہلی میں حکومت نہیں کی تھی۔ ۱۱۹۲ء سے ۱۸۵۷ء تک اقتدار کے زبردست نشیب وفراز کے باوجود دہلی کے تخت پر مسلمان بادشاہ متمکن رہے۔ ۱۸۵۷ کے بعد انگریز عیسائیوں نے ان کی جگہ لی۔

مگر جاگیردارانہ نظام بیسویں صدی تک ایک فرسودہ تصور بن چکا تھا۔ قوت کی نوعیت اور اس کے حصول کی شرائط نوآبادیاتی نظام کے مابعد ہندوستان میں یکسر بدل گئی تھیں۔ حکمراں کے اقتدار کا جائز یا ناجائز ہونا نسل یا تلوار کے زور پر ہونے کے بجائے ووٹوں کی گنتی کی بنیاد پر ہونے لگا تھا۔ صدی کے آخر میں ہندوستانی دماغ پر قابو پانے کے لیے قوم پرستوں اور فرقہ پرستوں میں کش مکش شروع ہوئی۔ نیا ہندوستان کیا ہوگا اور کیسا ہوگا، اس کے بارے میں متضاد خواب دیکھے جانے لگے۔ ۱۹۴۷ میں انگریزوں نے دو مکاتیب خیال کے لوگوں کو جزوی کامیابی عطا کر دی۔ مسلمان جو یہ کہتے تھے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتے، انھیں پاکستان دے دیا گیا اور ان قوم پرستوں کو جو ایک متحد اور جمہوری ہندوستان چاہتے تھے ملک کا باقی حصہ ان کے حوالے کر دیا گیا۔ مگر جد وجہد آج بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ پاکستان میں جو لوگ جمہوریت کی بحالی اور ایک نامذہبی حکومت کا قیام چاہتے ہیں وہ آج بھی احتجاج کر رہے ہیں اور امید باندھے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں ان لوگوں نے، جیسے سکھ جو ملک کو ایک بار پھر تقسیم کرانا چاہتے ہیں، جمہوری ریاست کے خلاف اپنی جنگ کو تشدد اور غلط استدلال کی انتہائی پستیوں تک پہنچا دیا ہے۔

مورخ بپن چندر نے اپنی ایک بڑی بروقت کتاب "کمیونلزم ان ماڈرن انڈیا" (وکاس پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۴) میں دونوں سیاسی محرکات کو یوں بیان کیا ہے۔ "ہندوستان میں قوم پرستی اور فرقہ پرستی دونوں ہی حال کی پیداوار ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں ہی جدید تاریخی عمل ہیں۔ نوآبادیاتی نظام کے زیر اثر ہندوستان کی تبدیلی اور اس کا تغیر۔ یہ دونوں پرچھائیاں تھیں اس روز بروز واضح ہوتی ہوئی حقیقت کی جو نوآبادیاتی نظام کے تسلط سے قبل کے سماجی ڈھانچے کی خاکستر سے پیدا ہوئی تھی، اور انیسویں صدی میں ہندوستان میں ابھرنے والی جدید سیاست کی دین بھی تھی۔ جدید سیاست، عوامی شرکت کی سیاست تھی، رائے عامہ کی بیداری کی سیاست تھی اور

عوامی اقتدار و خود مختاری کی بے مثال اور انقلابی نظریے کی سیاست تھی۔ نئی سیاسی زندگی اور وفاداریوں کو بہر حال نئی سیاسی شناختوں اور ارتباط و اتحاد کے اصولوں پر مبنی ہونا تھا۔

مسلم لیگ کے لاہور ریزولیوشن کی حمایت میں جو بعد کو مطالبۂ پاکستان کا منشور قرار پایا، تقریر کرتے ہوئے ۱۹۴۰ء میں محمد علی جناح نے کہا تھا کہ یہ بات ایک خواب ہی ہے کہ ہندو اور مسلمان کبھی بھی ایک مشترکہ قومیت کو فروغ دے سکیں گے۔ قوم پرستوں کا نقطۂ نظر ۱۹۴۲ء میں شائع ہونے والے گاندھی جی کے ایک مضمون میں بہت اچھے ڈھنگ سے پیش کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا "مذہب کی بنیاد پر انسان کو انسان سے الگ کرنا میں یکسر غلط سمجھتا ہوں۔ مالگزاری، صحت عامہ، پولیس، عدلیہ یا عوامی سہولتوں کے استعمال کے معاملے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفادات میں کیا فرق ہو سکتا ہے۔ ان دونوں کے مابین فرق صرف مذہبی رسوم اور طور طریقوں میں ہو سکتا ہے جس سے ایک نامذہبی حکومت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" گاندھی جی کے یہ جذبات محض زبانی یا ظاہری نہیں تھے، انھوں نے ان پر اپنی زندگی میں عمل پیرا ہو کر دکھایا۔ اس حقیقت سے عام طور پر لوگ واقف نہیں ہیں کہ گاندھی جی کا سب سے بڑا لڑکا مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں جب لوگوں نے گاندھی جی کو طنز و تشنیع کا ہدف بنایا تو گاندھی جی نے کہا اگر میرا لڑکا مسلمان ہونے کے بعد شراب پینا ترک کر دیتا ہے (شراب اسلام میں ممنوع ہے) تو میں اس کے مذہب تبدیل کر لینے کو بخوشی قبول کر لوں گا۔ انھوں نے ان لوگوں سے جو سمجھتے ہیں کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں، کہا "میرے بیٹے نے ابھی چند سال قبل اسلام قبول کیا ہے اسکا وطن پوربندر ہوگا (جہاں وہ پیدا ہوا تھا) یا پنجاب جہاں پاکستان کے تصور نے جنم لیا۔ میں مسلمانوں سے پوچھتا ہوں اگر ہندوستان تمھارا وطن نہیں ہے تو پھر کس ملک سے تمھارا تعلق ہے؟ تم میرے بیٹے کو جس نے اسلام قبول کر لیا ہے کس دوسرے وطن میں رکھو گے؟" (یہ اقتباس گاندھی جی کی اس تقریر سے لیا گیا جو انھوں نے بمبئی میں اس تاریخی کانگریس سیشن میں ۱۹۴۲ء میں کی تھی جس میں "ہندوستان چھوڑو" تجویز منظور ہوئی تھی)۔ اس صورت حال کا مقابلہ جناح صاحب سے کیجیے۔ جنھوں نے اپنی بیٹی کو عاق کر دیا کہ وہ ایک پارسی سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اور اس نے بہر حال ایک پارسی ہی سے شادی کی۔ جناح صاحب پاکستان چلے گئے، ان کی بیٹی ہندوستان میں رہی۔ ہندوستانیوں کو ان کی آزادی واپس دینے پر انگریزوں کو مجبور کرنے میں جد و جہد، ایثار و قربانی اور عزائم کے پچاس سال لگ گئے۔ دوسری طرف پاکستان نام کے ملک کی تخلیق و تشکیل محض سات برسوں کی قلیل مدت میں ہو گئی۔ ۱۹۴۰ء سے قبل مسلم لیگ کی قیادت میں جو لوگ نسبتاً زیادہ کٹر تھے وہ بھی بار بار یہ کہتے تھے کہ وہ ایک الگ ملک نہیں چاہتے،

ان کا مطالبہ تو صرف باعزت بقائے باہمی ہے۔ مسلمانوں کے ایک الگ قوم ہونے کے خیال کو ہر طرز فکر کے مسلم قائدین نے حماقت آمیز کہہ کر رد کیا تھا۔ دسمبر ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کے سیشن کے صدر مظہر الحق نے اس بات کو بڑے مختصر مگر واضح طور پر یوں کہا تھا "ہم ہندوستانی مسلمان ہیں۔ یہ الفاظ 'ہندوستانی مسلمان' ہماری قومیت اور ہمارے مذہب کا اعلان کرتے ہیں..... جب کبھی ہندوستان کی فلاح و بہبود اور ہندوستانیوں کے ساتھ انصاف کا سوال سامنے آتا ہے اس وقت میں صرف ایک ہندوستانی ہی نہیں ہوتا، بلکہ پہلے ہندوستانی ہوتا ہوں"..... مولانا محمد علی نے پہلی گول میز کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ "مسلمان خدا کے احکامات کے معاملے میں اول مسلمان، دوم مسلمان اور آخر میں مسلمان اور مسلمان کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا..... مگر جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے میں اوّل ہندوستانی ہوں، دوم ہندوستان ہوں اور بہر حال ہندوستانی ہوں۔"

۱۹۳۱ء میں مسلم لیگ کے صدر خان صاحب محمد عبداللہ نے بائیسویں سیشن کو خطاب کرتے ہوئے ۲۶ دسمبر کو کہا تھا "سب سے پہلے اور انتہائی صفائی کے ساتھ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم اتنے ہی ہندوستانی ہونے کے دعوے دار ہیں جتنی کہ ہندوستان میں کوئی دوسری قوم دعوے دار ہو سکتی ہے۔ اور ہمیں بھی ملک کے حصولِ آزادی سے اتنی ہی دل چسپی ہے جتنی کسی دوسرے کو..... دقتیں اس وقت درپیش ہوتی ہیں جب ہم پر پین اسلام ازم کا الزام لگایا جاتا ہے۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ محض اس لیے کہ ہم کچھ خصوصی تحفظات کا مطالبہ کرتے ہیں، ہم ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے منصوبے بنا رہے ہیں میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہندو بھائیوں کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم مسلمان سرزمین ہند کے ہیں اور ہمارا نقطہ نظر بنیادی طور پر ہندوستانی ہے...... ہمیں ایک مشترکہ ہندوستانی ثقافت کے فروغ اور خوش حالی اور ترقی پسند ہندوستانی قوم کی تعمیر کے لیے متحدہ کوشش کرنا چاہیے۔ یہ مشترکہ ثقافت ملک کی ان مختلف تہذیبوں کے مجموعی نے اس ملک میں راہ پائی ہے، بہترین عناصر پر مشتمل ہوگی۔ لیکن جب تک ایک کمیونٹی دوسری کمیونٹی پر اپنے تسلط کے لیے کوشاں رہے گی اور ہندو یا مسلم حکومت کے خواب دیکھے گی..... اس وقت تک ایک عظیم اور آزاد ملک بنانے کی ہماری جائز آرزوؤں کی تکمیل کی کم ہی امید رکھی جا سکتی ہے۔"

پاکستان کا قیام خواب تھا مگر مٹھی بھر کٹر مذہبی لوگوں کا۔ درحقیقت مسلمانوں کا ایک خاصا با اثر حلقہ آخر وقت تک گاندھی اور قوم پرست دھارے کے ساتھ رہا ان ہی سب میں عظیم تر تھے ابوالکلام جن کے دینی علم و فضل نے انھیں اپنے نام کے ساتھ مولانا کا لفظ لگانے کا حق دیا تھا۔ دوسری طرف جوشِ طبیعت نے لفظ "آزاد" نام کا حصہ بنا دیا۔ انکی خلاقی کا جوہر یا یوں کہیے کہ خلاصہ خود انکی

اس موثر تقریر میں مل جاتا ہے جو انھوں نے ۱۹۴۰ء میں کانگریس کے رام گڑھ سیشن میں کی تھی۔ یہاں وہ اُسی ہفتے میں پارٹی کے صدر منتخب ہوئے تھے جس ہفتے میں مسلم لیگ نے لاہور میں پاکستان کی تجویز منظور کی تھی: "میں مسلمان ہوں، اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب، میری دولت کا سرمایہ ہے۔ اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔ اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اسکی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں، میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔"

اگر ہندوستان کا اتحاد اور سالمیت ایک بار پھر تباہ ہوتی ہے تو اس کے اسباب اس دفعہ بھی وہی ہوں گے جو پچھلی دفعہ تھے۔ یعنی ایک اقلیت کی قیادت نے شعوری طور پر بھڑکائے ہوئے تشدد کے درمیان، اس نقطہ نظر کو پھیلانے کا اہتمام کر لیا کہ ایک ہندو اکثریت انھیں یا تو غلام بنالے گی یا پھر ان کے وجود ہی کو ختم کر دے گی۔ مسلمانوں کو یہ باور کرایا گیا کہ ہندو سیکولرزم ایک دکھاوا ہے اور اس کی جمہوریت، مسلمانوں کو غلام بنانے کے اس کے زہریلے ارادے پر پردہ ڈالنے کی ایک چال۔ آج سکھوں کو بھی یہی یقین دلانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ ان کا مذہب، ہندوؤں کی انھیں اپنے میں جذب کر لینے کی کوشش سے اس وقت تک نہ بچ پائے گا جب تک کہ وہ خود اپنا ایک الگ ملک حاصل نہ کر لیں۔ ہندوستان کے نقشے پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے پتہ چل جاتا ہے کہ نازک اور حساس مقامات کہاں کہاں ہیں۔ پنجاب کی سکھ ریاست اور جموں و کشمیر کی مسلم ریاست۔ یہ ریاستیں خود ایک دوسرے سے ملحق ہیں اور پاکستان سے بھی ملی ہوئی ہیں۔ دینی حکومت کے یہ مبلغین دماغوں کو بدل دینے کی نئی جنگ میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پنجاب اور کشمیر کو ہندوستان میں نہیں رکھا جا سکے گا۔ اگر ڈیموکریٹس یہ ثابت کر سکیں کہ بقائے باہمی نہ صرف ممکن ہے بلکہ مفید بھی ہے تو ہندوستان کے نقشے میں تبدیلی ایک دوسرے ڈھنگ سے ہوگی۔ اگر ہم مستقبل کے امکانات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم ۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند کے عمل کو سمجھ لیں۔ کیونکہ اس فیصلے کی منطق ہی میں ملک کی نظریاتی اساس مضمر ہے اور اس نظریے

کی صحت یا اس کے عدم صحت پر ہی ملک و قوم کی ناکامی یا کامیابی کا انحصار ہے۔ ۱۸۸۵ء میں ایک منکسر المزاج انگریز Allen Oclavia Hume کی دین کانگریس کا قیام ۱۹۴۷ء تک کے سفر کا ایک بنیادی واقعہ تھا۔ تاریخ کے نشیب و فراز سے ہمہ وقت مطابقت دیتے ہوئے کانگریس نے اتنے عرصے اپنے آپ کو زندہ رکھا کہ اسے موہن داس کرم چند گاندھی جیسا ایک قائد نصیب ہو گیا جس نے وکیلوں کی اس پارٹی کو ایک عوامی پارٹی میں تبدیل کیا۔ اور آزادی کی راہ دکھائی۔ گاندھی سے پہلے کے عہد میں بھی مختلف مذہبی فرقوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت کے اہم سوال پر کانگریس کا نقطۂ نظر بالکل واضح تھا۔ اس کا پہلا صدر اگر انگلستان سے آیا ہوا ایک عیسائی تھا تو تیسرا بمبئی کا ایک مسلمان بدرالدین طیب جی۔ سر بدرالدین طیب جی نے اپنے صدارتی خطبے میں پُرزور طریقے پر یہ کہا تھا "کم از کم میں ہندوستان کے مختلف فرقوں کے باہمی تعلقات میں وہ چاہے ہندو ہوں یا مسلمان، پارسی ہوں یا عیسائی، کوئی ایسی رکاوٹ محسوس نہیں کرتا جو ایک فرقے کے لیڈروں کو دوسرے فرقے کے لیڈروں سے اور اس جدوجہد سے الگ کرتی ہو جو یہ سب مفاد عامہ کی خاطر عظیم عوامی اصلاحات اور عمومی حقوق کے حصول کے لیے کرتے ہیں"۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ ہندوستان میں دریافت اور از سر نو جانچنے کا زمانہ تھا۔ پرانا نظام، اقتدار و اختیار کا جاگیردارانہ ڈھانچہ ٹوٹ چکا تھا اور مختلف مفادات رکھنے والے مختلف گروہ ان طریقوں کی تلاش میں لگے ہوئے تھے جن کی مدد سے وہ بدلتی ہوئی دنیا میں اپنے مرتبے اور اپنے مقام کو استحکام بخش سکیں۔ اسی کے پہلو بہ پہلو ایک نئے انگریزی داں طبقے نے اصلی ہندوستان کی دریافت کرنے اور اسے نئے ماحول میں صحیح مقام دلانے کی اپنی کوشش میں اپنے نظریات و جذبات کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ کیشب چندر سین جیسے مصلحین نے ایک عظیم وفاق میں ذات پات کی پابندیوں سے آزاد، اور ایک متحدہ ینگ انڈیا کی خواہش ظاہر کی۔ دوسروں نے جن کی آرزوئیں اور خواہشیں مختلف تھیں، ایک ایسی سرکاری زبان کی تلاش شروع کی جو شمالی ہندوستان کی ہندو خصوصیات اور ہندو جذبات کی انگریزی اور فارسی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ترجمانی کر سکے۔ ہندی اسی ضرورت کی پیداوار تھی۔ ماضی کی وضاحت کرنے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے تاریخ اور ادب کی تخلیق ہوئی۔ یہ ایک عام خیال تھا کہ سفید چمڑی والوں کی حکومت ایک عارضی حقیقت ہے مگر سوال یہ تھا کہ انگریزوں کے بعد برسرِ حکومت پر کون آئے گا؟ اس سوال کے مختلف اور متضاد جواب دیئے جاتے تھے۔ آزاد خیال (لبرل) طبقۂ اشراف، ایک عظیم اور اچھے آئین کے وضع کیے ہوئے قوانین کی حکومت چاہتا تھا۔ دوسرے بہت سے لوگ بڑے خطرناک ارادے اور آرزوئیں رکھتے تھے۔ اس صدی کے ایک سب سے زیادہ ممتاز فرقہ پرست ایم۔ ایس گولوالکر نے اپنی کتاب میں اپنے خیالات کو بے واضح طور پر پیش کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب "دی" ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ "اقلیتوں کو اکثریت کے رحم و کرم پر رہنا

چاہیے، صرف ایک ہندو ہی سچا ہندوستانی ہو سکتا ہے، جن لوگوں کے عقائد کی جڑیں اس برصغیر میں نہیں وہ بدیسی ہیں۔ مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں اور پارسیوں کو ہندو کلچر اور ہندو زبان کو اپنانا ہوگا، انھیں ہندو دھرم کا احترام اور اس کی تعظیم و تکریم کرنا سیکھنا ہوگا۔ انھیں اپنے دماغوں کو بالکل صاف کرکے صرف ہندو نسل اور ہندو تہذیب کی حمد و ثنا کرنا ہوگی ...... (وہ) ملک میں رہ سکتے ہیں مگر ہندو قوم کے ماتحت محض ہو کر۔ کسی چیز کے دعوے دار نہیں ہو سکتے، کسی قسم کی مراعات کا ان کو حق نہیں ہوگا، کسی ترجیحی سلوک کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے، ایک عام شہری کے حقوق بھی ان کے نہیں ہوں گے ...... اور ملک میں صرف ہندو ہی قوم ہیں اور مسلمان اور دوسرے لوگ چاہے قوم مخالف نہ بھی سمجھے جائیں، قوم سے باہر ضرور ہوں گے۔" راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ وہ تنظیم تھی جس کی گولوالکر نے بہت دنوں قیادت کی اور یہی وہ تنظیم تھی جس نے مہاتما گاندھی کے قتل کی ہمت افزائی کی تھی، بہرحال ایسی ہندو بنیاد پرستی کو جو متوسط طبقے کے بھی صرف ایک حصے کی آرزو تھی ایک ایسے ہندوستان میں کچھ مقبولیت نہیں مل سکی جس کی اسّی فی صد آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ہندوستان صرف اس لیے سیکولر نہیں ہے کہ اس کی آبادی کا پانچواں حصہ مسلمانوں سکھوں اور عیسائیوں پر مشتمل ہے اور ایک سیکولر آئین میں اس کا ذاتی مفاد مضمر ہے۔ بلکہ ہندوستان اس لیے سیکولر ہے کہ یہاں کے دس میں سے نو ہندو اقلیتوں کے خلاف کسی قسم کے تشدد پر ایمان نہیں رکھتے۔ اگر سارے ہندو کٹر اور تشدد پسند ہوتے تو قانون اور ضابطے کی کوئی طاقت بھی ان مسلمانوں کے قتل عام کو روک نہیں سکتی جو ملک بھر میں گاؤں اور قصبوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کے طبقۂ اشراف کے جو صدیوں کے جاگیردارانہ دورِ حکومت کی پیداوار تھا، دو اہم حصے تھے۔ ایک زمیندار اور دوسرے علماء۔ دونوں ہی جمہوریت کے خیال سے کچھ بہت خوش نہیں تھے کہ اس میں یقیناً اصلاحات اراضی اور ایک عام قانون ہوگا۔ لفظاً اور عملاً اسلام میں ایک دوسرے سے جس طرح وابستہ ہیں ایسا کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے۔ قرآن اور حدیث، بالترتیب فرمانِ الٰہی ہے اور سماجی قانون کی اساس۔ اس میں مُلّا کا اثر ہے اور قوت کہ تاویل و ترجمانی بھی وہی کرتا ہے اور وہی معلم بھی ہے۔ مُلّا صرف مسلم عدالت ہی میں بااثر نہیں ہے وہ فرقے کی روزانہ زندگی پر اور تعلیمی نظام پر بھی قابو رکھنے کی وجہ سے اثر انداز ہوتا ہے۔ مُلّا قانون اور تعلیم پر سے اپنے اس قابو اور کنٹرول سے دست بردار ہونے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا کیوں کہ یہی دونوں چیزیں مسلم فرقے کی رہنمائی اور تشکیل کرتی ہیں۔ وہ کبھی بھی کسی ایسے سماج کی تشکیل کی خواہش نہیں کر سکتا جس میں قانون اور تعلیم ریاست کی ذمہ داری ہو۔ اور اسی لیے ملاؤں کے ایک حلقے نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ثقافتی اور جذباتی بُعد پیدا کرنے کی کوششوں کی قیادت سنبھال لی۔ یہی کوششیں بعد کو جغرافیائی علیحدگی کی تمہید ثابت ہوئیں۔ اس گروہ کا پہلا نشانہ شہری اور نیم شہری

متوسط طبقہ تھا جس کی آواز اس کی تعداد کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ اس کا سب سے موثر ہتھیار خوف تھا اور اسی میں لے ان کٹر ہندوؤں سے زبردست مدد ملی جن کی زیادتیاں حقیقی ہندو رائے عامہ کی حیثیت سے پیش کی جاتی تھیں اور جن کے خواب ان خوش آیند حالات کا مظہر کہہ کر دہرائے جاتے تھے جو عنان حکومت ہندوؤں کے ہاتھوں میں آنے کے بعد ہوں گے۔ نعرہ جنگ یہ تھا کہ مسلمان خطرے میں ہے۔ پہلا حل تحفظ کی آئینی ضمانتیں، تجویز کیا گیا۔ بعد کو کوئی ضمانت بھی کافی نہیں سمجھی گئی اور مطالبہ ایک الگ ملک کی مانگ میں بدل گیا۔ ایک ملک جس میں ملا ایک مذہبی آئین کے ذریعے خود اپنا تحفظ کر سکے گا یہ ایک مشکل کام تھا، اور اس میں کافی وقت لگا۔ پچھلی صدی میں سنٹرل پروونسز (سی۔پی) میں ۱۸۷۲ء میں، بہار میں ۱۸۸۱ میں اور یو پی میں ۱۸۹۱ء میں سرکاری کاموں میں انتظامی اصلاحات کے ضمن میں ہندی کے استعمال کا جو فیصلہ ہوا اسے بڑی چابکدستی سے اس خدشے کو پھیلانے میں استعمال کیا گیا کہ ابھی تو ابتدا ہے ان کوششوں کی جو مسلمانوں کو (جو ہندی نہیں اردو جانتے ہیں) سرکاری نوکریوں سے محروم رکھنے کے لیے کی جائیں گی۔ اس بات کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونا چاہیے کہ اس قسم کے پراپگنڈے پر متوسط طبقے کے افراد کا ردعمل کیا ہوگا۔

زمیندار، نواب اور خان بہادر حضرات بڑی خوشی سے ان ملاؤں سے مل گئے۔ دو روایتی قوتوں کا یہ ایک بڑا دل چسپ کلاسیکی ملاپ تھا، ان میں سے ایک کو اپنی اقتصادی قوت بچانے کی فکر تھی اور دوسری اپنی سماجی برتری کو بدستور قائم رکھنے پر کمر باندھے ہوئی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں قائم ہونے والی آل انڈیا مسلم لیگ اسی اتحاد کی پیداوار تھی۔ اس کا آغاز ڈھاکہ میں، ڈھاکہ کے نواب کی ایما اور پہل پر ہوا تھا۔ بنگال کے حساس صوبے میں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، مگر اقتصادی قوت ہندو زمینداروں کے ہاتھ میں تھی، نفرت کے بیج بونے کی کوششوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ کشمکش کا ایک مستقل ذریعہ گائے کا ذبیحہ ہوا کرتا تھا۔ ملاؤں کا دعوی تھا کہ یہ ان کا حق ہے اور کٹر ہندو چاہتے تھے کہ ان کا فرقہ مسلمانوں کو قتل کر کے گائے کا تحفظ کرے۔ ایسی فضا میں قوم پرست عموماً ناقابل اعتنا اور بے اثر ہو جاتے تھے۔ "دی بنگال مسلمس ۱۸۷۱-۱۹۰۶ء" (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس) میں رفیع الدین احمد نے لکھا ہے "ایک بنگالی مسلمان ادیب میر مشرف حسین نے اپنے آپ کو اس وقت معرض بحث میں آئے ہوئے ایک تنازعہ میں پھنسا لیا جب انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ اخوت اور بھائی چارگی کی خاطر مسلمانوں سے رضاکارانہ طور پر گائے کشی کو ترک کرنے کی وکالت کی...... (انھوں نے) کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زندگیوں کا ایک دوسرے پر اتنا انحصار ہے کہ اگرچہ وہ اپنے آپ کو مختلف مذاہب کو ماننے والا کہتے ہیں مگر دلوں میں اور اپنے عمل میں وہ ایک جیسے ہیں۔" مشرف کی اس معقول اور اعتدال پسندانہ بات کو قبولیت نصیب نہ ہوئی نہ ان کے ہم مذہبوں میں اور نہ ہی ہندوؤں میں۔

۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے ایک مسلم اکثریت والے حصے اور ایک ہندو اکثریت والے حصے بنانے کے لیے صوبہ بنگال کی تقسیم کی۔ جب لوگوں کو یہ علم ہوا کہ اس قسم کا کوئی فیصلہ زیرِ غور ہے تو دونوں فرقوں نے زبردست احتجاج کیا۔ لارڈ کرزن نے انعام و اکرام کی پیش کش کر کے مسلمانوں کو ملا لیا۔ ۱۸ فروری ۱۹۰۴ء میں ڈھاکہ میں ایک تقریر کرتے ہوئے لارڈ کرزن نے مسلمانوں کو بتایا کہ وہ ڈھاکہ میں مسلم قوت کا ایک مرکز بنانے میں ان کی مدد کریں گے "جو مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں وہ اتحاد و یک جہتی پیدا کر دے گا جو انھوں نے مسلمان وائسرائے اور مسلمان بادشاہوں کے عہد میں بھی نہ دیکھی ہوگی"

مسلم لیگ کو اپنی جاگیردارانہ اور مذہبی فطرت کے اظہار میں بھی تردّد نہ ہوا، ۱۹۰۷ء کراچی کے آئین نے رکنیت چار سو بارسوخ اور اہلِ حیثیت افراد تک محدود رکھی۔ اس کا پہلا مطالبہ اُن ضمانتوں کا تھا۔ اس نے مسلمانوں کے لیے الگ حلقہ انتخاب کی مانگ کی۔ مسلم لیگ کے قیام کے محض تین سال بعد ۱۹۰۹ء کے انڈین کاؤنسل ایکٹ (جو مارلے منٹو ریفارمس کے نام سے مشہور ہے) نے علیحدہ حلقہ ہائے انتخاب اور قانون ساز اسمبلیوں میں مسلمانوں کی الگ اہمیت اور حیثیت کو دستوری طور پر تسلیم کر لیا۔ مگر مسلم لیگ کو کچھ عرصے بعد ہی ایک زبردست دھکا اس وقت لگا جب ۱۹۱۱ء میں دہلی میں منعقد ہونے والے "دلی دربار" میں کنگ جارج پنجم نے بنگال کی تقسیم کے ناسور کو ختم کر کے اور صوبے کو پھر سے متحد کر کے ہندوستان کو ایک عطیہ دے دیا۔

ایک افسردہ و غمگین نواب سلیم اللہ نے ۱۹۱۲ء میں عملی سیاست سے دست کشی اختیار کر لی۔ مسلم لیگ نے اب تک ہندوؤں کے تسلط سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے خیال سے برطانوی حکومت کی حمایت کی تھی۔ ۱۹۱۳ء میں اس نے سیلف گورنمنٹ کے کانگریس کے مطالبے کو مان لیا۔ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ کی طرف سے محمد علی جناح اور سر وزیر حسن اور کانگریس کی طرف سے موتی لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرو نے دونوں پارٹیوں کے مابین مشہور و معروف لکھنؤ پیکٹ کی تدوین کی۔ اس معاہدے کے امکانی عواقب کو مسلم لیگ کے لیڈر راجہ محمود آباد نے خوش آمدید کہتے ہوئے بہت اچھے طریقے پر بیان کیا تھا "ہم ہندوستانی پہلے ہیں اور مسلمان بعد میں" (۱۹۸۲ء میں پاکستان کے جنرل ضیاء سے مصنف کی ایک گفتگو میں اس بیان کی بڑی دل چسپ بازگشت سننے میں آئی تھی۔ جنرل نے کہا تھا "میری خواہش ہے کہ ہندوستانی مسلمان خود اپنی شناخت بنائیں۔ ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اور ایک مسلمان کی حیثیت سے بھی۔ یہ دیکھ کر مجھے بے انتہا فخر ہوگا کہ ہندوستانی مسلمان اپنے آپ کو ہندوستانی پہلے، مسلمان بعد میں کہنے میں فخر محسوس کریں۔ ایسا سننے کے بعد میرا سر غرور سے اٹھ جائے گا۔" بڑا اعلیٰ خیال ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں کے لیے ہندوستانی ہونا اور اس پر فخر کرنا ممکن ہے تو ملک کی قطع و برید کر کے پاکستان کیوں بنایا گیا؟)

مسلم لیگ کے سامنے جو سب سے بڑا مسئلہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ جو پارٹی مسلمانوں کے نام پر بنی تھی اسے خود مسلمانوں کی حمایت نہیں مل رہی تھی۔ مسلمانوں میں زیادہ دل چسپی کانگریس سے نظر آتی تھی۔ اس مقام پر اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں جماعتیں کانگریس اور مسلم لیگ حقیقی معنوں میں باقاعدہ جماعتیں تھیں ہی نہیں۔ یہ دراصل تحریکیں تھیں۔ ایک ملک کی آزادی کے لیے اور دوسری مسلمانوں کے تحفظ کے لیے۔ محمد علی جناح جیسے پرانے لیڈر صدی کی دوسری دہائی میں بیک وقت دونوں تنظیموں میں، اہم عہدوں پر فائز رہے اور بغیر کسی قسم کی دشواری محسوس کیے ہوئے۔ یہ تو جب گاندھی جی نے کانگریس کے لیے ایک مستحکم نظریاتی اساس کی تشکیل شروع کی اس وقت سے ہندو اور مسلمان فرقہ پرست کانگریس سے دور ہونا شروع ہوئے۔ یہ صورتِ حال خود گاندھی جی اور ان کے ساتھ ان کے نئے دست و بازو جواہر لال نہرو، سبھاش بوس، مولانا آزاد اور اچاریہ کرپلانی جن کی گاندھی جی تربیت کر رہے تھے، سب ہی کے لیے بڑی اطمینان بخش تھی۔ تیسری دہائی تک پہنچتے پہنچتے مسلم لیگ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر جاں بلب تھی۔ تین افراد جو اسے اب بھی بچا سکتے تھے، مر چکے تھے۔ تحریکِ خلافت کے پرجوش قائد مولانا محمد علی ۴ جنوری ۱۹۳۱ کو لندن میں ذیابیطس کے مرض میں انتقال کر گئے۔ ان کی تدفین یروشلم میں ہوئی۔ اسی سال ۳۱ مئی کو راجہ صاحب محمود آباد پر دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ بھی اس دنیا سے سدھار گئے۔ ان دونوں کے بعد ۶ جنوری ۱۹۳۲ء کو پنجاب کے لیڈر سر محمد شفیع بھی رحلت کر گئے۔ بددل اور مایوس جناح صاحب نے سیاست سے کنارہ کشی کا فیصلہ کیا اور ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے بعد لندن ہی میں رک گئے کہ وہاں اپنی وکالت کی پریکٹس کی تجدید کریں۔

آزادی سے قبل مسلم لیگ کے ایک اہم لیڈر چودھری خلیق الزماں اپنی کتاب (پاتھ وے ٹو پاکستان۔ لانگ مینس ۱۹۶۱) میں اپنی پارٹی کا ذکر یوں کرتے ہیں "مسلم لیگ پر ...... خطاب یافتہ شرفاء، نوابوں، زمینداروں اور جی حضوریوں کا تسلط تھا .... ۱۹۰۶ء میں اس کے قیام کے بعد ہی سے مسلم لیگ کی سرگرمیاں تقریباً ہمیشہ ہی اندرونِ خانہ سرگرمیوں تک محدود رہیں۔ اس کے سالانہ اجلاس بھی سجے سجائے پنڈالوں میں یا کبھی بڑے ہال میں ہوا کرتے تھے جن میں خصوصی اجازت ناموں کے ذریعے معدودے چند عزت مآب حضرات کو شرکت کا موقع ملتا تھا۔ بڑے بڑے عوامی جلسوں سے مسلم لیگ واقف ہی نہیں تھی۔ ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں اس کے قیام کے بعد سے ۱۹۱۰ تک اس تنظیم کا مرکزی دفتر علی گڑھ میں رہا۔ رکنیت کی فیس اور سالانہ چندوں سے آنے والی رقم عوام میں کام کے لیے تو کم تھی ہی، وہ سلیقے کا ایک دفتر چلانے کے لیے بھی کافی نہیں تھی۔ راجہ صاحب محمود آباد کی تین ہزار روپے سالانہ کی امداد پر اس نے اپنی زندگی گزارنا شروع کی یہی رقم اس کی اصل مقررہ آمدنی تھی۔

مسلم لیگ کو بچانے کے لیے ۱۹۳۳ میں بہرحال جناح صاحب کو واپس آنے پر مجبور کر لیا گیا۔ اسی سال فروری کے مہینے میں اسلیم پور کے راجہ نے دہلی کے سیسل ہوٹل میں جناح صاحب کے اعزاز میں ڈنر کا اہتمام کیا اور اس میں انھیں ملک کے مسلم قائدین سے از سر نو متعارف کرایا گیا۔

۲ جولائی ۱۹۳۵ کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو شاہی رضامندی حاصل ہوگئی۔ اور ۱۹۳۷ کے انتخابات کے لیے راہ ہموار ہوگئی۔ ان ہی انتخابات کے ذریعے ہندوستانی ریاستوں میں پہلی بار حکومت، ہندوستانی پارٹیوں کو سونپی جانے والی تھی۔ یہی موقع تھا کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے لیے، یہ ثابت کرنے کا کہ انھیں ان عوام کی کتنی حمایت حاصل ہے جن کی نمایندگی کا وہ دعوی کرتی ہیں۔ جناح صاحب نے پورا زور لگایا، گھر گھر جاکر مسلم لیگ کا ساتھ دینے کی بات کرنے والے ملاؤں کی پشت پناہی کی مدد سے "ہندو جبر و استبداد" کو اپنی مہم کا محور بنایا۔ انھوں نے کہا کہ ۲۳ کروڑ ہندو، ۷ کروڑ مسلمانوں کو ختم کر دیں گے اور ان ہندوؤں کو مسلمانوں کی اس بربادی کے لیے کانگریس کی شکل میں ایک موثر ہتھیار مل گیا ہے۔ ۱۹۳۷ میں مسلم لیگ کے اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ "ایسی قوتیں ہیں جو تم کو چھیڑیں گی، تم کو ڈرائیں اور دھمکائیں گی" اپنے ۱۹۳۸ کے خطبے میں انھوں نے کہا کانگریس مسلمانوں سے غیر مشروط طور پر ہندو راج کی ماتحتی قبول کرانا چاہتی ہے۔۔۔۔۔ کانگریس ہائی کمانڈ عزم کر چکی ہے، مصمم عزم، تمام دوسری کمیونٹیز اور دوسری ثقافتوں کو نیست و نابود کرنے کا۔ اور ہندو راج کے قیام کا۔۔۔۔۔ (گاندھی) کا مطمح نظر ہے ہندو مذہب کا احیا اور اس ملک میں ہندو راج کا قیام۔" ہندوستانی قوم پرستی کی تعریف مسلمانوں کی غلامی سے کی گئی اور اسی لیے سب سے بڑے دشمن مولانا آزاد اور رفیع احمد قدوائی جیسے وہ مسلمان قرار پائے جو بدستور کانگریس میں شامل رہے۔

مگر جناح صاحب اور مسلم لیگ دونوں کو یہ پتہ چل گیا کہ مسلم عوام اس نقطہ نظر سے بالکل اتفاق نہیں کرتے ہیں۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ فیصلہ کن حد تک مسترد ہوئی (یہ بہت دل چسپ بات ہے کہ مسلم لیگ نے صرف ایک ہی الیکشن جیتا جو ۱۹۴۶ میں تقسیم ہند سے ذرا پہلے ہوا تھا۔ مسلم لیگ خود اپنے تخلیق کردہ پاکستان میں کوئی الیکشن نہیں جیت سکی) چودھری خلیق الزماں جو مسلم لیگ کے گڑھ یوپی کی مسلم لیگ کے لیڈر تھے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی حمایت کے بغیر مسلمانوں کی ایک جماعت تھی۔ وہ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں "ہم نے دسمبر ۱۹۳۶ء میں انتخابی مہم کے لیے چندہ جمع کرنے کی خاطر بلائے گئے ایک جلسے کو خطاب کرنے کے لیے مسٹر جناح کو مدعو کیا۔ یہ جلسہ جو گنگا پرشاد میموریل ہال میں منعقد ہوا تھا، بہت برا رہا۔ یہ افسوس ناک صورت حال اس وقت مسلم لیگ سے

مسلمانوں کی دل چسپی کی آئینہ دار ہے۔ کیمونل اوارڈ آف ۱۹۳۲ کے تحت مسلمانوں کے صوبے میں ۴۸۵ نشستیں دی گئیں تھیں۔ وہ جماعت جسے مسلمانوں کا تحفظ کرنے کا دعویٰ تھا، ان میں سے صرف دس نشستیں ہی جیت سکی۔ اور یہی پارٹی تھی جسے انگریز "ہندوستانی مسلمانوں کی آواز" کہتے رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خود مذہبی لوگ بھی پورے طور پر لیگ کے ساتھ نہیں تھے۔ مثال کے طور پر ۱۹۳۸ء میں جمیعۃ العلمار ہند کے مولانا مدنی مسلمانوں کو بتا رہے تھے کہ "آج قوموں کا تعین ان کے وطن کے توسط سے ہوتا ہے، نسل یا مذہب سے قوم نہیں بنتی"۔ پچھلے سال مولانا آزاد، جمیعۃ العلما کو غیر مشروط طور پر مسلم لیگ کو چھوڑنے اور کانگریس میں شامل ہونے پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور ۷، امئی کو الہ آباد میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں جمیعۃ العلمار نے اس سلسلے میں ایک تجویز بھی منظور کی تھی (بنیاد پرست مذہبی گروہ نے علیحدگی اختیار کی اور جماعت اسلامی کے نام سے ایک الگ تنظیم اگست ۱۹۴۱ء میں لاہور میں بنا لی)

۱۹۳۷ میں جناح صاحب کے پیش کیے ہوئے اس فرقہ پرستانہ نقطۂ نظر کی حمایت سے اکثر اہم مسلمان لیڈروں نے انکار کر دیا۔ ان میں یہ خیال پرورش پانے لگا تھا کہ اب جب کہ مسلمانوں کو وہ "ضمانتیں" مل گئی ہیں، مسلم لیگ کا جواز ہی ختم ہو جاتا ہے۔ انھوں نے ۱۹۳۷ کے انتخابات مذہبی کی بجائے سیاسی منشوروں پر بڑی کامیابی کے ساتھ لڑے۔ پنجاب میں سکندر حیات خاں اور سر فضل حسین جیسے لیڈروں نے کسان لیڈر سر چھوٹو رام کے ساتھ مل کر یونینسٹ پارٹی بنائی اور انتخابات میں زبردست کامیابیاں حاصل کیں۔ انتہائی کوششوں کے باوجود مسلم لیگ پنجاب کی ۸۶ مسلم نشستوں میں سے صرف دو نشستیں جیت سکی (ان دو نشستوں میں بھی ایک پر راجہ غضنفر علی خاں کامیاب ہوئے تھے جو انتخابات کے بعد یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے تھے) بنگال میں فضل حق کی کرشک پرجا سمیتی جو غریب کسانوں کے حقوق اور زرعی اصلاحات کے لیے لڑ رہی تھی فاتح ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ فضل حق نے مسلم لیگ کے لیڈر خواجہ ناظم الدین کو خود ان کے حلقۂ انتخاب میں شکست دے کر یہ دکھا دیا کہ در حقیقت مسلم ووٹ کس طرف ہیں۔ سندھ میں کل ۶۰ نشستیں تھیں ان میں سے ۳۵ مسلم سیٹیں تھیں۔ ان میں سے مسلم لیگ کو ایک بھی سیٹ نہیں ملی۔ سندھ یونائیٹڈ پارٹی نے ۱۸ نشستیں حاصل کی، مسلم پارٹی نے تین، سندھ مسلم آزاد پارٹی نے دو، اور آزاد امیدواروں نے بارہ نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ سر ہدایت اللہ نے ایوان میں سب ہی کے تعاون سے حکومت بنائی۔ شمالی مغربی سرحدی صوبے میں مسلم لیگ کے لیے انتخاب کے نتائج اتنے ہی شرمناک تھے۔ غرض مسلم لیگ کے لیے ان علاقوں میں جو بعد کو پاکستان بننے والے تھے، مسلم عوام کی حمایت کا یہ حال تھا۔

بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی ضرور لگے گی مگر حقیقت یہی ہے کہ مسلم لیگ مسلم اکثریت والے علاقوں میں بھی، جہاں اس کا خیال تھا کہ وہ بادشاہ ہوگی بہت حمایت کبھی بھی حاصل نہ کر سکی کشمیر میں اسکے شاہی ریاست ہونے کی وجہ سے انتخاب نہیں ہوئے تھے مگر وہاں بھی مسلم عوام نے مسٹر جناح کی ان تھک کوششوں کے باوجود، مسلم لیگ کے مقابلے میں شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کو ترجیح دی۔ خود صوبہ متحدہ (یو۔پی) میں بھی، جہاں کٹر مسلم لیگیوں کا اچھا خاصا اجتماع تھا، مسلم لیگ ۶۶ مسلم نشستوں میں سے صرف ۲۹ نشستیں جیت پائی۔ اس صورت حال کے باوجود، یہ افسانہ حقیقت کے روپ میں مشہور ہو گیا کہ مسلم عوام پاکستان چاہتے تھے۔ ۱۹۴۶ میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کی حمایت یقیناً حاصل کی مگر یہ صرف اس وقت ممکن ہوا جب ملک ایک عظیم طوفان کے پیدا کیے ہوئے بھنور میں پھنس کر ناچ رہا تھا۔ انسانی معاملات میں ایسے طوفان شاذ و نادر ہی آتے ہیں مگر اس کی قوت ہر ایک کو اندھا ضرور کر سکتی ہے۔

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ۱۹۳۷ کے انتخابات عوامی رجحان کے سچے مظہر نہیں تھے۔ ووٹ کے اختیار کو جو ۱۹۳۲ کے انتخابات میں بہت محدود اور چنیدہ تھا، وسعت دے دی گئی تھی۔ اور کسانوں کو پہلی دفعہ ووٹ دینے کا موقع ملا تھا۔ اسی الیکشن میں کانگریس نے اپنے قومی پلیٹ فارم سے انتخابات میں اتحاد، جمہوریت، سیکولرزم اور نہرو کی صدارت کے زمانے میں سوشلزم کے نعروں کے ساتھ شرکت کی اور یہ دکھا دیا کہ اس کی حمایت کی بنیادیں کتنی گہری ہیں۔ کانگریس کی جیت اچھی جیت تھی۔ مسلم نشستوں کے حلقے میں بھی کانگریس نے مسلم لیگ کے مقابلے میں بہتر کارکردگی دکھائی تھی اور ان ۵۸ سیٹوں میں جس پر اس نے اپنے امیدوار کھڑے کیے تھے ۲۶ سیٹوں پر کامیابی حاصل کی (ہندو فرقہ پرست پارٹی ہندو مہاسبھا نے بھی جو مسلم لیگ کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی تھی، اتفاق سے ان انتخابات میں بری شکست کا منہ دیکھا) ۱۹۳۷ کے انتخابات اس لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل تھے کہ اس میں ملک کے سارے مسلمانوں کی نمائندگی کے مسلم لیگ کے وعدے کو کسوٹی پر پرکھنے کا پہلا موقع سامنے آیا تھا۔ اور اس کے نتائج کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ گاندھی یا جناح، کس کی فلاسفی نے عوامی ذہن کو متاثر کیا تھا؟ گاندھی نے ایک سیدھا سادا نعرہ دیا تھا اور اسے انھوں نے اپنی انوکھی خوب صورت انگریزی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا دلی ملاپ کہا تھا۔ اور اس کے اظہار کے لیے "ہندو مسلمان کی جے" کا نعرہ تجویز کیا تھا۔ عدم تشدد، اس نظریے کا بنیادی عنصر تھا۔ ۱۹۲۰ کے کلکتہ سیشن کے بعد جب سے گاندھی جی نے کانگریس کا چارج لیا تھا، ان عوام کو ان کا یہی پیغام تھا جن سے خود ان کو محبت تھی اور وہ خود انھیں چاہتے تھے۔ گاندھی جی نے کانگریس کو کسانوں کے مسائل سے وابستہ کرایا اور ان کے مفادات کے حصول اور تحفظ کے لیے جد و جہد کی، بہار کی نیل تحریک یا گجرات میں باردولی کی جد و جہد۔

گاندھی جی کو اعلیٰ طبقے کے ہندو اور مسلمان، حکومت کے روایتی ٹھیکہ داروں سے نفرت تھی۔ ان کا تعلق تو چند افراد سے نہیں لاکھوں لوگوں سے تھا۔ (اور لاکھوں یقیناً اسمبلی کے رکن یا سیاست داں نہیں بننا چاہتے) ہاں میں اس بات کی جرأت و ہمت تھی کہ وہ کانگریس کو ان لوگوں سے دور رکھیں جو اسے مسلم لیگ جیسی یا ہندو جماعت میں تبدیل کر دینا چاہتے تھے"۔ ڈاکٹر مونجے اور سری ساورکر جیسے ہندو جو تلوار کی طاقت کے نظریے پر ایمان رکھتے ہیں وہ مسلمانوں کو ہندو اقتدار و تسلط کے ماتحت رکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ میں اس طبقے کی نمائندگی نہیں کرتا، میں کانگریس کی نمائندگی کرتا ہوں۔" انھوں نے ۱۹۴۲ء کے کانگریس سشن کی اپنی تقریر میں وضاحت کی۔" اور بالکل اسی طرح جس طرح وہ کانگریس کو ایک ہندو پارٹی بنانے کی اجازت نہیں دیں گے ویسے ہی مسلم لیگ کے اس حق کو بھی وہ نہیں مانتے ہیں کہ وہ سارے مسلمانوں کو لیگ کی جائداد سمجھے" یہی وہ چیز تھی جو جناح صاحب چاہتے تھے کہ کانگریس مان لے۔ اور یہی وہ بات تھی جسے کانگریس بھی اپنے نظریات کو قربان کیے بغیر نہیں کر سکتی تھی۔ یہی کشمکش اور تنازعہ تھا جو ۱۹۳۷ء میں ایک اور مسئلے کی جڑ بنا اور جسے پاکستان کے قیام کا ایک فیصلہ کن عنصر کہا جا سکتا ہے۔ یہ عنصر تھا ۱۹۳۷ کے انتخابات کے بعد صوبہ متحدہ میں کانگریس اور لیگ کا متحدہ محاذ بنانے کی ناکام کوشش کا عنصر۔

انتخابات کی شکست نے مسلم لیگ کی حکومت کی خواہش کو مدھم نہیں کیا۔ اس خیال کو زندہ رکھنا تھا کہ یہ صرف لیگ ہی ہے جو مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کر سکتی ہے۔ اگر کانگریس کے مسلمان وزرا اپنی وزارت کے زمانے میں یہ دکھا سکتے کہ وہ کانگریسی حکومت کا ایک حصہ ہونے کے باوجود اپنی کمیونٹی کے لیے مفید ہو سکتے ہیں تو بہت ممکن تھا مسلم لیگ بھی ختم ہو جاتی۔ جناح صاحب صوبہ متحدہ (یو۔پی) جیسی اہم ریاست میں حکومت میں شامل ہونے کے لیے بے چین تھے۔ اور اسی لیے انھوں نے اس حقیقت کے باوجود کہ صوبے میں کانگریس اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے، کانگریس سے مسلم لیگ کے ساتھ مل کر ایک متحدہ محاذ تشکیل دینے کے لیے کہا۔ توقع کے مطابق جناح صاحب نے صرف یہ مطالبہ کیا کہ کانگریس کو اپنی طرف سے کسی مسلمان وزیر کا تقرر نہیں کرنا چاہیے۔ اور اسے اپنا رویہ ایک ہندو پارٹی کی طرح رکھنا چاہیے۔ مسلم لیگ نے ۲۲۸ اراکین کے ایوان میں ۲۹ نشستیں جیتی تھیں مگر اس نے کابینہ میں دو وزیروں کی شمولیت پر اصرار کیا۔ چودھری خلیق الزماں جو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر بنائے گئے اور نواب اسمٰعیل خاں۔

لیگ نے یہ تجویز رکھی کہ اگر اس کے مطالبات مان لیے گئے تو یہ بات ہندو مسلم تنازعہ کو ختم کرنے کی اور انگریزوں کے خلاف ایک مشترکہ محاذ بنانے کی بنیاد بن سکتی ہے۔ مگر یہ بات کہ کانگریس مسلم لیگ کی شرائط کو منظور کرے گی، ناممکن

سی نظر آتی تھی۔ کیوں کہ ایسا کر کے کانگریس نوآبادیاتی حکومت کے چنگل سے نکلنے کی جدوجہد میں، بلا امتیاز نسل و مذہب ہر ہندوستانی کی نمایندگی کرنے کے اپنے دعوے کے جواز اور اس کی صداقت کو یکسر ختم کر دیتی۔ کانگریس حقیقت میں ایک ہندو پارٹی نہیں ہو سکتی تھی۔ مجوزہ اتحاد کے خلاف لڑائی میں سب سے زیادہ جوش و خروش اور سرگرمی کے ساتھ کانگریس سوشلسٹ اور مسلمان کانگریسی شریک ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ ان تمام مقاصد اور اصولوں سے غداری کے مترادف ہوگا جن کے لیے وہ اب تک جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ خلیق الزماں نے لکھا ہے کہ وہ ۱۲ مئی ۱۹۳۷ کو مجوزہ اتحاد کے سلسلے میں نہرو سے تبادلہ خیال کرنے گئے۔ اس دن نہرو آنند بھون الہ آباد میں صاحب فراش تھے۔ "میرے نظریات کے بالکل برعکس نہرو کا خیال تھا کہ ہندو مسلمان کا سوال 'ہندو مسلم دانشوروں' زمینداروں اور سرمایہ داروں تک محدود ہے جو اسے ایک مسئلہ بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ اور جو حقیقت تو یہ ہے کہ عوام کے ذہنوں میں ہے ہی نہیں۔ اسمبلی کی چہار دیواری میں مسلمانوں کی ایک الگ تنظیم کے خیال کا ہی انھوں نے مذاق اڑایا۔

مسلم لیگ سے گفت و شنید کرنے کے ذمہ دار مولانا آزاد تھے۔ اور اس کام میں انھیں مدد دینے کے لیے تھے رفیع احمد قدوائی اور گوبند ولبھ پنت۔ مولانا نے کابینہ میں نواب اسماعیل خاں کی شمولیت پر اعتراض کیا کیوں کہ نواب ان جاگیردارانہ مفاد کی نمائندگی کرتے تھے جو کانگریس کی اقتصادی فلاسفی کے برعکس تھے۔ مگر مسلم لیگ کا اصرار ختم نہیں ہوا۔ ۱۵ جولائی کو مولانا نے کانگریس کی کم سے کم شرائط کی پیش کش کی۔ انھوں نے خلیق الزماں کو ٹائپ کیے ہوئے دو صفحات دیئے۔ اتحاد کے لیے خلیق الزماں کو دستخط کر کے ان کاغذوں کو واپس کرنا تھا۔ مذکورہ تحریر میں لکھا تھا۔ "مسلم لیگ کا گروپ صوبہ متحدہ میں الگ حیثیت سے کام کرنے کو ترک کر دے گا، صوبہ متحدہ کی اسمبلی میں مسلم لیگ کے موجودہ اراکین کانگریس کا حصہ بن جائیں گے۔ اور کانگریس پارٹی کے دوسرے ممبروں کی طرح تمام مراعات اور ہر ذمہ داری میں ان کا حصہ ہوگا۔" لیگ نے احتجاج کیا اور کہا کہ یہ بڑی کڑی شرطیں ہیں۔ مولانا نے معاہدے میں ترمیم کی۔ مگر مسلم لیگ بہر حال مسلمانوں سے متعلق مسائل پر ووٹ دینے کے وقت کانگریس سے الگ اپنے ووٹ دینے کے حق کو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ حقیقتاً کانگریس کو اسی بات کا ڈر تھا۔ بہر حال اس نے بھی مسلم لیگ کی اس ضد کو نہیں مانا۔

۲۰ جولائی ۱۹۳۷ کو جب اسمبلی کا سیشن شروع ہوا تو مسلم لیگ کے اراکین اسمبلی میں حزب مخالف کی بنچوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ تو نہیں مگر ان کے پاس ہی نواب زادہ لیاقت علی خاں بیٹھے ہوئے تھے جنھیں بعد کو پاکستان میں جناح کا جانشین بننا تھا۔ لیاقت علی خاں نے ۱۹۳۷ کے اواخر تک مسلم لیگ میں شرکت نہیں کی تھی۔ یہاں تک کہ سلیم پور کے راجا نے بھی مسلم لیگ چھوڑ دی تھی۔ وہ بھی ایوان میں ایک آزاد ممبر کی حیثیت سے بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا

راجہ صاحب ان لوگوں میں تھے جو جناح صاحب کو لندن سے واپس لائے تھے۔

کون صحیح تھا؟ کیا نہرو کا یہ کہنا صحیح تھا کہ مسلم لیگ محض طبقۂ اشراف کی تخلیق اور عوام کی ضرورتوں سے یکسر بے تعلق جماعت ہے؟ ثبوت صرف عمل میں اور تخلیق شدہ پاکستان کی اساسی نوعیت میں ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ یہ بات اب بالکل صاف طور پر سامنے آ چکی تھی کہ مذہبی حلقے اور زمینداروں کے اتحاد نے کس طرح پاکستان کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ ایک طرف اگر زمینداروں اور سرمایہ داروں نے مذہبی حلقے کو اس کی اجازت دی کہ وہ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بنائیں تو دوسری طرف مذہبی حلقے نے زمینداروں کو یقینی حقوق ملکیت اور سرمایہ داروں کو اقتصادیات پر بے روک ٹوک قابو کی ضمانت دی۔ حکومت الٰہیہ اور زمینداری اور سرمایہ داری، پاکستان اور بنگلہ دیش کے دو اہم ستون ہیں۔ سر پر حکومت پر کوئی بھی آئے، حاکم وردی میں ہو یا شہری کا لباس میں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مذکورہ دونوں باتوں میں کوئی دخل اندازی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان دونوں حقوق کے بارے میں کسی نے معمولی سوال بھی کرنے کی کوشش کی تو اقتدار سے ہٹا دیا جائے گا۔ جناح صاحب کا یہ خیال کہ پاکستان انھوں نے تخلیق کیا ایک خوش خیالی تھی، جس کی ہر شخص نے ہم نوائی اور ہمت افزائی کی۔ وجہ یہ تھی کہ جناح صاحب جیسے غیر معمولی عزم، صلاحیت اور سلیقہ رکھنے والے ایک لیڈر کی ان کو ضرورت تھی۔ اور یہ صحیح بھی ہے ان خوبیوں کے بغیر جو جناح صاحب میں تھیں، پاکستان وجود میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔

ایک آزاد اور متحدہ ہندوستان کے گاندھی کے خواب کو جس شخص نے بالآخر چکنا چور کر دیا وہ بھی ایک گجراتی ہی تھا، جس کے والدین کا گاؤں گاندھی جی کے آبائی گھر سے تقریباً بیس میل دور جنوب میں تھا۔ محمد علی جناح ۱۸۷۶ء میں کرسمس کے دن پیدا ہوئے اور اپنا بچپن انھوں نے کراچی میں گذارا جہاں ان کے والد نے اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔

سولہ[۶] برس کی عمر میں جناح صاحب کو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان بھیج دیا گیا تاکہ وہ اپنے باپ کی فرم کی وراثت کو حاصل کرنے کے لیے زیادہ لائق ہو جائیں۔ اس سلسلے میں ایک شرط ان کی ماں نے ضرور رکھی تھی اور وہ یہ تھی کہ باہر جانے سے پہلے ان کی شادی ہو جائے گی۔ ان کی ماں یہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا کسی انگریز مِس کے جال میں پھنس جائے۔ فرماں بردار بیٹے نے چودہ برس کی ایک لڑکی سے شادی کر لی جسے اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ لندن میں کاروبار سے متعلق تعلیم نے انھیں بور کر دیا۔ ایک موقع پر تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی تھیٹر میں شامل ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ایک تھیٹر گروپ کے ساتھ تین مہینے کا ایک معاہدہ کیا بھی۔ لیکن پھر طے یہ کیا کہ انھیں قانون کی ڈگری لینے پر توجہ مرکوز کرنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے "لنکنس اِن" میں داخلہ لے لیا۔ یہ فیصلہ ایک بڑی سمجھداری کا فیصلہ تھا۔ کیونکہ اپنی نسل کے بہترین وکیلوں میں ایک وکیل ہونا جناح صاحب کا مقدر تھا۔ جناح صاحب ابھی باہر ہی تھے کہ ان کے والد کی صحت خراب ہونا شروع

ہوئی۔ انھوں نے چاہا کہ ان کا لڑکا اب واپس آکر کاروبار کو اپنے ہاتھ میں لے۔ جناح صاحب بہرحال لندن میں اس وقت تک ٹھہرے رہے جب تک کہ انھوں نے اپنی وکالت کی تعلیم مکمل نہیں کرلی۔ جب تک وہ واپس آئے اس وقت تک ان کی والدہ اور ان کی بیوی کا انتقال ہوچکا تھا۔ جناح نے اپنے بیمار باپ کے ساتھ رہنے کی بجائے بمبئی آنے اور یہاں اپنی وکالت شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے ساتھ ان کی بہن فاطمہ بھی آئیں جن کو اپنے بھائی سے بے پناہ محبت تھی (جناح صاحب نے اپنی وصیت میں اپنی ساری دولت ان کے نام لکھی، محض برائے نام حصہ دوسرے عزیزوں کا بھی تھا)

جناح صاحب بنیادی طور پر پکے بیچلر تھے۔ ان میں وہ تمام عادتیں تھیں جو انگلستان سے آئے ہوئے ہندوستانی طبقہ اشراف کے ایک فرد کی خصوصیات ہوسکتی ہیں۔ اسلامی حکومت پاکستان کے تمام دفاتر میں ان کی تصویریں بڑے نمایاں طور پر لگی ہوئی ہیں۔ مگر جنرل محمد ضیاء الحق کو اس بات پر بڑا اطمینان ہوگا کہ پاکستان کے "باپ" جناح صاحب آج بقیدِ حیات نہیں ہیں، نہیں تو انھیں بھی ان کی شخصی عادتوں کی وجہ سے سرعام کوڑے لگائے گئے ہوتے۔ مسٹر جناح صرف یہی نہیں کہ Carvan A کی سگریٹیں لگاتار پیتے تھے بلکہ انھیں وِسکی بھی اچھی لگتی تھی اور ....
.... ان کی زندگی اعلیٰ طبقے کے ایک آزاد خیال فرد کی زندگی تھی۔ اپنی نجی اور پبلک زندگیوں کے بیشتر حصے میں وہ یقیناً آزاد خیال تھے۔

۱۹۱۶ میں مسٹر جناح اپنے ایک پارسی دوست مسٹر دنشا مانک جی پیتیت کے ساتھ، چھٹیاں منانے کے لیے دارجلنگ چلے گئے۔ پینتیس سال کا یہ کنوارا اپنے دوست کی نڈر اور چنچل سولہ سالہ لڑکی رتّی کے بے پناہ عشق میں مبتلا ہوگیا۔ رتی کے باپ نے اس شادی کو روکنے کی بس بھر کوشش کی۔ یہاں تک کہ وہ کورٹ بھی گئے، مگر رتّی اپنی اٹھارویں سال گرہ کے موقع پر، اپنے پالتو کتوں کے علاوہ ہر چیز کو چھوڑ کر اس شخص سے شادی کرنے کے لیے گھر سے نکل گئی جس سے اس نے محبت کی تھی۔ رتّی کا تعلق بمبئی کے تجارتی اور پیشہ ورانہ طبقۂ امرائے سے تھا۔ کچھ دنوں تک بمبئی میں اس جوڑے کا بڑا چرچا رہا۔ رتی کو محفل پسند تھی اور وہ پرلطف گفتگو کی عاشق تھی۔ مگر یہ شادی کچھ بہت زیادہ دن چل نہ سکی۔ سات سال بعد جناح کی عمر اڑتالیس سال کی تھی اور رتی کی پچیس سال، وہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ رتی اور جناح صاحب کی شادی کے بعد، رتی کے باپ نے پہلی بار جناح صاحب سے اس وقت بات کی جب انھوں نے جناح صاحب کو یہ خبر دینے کے لیے فون کیا کہ ان کی بیوی مر رہی ہے۔ رتی کا انتقال ۱۹۲۹ میں ہوا۔ انتقال کی وجہ تھی کولائٹس کے پرانے مرض کی تکلیف کو کم کرنے کے لیے بڑی مقدار میں مارفین کھالینا۔ اس کو دفن

کرتے وقت جناح صاحب بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے ۱۹۴۷ء میں ایک نئے ملک کی طرف جانے کے لیے بمبئی چھوڑتے وقت جناح صاحب نے آخری کام یہ کیا کہ وہ رتی کی قبر پر گئے۔ تند و خشک مزاج جناح صاحب جس نے سب کے سامنے شاید ہی کبھی جذبات کا اظہار کیا ہو، ایک بار پھر زار و قطار رو دیا۔

پاکستان جانے والوں میں ان کے ساتھ تنہا ان کی بہن فاطمہ تھیں (کئی برس بعد، ایوب خاں کے کرائے ہوئے انتخابات میں وہ متحدہ حزب اختلاف کی طرف سے امیدوار کی حیثیت سے الیکشن میں کھڑی ہوئی تھیں) جناح صاحب کی اکلوتی بیٹی دینا نے پاکستان جانے سے انکار کر دیا تھا۔ جناح صاحب جنھوں نے رتی سے شادی کی، اب بالکل بدل چکے تھے اور اسلامی فوجوں کے کمانڈر ہو گئے تھے۔ دینا ایک پارسی سے شادی کرنا چاہتی تھی، یہ خبر جب جناح صاحب کو ملی تو وہ بہت خفا ہوئے۔ انھوں نے اپنی بیٹی سے کہا کہ لاکھوں مسلمان لڑکے ہیں وہ ان میں سے کسی کا بھی انتخاب کر سکتی ہے اس پر دینا نے جواب دیا تھا کہ پہلے بھی لاکھوں مسلمان لڑکیاں موجود تھیں اس کے باوجود جناح صاحب نے ایک پارسی لڑکی سے شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ جناح صاحب کے پاس اس بات کا صرف ایک جواب تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو عاق کر دیں۔ انھوں نے اس کے بعد پھر کبھی دینا کو دینا کہہ کر نہیں پکارا۔ اگر کبھی نام لینے کی ضرورت پیش آئی تو مسز واڈیا کہا۔ وہ بہرحال اپنے باپ کی خاصی وفادار تھی۔ ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو اس نے اپنی بالکونی پر پاکستان اور ہندستان دونوں کے جھنڈے لگائے تھے۔

لیکن یہ روشن اور آزاد خیال جناح ہی تھے جن کی طرف اول اول سائے ملک کا نگاہیں اٹھیں۔ وی پی مینن نے اپنی کتاب ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا (اورینٹ لانگ مینس ۱۹۵۷ء) میں انھیں "اپنی نسل کا حقیقی ہیرو" کہا ہے جناح صاحب سیاست کے میدان میں بہت پہلے ہی آ گئے تھے۔ امپریل لیجس لیٹو کاؤنسل میں وہ بمبئی کے نمائندے کی حیثیت سے ۱۹۰۹ء میں داخل ہوئے۔ مارچ ۱۹۱۹ میں اس وقت تک اسمبلی کے رکن رہے جب تک کہ انھوں نے رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے استعفیٰ نہیں دے دیا۔ ۱۹۲۰ء میں وہ مسلم لیگ کے صدر بھی تھے اور کانگریس کے اہم لیڈر بھی۔ وہ گاندھی جی سے اوّلاً دور اس وقت سے ہونے لگے جب انھیں حقیقتاً یہ محسوس ہوا کہ گاندھی جی سیاست میں مذہبیت کو متعارف کرا رہے ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے مسلم لیگ کے سیشن کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ "مسلمانوں کو منظم کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوؤں سے لڑنے کے خیال سے نہیں، بلکہ اپنے مادر وطن کے لیے انھیں متحد کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے خیال سے۔"

مدھو لیمائے نے اپنے ایک اچھے مضمون "جناح دی لبرل" (سنڈے اکتوبر ۱۹۸۳ء) میں لکھا تھا۔ "اگر قوم پرستی

سے فرقہ پرستی مراد نہ ہو تو جناح ایک کٹر قوم پرست تھے۔ ۱۹۱۹ء میں پارلیمانی سیلیکٹ کمیٹی کے سامنے شہادت کے موقع پر ان سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ کیا وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان سیاسی امتیازات کا یکسر خاتمہ چاہتے ہیں۔ تو ان کا جواب تھا "جی ہاں۔ ایسی ساعت آنے سے زیادہ خوش کن بات میرے لیے اور نہیں ہو سکتی" تیسری دہائی کے وسط تک وہ انتہائی فخر کے ساتھ یہ اعلان کرتے رہے کہ وہ "ایک ہندوستانی پہلے ہیں اور ایک مسلمان بعد میں۔" جناح صاحب کو ان مولویوں اور ملاؤں سے کوئی محبت نہیں تھی جو سیاست میں دخل اندازی کرتے تھے۔

یہی جناح صاحب تھے جنھیں پاکستان کے خیال کا اصل معمار بنا دیا گیا۔ اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا خیال اس وقت تشکیل ہوا تھا جب جناح صاحب خود ترکِ وطن کیے ہوئے لندن میں تھے۔ ۱۹۳۳ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے ایک طالب علم رحمت علی نے لندن کے والڈورف ہوٹل میں ایک عشائیے کا اہتمام کیا۔ کھانوں کی فہرست انتہائی غیر اسلامی تھی۔ فہرست میں گھونگھے بھی تھے اور اچھے قسم کی وائن بھی۔ مگر کھانے کے موقع پر جو خیال پیش کیا گیا وہ تھا مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک کے قیام کا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں پاکستان کو "طالب علم کی تجویز" کہہ کر رد کر دیا جاتا تھا۔ ۱۹۴۰ء تک جناح صاحب بالکل تیار ہو چکے تھے۔ انھوں نے ایک اخباری نمائندے کو بتایا بھی تھا کہ لیگ کا لاہور سیشن ایک تاریخی سیشن ہوگا۔ پاکستان کا نام نہیں لیا گیا تھا مگر یہ بات طے ہو گئی تھی کہ "وہ علاقے، جہاں مسلمان تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں ہیں، جیسے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں، ایک ساتھ سمجھے جانے چاہئیں اور ان علاقوں پر مشتمل ایک "آزاد ریاست" بنائی جانی چاہیے، جس میں شامل اکائیاں خود مختار اور آزاد ہوں گی۔" ۱۹۴۷ء آتے آتے جناح صاحب کا فیصلہ کامیاب ہوا۔ ایک طرف گاندھی جی نے ہندوستان کو یوم آزادی کی خوشی منانے سے انکار کیا کہ یہ وہ ہندوستان نہیں جو وہ چاہتے تھے دوسری طرف جناح صاحب نے تالیوں کی گونج میں ایک نئے ملک کی پیدائش کا اعلان کیا۔

یہ تو پاکستان کے حصول کے بعد ہی جناح صاحب کو پتہ چلا کہ انھیں یہ نہیں معلوم کہ وہ اس ملک کا کیا کریں۔ دفعتاً وہ ایک بار پھر آزاد اور روشن خیال ہو گئے۔ ۱۴ جولائی ۱۹۴۷ کی ایک پریس کانفرنس میں، ایک صحافی نے جب ان سے پوچھا کہ کیا پاکستان ایک مذہبی ریاست ہوگا؟ جناح صاحب نے جواب دیا۔ "تم ایک ایسا سوال پوچھ رہے ہو جو فضول اور حماقت آمیز ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ایک مذہبی ریاست کا مطلب کیا ہوتا ہے۔" ۱۱ اگست کو جس دن انھیں پاکستان آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا اور نئے ملک کا پرچم اپنایا گیا تھا انھوں نے ایوان سے کہا تھا۔ "ہم اس ریاست کا آغاز، بغیر کسی امتیاز و تفریق کے کر رہے ہیں۔ یہ بات ہمیں اپنے سامنے اپنے مقصد کی طرح رکھنا چاہیے۔ اور آپ کچھ دنوں بعد دیکھیں گے کہ ہندو، ہندو نہیں رہ جائیں گے اور مسلمان، مسلمان نہیں رہیں گے۔ مذہبی لحاظ سے نہیں کیونکہ یہ تو ہر فرد کی

ذاتی اور نجی عقیدے کی بات ہے بلکہ سیاسی لحاظ سے، ایک ملک کے شہری ہونے کے لحاظ سے!"

جناح صاحب کے دست راست اور جانشین لیاقت علی خاں کے یہاں بھی قائدِاعظم ہی کے جذبات کی بازگشت تھی۔ جب انھوں نے ۱۱۔ اگست کو کراچی میں آئین ساز اسمبلی کو خطاب کرتے ہوئے اس پرچم کی وضاحت کی تھی جسے وہ اس وقت لہرانے جارہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ "یہ پرچم، کسی ایک مخصوص جماعت یا فرقے کا پرچم نہیں ہے۔ یہ پرچم ان تمام لوگوں کے لیے ہے جو اس کے وفادار ہوں گے، آزادی، حریت اور مساوات کا پرچم ہوگا۔ پاکستان کی ریاست کا جو تصور میرے ذہن میں ہے اس میں کسی مخصوص فرقے یا فرد کے لیے خصوصی مراعات نہیں ہیں، خصوصی حقوق نہیں ہیں"۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر پاکستان کیوں ؟

پاکستان کی تخلیق کرنے والوں اور عوام میں جو تضادات تھے وہ خود جناح صاحب کی زندگی ہی میں نظر آنے لگے تھے۔ جناح صاحب خود اُردو نہیں جانتے تھے، گجراتی ان کی مادری زبان تھی اور انگریزی ان کی اظہار کا ذریعہ۔ سارے کا سارا بنگالی پاکستان اُردو نہیں جانتا تھا۔ مگر یونائیٹڈ پراونس لابی کے دباؤ کی وجہ سے اردو پاکستان کی قومی زبان قرار پائی۔ ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو جب ڈھاکہ یونیورسٹی کے طالب علموں کو جناح صاحب خطاب کرنے گئے تو انھوں نے ان کو آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا "اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے ملک کی صرف ایک ہی زبان ہو سکتی ہے..... اور وہ صرف اردو ہی ہو سکتی ہے۔ ہربرٹ فلڈمین (دی اِنڈ اینڈ دی بگننگ: پاکستان ۷۱-۱۹۶۹ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس) نے کچھ زیادہ صفائی سے یہ بات کہی ہے۔ "یہ بات مشکوک ہے کہ خود محمد علی جناح ان سیاسی الجھنوں سے واقف تھے جو اس پاکستان میں فطری طور پر مضمر تھیں جو بالآخر انھوں نے منظور کیا تھا۔"

پاکستان کا خیال تیسری دہائی میں پیدا ہوا، چوتھی دہائی میں جدوجہد شروع ہوئی، پانچویں دہائی میں اس کی شکل مسخ ہوئی، چھٹی دہائی میں اس کا گلا گھُٹا اور ساتویں دہائی میں وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

برصغیر کے حالات ایک بار پھر غیریقینی ہو رہے ہیں۔ اگر جناح صاحب صحیح تھے تو ۱۹۴۷ ایک کرم خوردہ (تقسیم کے بعد پاکستان کو بیان کرتے وقت جناح صاحب نے یہی الفاظ استعمال کیے تھے) برصغیر کی طرف بڑھنے کے عمل کا محض آغاز تھا۔ اپنی اپنی حکومت کے پینتیس سال بعد اب وقت آگیا ہے کہ حقائق کا جائزہ

لیا جائے اور یہ دریافت کرنے کی کوشش کی جائے کہ زبردست دشواریوں اور مسائل کے باوجود کون زیادہ کامیاب رہا۔ جمہوری وفاقی ریاست جسے مہاتما گاندھی چاہتے تھے یا وہ مذہبی ریاست جو جناح صاحب اپنے بعد چھوڑ گئے۔ یہ تقسیم ایک حقیقت تھی یا برصغیر کے ارتقا کے سفر میں ایک بے کیف وقفہ۔ آخری وائسرائے لارڈ لوئیس فرانسس البرٹ وکٹر نکولس ماؤنٹ بیٹن نے اس سوال کا جواب دیا تھا۔ انھوں نے ہندوستان کی تقسیم پر اتفاق رائے حاصل کرنے کے فوراً بعد نجی طور پر لکھا تھا "اس مجنونانہ فیصلے کی ذمہ داری، دنیا کی نگاہوں میں، پورے طور پر ہندوستانیوں پر ڈالی جانی چاہیے۔ ایک دن وہ اس فیصلے پر جو وہ عنقریب لینے والے ہیں خود کفِ افسوس ملیں گے۔"



(۲)

پاکستان میں بُنیاد پرستوں کی بالادستی

۲۰ فروری ۱۹۴۷ کو وزیراعظم کلیمنٹ اٹیلی نے بالآخر برطانیہ کے اقتدار کے خاتمے کا اعلان کیا۔ آخری سامراجی لارڈ ویول کو ہٹایا اور بتایا کہ جون ۱۹۴۸ تک لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس سلسلے کی انتظامی تقریبات کی سربراہی کریں گے۔ آخری تاریخ کے آنے میں ابھی ایک سال سے زائد کی مدت باقی تھی۔ حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر لارڈ ماؤنٹ بیٹن مدت میں مختصر سی مزید توسیع کے لیے نہایت آسانی سے درخواست کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے التوا یا تاخیر کی بجائے بے حد جلدی کی۔ ان کی اس جلد بازی کی کوئی منطقی وضاحت آج تک نہیں ہو پائی ہے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا عذر یہ رہا ہے کہ اگر انھوں نے انتقالِ حکومت میں ذرا بھی تاخیر کی ہوتی تو اس کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہوتی جو دینی پڑی۔ مگر یہ محض ایک مفروضہ ہے۔ بہرحال یہ سمجھ میں آنا مشکل ہی نظر آتا ہے کہ اس صورت میں اور ابتری ہی ہوتی۔ کیوں کہ نہ صرف ملک ہی تقسیم ہوا تھا بلکہ چند ہفتوں کے اندر ہزاروں انسانی جانیں اس تقسیم کی نذر ہو گئی تھیں۔ اور اسی کی وجہ سے جنگوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو ابھی بھی ختم نہیں ہو پایا ہے۔ یہ کہا جاتا رہا ہے کہ انگریزوں نے انتقالِ حکومت میں اتنی جلدی اس لیے دکھائی کہ وہ ایک ایسی بات جانتے تھے جو ان کے اور خود جناح صاحب کے علاوہ کوئی تیسرا نہیں جانتا تھا۔ اور یہ بات یا یہ راز تھا پاکستان کے خالق جناح صاحب کا دق کا مرض، اپنی آخری حدوں پر پہنچ چکا تھا۔ اور اگر وہ پاکستان کے قیام کے منصوبے کے اعلان سے پہلے مر جاتے تو شاید ایک الگ ملک کے مطالبے کی تحریک دم توڑ دیتی۔ اس اندازِ فکر کا جواز موجود تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مسلمان ووٹروں نے مسلم لیگ کی حمایت کبھی نہیں کی۔ اور پاکستان کی تحریک نے صرف چوتھی دہائی کے وسط میں اس وقت تقویت حاصل کی جب جناح صاحب خوف و ہراس کی فضا بنانے میں پورے طور پر کامیاب ہو گئے۔

پاکستان مسلم عوام نے نہیں بنایا۔ اس کا جنم تو مرہونِ منت ہے ان مٹھی بھر لیڈروں کا جن کے لیے محض عقائد

یں علیحدگی باعث تسکین نہیں تھی۔ وہ تو الگ الگ حلقہ انتخاب، الگ الگ زبانیں، الگ الگ لباس، الگ الگ شناختیں حتیٰ کہ الگ الگ گھر چاہتے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں اپنے قیام کے بعد صرف ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو کچھ ووٹ ضرور ملے تھے۔ مگر لیگ، خود اپنے قائم کیے ہوئے ملک میں بھی زندہ نہیں رہ پائی۔ پاکستان سے ہمدردی رکھنے والے مفسرین نے بھی مسلم لیگ کے لیے عام حمایت کی کمی کو محسوس کیا۔ مثال کے طور پر خالص انگریزی اخبار دی اسٹیٹسمین (جس کی ملکیت بھی انگریزوں کی تھی) کے انگریز اڈیٹر Ian Stephens جنھیں سارے واقعات کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا اور نئے ملک سے ان کو ہمدردی بھی بہت تھی، اپنی کتاب "پاکستان، اولڈ کنٹری۔ نیو نیشن" (Penguin Books, p. 90) میں کہتے ہیں: "لندن میں کچھ دنوں وکالت کرنے کے بعد مسٹر جناح ۱۹۳۴ء میں ہندوستان آئے، اور یہاں انھوں نے کچھ ہی عرصے میں اپنے آپ کو مسلم لیگ کے لیڈر کے منصب سے سرفراز پایا۔ کانگریس کی بجائے انڈین لبرل پارٹی کی طرح مسلم لیگ نے بھی ابھی تک عوامی رابطے کی کوشش شاذونادر ہی کی تھی۔ اور اس کی حیثیت طبقۂ امرا کے ان افراد کے لیے جو ایک خاص قسم کی سیاسی دلچسپی رکھتے تھے، تبادلۂ خیال کی ایک جماعت سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتی تھی۔ فلسفی شاعر سر محمد اقبال نے جناح صاحب کے نام اپنے ایک خط میں جو انھوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو لکھا تھا یہی بات لکھی تھی۔ (جس کا اقتباس طارق علی نے اپنی کتاب "Can Pakistan Survive" میں دیا ہے) اس خط میں شاعر نے سیاست داں سے کہا تھا "لیگ کو بالآخر یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ آیا وہ ہندوستانی مسلمانوں کے امراء کی نمایندہ جماعت بنی رہے گی یا وہ ان مسلم عوام کی نمایندگی بھی کرے گی، جنھوں نے ابھی تک بوجوہ اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی ہے۔ اپنے طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایک سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کے حالات کو بہتر کرنے کا وعدہ نہیں کرتی ہے وہ ہمارے عوام کی توجہ بھی اپنی طرف مبذول نہیں کرا سکتی۔" ہمارا ذہن پھر اسی بنیادی سوال کی طرف لوٹتا ہے۔ آخر کس کا مفاد تھا جس کی خاطر پاکستان کا قیام عمل میں آیا؟ یہ مفاد بہرحال مسلم عوام کا مفاد نہیں تھا۔

اسے صرف انگریزوں کی دین کہنا چاہیے کہ جناح صاحب مسلمانوں کی نمایندگی کرنے کا دعویٰ کر سکے۔ یورپ میں جب دوسری جنگ عظیم چھڑی تو کانگریس نے اس سلسلے کی برطانوی کوششوں میں مدد دینے سے انکار کیا۔ اور (۱۹۳۷ء میں منتخب ہونے والی) اپنی صوبائی حکومتوں سے مستعفی ہو جانے کے لیے کہہ دیا۔ جناح صاحب کے لیے جو انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار آنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے یہ موقع فیضانِ الٰہی تھا۔ مسلم لیگ نے یہ فیصلہ کیا کہ پاکستان حاصل کرنے کا واحد راستہ ہے انگریزوں کی خوشنودی اور ان کی مہربانی۔ اور اسی وجہ سے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیانی دس برسوں میں مسلم لیگ نے انگریز دوستی کا زبردست اور سرگرم رول ادا کیا۔ ان دس برسوں

میں، انگریزوں کے خلاف اس نے نہ تو کوئی تحریک خود چلائی اور نہ ہی کسی ایسی تحریک میں شرکت کی۔ اپنے سارے جوش و خروش اور غم و غصے کو کانگریس کے لیے محفوظ رکھا جو نوآبادکاروں کی مخالفت بدستور جاری رکھے ہوئے تھی۔ دوسری طرف جناح صاحب ہر ہر موقع پر انگریز کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ چنانچہ جب کانگریس وزارتوں نے استعفے دے دیے تو جناح صاحب نے اعلان کیا کہ ۲۲ نومبر ۱۹۳۹ء کو "یوم نجات" منایا جائے گا۔ جنگ کے زمانے میں بنگال جیسے اہم صوبے میں لیگ کو حکومت کا وہ مزا مل گیا جس سے وہ ۱۹۳۷ میں محروم رہی تھی۔ جناح صاحب کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ ریاستی مشینری کو اپنے پراپیگنڈے کے لیے ہتھیار کی طرح استعمال کریں۔ ۱۹۳۷ میں مسلم لیگ نے "ہندو کانگریس سے اسلام کو خطرہ" کے نعرے کو اپنی مہم کا موضوع بنایا تھا جسے بہر حال مسلمانوں نے مسترد کر دیا تھا۔ اب انگریزوں نے فیصلہ کیا اور انتہائی اہم اور تشویش ناک فیصلہ، یعنی انتخابات میں شکست کھائے ہوئے ان ہی جناح صاحب کو ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمایندہ آواز بننے کا حق دینے کا فیصلہ۔ ۱۹۴۶ کے اوائل میں جب جنگ سے تھکے ہوئے اور نڈھال انگلستان نے ہندوستان کے مسئلے کا حل ڈھونڈنا شروع کیا تو جناح صاحب کو اس بات پر پورا اعتماد تھا کہ اگر برصغیر تقسیم نہ کیا گیا تو وہ ہندوستان میں سول وار کی دھمکی تو دے ہی سکیں گے۔ ۱۶ اگست ۱۹۴۶ کو یوم راست اقدام کے ذریعے بنگال میں شہید سہروردی کی مسلم لیگی حکومت نے یہ بات ظاہر کر دی کہ برسر اقتدار لیگ کیا کچھ کر سکتی ہے۔ کلکتہ خوفناک فسادات کی لپیٹ میں آگیا۔ لیگ کے مسلح کارکنوں نے بڑے پیمانے پر ہندوؤں پر حملے شروع کر دیے۔ اس کے جواب میں ہندوؤں نے بھی ویسی ہی شقاوت اور بربریت کا مظاہرہ کیا۔ یہ سول وار کی دھمکی کے سچ ہونے کا ایک اشارہ تھا۔ قتل و آتش زنی کا دور دورہ ہوا۔ دلوں میں خوف و ہراس بیٹھ گیا، اور یہی غیر فطری ماحول تھا جس میں مسلم لیگ نے اپنے ووٹوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کا اہتمام کر لیا۔ فروری ۱۹۴۷ کو آزادی کا اعلان ہو گیا۔ مارچ میں ماؤنٹ بیٹن آئے۔ اپریل کے آغاز میں ماؤنٹ بیٹن نے جناح صاحب سے چھ ملاقاتیں کیں۔ ۱۰ اپریل کو برطانیہ نے تقسیم کو منظور کر لیا۔ یکم مئی کو کانگریس نے ہتھیار ڈال دیے۔ اور اس کی ہائی کمان نے نہرو کو ایک منقسم ہندوستان کی آزادی کو مان لینے کا اختیار دے دیا۔ گاندھی جی نے بڑی بے چارگی کے ساتھ، جو کچھ ان کے چاروں طرف ہو رہا تھا، اس میں معنویت پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ انھوں نے کانگریس سے، ایک متحدہ ہندوستان میں جناح صاحب کو برسر اقتدار آنے دینے کی اپیل تک کی۔ مگر قتل و غارت گری اور بربریت کے اس بے نظیر دور دورے میں انسانیت اور سمجھداری کی بات کون سنتا۔

۲ جون کو ایک گول میز کانفرنس میں تقسیم کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت ہوئی۔ کانفرنس میں نہرو، سردار پٹیل

اور اچاریہ کرپلانی نے کانگریس کی نمائندگی کی۔ مسلم لیگ کی طرف سے جناح صاحب، لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر شریک ہوئے۔ برطانیہ کے ترجمان ماؤنٹ بیٹن، لارڈ اسمے اور سر ایرک میویل تھے۔ ۴ جون کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے وائسرائے کی محض دوسری پریس کانفرنس کو خطاب کیا اور اعلان کیا کہ ۱۵ اگست کو حکومت منتقل ہو جائے گی۔ صرف دو ماہ باقی تھے سرحدوں کے تعین کا سب سے دشوار کام ابھی تک شروع بھی نہیں ہوا تھا۔ وکیل سر سیسل ریڈکلف (Sir Cycil Redcliffe) کو لندن سے بلایا گیا کہ وہ ایک ایسے برصغیر کے دل پر نشتر چلائیں جسے انھوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔ مُلّا ایک ملک حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

جناح صاحب اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ چوں کہ انھوں نے ۱۹۳۳ء کے ایک ناممکن خواب کو ممکن بنا کر دکھا دیا تھا، وہ اسے ایک نظریہ دینے میں کامیاب ہوں گے۔ مگر پاکستان اُن لبرل اصولوں کی خاطر وجود میں نہیں آیا تھا جن کو جناح صاحب خود اس وقت تک مانتے رہے تھے جب تک کہ ان پر ایک ضد نہیں مسلط ہوئی تھی۔ ملّاؤں نے جو کام کافی برسوں پہلے شروع کیا تھا، اس کی تکمیل میں جناح صاحب آخری مگر انتہائی موثر ہتھیار تھے۔ تاریخ نے آج یہ بات ثابت کر دی ہے کہ کون تھا جس نے حقیقتاً پاکستان کے خیال کی تشکیل کی۔ اور مذہب کے نام پر بنے ہوئے اس ملک میں کون حکومت کرنے والا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پانچ سال کے اندر اندر لیاقت علی خاں کے قتل سے جناح صاحب کا سیکولرزم ختم ہوا۔ اگلی دہائی میں ایوب خاں نے جناح صاحب کی جمہوریت کو دفن کیا اور ۲۵ برس کے اندر پاکستان تباہ ہو چکا تھا۔ تو پھر ۱۴ اگست کو جناح صاحب نے کیا بات ثابت کی سوائے اس کے کہ انھوں نے یہ بھی نہیں جانا کہ اپنی زندگی کے آخری دس برسوں میں انھوں نے کیا کیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کچھ عرصہ تک ملّاؤں کو پاکستان میں اپنے اقتدار اور تسلط کو قائم کرنے کے لیے جد وجہد کرنا پڑی لیکن آخر میں بہر حال وہی ہوا۔ یہ صورتِ حال کب تک چلے گی یہ ایک دوسری کہانی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کوئی یہ فرض ہی کیوں کرے کہ مُلّاؤں کا اقتدار بہت دن نہیں چل سکتا؟ بنیادی طور پر اس لیے کہ برصغیر کا تجربہ دکھاتا ہے کہ مذہبی شدت، اپنے ماہرانہ اقتصادی نظریات کے ساتھ، خوف و ہراس کی فضا میں، عارضی طور پر تو موثر رہ سکتی ہے مگر اکثریت کی مدد اور تعاون کا جذبہ بہت دن برقرار نہیں رہ سکتی۔ پاکستان میں ان مُلّاؤں کی سب سے بڑی خواہش اگر کوئی ہے تو یہی کہ ان کی اس دینی حکومت کو کسی طرح جمہوری جواز حاصل ہو جائے۔ مگر جب بھی کسی شکل میں بھی کوئی موقع فراہم کیا گیا تو پاکستان میں انتخابات میں ان مذہبی جماعتوں کی اچھی طرح مرمت ہو گئی۔ اگر فوج، نوکر شاہی اور ملّا سب ہی کا یہ اصرار ہے کہ پاکستان میں ہر شخص ایک اسلامی

ریاست کے قیام میں دل وجان کے ساتھ ہے تو ایسا کیوں ہے؟ اس دینی جرگے کی فطری مقبولیت کی بہترین مثال ۱۹۷۷ء میں سامنے آئی۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب بھٹو مخالفت تحریک اپنے شباب پر تھی۔ بھٹو کی بد دماغی اور غلطیوں کا ثمرہ تھا جو دائیں بازو اور مذہبی جرگے کو انتہائی مقبولیت کی فضا میں پرواز کرنے کا موقع مل گیا۔ مگر جب بھٹو کو حکومت سے ہٹانے کے بعد جنرل ضیا نے واقعی انتخابات کرانے کی پیش کش کی تو اس وقت یہی دینی جرگہ تھا جس نے اپنی یقینی شکست کی پردہ پوشی کی خاطر انھیں رائے شماری کو ملتوی کرنے پر مجبور کیا۔ یہ دینی جرگہ کسی ایسے انتخابات ہی میں جیت سکتا ہے جس میں سیکولر اور مقبول پارٹیوں کے انتخاب لڑنے پر پابندی عائد کردی گئی ہو۔ مگر ایسا جھوٹا جواز ایک محض عارضی صورت حال ہو سکتی ہے۔

اس خیال کو لوگ آج بھی مانتے ہیں کہ اگر جناح صاحب زندہ رہتے تو انھوں نے محض اپنی شخصیت کے زور پر ملک کو صحیح راستے پر لگا دیا ہوتا۔ اور ہمارے سامنے اس وقت بیگم ضیا کا پاکستان نہیں رتی جناح کا پاکستان ہوتا۔ ع دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ جناح صاحب نے ۱۱ دسمبر ۱۹۴۸ء کو انتقال کیا۔ اس وقت ان کے ایک پھیپھڑے کا دو تہائی حصہ اور دوسرے کا ایک چوتھائی حصہ جو دق کے مرض کی نذر ہو چکا تھا، بالآخر جواب دے گیا۔ Collins اور la Pierre نے اپنی کتاب Freedom at Midnight میں لکھا ہے کہ بمبئی میں جناح صاحب کے معالج ڈاکٹر جے۔ اے۔ ایل پٹیل نے مرض کی تشخیص جون ۱۹۴۶ ہی میں کر لی تھی۔ مگر یہ تقسیم ہند کا وہ راز تھا جسے انتہائی خوبی کے ساتھ راز رکھا گیا۔ جناح صاحب نے اس مرض کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ وہ حسب دستور اتنی ہی سگریٹ پیتے رہے جتنی کہ وہ پیتے تھے۔ اپنی کھانسی اور بلغم کو وہ نرخرے کی نالیوں میں ورم کا نتیجہ بتاتے رہے۔ فروری ۱۹۴۸ء میں Ian Stephen سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا "جی ہاں مسٹر اسٹیفنس! میں بہتر ہوں۔ لوگ کہتے ہیں میں بیمار تھا۔ میں بیمار نہیں تھا۔" جناح صاحب کی گفتگو کا یہ اقتباس اسٹیفنس نے اپنی کتاب Pakistan, Old Country New Nation (p.281) میں دیا ہے۔ انگریز یقیناً اس بات سے واقف تھے کہ جناح صاحب بیمار ہیں۔ لارڈ ویول نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ جناح صاحب ایک بیمار آدمی تھے۔

وہ بڑا نحیف و ناتواں ملک ہوگا جسے کسی ایک بوڑھے آدمی کی دق کی بیماری مسخ کردے۔ ایک فرد اپنی موجودگی یا اپنی ذہانت کی وجہ سے ترقی کی رفتار کو سست و تیز تو کر سکتا ہے لیکن اگر بنیاد ہی کسی غیر مستحکم اور نامعتبر نظریے پر پڑی ہو تو پھر کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ جناح بھی گاندھی کی طرح پاکستان کو ایک مختلف رُخ پر موڑ سکتے تھے۔ اگر انھوں نے بھی کوئی نئی آئیڈیالوجی تشکیل کی ہوتی۔ مگر ان کے پاس اپنے ملک کو دینے کے لیے کچھ نہیں تھا سوائے اس

فلسفے کے جو انھوں نے ملّاؤں سے ورثے میں پایا تھا۔ ملک کی تخلیق قرآن اور ہلال کے نام پر ہوئی تھی اور اب اس کا امکان بہت کم تھا کہ اسلام کا خود ساختہ کاڈر لندن میں تعلیم حاصل کیے ہوئے ایک وکیل کو نئے نئے نظریات وخیالات کے تجربے کرنے کی اجازت دے گا۔

یہ خیال دلوں میں بیٹھ سا گیا تھا کہ ایک شخصیت ہی ہندوستان اور پاکستان میں بڑا اہم فرق پیدا کر دیتی ہے کچھ یہی انداز فکر تھا جس کی وجہ سے کہا جاتا تھا کہ ہندوستان میں جمہوریت کی کامیابیوں کے لیے جواہر لال نہرو کی بقا بہت ضروری ہے۔ اپنے ملک کے استحکام کے لیے نہرو نے بڑا اہم بلکہ بڑا انوکھا رول ادا کیا ہے مگر یہ کہنا کہ جمہوریت کا قیام ان کے اکیلے کا مرہون منت ہے محض جھوٹ ہوگا۔ یہی رویہ تھا جس نے اس سوال کی ہمت افزائی کی جو پانچویں دہائی کی صحافت پر مسلط ہو گیا تھا۔ سوال تھا "نہرو کے بعد کون ؟ حالانکہ ہونا صرف یہ تھا کہ نہرو کے بعد کس دوسرے شخص کو منتخب کیا جانا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں بہر حال سوال کا جواب دینا پڑا۔ نہرو کا انتقال ہوا۔ اور جمہوری طور پر ان کے جانشین نے عہدے کو سنبھالا۔ یہ وہی ہوا تھا جو کتاب نے کہا تھا کہ ہوگا۔ ایک وزیر اعظم کی ذہانت وفطانت کی بنا پر ہندوستان نسبتاً تیزی کے ساتھ ترقی کر سکتا تھا یا کسی کی لاپروائی اور عدم دل چسپی کی وجہ سے ٹھہراؤ اور جمود کے آثار نمایاں ہو سکتے تھے۔ مگر ملک کی مکمل تباہی وبربادی صرف اسی وقت ہوگی جب اس کی بنیادی آئیڈیالوجی اور اس کی سیکولر اور جمہوری بنیادوں میں دراڑیں پڑ جائیں گی۔ انتہائی ذہین ڈکٹیٹر بھی ہندوستان کو متحد نہیں رکھ سکتا تھا۔ اور ایک نقلی اور ناکارہ ڈیموکریٹ کے لیے بھی ملک کی شکست وریخت کا کام آسان نہیں تھا۔

پاکستان سے متعلق اپنے منصوبوں اور پروگراموں سے درحقیقت اگر کوئی واضح طور پر واقف تھا تو وہ پاکستان کے مفاد سے وابستہ ملاؤں کا گروہ تھا۔ نوکرشاہی، انگریزی تعلیم کے پروردہ افراد کے گروہ کا خیال تھا کہ اب جب کہ انھوں نے ایک مسلمان حکومت میں اپنا مقام حاصل کر لیا ہے۔ فزیکسٹین سے ―――――― واپس جانے کے لیے کہہ سکتے ہیں۔ ان کا خیال غلط تھا۔ ان کے مقابلے میں دینی جرگے کو زیادہ خبر تھی کہ ہدف کہاں بنانا چاہیے در حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے کیا طریقہ کار اپنانا چاہیے۔ فیصلہ کن کشمکش دراصل آئین پر ہونا تھی۔ ایان اسٹیفنس نے اپنی کتاب (پاکستان اولڈ کنٹری، نیونیشن، صفحہ ۷-۲۵۶) میں لکھا ہے۔ "ہم پاکستان میں ایک طرف خاص علی گڑھ تحریک کے پروردہ افراد رکھتے ہیں جو ثقافتی لحاظ سے انتہائی مسلمان مگر عمل میں کمزور، انگریزی بولنے والے اور آج کی دنیا میں جوش وخروش کے ساتھ حصہ لینے والے ہیں۔ دوسری طرف ملّا ہیں، عالم دین، عربی اور ماضی میں ڈوبے ہوئے، جن کی تعلیم وتربیت بچپن سے سہارن پور کے قریب دیو بند اور لکھنؤ کے ندوۃ العلما جیسے مدرسوں میں ہوئی تھی ......

ان دونوں گروہوں میں افہام و تفہیم یکسر معدوم ہو سکتی تھی۔ یہ بات ناگزیر تھی کہ دو یکسر مختلف دنیاؤں میں پرورش پائے ہوئے دونوں گروہوں کے ترجمان، کبھی کبھی ملک کے آئین کی حیثیت و مواد کے سلسلے میں ایک دوسرے کو دو بالکل مخالف سمتوں میں پائیں۔

وزیر اعظم لیاقت علی خاں، جن پر اب جناح صاحب کے انتقال کے بعد ذمہ داریوں کا زبردست بوجھ پڑ گیا تھا، بڑی تندہی اور جانفشانی کے ساتھ ایک آئین کی تدوین میں لگ گئے۔ ۷ مارچ ۱۹۴۹ کو بنیادی اصول کمیٹی (بیسک پرنسپلز کمیٹی) کی ایک رپورٹ، پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کو پیش کی گئی۔ یہ رپورٹ یکلخت رد ہو گئی۔ ملاؤں کو اس میں مذہبی ریاست کا کوئی وعدہ کوئی امکان نظر نہیں آیا۔ اس رپورٹ میں تو جمہوریت کی بات کہی گئی تھی۔ اور اس سے بڑھ کر برائی یہ تھی کہ اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ "اقلیتوں کو اپنے اپنے مذاہب کو ماننے، ان پر عمل کرنے اور اپنی اپنی ثقافت کو فروغ دینے کے مواقع فراہم کرنے کیلئے مناسب اقدامات کیے جائینگے"۔ ۲۲ نومبر ۱۹۵۰ میں اسے واپس لے لیا گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر جناح صاحب نے بھی مستقبل کے پاکستان کا ایسا کوئی تصور پیش کیا ہوتا تو انھیں بھی مذہبی جرگے کے غم و غصّہ کو جھیلنا پڑتا۔ بہر حال ان کی وفاداریاں "اللہ کی مرضی" کی ان کی اپنی تاویل سے تھیں جناح صاحب سے نہیں۔ ڈاسٹیفنس جو پاکستان کا ہمدرد بھی ہے تھوڑی جھجک کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ "ملّا ایک جمہوری آئین کی تدوین کی کوششوں کو ناکام بنانے میں کامیاب ہو گئے"۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ کو، خود جناح صاحب کے منتخب کیے ہوئے جانشین لیاقت علی خاں کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ گولی مارنے والے کی شناخت یا اس کے مقصد کا سرکاری طور پر آج تک پتہ نہیں چل سکا۔ حکمراں طبقے نے اس حادثے کو محض کسی پاگل کی مجنونانہ حرکت کہہ کر ٹال دیا۔ مگر لیاقت علی خاں کے قتل میں سازش کا نظریہ عوام کے ذہنوں میں بیٹھ گیا۔ یہ صورت حال مذہبی جرگے کی طرف انگلی اٹھاتی ہے۔ نوکر شاہی کی مدد سے، لیاقت علی خاں نے ایک ذمہ دار حکومت کا ڈھانچہ تشکیل دے لیا ہوتا۔ ان کی موت کے بعد اس کے امکانات ختم ہو گئے۔ سیاسی کھیلوں کی بساط بچھ گئی۔ اسباب، عمل، ردِ عمل، بھڑکانا اور اکسانا، لوٹ کھسوٹ اور پاگل پن۔ یہ سب عناصر ہر ادارے کو ختم اور بے اثر کرنے کے لیے یکجا ہو گئے۔

لیاقت علی خاں کی جگہ خواجہ ناظم الدین نے لی۔ انھوں نے گورنر جنرل کی رسمی کرسی چھوڑی اور وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا۔ اور جانشینی کا یکسر من مانا اور بے قاعدہ ڈھنگ شروع ہو گیا۔ اس بات کو سمجھنا بہت اہم ہے کہ پاکستان میں، عوامی خواہشات کے بل بوتے پر، حکومت کی تبدیلی صرف ایک دفعہ اس وقت ہوئی تھی جب ایک شکست خوردہ فوج نے ۱۹۷۱ میں حکومت ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کی تھی۔ کیوں کہ بھٹو نے ۱۹۷۰ کے منحوس انتخابات میں، مغربی پاکستان

میں زیادہ نشستیں جیتی تھیں اور اس نازک گھڑی میں عوام کے جذبات ان کے ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ، اقتدار کی تبدیلی ہمیشہ ڈرائنگ روم میں لیے جانے والے ان فیصلوں کے مطابق ہوئی ہے جو سب سے زیادہ طاقت ور اور بارسوخ گروہ لیتا تھا۔ پاکستان کا کاروبار بالکل اسی طرح چلایا جا رہا تھا جس طرح ۱۹۴۷ء سے قبل مسلم لیگ چلائی جاتی تھی۔ ایک چھوٹا سا گروہ، عوام کے تعاون کے مصنوعی دعوے کے ساتھ، ان کی اصلی خواہشات کا ذکر کیے بغیر عوام کا نام لے کر کام کیا کرتا تھا۔ یہ کوئی حیرت ناک بات نہیں ہے کیونکہ حکمراں اور بااثر طبقہ پہلے ہی والا تھا۔ بعض آرام دہ عادتیں بڑی مشکل سے چھٹتی ہیں! ——————— ۔ خواجہ ناظم الدین کے وزیر اعظم بننے کا کوئی جواز نہیں ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک پنجابی بیورو کریٹ غلام محمد ملک کے گورنر جنرل بن جائیں۔ سوائے اس کے کہ مٹھی بھر آدمیوں نے کسی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر یہ فیصلہ کر لیا کہ ایسا ہونا چاہیے۔ اقتدار کے حصول اور اس کے استعمال سے متعلق نہ تو کوئی نظام تھا اور نہ ہی کوئی سیاسی نظریہ۔ سازش کرنے والوں کے لیے آزادی تھی۔ پہلے دس برسوں کی سیاست نے سب سے واضح طور پر یہ بات ثابت کی کہ درحقیقت پاکستان طبقہ امرا کو ان کی خدمات کے سلسلے میں انعام کے طور پر دیا گیا تھا۔ ساتھ ہی اس زمانے کے واقعات بھی یہ ثابت کرتے ہیں کہ نظریات اور اخلاق سے مستغنی مٹھی بھر لوگ بے پناہ ورثے کو کس طرح تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔

دینی جرگے نے یہ جلدی ہی جتا دینے کا فیصلہ کیا کہ نئے ملک کا ذمہ دار کون ہو گا۔ اس نے سب سے پہلے تو مجوزہ آئین کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں۔ اس کے بعد یہ ظاہر کرنا شروع کیا کہ وہ پاکستان یعنی "اہل ایمان کی سرزمین" سے کیا مراد لیتے ہیں۔ اس بات کی بھی وضاحت ہو گئی کہ کسی قسم کی ملاوٹ برداشت نہیں کی جائے گی۔ احمدیہ یا قادیانی اسلام ہی سے نکلا ہوا ایک فرقہ ہے۔ متمول اور انتہائی لائق (۱۹۷۹ میں فزکس میں نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام اسی فرقے کے ہیں) چوتھی دہائی میں مشہور و معروف پاکستانی احمدیہ، سر ظفر اللہ خاں تھے، جو اس زمانے میں پاکستان کے وزیر خارجہ تھے اور انھوں نے اقوام متحدہ میں کشمیر کے کیس کی وکالت کی تھی اور چھوٹے موٹے ہیرو بن گئے تھے۔ مگر ۱۹۵۲ میں وہ خصوصاً اور ان کا سارا فرقہ عموماً بدعت کے مانوس الزام میں، باوجود اس کے کہ انھوں نے یہ یقین دلانے کے لیے کہ وہ اچھے مسلمان ہیں تقریباً ناکیں رگڑ ڈالیں، ملاؤں کے غیظ و غضب کا ہدف بنا۔ تقریباً ایک برس تک یہ دینی جرگہ جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا مودودی کی قیادت میں، احمدیوں کو خالص "مسلمانوں کی سرزمین سے خارج کیے جانے کے مطالبے کو منوانے کے لیے سڑکوں پر نکل آیا۔ (حسن اتفاق دیکھیے کہ جناح صاحب کے اس اعلان کے پانچ سال سے کم ہی بعد کہ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بنانے کا خیال بالکل غلط ہے یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔)

۱۳ اور ۷ مارچ ۱۹۵۳ء کے درمیان اس تحریک نے اتنا زور پکڑا کہ ملاؤں کی زیر قیادت ہجوموں نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ خواجہ ناظم الدین نے جو ابھی ان ؟ ں کے خلاف اقدام کرنے سے ڈرتے تھے، مارشل لا نافذ کرنے، مولانا مودودی کے ساتھ ساتھ تحریک کے دوسرے بہت سے قائدین کو گرفتار کرنے، دولتانہ کی پنجاب کی صوبائی حکومت کو معطل کرنے اور اس کی جگہ پر فیروز خاں نون کو فائز کرنے پر مجبور ہو گئے۔ دینی جرگے کی مخالف قوتوں نے ملاؤں کو کیفر ختم کرنے کے لیے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ مولانا مودودی اور نیازی کو نہ صرف قید کیا گیا بلکہ ان فسادات میں ان کے حصے کے پیش نظر انھیں موت کی سزا دی گئی۔ مگر پاکستان میں پھانسی پر صرف بھٹو کو لٹکایا جا سکتا ہے۔ موت کی سزائیں خاموشی سے واپس لے لی گئیں اور ملاؤں کو چھوڑ دیا گیا۔

اسی دوران اپنے وجود کے پانچ برسوں کے اندر اندر پاکستان کا نظریہ، ملک کے مشرق میں اپنی دل فریبی کھونے لگا۔ (یہ بات بار بار ہمارے سامنے آتی ہے کہ پاکستان کی جڑیں عوام کے ذہن میں کتنی اتھلی اور اس کے برخلاف کتنا اور صاحب اثر و رسوخ افراد کے دماغوں میں کتنی گہری پیوست تھیں) ۱۹۴۹ کے اوائل میں مولانا عبدالحمید بھاشانی نے نرائن گنج مشرقی پاکستان میں عوامی مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی۔ اس کے تین نائب سکریٹریوں میں ایک شیخ مجیب الرحمان تھے۔ برصغیر کے پار پاکستان کے دوسرے سرے پر بھی اسی طرح کا ایک امکان اسی وقت نظر آیا جب شمالی مغربی سرحدی صوبے میں پیر صاحب مانکی شریف نے اسی نام کی ایک پارٹی کے قیام کا اعلان کیا۔ یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شمالی مغربی سرحدی صوبہ یکسر مسلمانوں پر مشتمل ہونے اور مسلم پنجاب کے مغرب میں واقع ہونے کے باوجود ہمیشہ سے کانگریس کا ایک مضبوط گڑھ رہا تھا۔ فروری ۱۹۵۰ میں دونوں جگہ کی عوامی مسلم لیگوں نے شہید سہروردی کی زیر صدارت ایک دوسرے سے الحاق کر لیا۔ جیسا کہ Herbert Feldman نے اپنی کتاب The End and the Beginning میں وضاحت کی ہے "اس بات سے سب ہی واقف ہیں کہ جناح صاحب نے یہ نقطہ نظر کہ اپنے گھر میں ہر چیز پر اختیار خود مسلمانوں کو ہونا چاہیے ۱۹۴۶ میں بہار میں ہوئے فرقہ وارانہ قتل عام کے بعد ہی اپنایا تھا...... "بحیثیت مجموعی یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس نوعیت کا پاکستان ۱۹۴۷ میں سامنے آیا، متعدد بے جواب سوالات کے باوجود، دریائے سندھ کے دونوں جانب واقع صوبوں کے لیے قابل قبول تھا۔ مشرقی بنگال کے لیے بھی جو اس وقت مسرت سے سرشار تھا، یہ صورت حال قابل قبول تھی مگر بہت سے لوگ تھے جنھیں شبہات بھی تھے اور وہ بہت سے تحفظات بھی رکھتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا کہ ایسے متعدد غیر مطبوعہ دستاویزوں کا وجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناح صاحب نے مشرقی بنگال کو اپنی خود مختار حکومت بنانے پر رضامند کر لیا تھا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان دستاویزات پر نہ تو کوئی رائے زنی ہوتی ہے نہ ان کا کبھی انکشاف ہوا۔

ہم جو بات اچھی طرح جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے تین سال کے اندر مشرقی بازو میں بے اطمینانی کے آثار واضح طور پر نظر آنے لگے تھے۔ اور پانچ برسوں کے اندر اندر انسانی جانیں سیاست کی نذر ہونے لگی تھیں۔

خود ایک بنگالی خواجہ ناظم الدین کی مہربانی سے انسانی جانوں کا اتلاف ہوا۔ جناح اور لیاقت علی خاں نے یہ بات واضح طور پر کہہ دی تھی کہ بنگالیوں کو قومی زبان کی حیثیت سے اردو سیکھنا ہوگی۔ ۲۶ جنوری ۱۹۵۲ کو (جب ہندوستان دو سال قبل اپنے آئین کی تدوین کر کے اسے منظور کر چکا تھا اور بالغ رائے دہندگی کی بنا پر اپنے یہاں پہلا اور عظیم انتخاب کر رہا تھا) پاکستان قانون ساز اسمبلی کی Basic Principles Committee نے اپنی سفارشات میں اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی یعنی ایک ایسے ملک کی جہاں بنگالیوں کی اکثریت ہوگی، واحد سرکاری زبان اردو ہوگی۔ فروری کے آخر تک زبردست ہڑتالوں، مظاہروں اور ردعمل کے طور پر پولیس کارروائی میں طالب علموں اور بچوں کی جانیں جا چکی تھیں۔ آخر کار ۱۹۵۶ کے آئین میں بنگالی زبان کو مساوی درجہ عطا کیا گیا۔ مگر اس وقت تک ڈھاکہ میں شہیدوں کی یادگار ایک زیارت گاہ بن چکی تھی۔ اور خود مختار مشرقی بنگال کے بیجوں میں کلّے پھوٹ چکے تھے۔

۱۷ اپریل ۱۹۵۳ کو پاکستانی دیوان خانوں میں کیا جانے والا ایک اور فیصلہ مسلط ہو گیا۔ یہ دن تھا جب پاکستان میں پہلا ناگہانی تغیر ہوا۔ غالباً یہ تغیر تاریخ میں اولین تغیر تھا جسے منظم بھی نوکرشاہی نے کیا اور اس پر عمل درآمد بھی۔ یہ تغیر غیر معمولی تھا۔ اپنے اچانک پن کی وجہ سے بھی اور اس لحاظ سے بھی کہ اس میں وہ تمام اقدار و معمولات عنقا تھے جو کسی بھی نظام کی رہ نمائی کے لیے عموماً ہوتے ہیں۔ گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو اچانک اقتدار سے ہٹا دیا۔ اور اسے اس کا بھی موقع نہیں دیا کہ وہ اسمبلی کے سامنے جا سکے۔ ایک ہی اشارے میں قوت کا توازن بدل گیا۔ اسمبلی کی فیصلہ کن حیثیت دفعتاً ختم ہو گئی۔ ریاست کے رسمی سربراہ نے اپنا تکنیکی اختیار استعمال کر کے حکومت کو منسوخ کر دیا۔ درحقیقت یہ سب کچھ اوپر سے ہوا تھا۔

وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کی جگہ پر تقرر بھی فیصلہ سازی کی یکسر مطلق العنانی کی دوسری مثال تھی۔ ایک گمنام سابق سیاست داں محمد علی بوگرا، جو ۱۹۴۸ سے ایک سفیر کی حیثیت سے نسبتاً آرام دہ اور پرسکون زندگی گزار رہے تھے، وزیراعظم کے عہدے پر کام کرنے کے لیے بلائے گئے۔ ان کی قابلیتوں کو بڑی تلاش و جستجو کے بعد اگر نکالا جا سکتا تھا تو وہ دو تھیں۔ پہلی یہ کہ وہ انتہائی مطیع و فرماں بردار مشہور تھے اور دوسری یہ کہ وہ بنگالی تھے اور ان کے تقرر کو بنگالیوں کے لیے ایک میٹھی گولی قرار دیا جا سکتا تھا۔ جو خواجہ ناظم الدین کے برطرف کیے جانے کو، پنجابیوں کی طرف سے کی جانے والی بنگالیوں کی ایک اور تذلیل سے ناخوش ہو سکتے تھے۔ محمد علی بوگرا ابھی وزیراعظم ہوئے ہی ہوں گے کہ

ان کے اندر کا سیاست داں سرگرم عمل ہوگیا۔ انھوں نے قوت کے ایسے مرکز کی تشکیل کی کوششیں شروع کردیں جو خود ان کے محسن کے لیے ایک چیلنج تھا۔

بنگالیوں سے پنجابیوں کی نفرت کا الزام اس سے پہلے بھی صحیح تھا۔ بنگلہ دیش کے مابعد واقعات کے بعد ان تعلقات کے سلسلے میں پہلے بھی کافی لکھا جاچکا ہے اور اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پنجابی، بنگالی کے بارے میں کیا محسوس کرتا ہے اس سے لطف اٹھانے کے لیے صرف ایک اقتباس کافی ہوگا۔ اقتباس صدیق سالک کی ایک بہت اچھی کتاب سے لیا گیا ہے۔ صدیق سالک ۱۹۷۱ میں ڈھاکا میں، پاکستانی فوج کے تعلقات عامہ کے شعبے سے متعلق تھے اور یہ کردہ ایک ایسے شخص بھی تھے جس نے جنگ کو شکست خوردہ فریق کی طرف سے دیکھا تھا۔ اپنی کتاب Witness to Surrender (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی، ص ۹۴) میں سالک ان طریقوں کا بیان کرتے ہیں جو پنجابی اور پٹھان افسر ۱۹۷۱ کی جنگ کے اصلی آغاز سے قبل بنگالیوں سے برتاؤ کرنے میں استعمال کرتے تھے۔ آزادی اور خود مختاری کے جراثیم کو ختم کرنے کی بجائے حکام بنگوز (Bingos) کو قابو میں رکھنے کے لیے خوف دہراس کے دور دورے کو قائم رکھنے میں عقل مندی سمجھتے تھے Bingos بنگالیوں کی تذلیل کے لیے ایک خاص سینڈھرسٹ اور سیالکوٹی اصطلاح تھی۔ مشرقی پاکستان کے ان بنگوز نے آئینی قوت کے سلسلے میں جو سوال اٹھایا تھا وہ محض یہ تھا کہ تعداد کے لحاظ سے یہ لوگ مغربی پاکستان کے غیر بنگوز سے زیادہ ہیں اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ پاکستان کا مغربی علاقہ چار بہم آزار ریاستوں میں منقسم تھا، کوئی صورت نہیں تھی کہ کوئی نظری طور پر بنگالیوں کو ایک فرد ایک ووٹ کی بنا پر حاکم اعلیٰ ہونے سے روک سکے۔ اس سلسلے میں ہتھیار ڈالنے کے بجائے پنجابیوں نے انتشار کی اکاس بیل کے پھلنے پھولنے کو ترجیح دی۔

۱۹۵۲ تک بنگالی پاکستان کے اساسی نظریات کی طرف سے تشکیک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ عوامی مسلم لیگ نے اپنے نام سے دانستہ طور پر "مسلم" کا لفظ نکال دیا تھا۔ بات یوں نہیں تھی۔ تقسیم کے وقت بڑے پیمانے پر انتقال آبادی ہونے کے باوجود تین کروڑ ہندوؤں میں سے ایک معتد بہ حصہ جو تقسیم سے پہلے مشرقی بنگال میں رہتا تھا، بدستور مشرقی پاکستان میں قیام پذیر رہا۔ اسی دوران ستمبر ۱۹۵۳ میں فضل الحق نے اپنی کرانشک شرامک پارٹی یا کسان مزدور پارٹی بنائی۔ یہ اور اس جیسی دوسری تمام کوششیں شعوری کوششیں تھیں مسلم لیگ کی مذہبی اور جاگیردارانہ سیاست کا نعم البدل فراہم کرنے کی۔ ۱۹۵۴ میں مشرقی پاکستان کے صوبائی انتخابات میں عوام نے اس کی مکمل طور پر تائید و تصدیق کردی۔ مسلم لیگ (پاکستان دوست پارٹی) پر ۱۹۷۰ میں کیا گزرنی تھی اس بات کا پیشگی اندازہ ۱۹۵۴ کے ان انتخابات میں اس وقت ہوگیا جب اس نے ۳۰۹

نشستوں کے ایوان میں محض دس نشستیں حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۵۴ء میں عوامی لیگ، کرشک شرامک پارٹی اور دوسری چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے متحدہ محاذ نے انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کی۔

مگر پنجابی غیر فوجی شہری ڈکٹیٹر گورنر جنرل غلام محمد اپنے منصوبوں کی راہ میں عوام کی خواہش جیسی کسی حماقت کو دخل انداز ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ جس چیز کو وہ برداشت نہیں کریں گے وہ نہیں ہوگی۔ اور وہ مشرقی پاکستان کے متحدہ محاذ کی حکومت کو منظور نہیں کریں گے۔ مئی کے مہینے میں وزیر اعلیٰ فضل الحق کلکتے گئے۔ ان کے بعض جملوں سے وہ مایوسی جھلکی جو انھیں اب اس پاکستان کے بارے میں ہو رہی تھی جس کے قیام میں انھوں نے خود مدد کی تھی۔ غلام محمد نے وزیر اعلیٰ کے ان چند جملوں کو بہانہ بنایا اور فضل الحق کی حکومت کو سبکدوش کر دیا۔ ایک بار پھر یہ بات جتا دی گئی کہ صاحب اقتدار وہی ہیں۔ انھوں نے متحدہ محاذ کو توڑنے اور حکومت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسمبلی کے اراکین کراچی کی سازشوں کے جلدی ہی اور خوشی خوشی شکار ہو گئے۔ دھڑے بندی کن پستیوں تک پہنچ گئی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ عوامی لیگ نے اسمبلی کے اسپیکر کو مجنون و پاگل قرار دیئے جانے کی سازش کی۔ اس کے جواب میں کرشک شرامک پارٹی کے اراکین نے اپنے دشمن ڈپٹی اسپیکر شاہد علی پر میزیں اور کرسیاں اٹھا کر پھینکیں اور انھیں مار مار کر جنون سے موت تک۔ یہ قول نہ صرف اسمبلی کے اراکین کی تصویر پیش کرنے کے لیے نہایت مناسب ہے بلکہ سارے ملک پر بھی صادق آتا ہے[4]

مغرب میں بھی حالات کے سنگین ہونے کے آثار صاف نظر آنے لگے تھے۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو غلام محمد نے ایک بار پھر اپنی من مانی کرتے ہوئے ساری آئین ساز اسمبلی کو ہی اس افسوس کا اظہار کرتے ہوئے برخاست کر دیا کہ "آئینی ڈھانچہ ہی منہدم ہو گیا ہے۔ مزید یہ کہ انھوں نے وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کے اعلان کا اختیار خود اپنے آپ کو دے دیا۔

بہر حال اس بات کے آثار نظر آ رہے تھے کہ مسلح افواج کو جلدی ہی دخل اندازی کرنا پڑے گی۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں نے جب ۱۹۵۸ء میں حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے پہلے نشریے میں پاکستانیوں کو بتایا تھا کہ "آپ شاید نہ جانتے ہوں مگر میں نے حکومت اپنے ہاتھوں میں لینے کی مسٹر غلام محمد کی متعدد پیش کشوں کو کئی بار رد کیا۔" یہ بات اب یقینی معلوم ہوتی ہے کہ غلام محمد اب بہت بیمار تھے بلکہ قریب مرگ۔ اور انھوں نے سیاست دانوں کو حکومت سونپنے کے بجائے اسے فوجی جرنیلوں کے حوالے کرنے کو ترجیح دی۔ انھوں نے فوج کو سول انتظامیہ کی ذمہ داری سنبھالنے کی تربیت دینا شروع کر دی تھی۔ جنرل ایوب خاں ۱۹۵۴ء میں غلام محمد کی نامزد کی ہوئی کابینہ میں وزیر دفاع بنائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ جنرل اسکندر مرزا کو بھی کابینہ میں امور داخلہ کے وزیر کی حیثیت سے شامل کیا گیا۔ اسکندر مرزا ایک بیوروکریٹ تھے جنھوں نے اگرچہ فوج کو چھوڑ دیا تھا مگر اپنے فوجی عہدے کو برقرار رکھنے کی انھیں اجازت دے دی گئی تھی۔ پاکستان کو آئین دینے کی ایک کوشش

پھر کی گئی۔ ۱۹۵۵ء میں دوسری آئین ساز اسمبلی کی تشکیل ہوئی۔ جولائی میں اس سے پہلے کہ اس اسمبلی کا کوئی اجلاس ہوتا، دونوں بازوؤں کے سیاست دانوں نے معاہدے کے ایک فارمولے Murree Pact پر رضامندی ظاہر کی۔ بنگالی اپنی اکثریت کے دعوے سے دست بردار ہوئے اور اس کے بدلے میں بنگالی زبان تسلیم کی گئی اور خود اختیاری کا وعدہ کیا گیا۔

اگست ۱۹۵۵ء میں غلام محمد، جو اب بستر مرگ پر تھے، اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور ان کی جگہ اسکندر مرزا نے لے لی۔ اور ایک نئے وزیراعظم چودھری محمد علی کا تقرر کیا۔ یہ موخرالذکر کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ ۱۹۵۶ کا آئین قانون بنا۔ دستوری طور پر پاکستان ایک اسلامی ملک قرار پایا جس میں صرف کوئی مسلمان ہی سربراہ ہو سکتا تھا۔ دونوں مذکورہ شرطیں آئین کے اس پہلے مسودے میں نہیں تھیں جس کے نفاذ کو ملاؤں نے ناکام کر دیا تھا۔ بہر حال ۱۹۵۶ کا آئین اس لحاظ سے گینیز بک آف ریکارڈس میں رکھا جا سکتا ہے کہ دنیا کا سب سے کم مدت نافذ رہنے والا آئین تھا۔ دو سال سے کم مدت میں یہ آئین کالعدم ہو گیا

اسکندر مرزا نے بشمول شہید سہروردی تین مزید وزیراعظم مقرر کیے۔ مگر کامیاب کوئی نہیں ہو سکا، ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ کو بالآخر انھوں نے جنرل ایوب خاں سے حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے کہا۔ ۱۹۵۶ کا آئین کالعدم قرار دیا اور مرکزی اور ریاستی کابیناؤں کو ختم کر دیا گیا۔ ۲۷ اکتوبر کو نئے اختیارات سے سرشار فوج نے اسکندر مرزا کو بھی نکال دیا (ان کی یادداشتوں کے مطابق) ایوب خاں نے بڑا اوچھا ساہانہ یہ استعمال کیا کہ اسکندر مرزا کی بیوی سازش کرنے کے عمل کو ختم کرنے کی اجازت نہیں دیتی ہیں۔ تمام دوسرے جرنیلوں کی طرح ایوب خاں نے بھی حکومت پر قابض ہونے سے قبل وعدہ کیا کہ "مجھے بالکل صاف الفاظ میں یہ اعلان کرنے کی اجازت دیجیے کہ ہمارا اصل مقصد جمہوریت کی بحالی ہے مگر اس قسم کی جمہوریت جسے عوام سمجھ سکیں"۔ عوام نے ظاہر ہے کہ کبھی "سمجھ" کر نہیں دیا۔ ایوب خاں نے کہا کہ "نہ تو فوج نے جمہوریت کو عاق کیا نہ ہی جمہوریت نے فوج کو چھوڑا۔" مگر بات دراصل یہ تھی کہ جمہوریت اور فوج ایک دوسرے کے لیے بنے ہی نہیں تھے۔

فوجی حکومت ناگزیر تھی، فوج کے حق میں ایک اہم حقیقت ضرور تھی۔ پاکستان کے وجود کے پہلے دس برس میں سارے ہی ادارے خودکشی میں مصروف تھے۔ صرف فوج ہی ایک ایسا ادارہ تھا جو اپنی قوت، اپنی طاقت اور اپنے وقار میں اضافہ کر رہا تھا۔ یہ بہت دل چسپ بات ہے کہ ہندوستان میں اس کے بالکل برعکس ہو رہا تھا۔ عدلیہ، آئین ساز اسمبلیاں اور جمہوری سماج کے دوسرے اہم ادارے جیسے ذرائع ابلاغ وغیرہ آزادی اور ذمہ داری کی بقائے باہمی کے مشکل اسباق یاد کر رہے تھے۔ اور ہندوستانی فوج بے توجہی کا شکار ہو رہی تھی۔ اس حقیقت کا اظہار ۱۹۶۲ میں چینی جنگ کے زمانے میں بڑے واضح طور پر ہوا تھا۔ ہندوستانی فوج کی طرف سے یہ بے توجہی اور لاپرواہی، بے ارادہ ہو سکتی

ہے مگر یہ اتفاقی ہرگز نہیں تھی۔ اس صورت حال کے پیچھے یہ حقیقت تھی کہ ہندوستان کو چلانے کی ذمہ داریاں اٹھانے والے لوگوں کی تمام تر توانائیاں اور ان کی ساری دل چسپیاں مرکوز تھیں یا تو اقتصادی ترقی پر یا پھر جمہوری اداروں کے اوپر۔ کام آسان نہیں تھا۔ ملک کے ہزاروں عظیم مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، ہندوستانی آئین میں اقدار کے تحفظ کے لیے جواہر لال نہرو جیسے فرد کی ذہانت درکار تھی۔ ہندوستان اور پاکستان کو بہت سے ایک جیسے مسائل ورثے میں ملے تھے۔ مثلاً پناہ گزیں، علاقائیت، ایک قومی زبان جو عوام کے ایک بڑے حصے کو قبول نہیں تھی، مذہبی کش مکش (جو آج ہندوستان میں پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ بھیانک شکل اختیار کر چکی ہے) اور بدترین مسئلہ افلاس اور بھوک کا۔ ان سارے مسائل کا حل دونوں ملک ایک دوسرے سے بالکل مختلف ڈھنگ سے ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ ایک طرف پاکستان ایک تمسخر آمیز عہد میں پھنس گیا، دوسری طرف ہندوستان اپنے اوپر بھروسہ کرتے ہوئے مصائب سے نبرد آزما ہوا۔ ہندوستان نے دنیا کی بدترین پیشین گوئیوں کو غلط ثابت کیا۔ پاکستان کو خود اپنی دریافت کے لیے جرنیلوں کے عہد حکومت (جو جناح کے پروگرام میں نہیں تھا) کا تجربہ کرنا پڑا۔ اور فوجی حکومت کے دس برسوں (جسے آج عہد زریں کہا جاتا ہے) کے بعد پاکستان نے اگر کچھ دریافت کیا تو یہ کہ یہ کوئی ملک ہی نہیں تھا۔



۳

آقا نہیں دوست

جنوری ۱۹۴۸ میں جنرل ایوب خاں (بعد کو خود اپنی کارگزاریوں اور کامرانیوں سے متاثر ہوکر انھوں نے اپنے آپ کو فیلڈ مارشل مقرر کر لیا تھا) کو جنرل آفیسر کمانڈنگ مشرقی پاکستان کا عہدہ سنبھالنے کے لیے وزیرستان کے گردائی بریگیڈ کی کمان سے تبدیل کردیا گیا۔ آیئے ایک نظر جنرل کے کیریر پر ڈال لیں۔ ان کے بارے میں ہماری معلومات کا ذریعہ خود ان ہی کی خودنوشت سوانح عمری رہے گی۔ یہ کتاب جون ۱۹۶۴ میں اس وقت لکھی گئی جب وہ مری کے پہاڑی مقام پر آرام فرما رہے تھے اور پاکستان میں اپنے اختیار و اقتدار کے لحاظ سے انتہائی عروج پر تھے (آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس کی پاکستان شاخ نے جب، ۱۹۶ میں یہ کتاب شائع کی اس وقت تک ایوب خاں کے لیے حالات بہت کم سازگار رہ گئے تھے)

سوانح عمری کا عنوان "آقا نہیں، دوست" بڑا مدافعانہ ہے۔ اگر یہ حقیقت ذہن میں رکھی جائے کہ فوج کے بارے میں پاکستانی عوام کیا سوچتے تھے تو اس عنوان کا جواز سمجھ میں آجاتا ہے۔ کتاب کا آغاز روایتی دعائیہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے۔ اس کے نیچے قرآن کی ایک آیت ہے جس کے ذریعہ حکومت کو ہاتھ میں لینے کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "خدا کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود نہ بدلے"۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا (اقبال)

ایوب خاں نے پاکستانی عوام کی حالت کو بدلنے کا عزم کیا، کیوں کہ ۱۹۵۸ تک ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے وہاں جو تبدیلیاں کیں وہ مزید ابتری ہی کے لیے تھیں۔ "وقت آگیا تھا" جیسے بھیانک جملوں کے بار بار استعمال کو اگر نظرانداز کردیجیے تو سوانح کا پڑھنا گراں نہیں گزرتا۔ کتاب سے اُن رویّوں کا ادراک بھی ہوتا ہے جنھوں نے چھٹی دہائی میں پاکستان کی تاریخ کی تشکیل کی۔

ایوب خاں نے مشرقی پاکستان میں تقرری پر اپنی ناپسندیدگی پر پردہ ڈالنے کی بالکل کوشش نہیں کی: "میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ آیندہ کے امکانات کے سلسلے میں کچھ بہت خوش تھا۔ یہ ایک انتہائی خراب قسم کی "بیرونِ ملک" ذمہ داری تھی (اس کے برعکس بنگالی بیورو کریٹ یا بنگالی افسر کو اگر مغربی پاکستان بھیجا جاتا تھا تو یہ بات اس کے لیے باعثِ فخر ہوتی تھی۔ دراصل حقوق یافتہ اور ناحقوق یافتہ کا رشتہ تھا) ظاہر ہے کہ جنرل اس پریشان کن اور تکلیف دہ تقرر میں بیوی بچوں کو ساتھ نہیں لے گئے' اور مشرق میں اپنا زیادہ وقت مغرب میں واپس آنے کی کوششوں میں صرف کرتے رہے۔ بنگالیوں کے لیے ان کی نفرت ان کے قول اور فعل دونوں سے ظاہر تھی۔ خود ایوب خاں نے بیان کیا ہے کہ انھوں نے محمد علی بوگرہ سے 'جو بعد کو وزیر اعظم بنے اور اس وقت مشرقی پاکستان کی اسمبلی کے ایک چھوٹے موٹے لیڈر تھے، جولائی ۱۹۴۸ء میں ایک مظاہرے کے دوران پوچھا تھا "کیا تم گولی کی تلاش میں ہو؟" بھٹو جنھوں نے ایوب خاں کے ساتھ کام کیا تھا، ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ان کے گرد (ایوب خاں) بنگالیوں کے خلاف "زبردست تعصب" رکھتے تھے۔ یہ صرف ایک انفرادی سنک کا معاملہ نہیں تھا۔ ایوب خاں کا یہ رویہ پٹھانوں اور پنجابیوں کے اس تکبر کی علامت تھا جسے بعد کو پاکستان کی تنسیخ کا سبب بننا تھا۔ جب فوج برسرِ اقتدار آئی تو اس نے تعصبات، ثقافتی اور اقتصادی دونوں، سیاستوں تک پھیلا دیے۔ اس خیال کا برملا اظہار بھی بنگالیوں کے لیے اذیت کا باعث تھا کہ بنگالی زبان اور بنگالی ثقافت گھٹیا درجے کی ہے، ہندوانہ ہے، غیر عسکری اور نسوانی ہے اور اس لیے قابلِ نفریں ہے (اپنی مردانگی پر مغرور، پنجابی اور پٹھان پاکستانیوں کے لیے عورت تیسرے درجے کی مخلوق ہے)۔

عام آدمی کے لیے یہ بات بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز ہے کہ پنجابی اور پٹھان، اس میدان میں اپنے کارناموں کے باوصف، کسی دوسرے کو تہذیبی اعتبار سے اپنے آپ سے حقیر تصور کریں جسے تکبر اور جہالت ساتھ ساتھ ودیعت کی گئی ہو اسے کون سمجھائے اور کیسے سمجھائے۔ پاکستانی فوج کے بارے میں اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ فوج ہمیشہ وضع دار ضرور رہی ہے جب پہلی بار اس نے حکومت سنبھالی تو بنگلہ دیش بنانے میں اس نے مدد کی، حکومت کے اپنے دوسرے دور میں وہ سندھ کو ایک خود مختار ملک بنانے کے لیے اپنے بس بھر کوشش کر رہی ہے۔

پاکستان اور خیالِ پاکستان میں جو خرابیاں مضمر ہیں، فوجی حکومت ان ہی کی ایک دوسری علامت ہے۔ تربیت اور صلاحیت دونوں کے اعتبار سے غیر نظریاتی ہونے کی وجہ سے یہ ناگزیر تھا کہ ایک دن فوج، ایک ایسے ملک کو جس کی کوئی نظریاتی اساس نہیں تھی اپنے ہاتھ میں لے لے گی۔ پاکستان بغیر کسی ایسے موثر و مربوط نظریے کے، جو عوام اور لیڈروں میں حقیقی قوم پرستی کی روح پھونک سکتا، ایک جغرافیائی علاقہ تھا جسے ایک ملک میں تبدیل کر دیا گیا۔ غیر فوجی

سیاست دانوں نے اس حقیقت کو پردے میں رکھنے کی بہت کوشش کی مگر انھوں نے غلطیاں کیں اور ناکام ہوئے کیوں کہ ان کے ذہن، سیاسی عقاید کی سرزمین میں پروان نہیں چڑھے تھے۔ آپ کسی مصنوعی تخلیق پر حکومت نہیں کر سکتے اور زیادہ سے زیادہ عارضی طور پر نظم و ضبط فراہم کر سکتے ہیں۔ یہ بات بالکل منطقی تھی کہ فوج کسی نہ کسی دن حکومت پر قبضہ کر ہی لے گی۔ بہر حال اصل مسئلہ باقی رہا۔ نظم و ضبط فراہم کرنے کے پیچھے "قانون نہیں تھا"۔ ایمان لانے کے لیے کچھ نہیں تھا، لائقِ احترام کچھ نہیں تھا۔ عوام کو متحد کرنے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ آپ کسی ملک کی تخلیق اپنے ایمان کے صرف اظہار کی خاطر نہیں کر سکتے۔ مسلمان جو اللہ پر یقین رکھتے ہیں وہ اس کا اظہار کہیں بھی کر سکتے ہیں۔ افریقہ اور امریکا میں بھی اور چین اور ہندستان میں بھی۔ اسی لیے یہ کوئی حیرت ناک بات نہیں ہے کہ بہت سی کوششوں کے بعد (جن سب کی توثیق آئین ساز اسمبلیوں نے بھی کی تھی) پاکستان کے پاس آج بھی کوئی ایسا آئین نہیں ہے جس پر سارا ملک متفق ہو۔ آئین لفظیات کا کھیل نہیں وہ عقیدے کا اظہار ہوتا ہے۔

فوجیوں کو اگر کسی پر بھروسہ تھا تو وہ خود اپنے آپ پر۔ اور یہ چیز ایک انحطاط پذیر، اقتدار کے درمیان کامیابی کا فریب دینے کے لیے کافی تھا۔ ایوب خاں نے اس وقت تک بغاوت نہیں کی جب تک کہ انھوں نے فوج کی صلاحیت اور اس کا اعتماد مستحکم نہیں کر لیا۔ یہ ان کی دوربینی تھی نہیں تو پاکستان کا ایک واحد ادارہ جس نے کچھ مضبوطی حاصل کر لی، اسی غیر مستحکم حالت تک پہنچ جاتا جہاں سارا ملک پہنچا ہوا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں بہر حال فوج بھی ملک کو نہ بچا سکی اور پھر کون سی فوج ہے جو ایک ملک کو خود اپنے آپ سے بچا سکتی ہے۔

حکومت کا تختہ الٹنے کی پہلی کوشش کرنے والی فوج کی قیادت نہ تو ایوب خاں کر رہے تھے اور نہ ہی یہ کارروائی ۱۹۵۸ء میں ہوئی تھی۔ یہ کوشش اس وقت ہوئی جب ۱۷ جنوری ۱۹۵۱ء میں پہلے پاکستانی ایوب خاں نے جنرل سر ڈگلس گریسی سے ملک کی فوج کی سربراہی اپنے ہاتھ میں لی تھی (جنرل گریسی وہی ہیں جنھوں نے ۱۹۴۷ء کی جنگ میں کشمیر میں اپنی فوجوں کو بھیجنے کے جناح صاحب کے حکم کو نہ مانتے ہوئے یہ کہا تھا کہ وہ اپنے احکامات اعلیٰ تک ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے لیتے ہیں۔) اپنے برطانوی پیش رو سے پہلی بات ایوب خاں کو جو معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ فوج میں "ینگ ٹرکس" کا ایک گروپ ہے جو ملک اور نئے کمانڈر ان چیف دونوں کے لیے دردِ سر بن سکتا ہے۔ جنرل گریسی مزید زیادہ سے زیادہ جو بتا سکتے تھے وہ یہ تھا کہ میجر جنرل اکبر خاں جیسے افسر "عجیب و غریب" تھے۔

ایوب خاں اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ اس قسم کے شک و شبہہ کا اظہار وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے

بھی ان سے اور اسکندر مرزا سے دوپہر کے ایک کھانے پر سرگودھا کے ریلوے اسٹیشن پر کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک پریشان وزیر اعظم نے اس وقت کہا تھا "حضرات، میرے پاس آپ کے لیے بری خبر ہے۔ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ فوج کے بعض افسران حکومت کا تختہ پلٹنے کا ایک منصوبہ تیار کر چکے ہیں اور اس منصوبے پر عمل درآمد بھی جلد ہی ہونے والا ہے۔" ایوب خاں کو بریگیڈیر صدیق خاں پر شبہ تھا جن کے بارے میں عام طور پر لوگ جانتے تھے کہ وہ کچھ مفسد خیالات رکھتے ہیں۔ پوچھ گچھ بہت مختصر تھی۔ کمانڈران چیف نے کہا "صدیق تم مجھے سچ سچ بتادو ورنہ میں تمھیں سر سے پیر تک اُدھیڑ کر رکھ دوں گا۔" صدیق نے جھوٹ بولا اور ایمان دار بنے رہے۔ انھوں نے اس قسم کی سازش سے صاف انکار کر دیا اور انھیں اپنی کمانڈ پر بنوں واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔ مگر صدیق یہ بھول گئے کہ ان کا ٹیلی فون خفیہ طور پر سنا جاتا ہے۔ محکمہ جاسوسی نے انھیں اس وقت بے نقاب کر دیا جب تھل کے مقام پر انھوں نے فون پر سازش میں شریک اپنے دوست کرنل ارباب کو یہ بتایا اور غالباً خالص سینڈھرسٹ والوں کے تلفظ میں "کڑ بلّی تھیلے سے باہر نکل گئی ہے۔" پولیس انسپکٹر جنرل قربان علی نے شبخون کی قیادت کی اور ایک رات میں فوجی اور شہری سب ہی سازشیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

مقدمہ بند کمرے میں ہوا اور سازشیوں نے اپنے دفاع کے لیے جس شخص کا انتخاب کیا وہ شہید سہروردی تھے مقدمے کی کارروائی آج بھی صیغہ راز میں ہے مگر یہ بات معلوم ہے کہ سازش مٹھی بھر لوگوں کی نہیں تھی بلکہ حکومت کا تختہ الٹنے کے خیال کے حامی دوسرے بہت سے افراد بھی تھے۔ ۱۹۵۱ء میں ہی ایسے خیالات رکھنے پر افسروں کو الزام دینا مشکل ہوگا اگرچہ یہ وہ وقت تھا جب سولین حکومت عوام کی نظروں میں بدنام نہیں ہوئی تھی۔ افسروں نے دیکھا کہ شہری بااثر طبقہ غیر متوقع اور اچانک طور پر ملنے والے ملک کے قبضے سے فائدہ اٹھانے پر لگ گیا ہے تو انھوں نے سوچا کہ اس لوٹ میں شریک ہونے کا حق انھیں بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ دوسروں کو۔ آپ کو کرنا صرف یہ تھا کہ زبان سے اللہ کا نام لیتے رہیے۔ اور یہ کام کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

بعد کو ایوب خاں نے ۱۹۵۸ء میں خود اپنے "انقلاب" (حکومت کا تختہ پلٹنے کے لیے سرکاری اصطلاح) کو یہ کہہ کر حق بجانب ثابت کیا کہ "ملک کا دارالسلطنت کراچی سازش اور جعل سازی کا مرکز تھا..... آخر لوگ اپنا کام تھوڑی سی ایمان داری کے ساتھ کیوں نہیں کرتے؟ وہ اپنے اندر ایک اجتماعی احساس کیوں نہیں پیدا کر پاتے؟ یہ دھڑے بندیاں کیوں؟ اختلافات اور جھگڑے کیوں؟ یہ بغض وحسد اور بدگمانیاں کیوں؟ وہ سب ایک دوسرے کو تباہ کرنے میں لگے ہوئے تھے، کراچی کے ایک دورے سے پیدا ہونے والی مایوسی سے نجات پانے میں مجھے

تین دن لگ جاتے تھے۔ وہ تمام ادارے جو حصول آزادی کے وقت ہمیں ورثے میں ملے تھے یا بعد کو ہم نے خود بنائے تھے، ایک ایک کر کے منہدم ہوتے جا رہے تھے ہر شخص سیاسی نہ تک میں شامل ہو گیا تھا۔ انتظامیہ کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جسے شخصی سیاسی مفادات کو فروغ دینے میں نہ لگا دیا گیا ہو۔

۵ جون ۱۹۵۸ء کو وزیر اعظم فیروز خاں نون نے ایوب خاں کو کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے مزید دو سال اور دیئے۔ ۸ اکتوبر کو جنرل ایوب خاں نے خود اپنے لیے تھوڑی اور توسیع کا فیصلہ کیا۔ مگر اکتوبر کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی کارروائی کے لیے وہ کم از کم چھ مہینے تک بہت سرگرم رہے۔

اس زمانے میں انھوں نے جو ڈائری رکھی اور جس کے بہت سے حوالے انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں دیئے ہیں، اس میں انھوں نے لکھا کہ ۱۳ مئی ۱۹۵۸ کو انھوں نے ہیگ میں بیگم لیاقت علی خاں سے ملاقات کی۔ بیگم صاحب کا خیال تھا کہ مسائل کا حل صرف یہ ہے کہ تقریباً دس سال تک سخت حکومت رکھی جائے (درحقیقت یہی مدت تھی جس میں یہ حکومت قائم رہی، اور پھر وہ پراگندگی اور انتشار پھیلا کہ جس نے ملک کو توڑ ہی ڈالا) ڈائری سے پتہ چلتا ہے کہ جنرل ایوب اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کر رہے تھے۔ اس زمانے میں جو کتاب ان کے زیر مطالعہ تھی اس کا نام تھا "افراد جنھوں نے ہندوستان پر حکمرانی کی۔"

۶ اکتوبر کو ایوب خاں ٹرین کے ذریعہ اپنے مخصوص ڈبے میں بیٹھ کر کراچی پہنچے جہاں جنرل حامد اور جنرل یحییٰ خاں ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ۷ اکتوبر کی شام کے سات بجے تک وزیر اعظم نے اپنے متحدہ محاذ کے ساتھیوں کے آپسی جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے باہمی مصالحت کی راہ نکال لی مگر آٹھ بجے تک مصالحت کی ساری راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ صدر اسکندر مرزا کے تعاون سے ایوب خاں نے پاکستان کی تاریخ کے پہلے مرحلے کی تکمیل کر دی۔

پاکستان کی تاریخ کو نہایت واضح چار حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ دو پرانے پاکستان میں اور دو نئے پاکستان میں۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک بتدریج انحطاط کا شکار ہوتی ہوئی، سویلین حکومت، موجودہ پاکستان میں ۱۹۷۱ سے ۱۹۷۷ تک روز افزوں غیر نمایندہ ہوتی ہوئی جمہوریت اور ۱۹۷۷ کے بعد جیسا کہ ہم خود دیکھ رہے ہیں ایک فوجی آمریت جو اپنے اقتدار کو مستقل شکل دینے میں مصروف ہے۔ یہ دونوں غیر متوازی عہد ہیں۔ مستقبل ماضی کا عکس، سوائے اس کے کہ دوسری بار کی سویلین اور فوجی دونوں حکومتیں پہلے دور کے مقابلے میں زیادہ خطرناک اور تباہ کن تھیں۔

جمہوریت کے میدان میں پاکستان کا ابتدائی تجربہ، صاحبان اقتدار کی کم ظرفی اور چھوٹے پن کی مہربانی سے مایوسی اور ناامیدی کی شکل میں سامنے آیا۔ دوسرا تجربہ ایک فرد کے، ذہانت و طباعی سے نیچے گر کر مخبوط الحواس ہو جانے کی

کی وجہ سے کشت وخون میں ڈوب گیا۔ اگر غلام محمد سے لے کر اسکندر مرزا تک لیڈروں کے سلسلے نے مہر صبح آئینے کے سامنے بیٹھ کر شدومد کے ساتھ اپنی ناک اور منہ کے جاجتے جاری رکھ کر اپنے آپ کو تباہ کیا تو ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے آئینے کے سامنے بیٹھ کر ایک بادشاہ بننے کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے۔ عارضی اور ناپائدار لیڈروں کی بجائے کسی دوسری زیادہ اہم چیز پر ایمان رکھنے والے ادارے اول الذکر کی حماقتوں اور موخرالذکر کی انا پر قابو نہ پا سکے۔ غلام محمد گئے کسی کی آنکھ سے آنسو نہ ٹپکا۔ اسکندر مرزا کو ایوب خاں نے جلاوطن کر کے لندن بھیجا۔ بھٹو کو پھانسی پر چڑھانا پڑا۔ نظام کی انحطاط پذیری کی اس سے بڑی علامت اور کیا ہو سکتی تھی۔

بھٹو، میکالے کے تعلیمی نظام اور صدیوں سے چلی آرہی جاگیردارانہ روایت کی پیداوار تھے۔ ملک میں وہ اچھی گفتگو اور دلچسپ خیالات کے لبرل تھے اور گھر میں ملاقات کے لیے آنے والے کسانوں کو، اس سے پہلے کہ ایک شہزادہ اور ایک زمیندارزادہ ملاقات کا شرف بخشتے کئی دن انتظار کرا سکتا تھا۔ اپنے صحیح مقام اور اپنی اصلی حیثیت کا احساس دلانے کے لیے گنواروں اور دیہاتیوں کے لیے اس طرح کی تحقیر ضروری تھی۔

سڑکوں پر اور اپنے انتخابی جلسوں میں وہ ملاؤں کی قدامت پرستی کی دھجیاں اڑانے والا تھا۔ وہ مذہبی ٹولے اور فوج دونوں سے مقابلہ کر سکتا تھا۔ لاکھوں لوگوں کی تالیوں سے خود سرشار اور اپنی خوب صورت اور موثر تقریروں سے انھیں مخمور ومسحور کرنے والا، عوام کا ہیرو۔ وہ ضرورت، ردعمل موڈ اور دوسروں کی قوت فہم کا زبردست نباض تھا۔ لاہور میں، نعرے لگاتے ہوئے عوام کے ایک جلسے میں ان کی تقریر کی ایک کہانی بہت مشہور ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اس وقت بھی لوگ جانتے تھے کہ بھٹو اپنے ذاتی عادات واطوار میں کچھ بہت اسلامی نہیں تھے اور موڈ بنائے رکھنے کے لیے تھوڑی سی اسکاچ وسکی پسند کرتے تھے۔ ملاؤں کو بھی اس کا علم تھا اور وہ انھیں شرمندہ کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے چنانچہ انھوں نے اس جلسے میں ان کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کی، انھیں شرابی کہا، خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کا یہ مجمع ایسی غیر اسلامی عادت کو معاف نہیں کرے گا، تھوڑی دیر تک تو بھٹو ان باتوں کو سنتے رہے اور پھر مجمع سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یہ لوگ کہتے ہیں کہ میں شراب پیتا ہوں۔ ہاں میں شراب پیتا ہوں مگر ملاؤں کی طرح عوام کا خون نہیں پیتا" مجمع نے یہ سن کر فوراً ایک نعرہ بنایا اور اس کا وِرد شروع کر دیا۔ "پیوے پیوے بھٹو، جیوے جیوے بھٹو" ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد عوام، مذہبی ٹولے اور فوج دونوں ہی کو ملک کی شکستگی وبربادی کا ذمہ دار سمجھنے لگے تھے اور پاکستان میں روشن خیالی کی ایک ہوا سی چلنے لگی تھی۔ بھٹو نے اس لہر کا پورا فائدہ اٹھایا، اور ان لوگوں کے خلاف اپنی جنگ کو کسی حد تک بذلہ سنجی کے ساتھ مگر زیادہ کارگر بناتے ہوئے لاہور کی سڑکوں پر ملاؤں کے امرد پرستی کے بدنام جہاں شوق کا تذکرہ برملا کرنا

شروع کردیا۔

بھٹو کی شخصیت کا ایک دوسرا پہلو، ان کے پریس ایڈوائزر خالد حسن کے ایک تجربے سے سامنے آتا ہے۔ ایک دفعہ بھٹو روسیوں کو ایک ذاتی اور اسی لیے کسی حد تک غیر رسمی خط بھیجنا چاہتے تھے اور وزارت خارجہ کو اس قسم کا خط تیار کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ بڑی کوششوں کے بعد بالآخر بھٹو کو اس غیر رسمی خط کا دفتر خارجہ کا تیار کیا ہوا مسودہ ملا۔ بھٹو نے خط کے مسوّدے کو پڑھا اور خالد حسن کو بلا بھیجا۔ چہرے پر بڑے صابر وشاکر تاثرات کے ساتھ بھٹو نے خالد حسن سے پوچھا "تم جانتے ہو کہ برصغیر میں انگریزوں کی سب سے بڑی ناکامی کیا تھی؟ اب مایوسی اور بے بسی کی جھلک خالد حسن کے چہرے پر بھی کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اب آقا اپنی طول طویل آپ شناپ خود کلامی پر اترنے والے ہیں مگر بھٹو نے خلاف امید بڑے سلیقے کے ساتھ اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا" ان کی سب سے بڑی ناکامی یہ تھی کہ یہاں دو سو سال حکومت کرنے کے بعد بھی وہ کسی کو انگریزی نہیں سکھا سکے۔"

دھواں دھار مقرر اور زبردست ذہانت کے درمیان ایک نپولین کا مزاج تھا۔ اگرچہ بڑی انا اور نسبتاً کم صلاحیت کے ساتھ، خود ان سے وفاداری رکھنے والے لوگ انھیں ڈیموکریٹ نہیں کہتے تھے۔ شاید اپنے خیالوں کی دنیا میں وہ سمجھتے تھے کہ عوامی خواہش کے مطابق ان کی تاج پوشی ہونا ہے۔ بہر حال انھوں نے جلدی ہی اس تھوڑے بہت کا انتظام کر لیا جس کا براہ راست تعلق اور جس کی مماثلت اس چیز سے تھی جو ملک نے اپنے خالق جناح صاحب کو دی تھی۔ جناح صاحب قائد اعظم تھے، بھٹو نے اپنے آپ کو قائد عوام نامزد کیا۔ (یہ اس قسم کی حماقت تھی جس کا تصور بھی مسز اندرا گاندھی نہیں کر سکتی تھیں)۔

اگر جمہوریت کی فضا میں پروان چڑھے ہوئے ادارے پاکستان میں ہوتے تو شاید بھٹو صاحب ان زیادتیوں سے بچ جاتے جو ان سے سرزد ہوئیں۔ مگر انھیں تو ایک غیر واضح اور مبہم پاکستان ملا تھا جو استحکام کی طرف جانا تو چاہتا تھا مگر اسے یقین نہیں تھا۔ اور منطقی جواز کی حدود کے اندر وہ نشان راہ بھی نہیں تھے جنھوں نے اسے ٹھیک راستے پر رکھا ہوتا۔ بھٹو صاحب کو ایک جمہوری پاکستان بنانے کا موقع ملا مگر یا تو وہ یہ جانتے نہیں تھے کہ یہ کیسے بنایا جائے یا پھر یہ ممکن ہی نہ تھا۔ ۱۹۷۱ نے اگر سولین حکومت کی واپسی کو یقینی بنایا تھا تو ۱۹۷۷ نے ایک دوبارہ بحال کی ہوئی فوج کا پھر سے

اقتدار میں آنا ناگزیر کر دیا۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے کسی بڑے غیر معمولی درک کی ضرورت نہیں ہے کہ دسمبر ۱۹۷۱ میں جگجیت سنگھ اروڑہ کی فوجوں کے سامنے مشرقی پاکستان کی شکست کے بعد جب بھٹو کو عنان حکومت سونپی گئی تو اس وقت ان کی ترجیحات کیا ہوں گی۔ ملک طبیعی اور اخلاقی طور پر شکستہ ہو چکا تھا مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس وقت بھی فوج کو نکالنے کے لیے دھکا دینا پڑا۔ ۱۷ دسمبر کو ڈھاکہ ہاتھ سے نکل گیا اور ریڈیو پاکستان کے نشریوں میں سے یحییٰ خاں کا نام غائب ہو گیا مگر چوبیس گھنٹوں کے بعد پھر آنے لگا۔ مستقبل کے بارے میں برے خدشات تھے، مثال کے طور پر اسٹیٹ بنک آف پاکستان کو اس افواہ کی تردید کرنا پڑی کہ بڑی رقموں والے کرنسی نوٹ ترک کیے جا رہے ہیں۔ بھٹو صاحب نیویارک میں تھے اور ۱۹۶۵ کی طرح اقوام متحدہ میں ہونے والی جنگ (مباحثے) کی قیادت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھیں وہاں سے واپس بلا لیا گیا مگر یہ خبر گرم ہوئی کہ "اسلام آباد کے بنگالی رفیق نورالحسن کو وزیر اعظم بنایا جائے اور بھٹو صاحب کو ان کا نائب۔ اس سلسلے میں بھی کوئی واضح اور قطعی بیان نہیں تھا کہ یحییٰ خاں سبکدوش ہوں گے۔ ایئر مارشل اصغر خاں یحییٰ خاں سے ملے اور ان سے صاف صاف یہ کہہ دیا کہ وہ نکل جائیں نہیں تو ان کی تکا بوٹی ہو جائے گی۔ اصغر خاں نے کہا "یحییٰ نے فوج کی تحقیر کی ہے ..... (بد قسمتی سے) جاپان کی (ہراکری کی) طرح کی روایت ہمارے یہاں نہیں ہے ...... مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ان کی جگہ پر کون آتا ہے۔"

نیویارک سے واپسی میں سر الک ڈگلس ہوم سے گفت و شنید کے لیے لندن پہنچنے تک بھٹو صاحب کے پاؤں زمین پر نہیں تھے۔ انھوں نے اخبار نویسوں سے خطاب کرتے وقت کہا تھا "عوام کو مجھ پر بھروسہ ہے" اور پھر انھوں نے مستقبل میں اپنے امکانی رول کی تصویر کشی شروع کی۔ "ہم پھر سے ایک نیا ملک بنانے جا رہے ہیں۔ ہمارے سامنے بہت سے مسائل ہیں۔ بس یوں سمجھیے کہ یہ کتاب پیدائش کا پہلا باب ہے۔"

بھٹو کے ذہن میں یہ کتاب پیدائش تھی اور وہ خدا کا رول ادا کر رہے تھے۔

قوم سے کیے جانے والے پہلے خطاب میں لفظ "میں" کا بہت استعمال تھا۔ یحییٰ خاں نے بھٹو کو اسی طرح اقتدار سونپا تھا جس طرح ایوب خاں اور خود ان کے درمیان حکومت کا تبادلہ ہوا تھا۔ ایک کا دکھ دوسرے کا سکھ۔ مگر یہ سب کچھ ہوا پرامن طریقے پر۔ بھٹو صاحب نے بھی ریڈیو پر منتظر عوام سے خطاب کیا۔ بھٹو کی اس تقریر میں ایک طرف تو لفظ "میں" سے پرہیز کیا گیا تھا اور دوسری طرف ساری کی ساری تقریر ایک اچھی عوامی تقریر تھی۔ "کاش میں آج زندہ نہ ہوتا"...... "میں آج آپ لوگوں سے دل سے بات کروں گا (تقریر کے باقاعدہ تحریری شکل میں نہ ہونے کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے) فوج کی فتح کوئی فتح نہیں ہوتی (نیا آئین) میرا آئین نہیں ہوگا۔ میں عوام کا خادم ہوں..... مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے.....آپ کے تعاون کی ضرورت ہے.....میں آپ کی رضامندی کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ جمہوریت کے لیے کی جانے والی جد وجہد میں ساڑھے پانچ سال تک لگا رہا ہوں۔ یہ جد وجہد کوئی معمولی جد وجہد نہیں تھی۔"

اس سے قبل لندن میں اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے بھٹو صاحب نے کہا تھا "ریاستوں کا ایک لچک دار وفاق ہی حل ہے۔ اس وقت بھٹو صاحب نے برملا یہ تسلیم کیا تھا کہ دو چیزیں ہیں جو پاکستان کو اب بھی قائم رکھ سکتی ہیں، اور وہ ہیں جمہوریت اور صوبائی خود اختیاری بھٹو صاحب یہ بات بنگلہ دیش کے حوالے سے کر رہے تھے اور اس خام خوش فہمی کو بدستور قائم رکھنا چاہتے تھے کہ پاکستان ابھی ٹوٹا نہیں ہے مگر وہ اس بات سے یقیناً واقف تھے کہ بلوچستان اور سندھ بھی پنجابی جوئے کے نیچے بے چین ہیں۔ بہرحال، حال اور مستقبل کی آزادی کو یقینی بنانے والے اداروں کی تشکیل اور ان کے استحکام کے لیے کچھ کرنے کے بجائے بھٹو صاحب نے ان کو اپنے شخصی اقتدار کو فروغ دینے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

علامتیں بہت شروع ہی سے نظر آنے لگی تھیں۔ مثلاً برسر اقتدار آنے کے چند ماہ بعد بھٹو صاحب نے یہ بات صاف کر دی تھی کہ صرف وہی اخبارات اور وہی صحافی چل سکیں گے جو سچائی کو خود بھٹو صاحب کی نظر سے دیکھیں گے۔ لاہور کے تین رسالوں، زندگی، اردو ڈائجسٹ اور پنجاب پنچ پر پابندی عائد کر دی گئی اور ان کے ایڈیٹروں اور ناشروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ڈان نے جو ایک زمانے میں مسلم لیگ کا ترجمان تھا، اس کارروائی کو آزادی کے لیے پاکستان پریس پر سب سے زبردست حملہ قرار دیا۔

یہ بات بہت جلدی واضح ہو گئی کہ بھٹو صاحب کے ذہن میں کس قسم کی جمہوریت ہے۔ ضیا حکومت کی طرف سے شائع ہونے والے قرطاس ابیض ظاہر ہے کہ جانب دار ہیں ان میں دیے گئے بہت سے اقتباسات مسٹر بھٹو کے سیاسی حریفوں اور ذاتی مخالفین کے ہیں اور اسی لیے ان پر شک و شبہے کی پرچھائیاں ہیں لیکن پھر بھی اگر ہم اپنی شہادتوں کو ان باتوں تک محدود رکھیں جو مسٹر بھٹو کے زمانے کے سرکاری دستاویزات سے لی گئی ہیں تب بھی یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اگر انھوں نے کسی کا احترام کیا تو وہ خود ان کی اپنی ذات تھی۔ ہر وہ شخص جس نے انھیں سنجیدہ یا معمولی کسی مسئلے پر چیلنج کرنے کی کوشش کی نہ صرف ان کا بلکہ ملک کا دشمن قرار پایا۔ مسٹر بھٹو نے ایک ایسی غلطی کی جو کوئی دوسرا کم متکبر اور زیادہ محتاط آدمی کرنے سے احتراز کرتا۔ انھوں نے اچھی خاصی باتیں تحریری شکل میں اور خود سرکاری فائلوں پر لکھ دیں۔ ۱۹۷۶ء میں پانچویں آئینی ترمیم کی منظوری کے متعلق عدلیہ کے بارے میں دو واقعات اس حقیقت کی نشاندہی

کرتے ہیں کہ اس اہم ادارے کے سلسلے میں بھٹو گورنمنٹ کس طرح سوچتی ہے۔ ۲۰ مارچ ۱۹۷۶ کو (بھٹو عہد کی کارگذاریوں سے متعلق قرطاس ابیض، جلد دوم کے مطابق بنیادی ریاستی اداروں کے ساتھ برتاؤ) ایک آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی ملک فضل کریم نے ایک تحریر بھیجی جس میں انھوں نے لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی صدارت کے بھٹو کے دوست امیدوار کی شکست کا الزام لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے سر رکھا اور سفارش کی کہ "اب جب کہ عدلیہ ایک متوازی حکومت کے روپ میں سامنے آگئی ہے، وہ وقت آگیا ہے جب امریکہ کی طرح، عدلیہ کو سپریم جیوڈیشری کونسل کے بجائے پارلیمنٹ کے تحت لانے کے لیے پانچویں آئینی ترمیم پاس ہو جانا چاہیے۔"

بھٹو صاحب کو یہ بات پسند آئی اور انھوں نے حاشیہ پر لکھ دیا "اشد ضروری"۔ پانچویں ترمیمی بل پر ہونے والی بحث کے دوران مسٹر بھٹو اور ان کے ساتھیوں نے عدلیہ پر زبردست حملے کیے۔ ۴ ستمبر کو مسٹر بھٹو نے اعلان کیا کہ "عدلیہ قانون کی بڑے پیمانہ پر، غلط تطبیق، غلط نمایندگی اور غلط تاویل کر کے ایک متوازی انتظامیہ نہیں بن سکتی ...... اس بات کو بالکل واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے ...... اور اگر کوئی شخص اسے نہیں سمجھتا ہے تو اسے اس کی قیمت اپنی تباہی و بربادی کی شکل میں دینا ہوگی۔" یہ ترمیم کسی شخص کو حراست میں رکھنے کے انتظامیہ کے حق کے تحفظ کی خاطر پیش کی گئی تھی۔ انتظامیہ کی موافقت میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر بھٹو نے اسمبلی کو بتایا "یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے، مسٹر اسپیکر، احتیاطی نظربندی، ہنگامی حالات کے مترادف ہے، یہ اسی کا ایک حصہ ہے۔ ایمرجنسی کو منظور کیا گیا ہے اور اسے منظور کیا جانا تھا کیونکہ ہنگامی حالات کا وجود ہے یا نہیں اس بارے میں فیصلہ کرنا اور اعلان کرنا صرف انتظامیہ ہی کا حق ہے۔ حسن اتفاق یہ ہے کہ مسٹر بھٹو جس ایمرجنسی کا حوالہ دے رہے تھے وہ ۱۹۷۱ کی جنگ سے قبل ۲۳ نومبر کو نافذ ہو چکی تھی اور مسٹر بھٹو نے اپنے چھ سال سے زیادہ کے عہد حکومت میں بغیر اس کو ختم کیے ہوئے کام کیا۔

عدلیہ بے اثر کر دی گئی اور بیوروکریسی کو جاگیر بنا دیا گیا۔ تحکم پسند بھٹو سے کم وفاداری جیسے جرم پر من مانی برخواستگی اور سزاؤں کی لاتعداد مثالیں موجود ہیں، اور سب کی سب سرکاری فائلوں میں۔

آخر میں بھٹو صاحب نے جن اداروں کو استعمال کیا تھا وہی ان کے خلاف ہو گئے۔ اور جب انھوں نے ۱۹۷۷ کے انتخابات میں دھاندلی کر کے عوام کی تحقیر کی تو وہ بھی ان کی تشدد آمیز مخالفت پر اتر آئے۔ بھٹو صاحب کو بہرحال یقین ہمیشہ رہا کہ انھوں نے اعلیٰ عہدوں پر وفادار جرنیلوں کا تقرر کر کے فوج سے بیمے کی پالیسی لے لی ہے۔ اس خوش فہمی کے ساتھ ساتھ اپنی ذکاوت و ذہانت (میکیاولی، اسرو، بیلی رینڈ، افلاطون) کے بارے میں خود ان کے اندازے نے انھیں اپنی نظر میں ایک با اصول اور معصوم فرد بنا رکھا تھا۔ جیل میں اپنی بدبختانہ حالت اور پھانسی کے

پھندے کے بارے میں ان کی قابلِ رحم بے یقینی ، بڑی الم ناک ہے ۔ انھیں کوئی نہ بچا سکا ۔ یہاں تک کہ ان کی خارجہ پالیسی بھی ان کے آڑے نہ آئی جس پر انھیں فخر تھا اور حق بہ جانب تھا ۔ اپنے کردار اور اپنی داخلہ پالیسیوں کے نتائج سے بچ کر نکل جانے کا تو کوئی سوال تھا ہی نہیں ۔

مگر فوج ، جس کے لیے بھٹو صاحب نے اتنا کچھ کیا ، اس کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کیا ، ان کے خلاف کیوں ہو گئی ؟ اور ضیاء ، کہ جنھیں بھٹو صاحب نے جنرل بنایا تھا کس طرح ان کو پہلے جیل بھیجا اور پھر پھانسی کے تختے پر ۔

۱۹۶۹ میں ایوب سے الگ ہونے کے بعد ، بھٹو صاحب کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اقتدار تک پہنچنے کا راستہ ان کے لیے صرف جمہوریت ہی کا ہے کیوں کہ ظاہر ہے کہ فوج تو ان کو اپنی مدد سے اعلیٰ عہدے پر فائز نہیں ہونے دے گی چنانچہ انھوں نے فوجی حکومت کے خلاف ایک بڑی سیاسی تحریک شروع کی ۔ ۱۹۶۹ میں انھوں نے پُرجوش طالب علم لیڈر طارق علی (مصنف : Can Pakistan Survive Penguine Books) سے اپنی پارٹی میں شامل ہونے کی درخواست کرتے ہوئے کہا تھا "تم کچھ بہت زیادہ اصولی ہو ۔ یہ پاکستان ہے اور یہاں ہم اسلام سے صرف نظر نہیں کر سکتے ہیں ۔ ان حرام زادوں (فوج) سے چھٹکارا حاصل کرنے کے صرف دو طریقے ہیں ۔ میرا باپ جی گو مرا کا ۔ یہ یا تو میں ہوں گا یا پھر پہاڑوں میں بندوق بدست بلوچی ۔"

آخر جیسا کہ طارق علی نے اپنی کتاب میں انتہائی معقول طور پر لکھا ہے ، بھٹو اور ان کی حکومت کے طبقاتی کردار نے انھیں ان ہی بلوچیوں سے پہاڑوں کے دروں میں ، مقابلہ آرائی کے لیے دھکیل دیا ۔ علاقائی قومیتوں کو زیادہ خود مختاری دینے سے متعلق اپنے تمام خیالات و نظریات کو یکسر بھلا کر بھٹو صاحب نے ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے ایک مہم کا آغاز کر دیا ۔ سندھ نے بغاوت نہیں کی اس کی وجہ یہ تھی کہ بھٹو صاحب خود ایک سندھی تھے اور یہ علاقہ باوجود اس کے کہ اقتصادی طور پر اسے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا ، ان کی حکومت سے کچھ جذباتی لگاؤ رکھتا تھا ۔ حکومت پنجاب میں رہی اور بھٹو صاحب نے اپنے پورے عہد میں اس بات کا خاص خیال رکھا کہ پنجاب کو اپنی توقع کے مطابق بڑا حصہ ملتا رہے ۔

بلوچیوں کو پاکستان میں زبردستی کھینچ لیا گیا ۔ تقسیم ہند سے پہلے ان کی ایک جاگیردارانہ اسٹیٹ تھی اور وہ ۱۹۴۷ کے بعد اسی طرح رہنا چاہتے تھے ۔ پاکستان نے ۱۹۴۸ میں اس الحاق کو یقینی بنانے کے لیے اپنی فوج بھیجی اور ۱۹۴۹ میں بلوچیوں کے خلاف پہلی فوجی مہم کی قیادت ایوب خاں نے کی ۔ بلوچی لیڈروں کو پھانسیاں دی گئیں ، تحریک اس وقت دب گئی مگر بنگلہ دیش کے واقعہ کے بعد پھر نئی لہریں اٹھنے لگیں ۔ خانہ جنگی کا آغاز ہوا جس میں پاکستان کی چار ڈویژن فوج نے حصہ لیا ۔ اگست اور ستمبر ۱۹۷۴ میں پاکستان کی بری اور فضائی فوجوں نے زبردست زمینی اور ہوائی کارروائی کی

جس نے ایک بار بلوچیوں کو اطاعت پر مجبور کر دیا۔

طارق علی نے اپنی کتاب میں اس کے نتائج کو یوں لکھا ہے "بنگلہ دیش کے زوال کے بعد رسوائی کا منہ دیکھنے والی پاکستانی فوج کو ایک بار پھر ملک کے سیاسی اسٹیج پر قبضہ کرنے کا موقع ملا۔ اس بات کی طرف خصوصی توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی جرنیلوں کی چلائی ہوئی سب سے طویل مہمیں، خود پاکستان کے اندر، بنگالیوں اور بلوچیوں کے خلاف تھیں۔ ایک کا نتیجہ ملک کی تقسیم کی شکل میں نکلا اور دوسری نے ۱۹۷۷ کے بعد کی فوجی ڈکٹیٹرشپ کے لیے راہ ہموار کی ..... بھٹو کے زوال اور غیر فوجی حکومت کے خاتمے کو، ایک بامعنی علاقائی خودمختاری کو ماننے سے، پاکستان پیپلز پارٹی کے انکار سے براہ راست جوڑا جا سکتا ہے۔ بلوچستان میں بھٹو کی من چلی مہم ہر لحاظ سے ناکام تھی اس نے پاکستان کی فضا کو ایسا مسموم کیا کہ ملک آج بھی اس سمیت سے آزاد نہیں ہو پایا اسی نے جولائی ۱۹۷۷ کے فوجی انقلاب کی اساس رکھی۔ جب بھٹو اور ان کے وزیر دفاع جنرل ٹکا خاں نے بلوچیوں کو زیر کرنے کے لیے اپنی فوج کے چار ڈویژن کو احکامات صادر کیے تو دراصل انھوں نے خود اپنے عہد حکومت کے مقدر پر مہر لگا دی" (۱۹۸۳ میں ضیا کے خلاف اپنی مہم میں جب سندھ نے بلوچیوں سے ساتھ آنے کے لیے کہا تو انھوں نے سندھی لیڈر بھٹو کی ۱۹۷۴ کی کارگزاریوں کو یاد کرتے ہوئے صاف انکار کر دیا۔)

پاکستان کا ایک اور پرانا مسئلہ بھٹو صاحب کے لیے درد سر بنا ہوا تھا۔ یہ مسئلہ تھا بیرونی اور خصوصاً امریکی زور اور دباؤ کا۔ فوجی حکومتیں جنھیں اندرون ملک حمایت کا یقین نہیں تھا ہمیشہ بیرونی ملکوں سے آئے ہوئے ہتھیاروں روپے اور سہارے کی بیساکھی کی ضرورت مند تھیں، ۱۹۷۷ میں جب فوج دوبارہ سامنے آئی تو اسے کچھ امریکی ہمت افزائی کی ضرورت پڑی۔ بھٹو اپنے دوست اور ساتھی کرنل قذافی کے ذریعہ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں کچھ موڑ لا رہے تھے۔ واشنگٹن پر ان کے عدم اعتماد کی جڑیں بڑی گہری تھیں ان کا خیال تھا کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں امریکا نے ہندوستان کو بچ کر نکل جانے دیا تھا (بھٹو نے اپنی کتاب "آزادی کا فریب" (The Myth of Independence) کے پانچویں باب "امریکا ہندوستان کی مدد کرتا ہے اور پاکستان سے صرف نظر" اور چھٹے باب "پاکستان کو ہندوستانی اقتدار کے تحت رکھنے کی امریکی پالیسی" میں اس کا ذکر کیا ہے)

دل چسپ بات یہ ہے کہ جنرل ضیاء نے ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایک ممبر سبرامنیم سوامی سے ایک ملاقات میں اس کی تصدیق کی۔ دونوں کی اس ملاقات کا حال ۱۳-۱۹ نومبر ۱۹۸۳ کے "سنڈے" میگزین میں شائع ہوا ہے۔ جنرل ضیا نے سوامی کو بتایا کہ "بھٹو جو کچھ چاہتے تھے اس کو بالکل اسی طرح سمجھ کر امریکا نے ۱۹۷۷ میں پاکستان کو روس کی گود میں تقریباً بٹھا دیا تھا ..... چوں کہ انھیں امریکا سے کچھ حاصل نہیں ہو رہا تھا اس لیے روسیوں سے ایک باقاعدہ

تعارف کرانے کے لیے بھٹو نے معمر قذافی سے درخواست کی۔ انھوں نے قذافی سے کہا کہ روس کے مفادات کی خاطر وہ سب کچھ کرنے پر تیار ہیں۔ قذافی نے مارشل ٹیٹو سے رابطہ قائم کیا جو اس وقت ماسکو جا رہے تھے اور انھیں بھٹو کی اس پیش کش کے بارے میں بتایا اور بھٹو کے حق میں وہاں وکالت کی درخواست کی۔ مارشل ٹیٹو نے بعد کو مجھے بتایا کہ انھوں نے روسیوں سے اس کام کی کوئی قیمت مقرر کرنے کو کہا تھا جو پاکستان ادا کرتا۔ مگر اس سب میں تاخیر بہت ہو گئی اور اقتدار بھٹو کے ہاتھ سے چلا گیا۔" اقتدار ہاتھ سے چلا گیا یا انھیں نکالا گیا، قید کیا گیا اور پھر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ بہر حال یہ اختتام تھا پاکستان کی جمہوریت کے دوسرے اور زیادہ المناک تجربے کا۔



۴

اہلِ ایمان

عوامی تحریک میں مختلف خیال اور مختلف عقاید کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ شدید متضاد نظریات، مفادات اور محرکات کے ساتھ لوگ کسی ایک چیز کی مخالفت میں یکجا ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۷۱ کے پُرفریب انتخابات کے بعد پاکستان میں شروع ہونے والی تحریک کی، ایک طرف پاکستان قومی اتحاد میں شامل مُلّا اور دوسری طرف قومی جمہوری محاذ کے سیکولر افراد نے اور ۱۹۷۱ کے بعد کے غیر فوجی عہد حکومت میں از سرِ نو زندہ ہونے والے بائیں بازو کے لوگوں نے زبردست مدد کی مگر مسٹر بھٹو کو ہٹانے کی تحریک کو تقویت ملی دراصل عوام کی بے مثال شرکت سے جو مصیبتوں اور دشواریوں کے ساتھ ڈکٹیٹر شپ کو برداشت کرنے کے لیے تیار تھے۔ مگر ایک غدار ڈیموکریٹ کی بے ایمانی پر انھیں سخت طیش تھا۔ انتخابات کے اعلان کے فوراً بعد سے مسٹر بھٹو نے اس بات کی مسلسل کوشش شروع کر دی تھی کہ ان کی جیت یقینی رہے۔ ذرائع ترسیل و ابلاغ جو ہمیشہ ہی سے کمزور تھے انھیں پروپگنڈے کا ایک وسیلہ بنا دیا گیا۔ زمینداروں جیسے اقتدار کے دلالوں کو نہایت خاموشی کے ساتھ ملا لیا گیا دوسری طرف مسٹر بھٹو نے عوام کو اپنی چھتے دار تقریروں سے اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کی۔ اپنی کامیابی کے بارے میں پر اعتماد ہونے کے ان کے پاس اسباب تھے۔ مگر انتخابات میں بھٹو صاحب کو اپنی شکست کے سلسلے میں ایک دھڑکا سا ضرور لگا ہوا تھا اور اسی لیے انھوں نے برملا بے ایمانی شروع کر دی۔ مبصرین کا خیال ہے کہ مسٹر بھٹو اگر انتخابات آزادانہ اور ایماندارانہ ہو جانے دیتے تب بھی وہ جیت جاتے۔ شاید ایسا ہی ہوتا۔ مگر پاکستان میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو انتخابات میں اپنے تجربے کے بعد اس بات پر یقین لاتا۔ پاکستانیوں کے غم و غصّے کو مزید بھڑکا دیا اس حقیقت نے کہ مارچ ۱۹۷۷ میں جمہوری ہندوستان نے، مسز اندرا گاندھی کو نہ صرف سریر حکومت سے ہٹایا بلکہ انتہائی پرامن طریقے پر یہ ساری کارروائی کر دی۔ مسز گاندھی نے بھی تو انتخابات کو بے ایمانی سے جیتنے کی کوشش کی اور نہ ہی شکست کے بعد اپنے عہدے پر برقرار رہنے کی۔

جب کبھی کوئی تحریک کسی حکمراں کے خلاف کامیابیوں کی منزل کے قریب پہنچتی ہے تو عموماً ہوتا یہ ہے کہ اس میں شریک لوگوں میں کوئی گروپ جو نسبتاً زیادہ بااثر ہوتا ہے جانے والے حکمرانوں کی جگہ کو پر کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لیتا ہے۔ کچھ وقت تو ان لوگوں کے درمیان جنھوں نے جدوجہد میں شانہ بشانہ شرکت کی تھی باہمی جھگڑوں اور افراتفری کا ہوتا ہے اور پھر سب سے زیادہ طاقتور گروپ کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ دائیں بازو کے افراد تھے اور خصوصاً بنیاد پرست جنھوں نے بھٹو مخالف تحریک میں مرکزی کردار ادا کیا تھا مگر جوں ہی وہ کامیابی کے قریب پہنچے ان کی بنیادی کمزوری بھی بے نقاب ہو گئی ان کو اس بات کا احساس ہوا کہ اگرچہ بھٹو کو ہٹانے کے محدود مقصد کے لیے وہ عوام کو سڑکوں پر لا سکتے تھے مگر ایک نئی حکومت کے قیام کے لیے عوامی حمایت کی جس توانائی کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس نہیں تھی۔ بھٹو مخالف تحریک جب اپنے شباب پر تھی اس وقت بھی ملا عوامی حمایت پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے تو کسی اور موقع پر قبول عام حاصل کرنے کی ان کی صلاحیت سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔

یہ جائزہ یا یہ رائے صرف مصنف ہی کی نہیں ہے، کوئی دوسرا نہیں خود جنرل ضیا نے مئی ۱۹۸۲ کے ایک انٹرویو میں یہ بات بڑی صفائی سے کہی تھی۔ انھوں نے ۱۹۷۷ کے انتخابات کرانے کے وعدہ کو پورا نہیں کیا کیوں کہ دائیں بازو کی پارٹیوں کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ خود جیت نہیں سکتیں اور بھٹو کی قیادت میں پیپلز پارٹی سر پر حکومت پر پھر آ جائے گی۔ جنرل ضیا نے کہا ۔" ۱۹۷۷ میں پیپلز پارٹی جیت گئی ہوتی۔ یہ وہ پارٹی تھی جسے ہم نے نکال باہر کیا تھا۔ پیپلز پارٹی کی مخالف پارٹیوں نے کہا۔" اس سے کیا فائدہ ہے ؟ آپ حکومت بھی ان کے ہاتھ میں دے دیجیے۔ ہم نے اس پہل قدمی کے لیے فوج کو صرف اس لیے مجبور نہیں کیا تھا کہ وہ اس حکومت کو ختم کر دے بلکہ یہ بھی چاہا تھا کہ ایسے اقدامات بھی کیے جائیں جن سے اسلامی قوانین کا نفاذ بھی کیا جا سکے۔ نظام مصطفیٰ قائم ہو اور ایک ایسی حکومت بنے جسے پاکستان کے عوام کا فرمان ملا ہو۔" میں نے کہا تھا کہ اس بات میں تضاد ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی حکومت کو عوام کا فرمان کیا حاصل ہو گا جو انتخابات میں عوام کے سامنے جانے کی ہمت نہیں رکھتی۔ اس کے جواب میں جنرل ضیا نے صرف یہی کہا "ہاں اس میں تضاد ہے۔"

اس گفتگو میں 'مجبور کیا' کا طرز اظہار بھی دلچسپ ہے۔ جنرل ضیا کے قول کے مطابق ملاؤں نے حکومت پر قابض ہونے کے لیے فوج کو "مجبور کیا" وجہ بالکل سیدھی سی ہے۔ کیوں کہ کوئی دوسرا راستہ تھا ہی نہیں جس سے ان کے انتہا پسند نظریات ملک میں قانون بن سکتے۔ کیوں کہ ملا ایک جمہوری نظام میں حکومت کر ہی نہیں سکتے تھے اس لیے انھوں نے فوج کو اپنا آلۂ کار بنایا۔ اس وقت ملاؤں کو بنیاد پرست جنرل مل گئے تھے۔ اس افراتفری کے عالم میں جب بھٹو صاحب بھی پریشان تھے حکومت پر قابض ہونے کا ان کے لیے یہی موقع تھا۔ ان جرنیلوں کے ہاتھ ایک اچھا بہانہ آیا، اللہ کے نام کا۔

۱۹۷۷ء میں جولائی کا مہینہ تھا کہ جنرل ضیا بھٹو کے دفتر میں داخل ہوئے اور ان کو یہ بتا دیا کہ آپ کا وقت ختم ہو چکا ہے۔

جنرل ضیا نے مصنف کو بتایا تھا کہ درحقیقت انھوں نے مسٹر بھٹو کو حکومت پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں پندرہ دن کا نوٹس دے دیا تھا۔ یہ بات اس وقت سامنے آگئی تھی جب میں (مصنف) نے ان سے پوچھا تھا کہ کیا ان کے دماغ میں کبھی بھی یہ بات آئی کہ مسٹر بھٹو کو پھانسی پر لٹکانا غلط تھا۔ جنرل ضیا نے جواب دیا تھا کہ "نہیں نہیں، کبھی نہیں"۔ میں نے پھر سوال کیا کہ انھوں نے ذاتی طور پر اس وقت کیا محسوس کیا جس وقت مسٹر بھٹو کو پھانسی پر لٹکایا جا رہا تھا؟ جنرل ضیا نے ایک بڑا طویل جواب دیا۔ انھوں نے کہا کہ "مجھے اس وقت بھی ایسا ہی محسوس ہوا کہ پھانسی ان کا مقدر بن چکی تھی۔ کیوں کہ انھوں نے نہ جانے کتنے قتل کیے تھے، خود ان کے پانچ سالہ ریکارڈ پر نظر ڈالیے، پیچھے کی طرف دیکھیے۔ غالباً یہ سزا تھی جو خدا کی طرف سے متعین تھی۔ مجھے کوئی تاسف نہیں ہے اور نہ ہی کوئی دوسری بات میرے ذہن میں آتی ہے کیوں کہ ان کی جیسی ذہانت اور صلاحیتوں والا آدمی اور اتنا پڑھا لکھا..... اگر ان میں صرف خلوص ہوتا اور وہ وفادار ہوتے اور جبر اور زیادتیوں میں ملوث نہ ہوتے، اپنے عہد میں انھوں نے انتہائی غیر انسانی حرکتیں نہ کرائی ہوتیں تو انھوں نے ساری زندگی اس ملک پر حکومت کی ہوتی۔ تو پھر وہ کیوں ہٹا دیے گئے؟ کچھ تو ہوگا ہی، کوئی بات تو ہوگی ہی؟ یہ بات تھی ان کی زیادتیاں ان کے ظلم، خود ان کے عہد میں، اور غالباً ان کے علم میں، باعزت لوگوں کی بیٹیاں اٹھوائی گئیں اور ان کے ساتھ زنا کیا گیا۔ لوگوں کے ساتھ بدکاری کی گئی اور یہ صرف سیاسی دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے کیا گیا۔ کیا یہ سب انسانی افعال ہیں؟ ہزاروں باتیں ہیں..... مجھے حیرت ہوئی سچ کہتا ہوں (جب مجھے یہ معلوم ہوا) میں ان کے پاس گیا اور میں نے کہا: "بھٹو صاحب، مہربانی کر کے انتخابات کرا دیجیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ زبردست اکثریت سے جیتیں گے۔" میں ایک دفعہ پھر ان کے پاس گیا اور کہا کہ "وزیراعظم صاحب! یہ ایک تشویش ناک مسئلہ ہے اسے سیاسی طور پر حل کیجیے۔ اس سے پہلے کہ فوج ٹوٹ جائے۔ فوج کے ٹوٹنے کے بعد آپ اسے حل نہ کر سکیں گے۔" اور ۳۰ جون ۱۹۷۷ء کو میں ان کے پاس پھر گیا۔ اکیلا گیا اور میں نے ان سے کہا۔ "سر! چار سو موتیں ہو چکی ہیں، میں اس لحاظ سے ایک آتش فشاں پر کھڑا ہوں کہ اگر فوج میں رخنے پڑنے لگے تو ہم کچھ نہ کر پائیں گے۔ اگر آپ مسئلے کو حل نہیں کرتے ہیں تو پھر مجھے فوجی فیصلہ لینا ہوگا..... "بھٹو صاحب کا ردعمل تھا "برائے مہربانی مجھے کچھ اور وقت دیجیے۔ براہ کرم کوئی کارروائی جلدی میں نہ کیجیے" میں نے کہا "میں آپ کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتا ہوں، لیکن اگر مجھے رہنا ہے تو میں عوام کو اب اور منہ نہیں دکھا سکتا۔ آپ کو اس مسئلہ کو سیاسی طور پر حل کرنا ہے نہیں تو پھر میں فیصلہ لینے پر مجبور ہوں گا۔" میں نے جنرل ضیا سے کہا کہ وہ شاید دنیا میں واحد ایسے شخص ہوں گے جس نے حکومت پر قبضہ کرنے کا پہلے سے نوٹس دیا ہو۔ اس کے جواب

میں جنرل ضیا نے کہا "پندرہ دن" اور یہ بات ریکارڈ میں موجود ہے اور یقیناً یہ صرف میں تھا اور وہ تھے۔ صرف میری اور ان کی گفتگو تھی مگر یہی حقیقت تھی۔

ان پندرہ دنوں میں کیا کچھ ہوا اور وہ کون سے رخنے تھے جن کا ذکر جنرل ضیا نے کیا تھا؟ جنرل ضیا یقیناً اس بحث کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو اس وقت فوجوں میں چل رہی تھی اور موضوع تھا کہ حکومت کا تختہ پلٹا جائے یا نہیں اور اگر پلٹا جائے تو اس کی تاویل کیا ہو گی؟۔ آخر میں بنیاد پرست جنرل کی فتح ہوئی اور بھٹو صاحب کو اپنی جان کی قیمت دینی پڑی۔ جنرل اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں اور غالباً یہی وجہ تھی جو وہ اتنے دن چل گئے۔

جنرل ضیا دائیں ہاتھ میں بندوق اور بائیں میں جمہوریت کی بحالی کے وعدوں سے پُر ایک تقریر لے کر سامنے آئے اور چند ہی دنوں میں، بائیں ہاتھ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ دایاں ہاتھ کیا کر رہا ہے۔ انتخابات کی اجازت دے دی جائے گی مگر صرف اس وقت جب پاکستان پیپلز پارٹی کو راستے سے بالکل ہٹا دیا جائے گا۔ جنرل ضیا نے اس سلسلے میں مصنف کو بتایا کہ "جی ہاں اس کے بارے میں کوئی شبہہ نہیں ہے" میں نے کہا کہ "انتخابات تو ایک ذریعہ ہیں، بذات خود کوئی مقصد نہیں" انجام تو بہر حال پاکستان میں نظام مصطفیٰ اور ایک خالص مذہبیت کا قیام تھا لیکن یہ سوچنا ایک حماقت ہو گی کہ ایک ایسے پاکستان کو جسے فوج کے جنرل چلا رہے تھے محض اسلام کے نام پر بچایا جا سکتا تھا۔ ایوب خاں کے عہد کے بعد، مشرقی پاکستان نے جمہوریت کی بازیافت کو اپنی بہت سی مایوسیوں اور ناامیدیوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اگرچہ اندازے کی غلطی کی بنا پر تھی، مگر جنرل یحییٰ خاں کی اپنے ملک کے لیے واحد دین یہ تھی کہ انھوں نے جہاں تک پاکستانیوں کے حافظے اور تجربے کی بات ہے واحد حقیقی انتخابات کرا دیے۔ ۱۹۷۰ء کے ان انتخابات نے یہ بات ظاہر کر دی کہ ۱۹۴۷ کا ورثہ اب ختم ہو چکا ہے۔



۵

کیا موسم سازگار ہو رہا ہے

اگر ڈکٹیٹر شپ میں، عوامی جذبات کو سمجھنے اور ان کے مطابق عمل کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائے تو وہ بہت دن ڈکٹیٹر شپ نہیں رہ سکتی۔ دوسرا راستہ اس کے سامنے صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ جبر و ظلم کے ذریعہ جب تک ہو سکے حالات پر قابو رکھے۔ ۱۹۸۳ کے آخری چوتھائی زمانے میں جنرل ضیا نے یہی کیا۔

انھوں نے جب پہلی بار حکومت سنبھالی، انھیں لوگ ایک وقتی اہمیت کا حامل، اتفاقی طور پر اقتدار حاصل کرنے والا اور ایک ایسا شخص سمجھ کر مسترد کر دیتے تھے جو ۱۹۷۷ کے انتخابات سے پیدا ہونے والے جذبات و نظریات کی لہر کے سامنے بہت دن تک نہیں ٹک سکے گا۔ مگر وہ چل گئے اور اس وجہ سے کہ وہ پاکستان کو ملنے والے پہلے حاکم تھے جو نہ صرف یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کیوں بنا اور اسے کس نے بنایا بلکہ انھیں اس حقیقت پر کوئی شرمندگی بھی نہیں تھی انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ملک عوام کے نام پر نہیں بلکہ ایمان کے نام پر بنا ہے اور اس لیے اگر ملک کو زندہ رہنا ہے تو وہ ایمان کی منطق کے سہارے ہی زندہ رہ سکتا ہے نہ کہ عوامی خواہش اور ارادے کی منطق کی مدد سے۔ جمہوریت اور پاکستان کا قیام دو متضاد چیزیں تھیں اور اس لیے جمہوریت کو پنپنے کے لیے ذرا سی بھی ڈھیل دینا افراتفری پھیلا سکتا تھا اور آخر میں، اس بنیادی نظریے ہی کو چیلنج کر سکتا تھا جس نے ۱۹۴۷ میں پاکستان کو جنم دیا تھا۔ جنرل ضیا نے مصنف کو بتایا تھا کہ "پاکستان کے قیام سے قبل، جب اس کا محض ایک تصور تھا، یہ بات مان لی گئی تھی کہ پاکستان میں تمام مسلمانوں کو جگہ نہ دی جا سکے گی۔ اگرچہ اس کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوں گے۔ ایک بڑی اقلیت کو ہندوستان میں ہی چھوڑنا پڑے گا اور توقع یہ تھی کہ یہ لوگ ہندوستان میں اسلامی عقائد رکھنے والے ہندوستانی باشندوں کی طرح پھلیں بڑھیں گے۔ بنگلہ دیش بہر حال ایک مختلف حالات کی پیداوار ہے اگرچہ یہاں بھی ہندوؤں کی ایک اچھی خاصی اقلیت ہے اور جس کی وجہ سے یہ سوال یہاں اتنی وضاحت کے ساتھ طے نہیں ہوا جتنا کہ پاکستان میں۔ اگر یہ ملک اسلام کے نام پر قائم کیا گیا اور اگر کسی لمحے بھی یہ خیال ذہنوں سے نکلا تو پھر بچا کیا۔ آپ ایک نظریاتی

ریاست سے نظریئے کو نکال لیجیے تو کچھ بھی نہیں بچے گا۔ اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان نے ایک رکاوٹ کے بعد دوسری رکاوٹ کا سامنا کیا۔ مگر اس کی شخصیت کی شناخت ہی قائم نہیں ہوئی۔ بنیادی فلسفہ دھندلا گیا تھا اور عوام تاریکی میں ہاتھ پاؤں مارنے لگے تھے یہ چاہے ۱۹۵۶ کا آئین ہو یا ۱۹۶۳ کا دستور، مارشل لا ہو یا مارشل لا نہ ہو، پیپلز پارٹی ہو، شلسٹ نظام اور پھر مارشل لا اسی سبب سے ہماری قسمت خراب رہی، آپ کے سامنے آپ کی منزل واضح تھی آپ اس کے لیے چل کھڑے ہوئے یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان اچھی طرح مستحکم ہے اور ہم تاریکیوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔"

یہ بڑا خوب صورت تجزیہ ہے غلطی صرف ایک مرکزی حقیقت کے سلسلے میں ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ عوام جمہوریت چاہتے ہیں نہ کہ ایک نظریاتی ریاست جو ان کی زندگیوں کی توجیہ و تعریف، ملّاؤں اور ان کی نئی حلیف فوج کے خیال کے مطابق کرے گی۔ عوام یہ نہیں مانتے کہ ایک اچھا مسلمان ہونے کے لیے آپ کو ملاؤں کے بنجر ذہنوں کی پیروی کرنا ضروری ہے۔ عوام یہ بھی نہیں سمجھتے کہ 'ہندو' انڈیا سے مسلسل نبرد آزمائی ان کے وجود کے لیے کوئی شرط ہے اس کے برعکس انھیں اپنے پڑوسی کے وسیع و عریض علاقوں میں جمہوریت اور آزادی کی تازہ ہوا پر رشک آتا ہے اور وہ بھی اپنے یہاں ایسی ہی خوش گوار فضا چاہتے ہیں جو انھیں بھی آزادی کی مسرتوں سے ہم کنار کر دے۔ چنانچہ بااثر طبقے اور عوام کی باہمی کش مکش متعدد اور بسا اوقات مسخ شکلیں اختیار کرے گی۔ ایک طرف اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے بااثر طبقہ ان پالیسیوں کی طرف بڑھے گا، جو وقتی طور پر ملک کے اندر عدم توازن پیدا کریں گی اور داخلی نوآبادیاتی رجحان ناقابل برداشت ہونے کی وجہ سے بالآخر ملک کی شکست و ریخت ہو جائے گی۔ اسرائیل ایک دوسرا اہم مذہبی ملک ہے مگر وہاں انتخابات کرائے جا سکتے ہیں اس لیے کہ وہاں کی اکثریت کی عقاید سے وابستگی صدیوں کے ان مصائب کا نتیجہ ہے جو عیسائی جرمنی کے ہاتھوں کیے گئے قتل عام پر ختم ہوئے تھے۔ ایسی کسی ترغیب یا ایسے کسی محرک کا وجود پاکستان میں نہیں ہے۔ اس کی سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ برصغیر میں جو یورپ سے بھی بڑا ہے، اسلام نے بہت سے مد و جزر دیکھے مگر اسے ناپید ہونے کا خطرہ کبھی لاحق نہیں ہوا۔ نہ تو تقسیم سے پہلے اور نہ تقسیم کے بعد۔ ذاتی عقاید سے وفاداری اور مذہبی ریاست سے وفاداری ایک ہی بات نہیں ہے۔ پہلی کا وجود دوسری کے بغیر بھی ممکن ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت اس کا ثبوت ہے۔ المیہ یہ ہے کہ "اسلام خطرے میں ہے" کا نعرہ، سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو سلب کر لینے کا بڑا آسان اور موثر ہتھیار ہے۔

عوام کے حقیقی تعاون کو حاصل کرنے میں ناکام رہنے کی وجہ سے موجودہ فوج اور ملّا نے وہی حکمت عملی اپنائی جو ایوب خاں کی فوج اور نوکر شاہی راج نے اپنائی تھی اور ناکام رہا تھا یعنی پنجاب کو ایک مستحکم قلعہ بنا دو جس کی ایک خود مختار فوج ہو اور جہاں سے آپ سارے ملک پر حکومت کر سکتے ہوں۔ پاکستان، ہندوستانی مسلمانوں کا پہلا ملک نہیں بنا بلکہ وہ

پنجابی مسلمانوں کی پہلی سلطنت بن گیا۔ یہ بات ۱۹۸۳ کی بغاوت کے زمانے میں جس وضاحت سے سامنے آئی اس سے زیادہ، پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔

۱۹۸۳ میں یوم پاکستان کے موقع پر، تحریک برائے بحالی جمہوریت (ایم۔ آر۔ ڈی) نے فوجیوں کو ان انتخابات کو کرانے پر مجبور کرنے کے لیے، جس کا وعدہ وہ اس وقت سے کر رہے تھے جب سے وہ برسر اقتدار آئے تھے ایک اور جدوجہد کا آغاز کیا۔ یہ تحریک ٹال مٹول اور جھوٹے وعدوں کے چھ سے زیادہ برسوں کو ختم کرنے کی ایک دلیرانہ کوشش تھی۔ رائٹر کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۴ اگست کو ایک سرکاری دفتر پر دو بم پھینکے گئے، جس میں ایک آدمی شدید طور پر زخمی ہوا۔ کچھ ہی دنوں کے اندر سارا سندھ آگ کی لپیٹ میں آگیا۔ نواحی علاقوں کے دیہاتی لوگوں نے فوجی اقتدار کی ہر اُس علامت سے جو انھیں نظر آئی نبرد آزمائی اور بسا اوقات تشدد کے ساتھ نبرد آزمائی شروع کردی۔ پولیس والوں کو چیر پھاڑ دیا گیا، فوجوں پر حملے کیے گئے۔ نفرت کے ایک علامتی اظہار کے طور پر کتّوں کے جسموں پر ضیا کا نام لکھ کر چھوڑا گیا۔ عوام کی نفرت کا یہ ایک بے ساختہ اور ولولہ انگیز اظہار تھا مگر آخر میں یہ ناکام ہوا کیوں کہ یہ صرف سندھ تک محدود رہا۔ پنجاب نے تحریک میں کوئی خاص حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ کرسچین سائنس مانیٹر کی دلی میں مقیم نامہ نگار میری این ویور نے سندھ کی صورت حال سے متعلق اپنی رپورٹوں میں ایم آر ڈی کے جنرل سکریٹری اقبال حیدر کے قول کو لکھا ہے: "مستقبل کو سامنے رکھیے، تو اگر پنجاب ساتھ نہیں آتا ہے تو یہ بات پاکستان کے مستقبل کے لیے اور بھی نقصان دہ ہوگی...... صوبوں کی تھوڑی بہت خود مختاری پر مبنی جمہوریت ہی اس ملک کو متحد رکھ سکتی ہے۔" یہاں پر خود مختار جمہوریت پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ یہ خیال تھا جو کانگریس نے مسلم لیگ کے پاکستان کے مقابلے میں پیش کیا تھا۔

پنجاب کے اس رویّے نے عظیم اور معمر بزرگ جی ایم سیّد کو جو ایک الگ سندھو دیش کا مطالبہ کرنے کی پاداش میں پچھلے بیس سال سے اپنے گاؤں سان میں گھر میں قید ہیں، مایوس کرنے کے بعد خوش کر دیا کیوں کہ اس بات نے ان کے اس خیال کی تصدیق کردی کہ لیاقت پوتی سے وجود میں لائے ہوئے پاکستان کے لیے اگر یہی نظام قائم رہا تو بکھرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوگا۔ اسّی سالہ بزرگ نے جنھوں نے دنیا دیکھی ہے، میری این ویور کو بتایا کہ "اب مصالحت کی کوئی گنجایش نہیں ہے...... سندھ کو ایک خود مختار ریاست بن جانا چاہیے۔" انھوں نے اعداد و شمار کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ وہ کیوں سمجھتے ہیں کہ سندھ کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔ "مسلح افواج کا صرف دو فی صد حصہ سندھی ہے۔ وفاقی شہری ملازمتوں میں صرف پانچ فی صدی سندھی ہیں اس وقت صوبہ میں تقریباً دو ہزار صنعتی یونٹ چل رہے ہیں ان میں صرف پانچ سو سندھیوں کے ہاتھ میں ہیں۔"

جنرل ضیا نے دو حربے جو بہت آسانی سے دستیاب تھے استعمال کیے۔ ایک جبر و تشدد کا اور دوسرا اس خوف کی تبلیغ کا کہ "ہندو، انڈیا ایک بار پھر "اسلامی" پاکستان کو تباہ کر رہا ہے۔ مسز اندرا گاندھی کا ایک بڑا نرم سا بیان جو انھوں نے ہر جگہ پر، بشمول، پاکستان، اصولی طور پر جمہوریت کی حمایت میں دیا تھا اسے اس بات کا ثبوت بنا دیا گیا کہ وہ سندھ میں وہی کرنا چاہتی ہیں جو انھوں نے بنگلہ دیش میں کیا اور وہی اس سب کے پیچھے تھیں۔ مگر یہ ایک بڑی فرسودہ دلیل تھی۔ سندھیوں نے اسے یا تو قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھا یا پھر اس خیال کو خوش آمدید کہا، میری این ویور نے اس بیان کے بارے میں جی ایم سید کے ردعمل سے متعلق لکھا تھا "انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ سندھ کو ہندوستان کا حصہ بننے کو ترجیح دیں گے۔" انھوں نے اس بات پر اپنی مسرت کا برملا اظہار کیا کہ مسز اندرا گاندھی نے موجودہ احتجاج کی صاف صاف حمایت کی ہے اور یہ کہ پاکستان کے عوام اپنے سیاسی حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ شاید اسے شدت پسند سندھی ردعمل قرار دیا جائے مگر پاکستان پیپلز پارٹی کے لیڈر غلام مصطفیٰ کھر نے اخبار نویسوں کو بتایا تھا "کوئی محب وطن پاکستانی کسی دوسرے ملک کی مداخلت کو برداشت نہیں کرے گا...... مگر درحقیقت ان کے (مسز گاندھی کے) بیان کو اپنے جمہوری حقوق کے لیے لڑنے والے پاکستانی عوام نے خوش آمدید کہا ہے۔ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے عوام کے درمیان ایک نیا اور ہم آہنگ رشتہ استوار ہوگا۔ انشاءاللہ....."

بھٹو نے عوام کی حمایت، اپنے وطن سندھ میں حاصل کر لی تھی اور پنجاب میں بھی۔ لیکن ان کی بیٹی بے نظیر اس وقت اپنے باپ سے زیادہ تلخ نظر آئیں جب انھیں ۱۹۸۴ میں پاکستان سے نکلے جانے کے بعد دنیا سے بات کرنے کا موقع ملا۔ طارق علی سے جو اس وقت کلکتے کے روزنامہ ٹیلی گراف کے لیے لکھ رہے تھے گفتگو کرتے ہوئے (۱۵ جنوری ۱۹۸۴) انھوں نے کہا "ہمارے عوام کی خصوصاً سندھ میں حالت بڑی ابتر ہے۔ میری حالت تو ان مردوں اور عورتوں کے مقابلے میں کچھ بھی خراب نہیں ہے جنھوں نے اس ڈکٹیٹر شپ میں بھگتا ہے...... میں اپنی آزادی پر خوش ہوں مگر اس بات پر غمگین کہ میں اپنے ملک میں آزاد نہیں ہو سکی۔"

انڈیا ٹوڈے (فروری ۱۹۸۴) کے نامہ نگار رمیش چندر سے اپنی ایک طویل ملاقات میں بے نظیر نے کہا کہ سندھ میں فوج کی زیادتیوں کے الزامات بڑے پیمانے پر عام ہیں، میں چوں کہ حراست میں تھی اس لیے ان ذرائع تک میری پہنچ نہیں ہو سکی، مگر پھر بھی، بڑی عجیب و غریب کہانیاں مشہور ہیں، فصلوں کے جلانے کی، گنے کے کھیتوں میں لاشوں کے ملنے کی، مردوں، عورتوں اور بچوں کو مشین گنوں سے بھون ڈالنے کی۔ ہمارے ایک آدمی نے جو بنگلہ دیش میں کام کر چکا تھا مجھے بتایا کہ صورت حال بنگلہ دیش سے بھی زیادہ خراب تھی۔ زبردست فوجی طاقت استعمال کی گئی ہے........

فوج کو عوام کے غصے کی شدت کا احساس نہیں ہے۔ سارا دیہی سندھ انقلابی بن چکا ہے۔"

اس سوال کے جواب میں کہ کیا ضیا صاحب کا ملک کو اسلامی بنانے کا عزم پورا ہو رہا ہے؟ بے نظیر نے جواب دیا کہ "کہاں کا اسلامی بنانا؟ اگر کوئی کہتا ہے کہ موسم سرما ہے تو آپ اس کے الفاظ پر نہیں جاتے۔ کیا لوگ اوور کوٹ پہننے لگے ہیں؟ کیا درختوں نے اپنی پتیاں گرا دی ہیں؟ کیا موسم سرد ہو رہا ہے؟"

۱۹۴۷ میں جناح صاحب نے اپنا کرم خوردہ پاکستان حاصل کیا۔ ۱۹۷۱ میں مجیب نے اس میں سے نصف لے لیا۔ جو کچھ بچا وہ ایک کانپتا کپکپاتا ہوا ملک، اور ایسا لگتا ہے کہ ایک اور زلزلے کے ابتدائی جھٹکے محسوس ہو رہے ہیں۔

مگر ساری روایتی ذہانت کے مطابق، یہ ہندوستان تھا پاکستان نہیں جس کے مقدر میں اپنی آزادی کی چوتھی دہائی میں بکھرنا لکھا تھا۔ درحقیقت، ۱۹۴۷ میں، مدراس میں، ایک باقاعدہ، طاقتور اور بڑھتی ہوئی علیحدگی پسند سیاسی پارٹی موجود تھی جس نے منبر پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ وہ خودمختاری چاہتی ہے۔ مگر ہوا کیا؟ ۱۹۸۵ تک ہندوستان متحد رہا۔



(۶)

گاندھی جی کی آتما کا مسکن

آزادی کے دن (۱۹۴۷) پاکستان، ایک بڑی سرمستی اور سرخوشی کی کیفیت میں تھا۔ ناقابلِ بیان دکھوں اور مصائب کے مارے قافلے برِصغیر میں خون آشام راہوں پر اب بھی محوِ سفر تھے لیکن کم از کم مسلمانوں کے لیے اطمینان و سکون کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ بہرحال ایک ایسی سرزمین کی طرف جا رہے ہیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا اور ایک ایسے ملک میں جا رہے ہیں جو اس خوف و دھشت سے پاک ہو چکا ہے جس کا وہ پچھلے چند مہینے میں شکار رہے ہیں۔ دوسری طرف ہندوستان کی طرف آنے والے ہندوؤں اور سکھوں کو نفرت و تعصب سے ایسے نفسیاتی سکون کو حاصل کرنے کا موقع نہیں تھا۔ موہن داس کرم چند گاندھی کا اصرار تھا کہ ان سب کو ان لوگوں کے ساتھ امن اور دوستی کے ساتھ رہنا سیکھنا چاہیے جنھوں نے مذہب کے نام پر ان کے بچوں کو مارا تھا اور عورتوں کو بے عزت کیا تھا۔ گاندھی کے پیروؤں نے، راجندر پرشاد، جواہر لال نہرو، ولبھ بھائی پٹیل اور ابوالکلام آزاد نے اپنے اپنے ذاتی تعصبات سے قطعِ نظر گاندھی کے اس پیغام کو اپنے سینوں سے لگایا کہ ہندو اور مسلمان مل کر رہ سکتے ہیں اور اسے ایک دستاویز آئینِ ہند میں جسے ملک کے دل کی دھڑکن بننا تھا محفوظ کر دیا۔ ہندوستان ایک ہندو ریاست نہیں ہو گا۔

ہندوستان کی سڑکوں پر خوشی اور مسرت کا رقص ہو رہا تھا جب جواہر لال نہرو نے پہلے کبھی کی لکھی ہوئی چند سطروں کی محض یادداشت کے سہارے پر مگر حقیقتاً ایک طویل خواب سے جاگتے ہوئے ایک بڑا انوکھا سا وعدہ کیا تھا۔" ایک مدت ہوئی جب ہم نے اپنے مقدر سے ایک عہد کیا تھا اور آج وہ وقت آ گیا کہ ہم اپنے عہد کا اعادہ کریں اور صرف اعادہ ہی نہیں ایک عزم کے ساتھ اعادہ..... ٹھیک آدھی رات کو جب ساری دنیا سوتی ہے ہندوستان آنکھ کھولے گا زندگی اور آزادی کی فضا میں۔ ایک لمحہ آتا ہے، اور تاریخ میں شاذ و نادر ہی آتا ہے جب ہم قدیم سے جدید میں قدم رکھتے ہیں، جب ایک عہد ختم ہوتا ہے اور مدتوں سے دبائی گئی قوم کی روح کو قوت گویائی ملتی ہے..... ہمیں آزاد

ہندوستان کا ایک ایسا پرشکوہ ایوان تعمیر کرنا ہے جس میں اس کے تمام سپوت رہ سکیں گے۔"

یوم آزادی کے اس موقع پر اپنے غموں کو چھپانا انتہائی مشکل تھا جیسا کہ مسرت اور خوشی کو کیوں کہ یہ آزادی وہ آزادی نہیں تھی جس کا انھوں نے خواب دیکھا تھا۔ یہ آزادی تھی، جو تقسیم اور نفرت کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی اور تاریخ کی سب سے زیادہ بھیانک سول وار کے ہیجان کے درمیان بربریت کی ایک ایسی جنگ میں الجھی ہوئی تھی جس کی آگ فرقہ پرستوں نے لگائی تھی اور جسے ختم ہوتے ہوتے پانچ لاکھ افراد کی جانیں لینا تھیں، وہ آگ آج بھی نہیں بجھی ہے اور اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنا سارا وقت اسی راکھ کو کرید کرید کر بھڑکانے میں لگے رہتے ہیں۔ اس آزادی کے پیچھے جو المیہ ہے اس کی علامت گاندھی سے بہتر کون ہو سکتا ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو گاندھی جی اس وقت کی مسرت اور شادمانی میں شریک نہیں ہوئے، کیوں کہ ان کے پاس جشن منانے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ اس وقت کلکتے میں حیدری ہاؤس ۱۵۱ بیلیا گھاٹ میں تھے اور اپنی زندگی کا آخری معجزہ دکھا رہے تھے۔ جس وقت نہرو نے نصف شب ہوتے ہی آزادی کا اعلان کیا تھا، مہاتما گاندھی ایک مسلمان کے لٹے ہوئے گھر کے ایک کمرے میں چٹائی پر لیٹے سو رہے تھے۔ اسی کمرے میں ان کے چند پیرو بھی ساتھ تھے، ان کے پاس ہی مقدس گیتا کا ایک نسخہ، ان کی لوہے کی فریم کی عینک اور مصنوعی دانت رکھے ہوئے تھے۔ پچھلی شام انھوں نے اپنے ایک دوست سے پوچھا تھا "کیا میں نے ملک کو بھٹکا دیا ہے؟" اس رات وہ خلاف معمول دو بجے یعنی ایک گھنٹہ پہلے ہی بیدار ہو گئے اور حسب معمول اپنے دن کا آغاز عبادت اور مقدس گیتا کے پاٹھ سے کیا۔ یہ دن قوم کے باپ کے لیے غم کا دن تھا۔

وہ دلّی کی طرح چہل پہل میں شرکت کرنے کی بجائے کلکتے میں بیٹھے ہوئے تھے کیوں کہ انھوں نے خود اپنے آپ سے ایک عہد کر رکھا تھا کہ وہ کلکتہ جیسے ہنگامہ خیز شہر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تباہی و بربادی نہ ہونے دیں گے اگر کلکتہ اس دن عرصہ کارزار بن گیا ہوتا تو تباہی اور بربریت نے پنجاب کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہوتا۔ گاندھی جی نے کلکتے کو پرامن رکھا۔ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے کہا کہ اگر انھوں نے ایک دوسرے کے قتل سے ہاتھ نہ روکا تو وہ مرن برت رکھ لیں گے۔ یہ ایمان اور اعتماد کا ایک ناقابل یقین مظہر تھا کہ سارے کلکتے نے عزم و ہمت اور امن و شانتی کے اس پیغامبر کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ وہی کلکتہ تھا جس نے ایک سال قبل ۱۹۴۶ میں ایک بھیانک قومی تباہی کا منظر کیا تھا، اس وقت پرسکون رہا جب کہ سارا شمالی ہندوستان قتل عام میں مصروف تھا۔ یہ بڑی تلخ گھڑیاں تھیں اس فرد کے لیے جس نے برصغیر کو اس کی آزادی کا تحفہ دیا تھا۔ اگلے دن کا سب سے مقدس لمحہ، یعنی اس کی عبادت اور پرارتھنا کی

میٹنگ میں گڑبڑ کرنے کے واقعات بڑھتے جارہے تھے۔ یہ گڑبڑ ان ہندوؤں کی طرف سے ہوتی تھی جو اس بات پر خفا تھے کہ گاندھی جی آج بھی، ان میٹنگوں میں قرآن کی تلاوت کراتے ہیں۔ گاندھی جی کے قدم ڈگمگائے نہیں۔ افراتفری کے اس دور دورے میں ان کی بصیرت برقرار رہی۔ وہ جنوری ۱۹۴۸ء میں پاکستان جانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ وہ فرقہ پرستی کی سرحدوں کو پیدل پار کرنا چاہتے تھے۔ ۳۰ جنوری کو انھیں اس کام سے روک دیا گیا۔ انھیں روکا کسی حکومت نے نہیں بلکہ ایک فرقہ پرست ہندو برہمن، ناتھورام گوڈسے کی گولیوں نے یہ کام انجام دیا، شام کے پانچ بج کر سترہ منٹ پر۔ اس وقت ہر شخص کی زبان پر یہ سوال تھا، یہ کس نے کیا؟ ہر شخص جانتا تھا کہ اگر قاتل کوئی مسلمان نکلا تو اس کا نتیجہ ملک کی تباہی وبربادی کی شکل میں سامنے آئے گا۔ آل انڈیا ریڈیو نے ہندوستان کے معزز ترین شہری کی موت کی خبر ملنے پر اپنی نشریات کو روکا نہیں۔ اس کے مقررہ پروگرام بدستور چلتے رہے۔ بہرحال، پولیس نے قاتل کی شناخت کرکے حکومت کے اعصاب پر سے دباؤ کو کم کیا۔ چھ بجے آل انڈیا ریڈیو نے بالآخر ایک پیغام نشر کیا، پیغام کا ایک ایک حرف بڑی احتیاط سے چنا گیا تھا: "پانچ بج کر بیس منٹ پر نئی دہلی میں، مہاتما گاندھی کو قتل کر دیا گیا۔ قاتل ایک ہندو تھا۔" گاندھی جی کی موت نے ملک میں فرقہ پرستی کے پاگل پن کو پس پشت ڈال دیا۔ اس وقت کے سب سے بڑے مسئلے کو ان کی قربانی نے حل کر دیا تھا مگر مسائل تو اور بھی تھے۔ تمام وہ امکانی کشمکشیں جو پاکستان میں تھیں، وہ ہندوستان میں بھی موجود تھیں، اور وہاں سے زیادہ گمبھیر شکل میں۔ زبان، نسل، علاقائیت، افلاس، سات کروڑ اچھوت، چار کروڑ مسلمان پناہ گزیں، قبائلی، راجے مہاراجے جو اپنے جاگیردارانہ اقتدار کو محفوظ رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ تناؤ اور بے یقینی کے پہلے دو سال دہلی میں حکومت کے لیے مشکل ترین سال تھے۔ کئی برس گزرنے کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے دو ادیبوں Larry Collins اور Dominique la Pierre کو بتایا تھا کہ ایک وقت ایسا آیا تھا جب پنڈت نہرو نے درحقیقت ان سے کہا تھا کہ وہ آزاد ہندوستان کے نظم ونسق کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ یہ بات یقیناً متنازعہ فیہ ہے کیوں کہ یہ بات فرد کی، یادداشت پر عمر کے اثرات کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے۔ مگر اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان ابتدائی دنوں میں بے بسی کا ایک عنصر ضرور موجود تھا۔ جمہوریت پر عمل درآمد کو ملتوی کرنے کے لیے کوئی بہانہ بھی استعمال کیا جا سکتا تھا کیوں کہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ جمہوریت اور آزادی نے کن قوتوں کی بیڑیاں کاٹی ہیں۔ کیا فرقہ پرستی کے فسادات پھر شروع ہو جائیں گے؟ کیا لسانی ریاستوں کا مطالبہ انتخابات کے زمانے میں تشدد اختیار کرے گا؟ کیا ۱۹۴۶ کی طرح علیحدگی پسندوں کو عوامی رائے عامہ کی مدد سے ایک بار پھر نیا جواز مل جائے گا۔ کیا فرقہ پرستوں کی جیت ہوگی؟ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا آسان ہے کہ پنڈت نہرو کو اس بات کا یقین تھا کہ کانگریس زبردست فتح حاصل کرے گی، مگر انتخابات سے

پہلے یہ بات یقینا کسی طرح بھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ پنڈت نہرو کو خطرہ صرف کٹر اور علیحدگی پسند قوتوں ہی سے نہیں تھا بلکہ کانگریس کی جدوجہد آزادی کے بہت سے باصلاحیت لیڈر، جن پر گاندھی جی کو بھی اعتماد تھا، کانگریس کو چھوڑ کر، سوشلسٹ پارٹی کرشک مزدور پرجا پارٹی، شیڈ، پیزانٹس، اور کرزاینڈ ٹینینٹس پارٹی وغیرہ بنا چکے تھے۔ سوشلسٹ خصوصاً اپنے انقلابی نعروں، پرجوش عقائد، اور توانا قیادت کی وجہ سے اس بات کا یقین کر چکے تھے کہ وہ آزاد ہندوستان میں ہونے والے ان پہلے انتخابات میں یقیناً کامیابی حاصل کریں گے۔ مگر پنڈت نہرو اور کانگریس پارٹی نے جمہوریت کی راہ کو روکنے اور انتخابات کو ملتوی کرنے کے لیے کوئی بہانہ استعمال نہیں کیا۔ یہ اس اعتماد کا مظاہرہ تھا جس نے ہندوستان کو بچا لیا۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ تک، پاکستان میں لیاقت علی خاں، اپنے بنیادی اصولوں کی تلاش و تدوین میں الجھے ہوئے تھے، ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی اپنا کام مکمل کر چکی تھی اور ہندوستان ایک سیکولر جمہوریہ بن چکا تھا۔ اس تاریخ کا انتخاب اس لیے ہوا کہ ۱۹۳۰ کی یہی تاریخ تھی جب کانگریس نے ملک کو آزاد کرنے کا اپنا پہلا عہد کیا تھا۔ نئی جمہوریہ ہند کے جن پہلے تین فوجی افسروں کو صدر جمہوریہ ہند نے اعزازات بخشے ان میں ایک مسلمان بریگیڈیر عثمان بھی تھے جو کشمیر کی ۱۹۴۸ کی جنگ میں پاکستانیوں کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے تھے۔ انھیں فوج کا ایک اعلیٰ اعزاز "مہاویر چکر" بھی دیا گیا تھا دوسرے افسران جنھیں اعزاز ملا تھا وہ تھے لفٹیننٹ کرنل رنجیت لال اور میجر سومناتھ شرما۔ قومی ترانہ بھی ملک کو اسی دن ملا تھا۔ جن گن من کی پیانو پر دھن مشہور و معروف موسیقار ہربرٹ میورل نے تیار کی تھی۔

پہلے عام انتخابات جو تبت سے لگے ہوئے دور افتادہ گاؤں اور کلکتے کی گنجان بستیوں تک میں ہوئے تھے تقریباً چھ مہینے تک چلتے رہے۔ اکتوبر ۱۹۵۱ کی ۲۵ تاریخ تھی جب ہماچل پردیش کے پہاڑوں میں چینی اور چگل کے دور افتادہ گاؤں میں ہندوستان کے ۱۷۵ ملین میں سے پہلے ووٹروں نے اپنا اپنا ووٹ ڈالا تھا۔ پنڈت نہرو نے وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف ۱۳ مئی ۱۹۵۲ کو اٹھایا تھا۔

انتخابات اتنے ہی ہندوستانی تھے جتنا کہ ہندوستان، ہندوستانی ہو سکتا تھا۔ جو واقعات نیچے بیان کیے گئے ہیں وہ اس واحد مطالعے سے لیے گئے ہیں جو ۱۹۵۲ کے ان انتخابات کے بارے میں انڈین جنرل الیکشن ۵۲-۱۹۵۱ کے عنوان سے تعلیم کے میدان میں کچھ کام کرنے والوں نے کیا تھا۔ (مولفین، ایس وی گوئیکار اور رچرڈ ایل پارک۔ پاپولر بک ڈپو ۱۹۵۶) سلسلے کے آغاز کے لیے اس سے بہتر کیا ہوگا کہ اسے ان باتوں سے شروع کیا جائے جو ووٹ حاصل کرنے کے لیے اڑیسہ کے کچھ کانگریسیوں نے کیں۔ انھوں نے بیشتر گاؤں میں یہ خبر مشہور کر دی کہ گاندھی جی کی آتما نے ووٹوں کے ڈبوں میں ٹھکانا بنا لیا ہے اور مہاتما وہاں یہ دیکھتے رہیں گے کہ آیا ووٹر کانگریس کو ووٹ ڈالتا ہے یا نہیں۔ بعض ووٹروں

نے اس بات کو اتنی سنجیدگی سے قبول کیا کہ وہ ان کی پارٹی کانگریس کو ووٹ دینے سے پہلے دونوں کی پیٹیوں کے سامنے عقیدت کے جذبے سے سرشار لیٹ لیٹ گئے۔

ان اولین انتخابات میں "ہندو ردعمل" "Back lash" کا نظریہ پھیلایا گیا۔ اس نظریے کے مطابق ہندو، خصوصاً تقسیم کے بعد ہوئے فسادات کے بعد صرف ان امیدواروں کو ووٹ دیں گے جو خاص طور پر ہندو مفاد کی نمائندگی کریں گے۔ ہندو مہاسبھا اور ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی قیادت میں نئی نئی قائم ہونے والی پارٹی جن سنگھ دونوں نے اسی پر الیکشن لڑا۔ دونوں نے ایسی بھرپور شکست کا منہ دیکھا کہ پھر کبھی جانبر نہ ہو سکیں۔ مہاسبھا کے صدر ڈاکٹر این بی کھرے، اپنے وطن ناگ پور سے پارلیامانی امیدوار تھے۔ ناگ پور ابھی بھی مہاتما گاندھی کے قتل کی ترغیب دینے والی راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کا گڑھ تھا انتخابات میں ڈاکٹر کھرے کی ضمانت ضبط ہوئی لیکن کٹر ہندو دراصل جو چاہتے تھے وہ تھا پنڈت نہرو کا ان کے حلقۂ انتخاب پھول پور میں ہارنا۔ نہرو کے واحد مخالف ایک سادھو تھے پربھودت برہمچاری، جنھوں نے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ مسئلہ جس پر انھوں نے اپنی توجہ مرکوز کی تھی وہ تھا ہندو کوڈ بل جس نے ہندوؤں کے سماجی قوانین کو نسبتاً لبرل بنا دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ نہرو کو اپنے ایسے مخالف کے خلاف مہم چلانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اگرچہ ایک وقت ایسا ضرور تھا جب ان کی پارٹی کو یہ پریشانی لاحق ہو گئی تھی کہ کہیں پھول پور سے مخالف نتیجہ نہ نکل آئے۔ کانگریس پارٹی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی، خاموش سادھو کو نہرو کے دو لاکھ ۳۵ ہزار ۵۷۱ ووٹوں کے مقابلے میں صرف چھپن ہزار سات سو اٹھارہ ووٹ ملے تھے۔ ہارنے کے بعد پربھودت برہمچاری نے نہرو کے نام اپنے ایک پیغام میں، ان کی کامیابی پر مبارک باد دی تھی اور نہ جانے کیوں یہ بھی کہا تھا کہ اگر وہ خود جیت بھی جاتے تو وہ نہرو کے لیے اپنی سیٹ خالی کر دیتے۔

کمیونسٹوں کو بھی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ کسی ہندوستانی کا ووٹ محض مارکس کے نام پر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ بنگال میں کانگریسی اپنے انتخابی نشان، کندھوں پر ہل رکھے ہوئے بیلوں کی جوڑی کا جو کسانوں کی نمائندگی کرتی تھی خوب استعمال کر رہے تھے اس کے جواب میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا کہنا تھا کہ اس کا انتخابی نشان گیہوں کی بالی، خوش حالی کی دیوی لکشمی کا پرتو ہے۔

دلی کے ایک جیوتشی نے ایک پیشین گوئی کر کے اپنے قبیلے کی عزت میں کچھ اضافہ نہیں کیا، نا ایک پورا انتخابی حلقہ میں انھوں نے ایک پوسٹر نکالا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ اس نشست پر کانگریس کو کامیابی حاصل ہوگی۔ ایک ایسے الکشن میں جس میں کانگریس نے ملک کے زیادہ تر حصوں میں اور خود دلی میں بھی زبردست کامیابیاں حاصل کی تھیں یہ ایک سیٹ تھی جو اس نے سوشلسٹوں کے مقابلے میں کھوئی تھی۔ ایک نسبتاً زیادہ سنجیدہ سطح پر اس وقت کے موڈ کا اندازہ دلی کے سیتارام بازار کے

حلقۂ انتخاب میں ہوتا تھا ہیتارام بازار آراسیں اہیں اور فرقہ پرست ہندوؤں کا گڑھ تھا، کانگریس نے اپنے عقائد کے استحکام اور مضبوطی کے ایک اظہار کے طور پر ہندو اکثریت والے اس حلقۂ انتخاب سے ایک مسلمان امیدوار کھڑا کیا، کانگریسی مسلمان نے اپنے ہندو مخالف کو تین ہزار سے زیادہ ووٹوں سے شکست دی۔ عام طور پر مسلمانوں نے بہت بڑی تعداد میں کانگریس کو ووٹ دیا۔ اترپردیش میں ۷۰ مسلمان ممبران اسمبلی میں سے ۲۶ نے کانگریس کے ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی بچا ہوا ایک ممبر آزاد امیدوار تھا۔

"امل ناڈو نے ذرا کچھ زیادہ نفاست کا مظاہرہ کیا۔ اس کے تحقیقی شعبے نے برطانیہ سے رابطہ قائم کیا اور لیبر اور کنزرویٹو دونوں پارٹیوں سے اپنے پوسٹر ڈیزائن کرنے میں مدد مانگی۔ مگر برطانیہ سے اس نوعیت کی امداد کچھ بہت مفید نہیں ثابت ہوئی اور پارٹی کی کارگزاری توقع سے بھی کم رہی۔ ایک پوسٹر کا برطانوی ڈیزائن شاید پیغام کو دوسروں تک پہنچانے میں کچھ بہت کامیاب نہیں رہا" جھجک کیسی ؟ بڑھیے، چلیے ہم کانگریس کو ووٹ دیں جس نے شراب ممنوع کردی۔" پنجاب کے ووٹر نے ثابت کیا کہ وہ سیاست دانوں کے حیلوں اور ان کی چالوں کو سمجھنے میں کہیں آگے ہے۔ "انڈین جنرل الیکشن ۵۲-۱۹۵۱ء" میں بودھ راج شرما نے لکھا ہے" ضلع ہوشیارپور کے ایک ووٹر نے یہ واقعہ بیان کیا۔ ایک امیدوار نے ووٹ دینے کے لیے مجھے تین روپیے دیئے اور دوسرے نے مجھے دو روپیوں کی پیش کش کی۔ میں نے دونوں کو شکریے کے ساتھ قبول کرلیا۔ جب اس سے یہ سوال کیا گیا کہ تم نے ووٹ کس شخص کو دیا تو اس نے بتایا کہ موخرالذکر کو۔ اس فیصلے کی اس نے وجہ یہ بتائی کہ دوسرے والے نے چونکہ کم رقم دی تھی اسلیے اسکے بارے میں یہ خیال ہوا کہ وہ کم بے ایمان ہوگا اور اسمبلی کا نسبتاً بہتر رکن ثابت ہوگا۔

نہرو خاندان کے ایک فرد ایسا لگتا ہے کہ ہمیشہ بغاوت پر آمادہ نظر آتا ہے۔ یہ ۱۹۵۲ تھا جب نہرو کی بہن کرشنا ہٹھی سنگھ نے کہا تھا کہ یہ کانگریس ہے جو ملک کو تباہی کی طرف لے جارہی ہے۔ سوشلسٹوں نے اس بات کو فوراً اپنے انتخابی پوسٹروں میں استعمال کرلیا۔ سوشلسٹوں کا خاص نعرہ تھا "کام دو، مکان دو، ورنہ گدی چھوڑ دو۔" مگر یہ نعرہ کانگریس کے اس نعرے کے سامنے ٹک نہ سکا" مستحکم، سیکولر اور ترقی پسند ملک کے لیے کانگریس کو ووٹ دیجیے۔" انتخابات میں شکست کھانے کے بعد سوشلسٹوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ الیکشن میں بے ایمانی کی گئی ہے۔ سوشلسٹ لیڈر، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے کہا کہ "اترپردیش میں الیکشن کے نتائج کو مسخ کرنے کے لیے لکھنؤ میں بیٹھ کر ایک سازش کی گئی تھی۔" اس الزام کو بہرحال کسی نے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ سوشلسٹوں کو ایک جائز شکست ہوئی تھی۔ کچھ شکایتیں ضرور ہوئیں، جیسے بہار میں، جہاں ۱۹۴۲۷ پولنگ بوتھوں میں سے ۶۰ میں دوبارہ ووٹ ڈالے گئے، مگر عوام کو اس بات کا یقین تھا کہ انتخابات اتنی ایمانداری سے ہوئے تھے جتنی ایمانداری کا امکان تھا۔ ہندوستانی جمہوریت کا بڑا قابل اطمینان آغاز ہوا تھا۔

۱۳ مئی کو جواہر لال نہرو نے آزاد ہندوستان کے پہلے منتخب وزیراعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور اب آزادی، استحکام اور ترقی کے اپنے وعدوں کو پورا کرنے کا کام سامنے آئے گا۔

(۷)

طائرِ قفس کا عروج

پاکستان کے بنگالی صرف عزت اور برابری کے خواہاں تھے، اس کے بدلے انھیں ملا ایک ملک۔ جنوبی ہندستان کی ریاست مدراس کے تاملوں کا مطالبہ تھا ایک ملک کا، وہ عزت اور جمہوریت پاکر مطمئن ہو گئے۔ یہ موازنہ جمہوریت کی جوڑنے اور متحد کرنے کی خوبی کے برعکس ڈکٹیٹرشپ کی تخریبی صلاحیتوں کی بڑی اچھی تصویر پیش کرتا ہے۔ ہندوستان کا تامل مسئلہ درحقیقت پاکستان کی بنگالی دشواری سے کہیں زیادہ سنجیدہ تھا۔ سب سے پہلے تو یہی کہ ہندوستان میں علیحدگی کی وکالت کرنا پورے طور پر آئینی تھا۔ ۱۹۶۳ء تک ہندوستانی آئین نے ہر سیاسی جماعت کو علیحدگی کی تبلیغ کا حق دے رکھا تھا۔

اس صورت حال سے وابستہ علاقائیت اور لسانی مطالبات تھے، ہندی، ملک کے سب سے بڑے حصے کی زبان ہونے کی رو سے آئین میں قومی زبان قرار دی گئی مگر کوئی صورت نہیں تھی کہ جنوبی ریاستیں اور بنگال ہندی کے بے روک اور برملا استعمال کو قبول کرلیں۔ زبان کا مسئلہ دنیا بھر میں، ہمیشہ ایک دھماکہ خیز مسئلہ رہا ہے۔ ہندوستان بھی اس مسئلے پر اکثر اور حقیقی اسباب کی بنا پر ٹھوکر کھا چکا ہے۔ ہندوستان میں تقریباً نوسو بولیاں ہیں، کشمیری، راجستھانی، پنجابی، گجراتی، مراٹھی، کنڑ، ملیالم، تامل، تیلگو، بنگالی، آسامی اور اردو، اور ان سب زبانوں کو بولنے والے اتنے ہیں کہ وہ ایک اوسط یورپین ملک سے کچھ بڑے ہی ملک کو آباد کر سکتے ہیں اور اس لحاظ سے ہندی اپنے لیے ایک برصغیر کی دعوے دار ہو سکتی ہے۔

ابھی آزادی ملی ہی تھی کہ یہ مطالبہ ہونے لگا کہ ملک کا موجودہ داخلی نقشہ جو برطانیہ کی سیاسی اور انتظامی مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر بنا تھا اور لسانی اصولوں پر صوبوں کی از سر نو تشکیل کی خاطر اسے پھر سے بنایا جانا چاہیے۔ اپنی مصائب سے پُر زندگیوں کے تجربے کی بنیاد پر نہرو اور وزیر داخلہ سردار پٹیل یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ نظریہ کس سمت رہنمائی کر سکتا ہے،

دونوں ہی خوف زدہ تھے اور انھوں نے ایک مضبوط مرکز اور انتظامی اصولوں کی بنیاد پر تقسیم کے خیال کو فروغ دینے کی اپنے بس بھر کوشش کی مگر لوگ احتجاج میں سڑکوں پر نکل آئے اور جب انھوں نے اپنی بات کہی تو ان کی آواز دبائی نہیں سنی گئی۔ انھیں غدار یا جاسوس کے لقب نہیں دیئے گئے، اس کے بجائے انھیں اپنی پسند کے مطابق ملک کی تشکیل و تعمیر کی اجازت دی گئی۔ یہی طریقہ کار تھا جس کی وجہ سے ہندوستان بچ گیا۔

تامل علیحدگی پسندی کی تحریک ایک بڑے قابل ذکر شخص کی زندگی سے منسلک ہے جس نے ایک الگ ملک کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد، ایک امیر زمیندار کے اس لڑکے نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا جو ابھرتے ہوئے طبقۂ امرا کا روایتی ڈھنگ تھا۔ ای وی راماسوامی نائیکر (جنھیں E.V.R. کے نام سے جانا جاتا تھا) کا عہد اپنے بے کیف آغاز کے باوجود، ―――――― عظیم شخصیتوں کے ہجوم کا ایک دلفریب عہد ثابت ہوا۔ ای۔ وی۔ آر نے بالکل روایتی انداز میں، کانگریس کی شرکت سے آغاز کیا اور اپنی سماجی حیثیت کے بل بوتے پر جلدی ہی مدراس کانگریس کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ وہ ابھی کانگریس ہی میں تھے، جب ۱۹۱۴ء میں ڈاکٹر سی نڈیسن مدلیار نے، ڈراوڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن کا مقصد ڈراوڑ لوگوں کی حالت کو (شمال میں آریوں کی حالت کے مقابلے میں) بہتر کرنے میں امداد دینا تھا۔ اس تحریک کی خاص مخالف برہمنوں کی ذات تھی، جو ذات پات کے جابر نظام کی وجہ سے جنوبی ہندوستان کی ایک اقلیتی مگر صاحبِ اختیار و اقتدار جماعت کی حیثیت رکھتی تھی۔ مثال کے طور پر اس صدی کی دوسری دہائی تک ٹراونکور کی راج دھانی میں، کوئی اچھوت سڑکوں پر چل نہیں سکتا تھا اس سے بھی زیادہ یہ کہ اپنی ذات سے اونچے فرد کے سامنے اسے آنکھ بھی اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ دراوڑ ایسوسی ایشن نے ساؤتھ انڈین لبرل فیڈریشن کا نام اختیار کیا اور "جسٹس" نام کا ایک روزنامہ نکالنا شروع کیا۔ اخبار نے اپنا یہ نام ایک سیاسی پارٹی کو دیا جو جسٹس پارٹی کہلائی۔ اسی دوران، ای وی آر ساتھ ہی ساتھ ایک لڑائی کانگریس کو برہمنوں کے شکنجے سے آزاد کرانے کے لیے لڑ رہے تھے ان کی اس جد وجہد نے ان کو ایک ممتاز برہمن، زبردست کانگریسی شری راج گوپال اچاریہ کے روبرو لا کھڑا کیا۔ بالآخر ای۔ وی۔ آر نے جسٹس پارٹی میں باقاعدہ شرکت کر لی۔

ای وی آر ذات پات کے ظالمانہ نظام کے کٹر مخالف تھے۔ ان کا فلسفہ سیدھا سادا اور عملی تھا۔ وہ ایسے مذہب کو جو ذات پات کی تفریق کی اجازت دیتا ہے ملیریا کے مترادف سمجھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انھیں دوا کی تلاش سے دلچسپی نہیں ہے وہ تو ان مچھروں کو تلاش کرنا چاہتے ہیں جو بیماری پھیلاتے ہیں۔ ذات پات کی بنیاد ان پُرانوں پر تھی جو بقول ان کے معتقدین کے، کلام الٰہی تھا اسی لیے وہ ایک دہریے بن گئے۔ برہمن ان دیوتاؤں کے ایجنٹ تھے اس

لیے ان کی لڑائی ان ہی ایجنٹوں سے تھی۔ چورانوے سال کی عمر میں، اپنی موت کے وقت تک انھیں نہ تو اپنی دہریت پر کوئی افسوس تھا اور نہ مذہبی برہمنوں کے خلاف اپنی لڑائی پر کوئی تاسف۔

دوسری دہائی میں انھوں نے ٹراونکور کی سلطنت میں، اچھوتوں کی فلاح وبہبود کے لیے ویکم کا احتجاج شروع کیا۔ مہاراجا، ای وی آر کے ذاتی دوست تھے اور کبھی کبھی ایروڈ میں جہاں ای۔ وی۔ آر رہا کرتے تھے ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے مگر ان باتوں سے مجاہد کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ای وی آر کو قید کر دیا گیا مگر احتجاج کامیاب ہوا اور اچھوتوں کی زندگی کو کچھ قابل برداشت بنانے کے لیے ایک خصوصی قانون وضع ہوا۔ اس کامیابی کے بعد ای وی آر کو ویکم سپاہی کا نام دیا گیا اس احتجاج سے متعلق ایک نسبتاً زیادہ دل چسپ کہانی یہ ہے کہ برہمنوں نے اپنے اقتدار کے اس خطرے کو محسوس کر کے اور اس سے گھبرا کے دیوتاؤں کو خوش کرنے اور نحوست کو ٹالنے کے لیے ایک زبردست یگیہ (مقامی زبان میں داہ تروسا گرا یگیم) کا اہتمام کیا اور اس میں دیوتاؤں سے اس دہریے (ناستک) احتجاجی کو مار ڈالنے کی درخواست کی مگر ظاہر ہے کہ پرارتھناؤں میں کچھ گڑبڑ ہوئی کیونکہ ناستک ای وی آر تو زندہ رہا مگر مہاراجہ کا انتقال ہو گیا۔

۱۹۳۵ میں ای وی آر نے ایک تحریک "تحریک خودداری" کے نام سے چلائی آج بھی ۵۰ سمپت روڈ مدراس میں ایک ادارہ پیریار خودداری پروپگنڈہ انسٹی ٹیوشن کے نام سے قائم ہے جو ای وی آر کی تحریروں کی اشاعت کرتا ہے۔ ان کی تحریر کی ایک مثال پیش ہے۔ "آریا جو اپنی گذر بسر کرنے کی کوشش میں ہندوستان آئے، انھوں نے اپنی بربری حیثیت کے عین مطابق بہت سی لغو کہانیاں گھڑیں...... نشے میں دھت برہمنوں کی اس زمانے کی بکواس آج بھی اس جدید دنیا میں، مذہبی رسوم، اخلاقی کہانیوں، تہواروں، برتوں، قسموں اور عقائد کی حیثیت سے مانی جارہی ہیں۔" ای وی آر کے نزدیک برہمنوں اور ذاتوں کے نظام کا ہندو مذہب اس ملک میں آریاؤں کی نوآبادکاریت کا نتیجہ تھا۔ یہ وہی آریہ تھے جنھوں نے دراوڑ کمیونٹی کو اپنی فتوحات اور اپنی تسخیر کے بل پر گنگا کے میدانوں میں سے نکالا اور پھر اپنے اقتدار کو مذہبی اور ثقافتی بالادستی کے ذریعے قائم رکھا۔ ای وی آر کے فلسفے میں آریائی شمالی اور دراوڑی جنوب کی علیحدگی ناگزیر طور پر شامل ہے اور یہ کہ جنوب کے برہمنوں کو تباہ و برباد کرنا ضروری تھا کیونکہ یہ لوگ آریائی شمال کے حقیقی ایجنٹ تھے۔ تامل ناڈ میں راون کو جنوبی ہندوستان کا ایک شہزادہ تصور کیا جاتا ہے اور رام کے ہاتھوں اس کی شکست تامل لوگوں کے نزدیک کسی عفریت یا آسیب کی شکست نہیں بلکہ ایک قوم پرست کی محکومی سمجھی جاتی ہے۔ ریاست میں ہندی زبان کی اتنی شدید مخالفت کی اصل وجہ یہی ہے کہ اس زبان کو شمالی آریائی سامراجیت کا جدید ترین ہتھیار سمجھا جاتا ہے جس کے خلاف ای وی آر نے اپنے پیروؤں کو آگاہ کیا تھا۔

بہر حال ۱۹۳۷ کے اہم انتخابات میں، ایک برہمن راج گوپال اچاریہ کی قیادت میں کانگریس نے بابلی راجو کی جسٹس پارٹی کو تباہ کن شکست دی اور ایک نشست کے علاوہ ساری نشستیں جیت لیں۔ جسٹس پارٹی کی قیادت پر زمینداروں کا غلبہ تھا، کانگریس نے اس کے اس تضاد کو بڑی خوبی سے استعمال کیا۔ خود کانگریس نے اپنے آپ کو گاندھی کی کسانوں کی پارٹی سے وابستہ کیا۔ اچھوتوں کو اس وقت ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ انتخابات کے نتائج کی بنا پر کانگریس نے حکومت بنائی اور سی راج گوپال اچاریہ، مدراس کے وزیر اعظم بنے۔ موجودہ وزیر اعلیٰ کا عہدہ اس وقت وزیر اعظم کے نام سے ہی جانا جاتا تھا۔ وزیر اعظم بننے کے کچھ ہی دنوں بعد راج گوپال اچاریہ نے ایک کام ایسا کیا جس کی وجہ سے ای وی آر جو اس عرصے میں جسٹس پارٹی کے سربراہ ہو چکے تھے، پھر ابھر کر سامنے آ گئے۔ راج گوپال اچاریہ نے کانگریس کی قومی پالیسی پر عمل درآمد کرتے ہوئے ہندی کی تدریس کو اسکولوں میں لازمی قرار دے دیا۔ ای وی آر کے لیے تو یہ پہلے ہی سے ایک موثر ہتھیار تھا۔ ایک بار پھر ایک برہمن، تامل زبان اور تامل تہذیب کو تباہ کر کے ہندوستان کی سامراجیت کا ایجنٹ بن کر سامنے آیا تھا۔

ای وی آر نے ایک ہندی مخالف تحریک شروع کی اس تحریک کو، ۱۹۶۷ میں اس تحریک کا پیش خیمہ بننا تھا جو ای وی آر کے جانشیں کو سریر حکومت پر لانے والی تھی۔ کانگریس حکومت نے ای وی آر کو جیل بھیج دیا۔ (اور جان بوجھ کر بلاری کے گرم ترین علاقے میں رکھا) ای وی آر دو سال تک قید میں رہے۔ پندرہ برس کی مدت میں وہ تیس بار جیل گئے۔ اسی وجہ سے ان کا نام ہی "طائر قفس" پڑ گیا مگر بلاری کے دورِ اسیری میں ہندی مخالف تحریک عوام کے ذہن و روح میں سما گئی تھی چوں کہ ای وی آر بذات خود موجود نہیں ہو سکتے تھے اس لیے جلسۂ عام میں، ان کی تصویر یا ان کا مجسمہ اسٹیج پر رکھا جاتا تھا۔ قید سے رہائی ملنے کے بعد ای وی آر کو ۳۰-۲۸ دسمبر ۱۹۳۸ کی مدراس کانفرنس میں "پیریار" کا خطاب دیا گیا۔ پیریار کا مطلب ہوتا ہے غیر معمولی ذہانت والا آدمی۔ ان کی مقبولیت اتنی زیادہ تھی کہ کانگریس کو انھیں خریدنے کی کوشش کرنا پڑی ۱۹۳۹ میں ان کے حریف راج گوپال اچاریہ نے انھیں اپنی حکومت میں ایک جگہ دینے کی پیش کش کی۔

پیریار نے انکار کر دیا۔ ان کے ذہن میں کچھ دوسرے ہی منصوبے تھے۔ وہ مسلم لیگ میں ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھ رہے تھے انھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ جب شمالی ہندوستان کا مسلمان وہاں کے ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتا ہے جب کہ ان کے مابین بہت کچھ مشترک ہے تو پھر دراوڑ اور خصوصاً تامل لوگوں کی شمال کے ساتھ بقائے باہم کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ ان کی زبان، ان کا رسم الخط، ان کا کھانا، ان کے خدوخال ہر چیز ہی مختلف تھی۔ ای وی آر نے اب ایک دراوڑ ناڈو یا ایک دراوڑ قوم کے اپنے نعرے کی لے بلند کرنا شروع کی۔ اپنی مکمل شکل میں یہ جنوبی ہند

کے ملائیلی، کناڈیگا، تیلگو اور تامل چار لسانی گروہوں پر مشتمل ایک علیحدہ فیڈریشن تھی۔ اگرچہ یہ ایک ناممکن بات تھی مگر ایک علیحدہ تامل ملک "تامل ناڈو" کے علاوہ کوئی دوسری صورت قابل قبول بھی نہیں تھی۔ (یہ نام آج ایک حقیقت ہے مگر اس نام کا علاقہ بہر حال انڈین یونین میں ہے)۔ ایس راجن نے جنھوں نے ای وی آر کے ساتھ کام کیا تھا اور بعد کو وہ تامل ناڈ قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر بھی رہے تھے ماضی پر نظر ڈالتے ہوئے مصنف کو بتایا کہ علیحدگی کی خواہش ایک سنجیدہ کوشش کی شکل میں شروع ہوئی۔

اس بات کا احساس بھی پیدا ہو چلا تھا کہ قیادت پر زمینداروں کے غلبے کے کانگریسی الزام میں حقیقت کا ایک پرتو ہے۔ تحریک اگر عوامی حمایت و تعاون کی خواستگار ہے تو اسے متوسط درجے کے کسانوں کو اپنی طرف کھینچنا پڑے گا۔ ۱۹۴۴ میں سی این انا دورائی نے جو ایک شعلہ بیان مقرر تھے اور ای وی آر کے نائب کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ سیلم کانفرنس میں جسٹس پارٹی کے نام کو تبدیل کر کے دراوڑ کازگام (D.K.) کا نام رکھنے کی تجویز پیش کی اور پارٹی کے تمام لیڈروں سے یہ کہا کہ وہ انگریزوں کے عطا کیے ہوئے اپنے تمام خطابات ترک کر دیں۔ مگر بہر حال "ڈی کے" کو اپنے اوپر اتنا بھروسہ نہیں تھا کہ وہ ۱۹۴۶ کے انتخابات میں حصہ لیتی چنانچہ اس نے الیکشن میں کانگریس کو بالکل آزاد چھوڑ دیا۔ ایک اور دشواری سامنے آئی۔ انا دورائی نے پیریار کی سنکی پن کی باتوں پر تنقید کرنا شروع کی، ان کے خیالات سے پارٹی کی اکثریت نے جو ۱۹۴۹ کی پارٹی کی تقسیم کے وقت ان کے ساتھ آگئی تھی، اتفاق کیا، مگر نئی پارٹی دراوڑ مونیترا کازگام (ڈی ایم کے) میں ای وی آر کے لیے جنھوں نے اس کے نظریات کی تشکیل کی تھی، عزت و احترام کا اتنا شدید جذبہ تھا کہ اس نے ان کی جگہ پر کسی کو بھی پارٹی کا صدر نامزد نہیں کیا۔ پارٹی میں صرف جنرل سکریٹری کے عہدے تھے۔ ای وی آر کی جسمانی موجودگی کو رد کیا گیا تھا مگر ان کے خیالات کی ذمہ داری بدستور تھی۔ کرسی صدارت "پیریار کی روح" کے لیے خالی ہی رکھی گئی۔

مگر اس سے قبل کہ تامل علیحدگی کے اپنے مطالبے کو سڑکوں پر مظاہرے کر کے موثر بنائیں، پڑوس میں ایک اور بھیانک آگ لگ گئی۔



۸

فرد، جس نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا

اگرچہ تامل، مدراس پریسیڈنسی کے سب سے اہم باشندے تھے مگر وہ اکیلے نہیں تھے۔ انگریزوں کی بنائی ہوئی گیارہ اضلاع کی اس پریسیڈنسی میں تلگو آندھرا کے عوام بھی تھے۔ (بقیہ تلگو آبادی اور اس کی سرزمین پر نظام حیدرآباد کی حکومت تھی) انھوں نے مدراس پریسیڈنسی کی تقسیم اور ان کی اپنی ایک ریاست بنائے جانے کا مطالبہ کیا..... اس مطالبے میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کانگریس پارٹی نے اپنے ۱۹۱۶ اور ۱۹۲۰ کے دونوں اجلاسوں میں آزادی کے بعد لسانی ریاستوں کے اصول کو تسلیم کیا تھا۔ ۱۹۲۸ کی موتی لال نہرو رپورٹ نے اس یقین دہانی کا اعادہ کیا۔ کانگریس نے ۱۹۲۷ کے اپنے کلکتہ اجلاس میں آندھرا اور کرناٹک کی ریاستوں کی تشکیل کے خیال کو خاص طور پر منظور کیا تھا اور ۱۹۳۸ء میں واردھا میں، آزاد ہندوستانی وفاق کے اندر ملایالی لوگوں کے لیے کیرالا کی ریاست کے قیام پر بھی رضامندی ظاہر کی تھی۔

مگر تقسیم ہند کے مابعد اثرات کی بنا پر لسانی ریاستوں سے متعلق نہرو کے وعدے میں تزلزل پیدا ہوا اور یہی کیفیت وزیر داخلہ سردار پٹیل کے یہاں بھی نظر آئی۔ ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو قانون ساز اسمبلی میں اسی موضوع پر ہونے والے ایک مباحثے کے موقع پر نہرو نے نہایت ٹھنڈے انداز میں کہا "پہلی چیزیں پہلے آتی ہیں اور پہلی چیز ہے ہندوستان کا تحفظ اور اس کا استحکام۔" کانگریس کے وعدے کو پورا کرنے کی بجائے حکومت نے لسانی ریاستوں کے خیال پر از سر نو غور کرنے کے لیے کمیشن مقرر کر دیا۔ کمیشن نے انتہائی تابعداری کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا کہ اس وقت کوئی بھی تبدیلی، خطرناک ہوگی۔ کمیشن نے مزید کہا کہ زبانیں نہیں انتظامی سہولتیں ہندوستان کی تنظیم نو کی بنیاد ہونا چاہئیں۔ دوسرے الفاظ میں یہی بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ انگریزوں کا اصول بدستور قائم رہنا چاہیے اور نہرو کو لاتعداد لسانی ریاستوں کے بجائے صرف چار انتظامی علاقے بنانے کی اجازت دی جانی چاہیے۔

انگریز نے ملک کو سیاسی یا انتظامی مصلحتوں یا وقت کی سہولتوں کے مطابق تقسیم کیا تھا (ہندوستانی آئینی

اصطلاحات ۱۹۱۸ء کی رپورٹ) ۱۸۰۱ اور ۱۸۲۷ تک، مدراس اور بمبئی پریسیڈنسیاں بتدریج اپنے پورے قدوقامت پر پہنچ چکی تھیں۔ اگرچہ بنگال اس وقت تک برطانوی اقتدار کا مرکز بن چکا تھا مگر وہ ابھی تک اتنا بڑھ نہیں سکا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ میدان جنگ اور ہندوستانی راجاؤں کے سازشی درباروں میں کامیابیوں کی مدد سے برطانوی قلمرو ترقی ہی کرتی گئی اور ۱۸۳۳ء میں آگرہ پریسیڈنسی وجود میں آئی۔ ۴۹-۱۸۴۸ میں سکھ فوجوں کی شکست کے بعد پنجاب بھی زیر ہوا اور اسے ایک الگ صوبہ بنا دیا گیا۔ اودھ ۱۸۵۶ میں شکنجے میں آیا۔ ۱۸۶۱ء میں سنٹرل پراونسز کا وجود عمل میں آیا۔ آسام کو غصب کر کے ۱۸۲۶ میں بنگال کا حصہ بنا دیا گیا۔ مگر وہ ۱۸۷۴ میں پھر الگ کر دیا گیا۔ ۱۹۰۵ میں مشرق، چھوٹا ناگپور سے آسام تک، کرزن کے دو بنگالوں میں تقسیم کر دیا گیا اور بہار اور اڑیسہ کو ایک اور صوبہ بنانے کے لیے ملا دیا گیا۔ آخری صوبہ جسے انگریزوں نے بنایا وہ اڑیسہ تھا۔ یہ اپریل ۱۹۳۶ میں وجود میں آیا۔

۱۹۴۷ میں ہندوستان کو مختلف عرض و وسعت اور بیش و کم اہمیت کی حامل ۵۶۵ سلطنتیں (ریاستیں) ورثے میں ملیں۔ رقبے کے لحاظ سے یہ سب برصغیر کے دو تہائی سے زیادہ حصے پر مشتمل تھیں۔ ان میں سے ۲۱۵ چھوٹی چھوٹی رجواڑہ ریاستیں جن کی آبادی دو کروڑ کے قریب تھی، موجود صوبوں سے منسلک تھیں۔ ۷۰ لاکھ کی آبادی رکھنے والے ۶۱ رجواڑے (ریاستیں) مرکزی انتظامیہ کے حوالے کیے گئے۔ ۲۷۵ ریاستوں کو، جن کی آبادی تقریباً ساڑھے تین کروڑ تھی، راجستھان، مدھیہ بھارت، ٹراونکور، کوچین، سوراشٹر اور پیپسو (پٹیالہ ایسٹ پنجاب اسٹیٹ یونین) میں تبدیل کر دیا گیا۔ حیدرآباد، میسور اور جموں و کشمیر کی بڑی ریاستوں کو ان کی سابقہ حالت میں چھوڑ دیا گیا۔ ان تینوں ریاستوں کو ہندوستان میں مدغم کرنا، پرعزم سردار پٹیل کی اس ملک کو آخری بڑی دین تھی۔ مگر یہ وہ نہیں ہوا جس کی عوام کو خواہش تھی۔ عوام تو اپنی زبان اور اپنی تہذیب کی حدود میں رہنا چاہتے تھے نہ کہ انتظامیہ کی ضرورتوں کے مطابق۔

۱۲ مارچ ۱۹۳۱ کا دن تھا اور صبح کے ساڑھے چھ بجے تھے جب مہاتما گاندھی نے اپنی لٹھیا اٹھائی اور ۲۴۱ میل دور بحر ہند کے ساحل پر ڈانڈی کی طرف کوچ شروع کیا۔ ۶ مارچ کو انھیں وہاں پہنچ کر ایک مٹھی نمک اٹھا کر ایک بار پھر ایک عظیم قومی احتجاج شروع کرنا تھا، جو ساری دنیا کو ہلا دینے والا تھا۔ مہاتما گاندھی کے جن ۷۹ پیروؤں نے مارچ میں شروع سے لے کر آخر تک ساتھ دیا ان میں پوٹی سری راملو بھی تھے۔ خود مہاتما نے ان کے خلوص اور لگن کی بار بار تعریف کی ہے۔ ۲ اکتوبر ۱۹۵۲ کو گاندھی کے اس پیرو نے خود ہندوستانیوں کے ساتھ وہ کرنے کا فیصلہ کیا جو اس کے گرو نے انگریزوں کے ساتھ کیا تھا۔ یعنی، ایک عظیم حکومت کی طاقت اور ایک فرد کے ایمان اور عقیدے

کی قوت کی آزمائش، انھوں نے ایک برت شروع کیا اور کہا کہ یہ برت یا تو ان کی موت پر ختم ہوگا یا پھر آندھرا کے الگ صوبے کی تشکیل پر۔ پنڈت نہرو جو آزاد ہندوستان کو چلانے کی پریشانیوں میں غالباً یہ بھول گئے کہ ایک گاندھی وادی کیا کچھ کر سکتا ہے، انھوں نے سری راما لو سے برت ختم کرنے کے لیے کئی اپیلیں کیں اور اس کے بعد ان کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۵۲ء رات کے آٹھ بج کر چالیس منٹ پر سری راما لو جو مدراس میں مائی لاپور کے علاقے میں بلو سو سمبا مورتی کے گھر پر مقیم تھے، بے ہوش ہو گئے۔ برت کا اٹھاونواں دن تھا۔ رات کو گیارہ بج کر بیس منٹ پر سری راما لو نے دم توڑ دیا۔ بھوک سے جان دے دی۔

پنڈت نہرو اس دن سارا دن، پارلیمنٹ میں اپنے نئے ہندوستان کی تشکیل و تعمیر میں لگے رہے اس دن انھوں نے پارلیمنٹ میں اپنے پہلے پنج سالہ منصوبے کی تمہید شروع کی تھی وہاں انھوں نے کہا کہ "آج کا دن ملک کے لیے ایک عظیم دن ہے۔ یہ منصوبہ ملک کے اتحاد اور اس کی یکجہتی کا شعور پیدا کرنے کی اولین کوشش ہے اور ایک غیر طبقاتی سماج کی طرف پہلا قدم۔" یک جہتی اور اتحاد کے جذبات کو بہر حال اگلے دن کسی دوسری سطح پر ایک کڑی آزمائش سے گزرنا تھا۔

سری راما لو کی موت کی خبر جیسے ہی نکلی، مدراس پریسیڈنسی کے گیارہ تلگو اضلاع میں ایک شور مچ گیا اور بے ساختہ مظاہرے شروع ہو گئے۔ وجے واڑہ میں، مشتعل ہجوم نے ریلوے اسٹیشن کو پانچ گھنٹے تک اپنے قبضے میں رکھا (اپنے غم و غصے کو کوئی شکل نہ دیتے ہوئے، ہجوم نے ٹرینوں کو اپنی لوٹ کا سامان ادھر سے ادھر لے جانے میں استعمال کیا) تشدد ہر طرف پھیل گیا اور پولیس کو گولی چلانا پڑی۔ اخبار نے نقصان کا اندازہ دو کروڑ روپیوں کا لگایا (اور یہ وہ زمانہ تھا جب روپیے کی قیمت کہیں زیادہ تھی) چوبیس گھنٹوں کے اندر ایک مضبوط مرکز اور چار انتظامی حلقوں کا نہرو کا، بڑی احتیاط سے تشکیل دیا ہوا تصور چور چور ہو گیا۔ ۱۸ دسمبر کو ہندوستانی کابینہ نے فیصلہ کیا کہ آندھرا پردیش بنایا جائے گا۔ دوسری ریاستوں نے ۱۹۶۶ میں پنجاب کی تشکیل کے بعد تک، فیصلے کے منطقی تسلسل کی پیروی کی۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۵۳ کو سید فضل علی کی قیادت میں ایچ این کنزرو اور کے ایم پانیکر پر مشتمل ایک ریاستی تنظیم نو کمیشن قائم کیا گیا۔ کمیشن نے تقریباً دو ہزار انتہائی غور و خوض کے بعد تیار کی ہوئی یادداشتوں کے مطالعے ۳۸ ہزار میل کے سفر ۱۰۴ مقامات کے دوروں اور نو ہزار افراد سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد اپنی رپورٹ یعنی ہندوستان کی لسانی تقسیم کا جواز پیش کیا۔



۹

اعزازات کی فہرست میں

جب انھوں نے اپنی سیاسی پارٹی کی جگہ ایک نئی بیوی کو دے دی تو پیری یار ای، وی، راماسوامی نائیکر ایک ڈرامہ باز بن کر رہ **گئے۔ مگر** ان کے یہ ڈرامے بھی بہر حال بڑے موثر ہوتے تھے اور انھوں نے پارٹی کی روح کو بیدار رکھ کر تحریک کو زندہ رکھا۔ ۱۹۵۲ء میں اِس معمر آدمی نے اعلان کیا کہ وہ ہندو رزمیہ رامائن کو جس میں رام اور راون کی لڑائی بیان کی گئی ہے، سرِ عام نذر آتش کریں گے اس اعلان کے بعد انھیں یہ لطف ضرور آیا کہ ان کے پاس سینکڑوں کی تعداد میں ناراض برہمنوں کے خطوط آنے لگے جن میں اُن سے کتاب کی بے حرمتی کرنے سے احتراز کرنے کی درخواست ہوتی تھی۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے علیحدگی کے تامل مطالبے کے اظہار کے طور پر ہندوستان کے آئین کو جلانے کا پروگرام بنایا لیکن جب ایک طرف یہ معمر بزرگ اخباروں کی شاہ سرخیوں پر توجہ مبذول کیے ہوئے تھا ڈی ایم کے میں اس کے حامی شدید جدوجہد میں مصروف تھے۔

۵۲-۱۹۵۱ کے عام انتخابات کے لیے وہ تیار نہیں تھے۔ مگر ۱۹۵۶ء میں ترو چیراپلی کانفرنس میں ڈی ایم کے نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ سی این انادورائی کی قیادت میں ۱۹۵۷ کے عام انتخابات لڑے گی۔ پارٹی کے بعض عملی پروگراموں پر مثبت عوامی ردعمل نے پارٹی کے ممبروں کی ہمتیں بڑھا دی تھیں۔ ان عملی پروگراموں میں مثال کے طور پر ۱۹۵۴ء میں انادورائی کی قیادت میں مدراس میں سمپسن کمپنی کے دفتر سے نیپیر پارک اور وہاں سے میرینا بیچ کے ساحل تک جلوس لے جانے کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جانب داروں کا کہنا ہے کہ جلوس میں تقریباً پانچ لاکھ افراد شریک ہوئے۔ سیاست دانوں کی معروف مبالغہ آرائیوں سے اگر صرف نظر بھی کر لیا جائے تب بھی یہ حقیقت ہے کہ اس میں عوام کی شرکت ڈی ایم کے کی ہمتوں کو بلند کرنے کے لیے کافی تھی۔ ۱۹۵۷ کے ریاستی اسمبلی کے انتخابات میں پارٹی نے پندرہ نشستیں جیتیں اور علیحدگی پسند انادورائی قانون ساز نظام کے ایک رکن بن گئے۔ اس کامیابی کے نتیجے کے طور پر پارٹی کو الیکشن کمیشن نے تسلیم کر لیا اور ابھرتے سورج

کاان کا نشان سرکاری رجزرو نشانوں میں شامل کر لیا گیا۔ علیحدگی، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، اس وقت تک کلی طور پر جائز چیز تھی
۱۹۵۹ء تک ڈی ایم کے نے مدراس کارپوریشن کے انتخابات جیت لیے تھے۔ اور پہلا سرکاری افسر کارپوریشن کا
میئر ان کا آدمی منتخب ہوا تھا۔ ۱۹۶۲ء کے انتخابات میں، ریاستی اسمبلی کی ۲۰۶ نشستوں میں سے پچاس نشستیں جیت کر انھوں
نے اپنی ترقی کو جاری رکھا مگر قسمت کی ستم ظریفی، جس کا بعد کو بہت اثر پڑنے والا تھا، یہ ہوئی کہ انا دورائی خود الیکشن میں
ہار گئے۔ ان کی شکست کی اصل وجہ کانگریسی چیف منسٹر کامراج نادر کی وہ ذاتی دل چسپی تھی جو انھوں نے علیحدگی پسند لیڈر
کو ہرانے میں دکھائی تھی۔ اس صورت حال کے پیش نظر ڈی۔ ایم کے نے انا دورائی کو دہلی میں راجیہ سبھا میں بھیجنے کا فیصلہ
کیا جہاں انتخاب بالواسطہ ہوتے ہیں۔ انا دورائی پارلیمنٹ کے ممبر بن گئے اس سے صرف یہی نہیں ہوا کہ ڈی ایم کے
کی تحریک قومی پیمانے پر سامنے آگئی بلکہ خود ڈی۔ ایم کے کی تحریک میں قومی خصوصیات سرایت ہونے لگیں۔ ۱۹۶۲ء کو ملک
کی تاریخ میں ایک اہم سال ہونا تھا۔

اپریل ۱۹۶۲ء کو، صدر کے خطبے کے شکریے کی تحریک پر پہلی بار راجیہ سبھا میں کنجیورم نٹراجن انا دورائی بولنے کھڑے ہوئے تو انھوں نے دراوڑ ناڈ کی وکالت کرنے میں اپنی تقریر کرنے کی تمام تر صلاحیتوں کو استعمال کیا۔ انھوں نے ایوان کے تمام اراکین سے کہا کہ وہ ان کے عوام کو شمال کی سامراجیت سے نجات دلانے کی ضرورت پر سنجیدگی اور ہمدردانہ طور پر غور کریں۔ "میں دراوڑ ناڈ کی علیحدگی کی بات کسی دشمنی کے جذبے سے نہیں کہتا۔ میرا یہ خیال صرف اس لیے ہے کہ اگر یہ علیحدہ کر دیا جائے تو یہ ایک چھوٹا سا ملک بن جائے گا، مستحکم، یک رنگ اور متحد اس وقت ہم اقتصادی نشاۃ ثانیہ کو زیادہ موثر اور سماجی حیات نو کو زیادہ بار آور بنا سکیں گے۔" یہ تقریر میں ان کا دوسرا ہدف ظاہر ہے کہ ہندی تھی۔

وزیر مالیات کی تقریر پر ہونے والے مباحثے میں شرکت کرتے ہوئے جون ۱۹۶۲ء میں جو تقریر انھوں نے کی اس کا لہجہ بھی وہی تھا (راجیہ سبھا میں انا دورائی کی بہترین تقریروں کا انتخاب "انا اسپیکس" کے نام سے اورینٹ لانگمین نے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا ہے۔ انتخاب کے مولف ایس راما چندرن ہیں) "مجھے یہ بات بالکل واضح کر دینا چاہیے کہ جس مشن کو میں نے اپنایا ہے اس سے نہ تو ہمدردی مجھے الگ کر سکتی ہے اور نہ ہی اظہار نفرت۔ اس سلسلے میں کسی مفاہمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" مگر اسی سال اکتوبر تک ایک بڑا انقلابی واقعہ ہوا۔ ملک کے شمال میں چینی توپوں کے دہانے کھل گئے اور ملک کو جو ابھی تک امن و شانتی اور "ہندی چینی بھائی بھائی" کے نعروں میں گم تھا اسے نہ صرف جنگ سے نبٹنا پڑا بلکہ ہزیمت کی ذلت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ بریگیڈیر جے۔ دلوی جنھوں نے ایک بریگیڈ کی قیادت کی تھی اور سات مہینے چینیوں کی قید میں گزارے تھے۔ جنگ کے بارے میں اپنی مشہور تصنیف "ہمالین بلنڈر" (اورینٹ پیپربیک) میں یوں

بیان کرتے ہیں "۱۹۶۲ کی چین ہند جنگ مدِمقابل فوجوں کے ایک بہت چھوٹے حصے تک محدود تھی اور سرحد کے ایک چھوٹے سے دور دراز کونے میں محض ایک مہینہ لڑی گئی تھی جس میں حقیقی لڑائی کے صرف دس دن تھے مگر اس سب کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس جنگ نے ہماری بین الاقوامی حیثیت، داخلی سیاست اور اقتصادی ترقی میں بڑی تبدیلیوں کا آغاز کر دیا۔"

جنگ نے ہندوستانی نفسیات پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ کچھ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے عنفوان شباب کا عہد ایک دم ختم ہوا، اور ملک کو ایک تکلیف دہ بحران سے گزر کر پختہ اور بالغ ہونا پڑا۔ نہرو کی محافظ ہستی یک لخت جواب دے گئی۔ اس حادثے پر درد ہوا مگر اس درد میں اس بات کا احساس بھی تھا کہ کسی ایک کا ہاتھ پکڑے رہنے کا اب وقت نہیں رہا۔ ایک شکستہ اور بجھے ہوئے نہرو کو بڑھاپے نے آ گھیرا اور وہ بیس مہینوں کے اندر ہی چل بسے۔ ان دس دنوں میں، جب ایسا لگتا تھا کہ چینی ہمالیہ پہاڑوں کو پار کرینگے یا گوہاٹی کو فتح کرتے ہوئے آسام میں در آئیں گے تو اس وقت یہ شعور بھی پیدا ہو رہا تھا کہ آزادی اور قومیت کے ساتھ اتنی لاپروائی نہیں برتی جا سکتی جتنی کہ ابھی تک برتی گئی تھی۔ چنانچہ شکست کا وہ لمحہ ملک کا سب سے زیادہ حیات افزا لمحہ ثابت ہوا ایک جذبے نے سارے ملک کو ایک ایسی سرشاری عطا کر دی جو اس سے پہلے کسی نے نہیں بخشی تھی۔ ۱۹۶۲ کی اس ذلت آمیز شکست کے بہت سے خوش آیند نتائج بھی تھے مثلاً "اس شکست نے اگر ملک کو اصلاحی اقدامات پر مجبور نہ کر دیا ہوتا تو ۱۹۶۵ کے پاکستانی چیلنج کا ہندوستانی فوج شاید مقابلہ نہ کر سکتی اور کشمیر ہاتھ سے نکل گیا ہوتا اور بددلی اور مایوسی کا ایک اور چکر شروع ہو جاتا مگر سب سے بڑا اور غیر متوقع فائدہ تھا جذبۂ حب الوطنی کی بیداری اور علیحدگی پسندی کے احساسات کا خاتمہ۔

اناّدورائی نے چینی حملے کی خبر سب سے پہلے ویلور جیل میں پڑھی اس وقت وہ وہاں سیاسی حراست کی ایک اور مختصر مدت گذار رہے تھے۔ مدراس مستقبل کا تامل ناڈو، میدانِ جنگ سے دور ہندوستان کے دوسرے کنارے پر تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ شمال جس سے انھیں نفرت تھی حملے کی زد پر تھا اور جنوب اس سے بالکل غیر متاثر اور محفوظ۔ مگر ۲ اکتوبر کو اپنی رہائی کے بعد اناّدورائی نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ ڈی ایم کے کی تمام سرگرمیوں کو خواہ وہ احتجاجی ہوں یا کوئی دوسری یکسر ملتوی کر دیا اور پارٹی کے تمام کارکنوں سے کہہ دیا کہ وہ حملہ آور کے عزائم کو روکنے کے لیے اپنی ساری تنظیم اور ساری توانائی کو یکسر حکومتِ ہند کے سپرد کر دیں۔ "میں ڈی ایم کے، کے نام کو اعزاز کی اس فہرست میں درج کرتا ہوں جو اس وقت اس ملک اور اس قوم کے لیے اس کے وقار کے لیے اور اس کے مستقبل کے لیے تیار ہو رہی ہے۔" اناّدورائی کی تقریروں کے انتخاب کے مولف کی حیثیت سے ایس راما چندرن نے کتاب "انا اسپیکس" کے دیباچہ میں لکھا ہے:

"ایک لحاظ سے ۱۹۶۲ ہندوستان کے لیے بہترین ساعت تھا کیوں کہ اسی اد بار نے ہندوستانی عوام کو اپنے اختلافات بھلا کر حملہ آور کے خلاف متحد ہو جانے پر مجبور کر دیا" ستمبر ۱۹۶۵ میں السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا (۲۶ ستمبر) کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انادورائی نے اس بات کی تصدیق کی کہ "ہم نے اب دراوڑ ناڈو کا اپنا مطالبہ ترک کر دیا ہے۔ ہم نے چینی حملے کے وقت پہلی مرتبہ اس مطالبے کے خطرناک امکانات کو محسوس کیا۔"

حکومت ہند نے بھی موقع ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا۔ ۱۹۶۳ء میں سارے ایوان کی حمایت کے ساتھ اس نے آئین ہند سے وہ دفعہ ہی نکال دی جو بہر حال غلط تھی۔ وزیر قانون اسے کے سین نے آئین کی دفعہ ۱۹ کو بدلنے کے لیے سولھواں ترمیمی بل ۱۹۶۳ پیش کیا، جس کی رو سے ہر علیحدگی پسند جماعت کو انتخاب میں حصہ لینے کے لیے نااہل قرار دیا گیا۔ ڈی ایم کے نے اپنے خیالات میں اتنی تبدیلی ہو جانے کے باوجود بھی ایک ایسے بل کی موافقت کے لیے اپنے کو تیار نہیں پایا جو ان کے اصل موقف کے خلاف تھا۔ بہر حال بل منظور ہوا اور زبردست اکثریت کے ساتھ۔ جلدی ہی ڈی ایم کے نے علیحدگی کے اپنے مطالبے کو باقاعدہ ترک کر دیا اور اپنے صوبے کی حکمراں جماعت بننے کی تیاری میں لگ گئی۔ یہی کلیدی تھی۔ اس حقیقت نے کہ وہ مدراس میں حکومت کر سکتی ہے، ڈی ایم کے کے علیحدگی کے مطالبے کو بے معنی اور فضول بنا دیا۔ مگر اس سے پہلے کہ پارٹی اور تحریک پورے طور پر ہندوستان میں مدغم ہوں ڈی ایم کے کے سامنے ایک اور اہم لڑائی لڑنے کو رہ گئی تھی۔



۱۰

مہاندی

یورپ کے جن لوگوں نے عثمانی اور آسٹرو ہنگرین سلطنتوں کا زوال اور زبانوں کی بنا پر چھوٹے چھوٹے ملکوں کی ازسر نو تشکیل کو دیکھا ہے ان کے لیے یہ سمجھنا خاص طور پر مشکل ہوتا ہے کہ یہ مقدر برطانوی سلطنت کے جنوب ایشیائی علاقوں کا آخر کیوں نہ ہوا۔ اگرچہ بہت تاخیر ہوتی مگر پھر بھی ہندوستان کو آٹھویں دہائی تک منتشر ہو جانا چاہیے تھا۔ لسانی بنیاد ور پر ریاستوں کی تشکیل کے لیے جان دینے والے ایک سری راما لو تھے تو ہندوستان میں ایسے بہت سے لوگ تھے جنھوں نے قومی زبان ہندی کو غلام بنانے کا ہتھیار بننے کی مخالفت میں اپنی جانیں دے دیں۔

۱۲ ستمبر ۱۹۴۹ کو ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا جہاں، ایک انتہائی اہم فیصلہ لیا جانے والا تھا اور وہ تھا آزاد ہندوستان کی قومی زبان کو طے کرنے کا مسئلہ۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو جلد سے جلد انگریزی کے استعمال کو ختم کر کے ہندی کو ملک کی سرکاری زبان کا درجہ دینا چاہتے تھے۔ ہندی کے ان مبلغین کے پاس جواز یہ تھا کہ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ہندوستان کی ۳۳۰ ملین آبادی میں سے ۱۴۰ ملین افراد ہندی سمجھتے تھے۔ دوسرے فریق کو اس فیصلے میں بقائے باہمی کا اختتام دکھائی دے رہا تھا۔ اسمبلی کے بہت سے اراکین اس بات سے متنبہ کر رہے تھے کہ اگر ہندی کو اقتصادی یا ثقافتی اقتدار کی زبان کا درجہ مل گیا تو ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ اعتدال پسند حضرات چاہتے تھے کہ انگریزی اس وقت تک سرکاری زبان بنی رہے جب تک کہ ہندی کا کوئی مقبول عام روپ دریافت نہ کر لیا جائے۔

کانگریس پارٹی ۲۵ سال قبل اس وقت ہی ہندی کی حیثیت تسلیم کر چکی تھی۔ جب کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ہندی کو آزاد ہندوستان کی قومی زبان بنائے جانے کی رضامندی دی تھی (اتفاق یہ ہے کہ یہ فیصلہ ایک ووٹ کی اکثریت سے ہوا تھا) مگر اس کا ارادہ یہ تھا کہ ہندی کے لیے دو رسم الخط ہوں گے ایک دیوناگری اور دوسرا اردو مگر یہ بات ۱۹۲۴ کی ہے اس وقت ہندوستان تقسیم نہیں ہوا تھا۔ کانگریس کا دعویٰ تھا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کی نمایندگی کرتی ہے اور اسے اپنے

ریزولیوشنوں اور تجویزوں میں دونوں کے جذبات کو مطمئن کرنا ہوتا تھا۔ مہاتما گاندھی، بہر حال قومی زبان کی حیثیت سے، سنسکرت آمیز اور فرقہ وارانہ شدت کی مظہر ہندی کی بجائے ہندی اور اردو سے مل کر بننے والی ایک زبان، ہندوستانی کی وکالت کرتے رہے۔ انھوں نے جو زبان سوچی تھی وہ ایک وسیع القلب اور روشن خیال زبان تھی جو اردو اور دوسری ہندستانی زبانوں کے الفاظ بھی اپناتی اور ان کے اثرات بھی قبول کرتی اور جو بنارس کی نہیں ہندوستان کی تہذیب کی علامت بھی ہوتی اور اس کی تعریف بھی۔ مگر ۱۹۴۹ میں اردو پاکستان کی قومی زبان قرار پائی، تقسیم ہند کے مابعد بھیانک فسادات کے نتیجے کے طور پر ہندوستانی مسلمان کی آواز گھٹ کر رہ گئی اور مولانا آزاد جیسا آدمی بھی اس حقیقت پر کہ ہندوستانی کی بجائے ہندی ملک کی قومی زبان ہوتی جارہی ہے صرف اپنے بوجھل دل کا ذکر کرسکا۔ یہ صرف پنڈت نہرو تھے جو ہندی اور اس کی بہن اردو کے باہمی رشتے کو قائم رکھنے کی ضرورت پر زور دے سکے۔ زبان کے سلسلے میں اور بھی بہت سے مختلف خیالات پیش کیے گئے۔ مثلاً ہندی کے دیوناگری کے بجائے رومن رسم الخط کو استعمال کرنا (یہ بات بظاہر جتنی مشکل معلوم ہوتی ہے، اتنی ہے نہیں۔ ہندی صحافی جو انگریزی ٹیلکس استعمال کرتے ہیں اپنی خبریں رومن رسم الخط ہی میں بھیجتے ہیں) اس خیال کے ممتاز حامی عظیم اور سر سے پیر تک سیکولر قوم پرست سبھاش چندر بوس تھے۔ ان کا اتنی جلدی مرنا، ہندستان کا ایک عظیم نقصان تھا۔

بہر حال اس بات پر ایک عام اتفاق تھا کہ اگر کسی زبان کو قوم زبان بننا ہی ہے تو وہ ہندی ہوگی۔ اس سلسلے میں بھی بہت سی مختلف رائیں تھیں کہ یہ کام ہو کیوں کر۔ اس بات کا سب کو احساس تھا کہ لسانی پالیسی کے سلسلے میں ذرا سی لغزش بھی نقصان کا باعث بن سکتی تھی۔ قانون ساز اسمبلی کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اس موضوع پر مباحثے کو شروع کرنے کی اجازت دینے سے پہلے یہ کہا کہ "اگر ہمارے فیصلے کو ملک کے کسی بھی خاصے بڑے حصے کی خواہ وہ شمال ہو یا جنوب، حمایت حاصل نہیں ہوتی تو پھر آئین کا نفاذ ایک انتہائی دشوار مسئلہ بن جائے گا۔ زبان کے مسئلے کا حل سارے ملک کو بحیثیت مجموعی کرنا ہوگا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارے پورے آئین میں کوئی دوسری شق نہیں ہے جس کے نفاذ کی عملی طور پر ہر روز بلکہ ہر لمحہ ضرورت پڑے گی۔"

جواہر لال بھی بالکل واضح تھے۔ "ہم ہندوستان میں ایک لسانی انقلاب کی دہلیز پر کھڑے ہیں اور ہمیں اسے صحیح سمت دینے، صحیح شکل دینے اور صحیح سانچہ دینے میں بہت محتاط رہنا ہوگا کہ کہیں یہ غلط نہ ہو جائے اور ہمیں کسی غلط سمت میں نہ موڑ دے۔" انھوں نے اسمبلی کے اراکین کو گاندھی جی کے خیالات یاد دلائے جب انھوں نے کہا تھا کہ ہندی میں سب کچھ شامل ہونا چاہیے اور یہ کہ اسے کسی پر بھی جبراً مسلط نہیں کرنا چاہیے اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے کہ ردعمل

کتنے جذباتی ہو سکتے ہیں ثبوت خود اسمبلی میں موجود تھے۔ مشرقی پاکستان کے ایک ممتاز سکھ لیڈر سردار حکم سنگھ جنھوں نے ابتدا میں دیوناگری رسم الخط میں ہندی کو قومی زبان بنائے جانے کے خیال کی تائید کی تھی۔ تین دن کی بحث کے دوران انھوں نے اپنا موقف بدل لیا۔ آخری دن تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا "میں نے اب اپنے ذہن کو بدل لیا ہے۔ ہندی کے پرجوش حامیتیوں نے میری حمایت کھو دی ہے اور اب میں مسٹر انھونی کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں (فرینک انیتھونی، ایک اینگلو انڈین لیڈر جو متعدد جگہوں پر انگریزی کو بدستور قائم رکھنے کی وکالت کر رہے تھے) میں ان لوگوں میں سے ایک ہوں جو محض دیوناگری رسم الخط میں ہندی کی حمایت کرنے والوں کے پاگل پن اور ان کے تعصب اور غیر رواداری کی وجہ سے اس کی حمایت سے دست کش ہو گئے ہیں۔"

یہ صرف اردو سے خصوصی تعلق محسوس کرنے والے مسلمان ہی نہیں تھے جو ہندی سے ڈرے ہوئے تھے سارا جنوبی ہندوستان، جو ہندی سے نا واقف تھا، اس کے خلاف تھا۔ تاملوں کی مخالفت شدید ترین تھی اور شاید اسی لیے انڈین یونین کی حکومت نے ہندی کو، ہندوستان کی لنگوا فرانکا بنانے کی تجویز کا مسودہ تیار کرنے کی ذمہ داری ایک تامل برہمن پر ڈالی۔ ۱۲ ستمبر کو این گوپالا سوامی آئینگر نے، قانون ساز اسمبلی سے یہ درخواست کرتے ہوئے کہ ہندی کو ملک کی قومی زبان بنائے جانے پر اپنی رضامندی دے، تجویز پیش کی، اس موقع پر انھوں نے جو تقریر کی تھی اس میں انھوں نے کہا تھا "ہم آج اس زبان کو الوداع کہہ رہے ہیں، جس کی مدد سے، میرا خیال ہے کہ ہم نے آزادی کی لڑائی لڑی اور آزادی حاصل کی" الوداع کے اس عمل کو ابھی کچھ دن جاری رہنا تھا۔

آئینگر، ڈاکٹر بی آر امبیدکر، اور کے ایم منشی کے نام سے پیش ہونے والا ریزولیوشن نمبر ۳۰۱-اے اس طرح شروع ہوا تھا "یونین کی سرکاری زبان دیوناگری رسم خط میں ہندی ہوگی اور سرکاری کاموں میں استعمال ہونے والی گنتی، بین الاقوامی گنتی کی شکل میں ہوگی۔ انگریزی ہندوستان کے آئین کی منظوری کے بعد پندرہ سال تک رہے گی۔ اس کے بعد ایک قومی زبان کی حیثیت سے ہندی اس کی جگہ لے لے گی" مگر آئینگر نے، جو بہر حال ایک اچھے وکیل بھی تھے تجویز میں ایک راہ فرار کی گنجائش رکھی تھی "اگرچہ اس دفعہ میں کوئی بات ایسی نہیں ہے مگر پارلیمنٹ، پندرہ سال کے بعد ان ضرورتوں میں جن کا تعین قانون نے کر دیا ہوگا، انگریزی کے بدستور استعمال کے لیے قانون بنا سکتی ہے۔

اس مفاہمت پر ہندی پریمیوں کا ٹولہ کافی خوش تھا اور پھر ایک خواب کی زندگی میں پندرہ برس ہوتے کیا ہیں ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر اور قانون ساز اسمبلی کے رکن سیٹھ گووند داس نے ایوان کو بتایا کہ زبان کا مسئلہ ۹۵ فی صدی حل ہو چکا ہے باقی ۵ فی صدی ابھی حل ہونا ہے۔ وہ ان کے خیال میں غالباً دیوناگری گنتی کے بجائے رومن ہندسوں کے استعمال کا

تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے ہندوستان کی لاتعداد زبانوں کو یہاں کی ندیاں قرار دیا تھا اور ہندی کو 'مہاندی'۔ اس مہاندی کو بالآخر ملک کے معاملات میں اپنا رول مل گیا۔ مگر یہ بہر حال ابھی دیکھنا تھا کہ ملک اس مہاندی کی لہروں اور اس کے دھاروں کو نفع بخش طریقوں پر استعمال کرنے کے لیے پورے طور پر تیار تھا یا نہیں۔

۱۹۶۳ تک یہ بات ظاہر تھی کہ ملک میں لوگوں کا بہت بڑا گروہ ابھی بھی اس 'مہاندی' کو خطرناک سمجھتا تھا ان کے خیال میں اس کے پانی کو ابھی تک ملک کی ضرورتوں کے مطابق قابو میں نہیں کیا گیا تھا اور آئین کے مطابق دو سال سے کم مدت کے اندر اندر یعنی جنوری ۱۹۶۵ تک، انگریزی میں سرکاری خط و کتابت کرنے کا طریقہ ختم ہو جانا چاہیے تھا اور اس کے بدلے ساری سرکاری خط و کتابت ہندی میں ہونا چاہیے تھی، حکومت ہند نے جس کی سرپرستی پنڈت نہرو کر رہے تھے وہی کیا جو سمجھ داری کا تقاضا تھا یعنی اس نے درہ راہ فرار دالی شق استعمال کی۔ ۱۹۶۳ء کا سرکاری زبانوں والا بل پارلیمنٹ میں پیش ہوا اس موضوع پر ہونے والی بحث اس حقیقت کا ایک اور ثبوت تھی کہ شکایتوں کے حل نکالے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ ان کے اظہار کا پورا پورا موقع فراہم کر دیا جائے۔ جیسا کہ سی اناّدورائی نے کہا تھا میں سمجھتا ہوں کہ سیاسی سود و زیاں کے حساب کتاب سے الگ، یہ مقتدر ایوان، سیاسی اخلاقیات اور جمہوری وسیع القلبی پر بھی توجہ دے گا کیوں کہ جمہوریت کا مطلب محض اکثریت کی حکومت نہیں ہوتا اس کا مطلب بنیادی طور پر، اقلیتوں کے حقوق کے تقدس کو محسوس کرنا اور ان کی حفاظت کرنا ہی نہیں بلکہ اقلیتوں کے جذبات کا احترام کرنا بھی ہے۔"

توقع کے مطابق اناّدورائی کی تقریر بحث کی مرکزی تقریر تھی انھوں نے ہندی کی اعلان کی جانے والی حیثیت اور حقیقت کے فرق کو بڑی خوبی سے پیش کیا تھا۔ بنگالی کمیونسٹ لیڈر بھوپیش گپتا ہندی کی وکالت کرتے رہے تھے۔ اور جب اناّدورائی کی باری آئی تو انھوں نے بھوپیش گپتا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "میرے دوست بھوپیش گپتا کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم ٹوڈیوں کا کردار ادا کر رہے ہیں اور اسی لیے انگریزی چاہتے ہیں، ہرگز نہیں" انھوں نے کہا کہ وہ (بھوپیش گپتا) ہندی کی وکالت کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ہندی ہی قومی زبان اور سرکاری زبان بنائی جائے مگر وہ ہندی سیکھنے اور ہندی میں بات کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔"

بھوپیش گپتا جو خود ہی ایک زبردست پارلیمنٹیرین تھے فوراً بولے "میرے پاس وقت نہیں تھا" اناّدورائی بھی اس کا جواب دیے بغیر کیسے رہ سکتے تھے، انھوں نے بھی فوراً جواب دیا اور کہا "لیکن ان (بھوپیش گپتا) کے پاس داس کیپٹل پڑھنے کے لیے وقت تھا، ان کے پاس روسی کمیونزم اور چینی کمیونزم کے فرق کو سمجھنے کے لیے وقت تھا، ان کے پاس ہندی کے علاوہ سب کچھ پڑھنے کا وقت تھا۔"

انادورائی نے اس دلیل کا بھی جواب دیا کہ ہندی کی حیثیت اور اہمیت اس حقیقت کی بنا پر بھی ہے کہ وہ اس ملک کا ۴۲ فی صدی حصہ تسلیم کرتا ہے انھوں نے کہا کہ یہ حقیقت کہ یہ ۴۲ فی صدی حصہ تقریباً ایک ہی جغرافیائی علاقے میں آجاتا ہے، اس خیال کو خطرناک بنا دیتی ہے۔ اگر یہ علاقہ سارے ملک میں بکھرا ہوا ہوتا تو شاید اس زبان کا استعمال زیادہ قابل قبول ہوتا۔ اس لیے ۴۲ فی صد کو جو زیادہ تر ایک ہی علاقے میں ہے مفروضہ اکثریت کی علامت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ محض اعداد شمار اور گنتیوں کی اکثریت ہے۔ پھر مسئلے کا حل کیا ہے؟ آئین میں ترمیم کر کے صورت حال کو بدستور رکھیے۔" مسئلے کا حل ہونے دیجیے ضروری نہیں ہے کہ وہ حل ہم ہی کریں، ہم ہندوستان کے آخری خلف نہیں ہیں، غالباً ہماری سمجھ زیادہ الجھی ہوئی اور مبہم ہے۔ ہم میں سیاسی نفرت بہت ہے آنے والے زمانے میں شاید کوئی مناسب حل ڈھونڈا جا سکے...... اگر ہندی کی یہ حیثیت ایک حقیقت بن جاتی ہے تو...... سارا جنوبی ہندوستان اس کے خلاف بغاوت کر دے گا۔"

یہ انقلاب کیا اور کیسا ہوگا اس کی کچھ جھلک جلدی ہی نظر آنے لگی۔ سرکاری زبانوں کے بل کو ۱۹۶۳ء میں جس وزیر امور داخلہ نے پیش کیا تھا وہ تھے لال بہادر شاستری۔ مئی ۱۹۶۴ء میں جواہر لال کی موت کے بعد لال بہادر شاستری وزیر اعظم بنے۔ ابھی وہ اپنے منصب کے ابتدائی مشکل دور سے گذر ہی رہے تھے کہ پہلا بحران ان کے سامنے آگیا۔ آئین ہند ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ کو باقاعدہ قانون بن گیا۔ یہی دن تھا جب ہندوستان ایک جمہوریہ بنا تھا اور ۲۶ جنوری ۱۹۶۵ء کو ہی پندرہ برسوں کی وہ مدت ختم ہو رہی تھی جس میں انگریزی کے استعمال کو ختم ہونا تھا یہ اگرچہ ایک حقیقت تھی کہ ۱۹۶۳ کے ایکٹ نے اس پریشانی کو دور کر دیا تھا کہ اس تاریخ تک انگریزی زبان کا بستر پورے طور پر بندھ جائے گا مگر جنوب کو اس سلسلے میں شبہات تھے۔ مدراس میں ڈی ایم کے نے آزاد ہندوستان کے پندرھویں یوم جمہوریہ کو "یوم تاسف" کی حیثیت سے منانے کا فیصلہ کیا۔

۲۴ جنوری ۱۹۶۵ء اتوار کے دن ونسٹن چرچل کا انتقال ہوا۔ ہندوستانی اخباروں نے اس خبر کو شاہ سرخیوں میں شائع کیا۔ اخباروں کے پہلے صفحات طول طویل کہانیوں سے بھرے ہوئے تھے اور ہر ایک نے بڑے مہذب طریقے پر اس بات کے اظہار سے پرہیز کیا تھا کہ اگر مسٹر ونسٹن کو اپنے ڈھنگ سے عمل کرنے کا موقع ملتا تو شاید سورج برطانوی سلطنت میں کبھی غروب نہ ہوتا۔ بہرحال "ایک عہد کا خاتمہ" جیسی شاہ سرخیوں نے ایک ایسی خبر کو جو عام حالات میں پہلے صفحہ پر شائع ہوتی اسے اندرونی صفحات پر پہنچا دیا۔ اور وہ خبر تھی یونین گورنمنٹ کی اس تشویش کی جو ان امکانات کے بارے میں اسے تھی جو ۲۶ جنوری یا ۲۶ جنوری کے بعد پیش آسکتے تھے۔ اگر انگریزی زبان کا قتل نہیں بھی ہو رہا تھا

تب بھی ہندی ملک کی سرکاری زبان بننے جا رہی تھی۔ انگریزی کی حیثیت رابطے کی ایک سرکاری زبان کی ہوتی۔ ہندی بولنے والی ریاستیں خوش تھیں۔ غیر ہندی ریاستیں پریشان اور مشکوک تھیں ان کے نزدیک "جبریہ تسلط" کی گھڑی آگئی تھی۔

دلّی میں وزارت داخلہ کے حکام مخصوص صحافیوں کو اس سلسلے میں وضاحتی خبریں شائع کرنے کا مشورہ دے رہے تھے کہ ملک اچانک ایک زبان کا ملک نہیں بننے والا ہے۔ ایک ذمہ دار نے کلکتے کے اخبار سنڈے اسٹینڈرڈ کے خصوصی نامہ نگار کو بتایا کہ ہندی کو واحد سرکاری زبان بنانے کا عمل بہت ہی طویل وقت لے گا۔ میں کوئی وقت تو متعین نہیں کر سکتا۔ عملی طور پر جو کچھ ہوگا وہ کچھ ایسا ہوگا۔ ذمہ دار نے کہا:

(الف) ہندی میں لکھے ہوئے مرکزی حکومت کو وصول ہونے والے خطوط کا جہاں تک ممکن ہوگا ہندی ہی میں جواب دیا جائے گا۔ (پہلے ہندی میں جانے والے خطوط کی تعداد محض ایک فی صدی ہوا کرتی تھی)۔ تمام خطوط جو انگریزی میں ہوں گے ان کے جوابات انگریزی میں دیئے جائیں گے۔ اہم خطوط اور احکامات ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں میں بھیجے جائیں گے۔

(ب) انگریزی اصطلاحات کے ہندی متبادل بنائے جائیں گے۔

(ج) سرکاری گزٹ ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوگا۔

(د) فائلوں پر نوٹنگ انگریزی یا ہندی میں ہوگی۔

(ہ) ہندی ریاستوں کو اپنے ان مراسلات کا ہندی ترجمہ بھی بھیجنا ہوگا جو وہ غیر ہندی ریاستوں کو بھیج رہی ہیں۔

(و) سپریم کورٹ کی زبان صرف انگریزی ہی رہے گی۔ ویسے ریاستیں، اپنی ریاستی زبان کو ہائی کورٹوں میں متعارف کرانے کی درخواست دے سکتی ہیں۔

۲۵ جنوری کو، گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے پہلا ہندی اعلان نکلا۔ ایک غیر معمولی گزٹ نام تھا "بھارت کا راج پتر" اس میں ان روایتی صدارتی انعامات کا اعلان تھا جو ان ہندوستانیوں کو دیئے جاتے تھے جنھوں نے اپنے اپنے پیشوں میں کوئی کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ اور اس طرح دوسرے متعدد لوگوں کے ساتھ بنگالی فلم ساز ستیہ جیت رے اور مہاراشٹر کے ممتاز سائنس داں جینت نارلیکر کو پدم بھوشن کا اعزاز دیتے وقت پہلی دفعہ ہندی کو سرکاری کام میں استعمال کیا گیا۔ لندن نے ہندوستان میں اپنے نئے ہائی کمشنر کے لیے جان فری مین کے نام کا اعلان کیا۔ جان فری مین نے انتہائی وفاداری کے ساتھ بی بی سی کی ہندی سروس کے کارکن آل حسن کو بتایا کہ وہ آزاد بھارت کی قومی زبان کو سیکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔" میں اس وقت ہندی کا ایک لفظ نہیں جانتا اور میں سمجھتا ہوں

کہ اپنے ان ہندوستانی سامعین کو جو شاید مجھے اس وقت سن رہے ہوں آگاہ کر دینا چاہیے کہ میں زبانیں سیکھنے کے معاملے میں بڑا بے ہنر اور بے استعداد ہوں، مگر پھر بھی میری یہ کوشش ہوگی کہ دلی پہنچنے پر میں ہندی پڑھوں اور ہر وہ کام کروں جس سے میں زبان کے کم از کم آسان اور سیدھے سادے عناصر سے واقف ہو جاؤں۔"

مگر مدراس میں لوگ ایسی وسیع القلبی کے موڈ میں کم تھے۔ گڑبڑ کے خدشے کو محسوس کرتے ہوئے، کانگریسی وزیراعلیٰ بھکتا وتسلم نے انادورائی اور ڈی ایم کے کے دوسرے ممتاز لیڈروں کو ۲۵-۲۶ جنوری کی نصف شب میں گرفتار کرلیا۔ مگر یہ احتیاطی تدبیر ۲۰ ہزار طالب علموں کے اس اجلاس کو نہ روک سکی جس کے آگے آگے "ہندی عفریت" کا پتلا تھا اور اسکے گلے میں جوتوں اور چپلوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ مدورائی میں کانگریس کے جھنڈے ہٹا کر سیاہ جھنڈے لگائے گئے دوسرے مقامات پر قومی جھنڈے کی بے حرمتی کی گئی۔ اور یہ سب محض تمہید تھی۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں دو نوجوانوں نے تامل کو بچانے کی خاطر خود اپنی جانیں لے لیں۔ ویرودگیاکم میں، ڈاک خانہ میں کام کرنے والے ۳۲ سالہ نوجوان رنگاراجن نے ایک چوراہے پر اپنے آپ کو آگ لگالی آگ کے شعلوں جوں جوں اسے اپنی لپیٹ میں لیتے جاتے تھے وہ "تامل زندہ باد" کا نعرہ لگاتا جاتا تھا۔ کوڈامبکم کے مقام پر ۲۲ سالہ سیوالنگم نے بھی یہی کیا۔

مظاہرے پُرتشدد ہو گئے۔ مدراس کے وزیراعلیٰ (وزیر داخلہ شری گلزاری لال نندہ کے الفاظ میں ایک چٹان کی طرح سخت) نے ان مظاہروں کو نظم و ضبط کا مسئلہ قرار دینے کا فیصلہ کیا اور پولیس بھیج دی۔ اب مظاہرین پولیس کی گولیوں سے مرنے لگے اور غم و غصے کی لہر ملک کے باقی حصوں کو بھی متاثر کرنے لگی۔ ۲۸ جنوری کو، اپنے کلکتے کے ایک دورے میں وزیر داخلہ شری گلزاری لال نندہ نے نامہ نگاروں کو بتایا کہ "میں نے بالکل واضح اور مثبت وعدہ کیا ہے اور یقین دلایا ہے کہ ہندی مسلط نہیں کی جائے گی" کانگریس کے اونچے حلقے میں ان کے ساتھ اتولیا گھوش نے بھی ہندی کے پرجوش حامیوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ جلد بازی آہستہ کریں، دلی میں وزیراعظم لال بہادر شاستری نے پیش کش کی۔ "ہم ہمیشہ ساتھ بیٹھ سکتے ہیں اور اختلافات کو دور کر سکتے ہیں۔" (یہ بیان دیتے وقت شاستری جی انگریزی میں بول رہے تھے)۔

مگر ڈی ایم کے کے اہم لیڈر ابھی تک جیلوں میں تھے اور عوام سڑکوں پر، اور کوئی بھی مل بیٹھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ۲۹ جنوری کو کیرانور کے ایک ہوٹل کے ایک بیس سالہ بیرے نے دو خط لکھے ایک اپنے باپ کو اور دوسرا ڈی ایم کے کے لیڈر انادورائی کو۔ ان خطوں میں اس نے لکھا کہ وہ تامل کے لیے اپنی جان قربان کر رہا ہے۔ اس نے کھٹمل مارنے والا زہر پی لیا اور مر گیا، لوگوں کو اس سلسلے میں اپنی قطعی رائے ظاہر کرنا پڑی، وہ کس کے طرف دار ہیں بتانا پڑا۔

گروہوں کی تقسیم ہندی اور غیر ہندی کے روایتی خطوط پر ہوئی۔ بمبئی میں ذہین کارٹونسٹ لکشمن نے (جو خود کرناٹک

(جنوبی ہندوستان کے ہیں) "ٹائمز آف انڈیا (جس کے لیے وہ آج بھی کام کرتے ہیں) میں ایک کارٹون شائع کیا۔ کارٹون میں ہندوستان کے جہاز کو فرقہ پرستی، غربت، رشوت خوری اور کمزور دفاع کی مہیب لہروں کے تھپیڑے کھاتا اور جہاز کے کپتان اور غافل عملے کو انگریزی کی تحریروں کو ہندی میں بدلنے میں مصروف دکھایا گیا تھا، کلکتے میں انگریزی ادب کے استاد اور شاعر مسٹر پی لال نے ہندوستان میں انگریزی کے دفاع میں ایک بڑا سخت مضمون لکھا جس کے آخر میں انھوں نے لکھا تھا "اس سے زیادہ لچر کوئی اور بات نہیں ہو سکتی کہ لسانی مسائل کو سڑکوں اور گلیوں میں طے کیا جائے۔"

"۳۰ جنوری کو ہندو فرقہ پرستوں کے ہاتھوں گاندھی جی کے قتل کی برسی کے موقع پر شاستری جی نے ملک سے مخاطب ہو کر باقاعدہ اعلان کیا تھا "انگریزی ایک رابطے کی زبان کی حیثیت سے بدستور استعمال ہوتی رہے گی۔ اور پارلیمنٹ کے ایکٹ کے مطابق مدراس میں بغیر کسی رکاوٹ یا دشواری کے استعمال ہوگی" دوسرے دن، اس خوف کو دور کرنے کے لیے کہ ہندی کے قومی زبان بن جانے سے غیر ہندی لوگوں کے ساتھ امتیازی سلوک ہوگا، مرکزی حکومت نے سرکاری ملازمتوں میں ریاستوں کے کوٹے کی پیش کش کی۔ ۳۰ فروری کو کلکتے میں طالب علموں نے مظاہرہ کیا ان کے جھنڈوں پر لکھا تھا "ہم ہندی نہیں بولیں گے۔ ہم ہندی نہیں پڑھیں گے، ہم ہندی موسیقی نہیں سنیں گے" (اس میں آخری عہد ایک بڑی قربانی تھی کیوں کہ مقبول عام ہندی فلمی میوزک کا سارے ملک میں شوق پاگل پن کی حد تک موجود ہے)

۱۰ فروری کو وہ تشدد جو مدراس میں آہستہ آہستہ سلگ رہا تھا ایک دم بھڑک اٹھا۔ ایک دن میں دو درجن موتیں ہو گئیں۔ پولیس کو بیچ جگہ گولی چلانی پڑی۔ سیلم میں جہاں بدترین گڑبڑ ہوئی تھی فوج بلانا پڑی۔ تریپور کے مقام پر غضبناک مجمعے نے پولیس کے دو سب انسپکٹروں راماسوامی اور راین کے وشنکا تیسن کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نذر آتش کر دیا۔ تشدد پر ردعمل اتنا شدید تھا کہ یونین گورنمنٹ کے دو انتہائی اہم مدراسی وزیروں (سی۔ سبرامنیم (جنھوں نے بعد کو سبز انقلاب کا آغاز کیا) اور او۔ وی۔ الگاسن نے کانگریس کی مرکزی حکومت سے اس بنا پر استعفا دے دیا کہ وہ شاستری جی سے مدراس کے مطالبات منوانے میں ناکام رہے تھے۔ ۱۲ فروری تک پولیس نے پولاچی میں عوام کے خلاف ملکی مشین گنیں استعمال کرنا شروع کر دی تھیں۔ ایک اور تامل ترومچی کے ابتدائی اسکول کے ایک ہیڈ ماسٹر ویرا پن نے خودسوزی کا مظاہرہ کر کے اپنی جان دے دی (بعد کو جب ڈی ایم کے سریر حکومت پر آئی تو اس نے اس تحریک کے شہیدوں کو اعزاز دینے کی خاطر، ان کے پس ماندگان کو مالی انعامات دینے کا فیصلہ کیا۔ مگر سپریم کورٹ نے اس قدم کو غیر آئینی قرار دیا اور کہا کہ آئین، تمام ریاستی حکومتوں کو ہندی کی ترویج میں مدد کرنے کا ذمہ دار قرار دیتا ہے)

مرکزی حکومت کے وزیروں کے استعفے نے ایک ہیجان سا پیدا کر دیا کیوں کہ عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی

سیاست دانوں کو کسی عہدے کو چھوڑنے پر مجبور کرنا پڑتا ہے انھیں خود کسی چیز سے دست کش ہونا کچھ بہت پسند نہیں ہوتا ان استعفوں کا وہی اثر ہوا جو چاہا گیا تھا۔ تحریک نے ان لوگوں کو بیرد بنا دیا۔ وزیر اعظم لال بہادر شاستری جو خود ہندی پریمیوں کے ایک خاموش حامی تھے ان وزیروں کو اپنی کابینہ میں واپس نہیں لینا چاہتے تھے مگر صدر جمہوریہ ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن نے اس ضد کے عواقب سے متنبہ کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ اس سے ملک کا اتحاد خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس کے بعد ہی ان مطالبات کی تکمیل کے طریقوں پر کچھ سنجیدگی سے غور و فکر ہونا شروع ہوا۔

مطالبات کیا تھے ؟ تامل ایک قومی زبان کی حیثیت سے ہندی کو متروک قرار دیے جانے پر مصر نہیں تھے۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ یہ بات ناممکن ہے۔ وہ نہرو یقین دہانی کو جس میں کہا گیا تھا کہ ہندی کسی ایسے شخص پر مسلط نہیں کی جائے جو اسے نہیں چاہتا ہے، آئینی شکل دلوانا چاہتے تھے۔ ایک بار پھر یہ نہرو ہی کی بصیرت تھی جو اس ملک کی دست گیری کر رہی تھی "نہرو یقین دہانی" کے پیچھے کیا فلسفہ تھا اسے مختصراً بیان کرتے ہوئے ان کی ۱۳ ستمبر ۱۹۴۹ کی قانون ساز اسمبلی کی ایک تقریر کا اقتباس بہت مناسب رہے گا۔ " اپنے ملک میں انگریزی کے علاوہ ہماری خود اپنی زبان ہونا چاہیے۔ ..... ہمیں اس سلسلے میں جمہوری طریقہ کار اپنانا ہوگا یا ایک تحکمانہ رویہ؟ یہ سوالات میں ہندی کے پرجوش حامیوں سے کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کیوں کہ ان کی متعدد تقریروں میں جو میں نے یہاں اور بعض دوسری جگہوں پر سنی ہیں مجھے تحکمانہ لب و لہجہ محسوس ہوا ہے۔ یہ صرف یہی نہیں کہ بنیادی طور پر غلط رویہ ہے بلکہ یہ ایک خطرناک رویہ بھی ہے۔ اس سوال پر آپ سمجھ داری کے ساتھ غور کریں تو یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اگر آپ ہندی کو ان لوگوں پر مسلط کر دیں جو اس کے مخالف ہیں تو یہ طریقہ خود ہندی کے فروغ میں مددگار نہ ہوگا۔ ہندوستان کے جمہوری پس منظر میں یہ صورت حال یقیناً ناممکنات میں سے ہے۔ اسی لیے آپ کو ہندوستانیوں کے ان تمام گروہوں کی نیک خواہشات کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہوگی جن کی مادری زبان ہندی نہیں ہے۔ آپ کو ان لوگوں کے دل بھی جیتنے ہوں گے جو ہندی ہی کی ایک مختلف قسم بولتے ہیں جسے ہندوستانی یا اردو کہا جاتا ہے۔ آپ اگر کوئی ایسی بات کریں گے جو تحکمانہ نظر آئے تو وہ ناکام ہی رہے گی۔"

۱۷ فروری ۱۹۶۵ کو ہندوستانی پارلیمنٹ کے بجٹ کے اجلاس کا افتتاح صدر جمہوریہ کے خطاب سے ہوا۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے دونوں ایوانوں کی مشترکہ نشست کو خطاب کرتے ہوئے اراکین کو یہ یقین دلایا کہ ہندوستان میں انگریزی باقی رہے گی۔ ۲۴ فروری کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے حکومت سے یہ درخواست کرنے کا فیصلہ کیا کہ وہ "آفیشیل لینگویجز ایکٹ" میں نہرو کی یقین دہانی کو آئینی شکل دینے کے لیے ضروری ترمیم کرائے۔ بحران دھیما پڑ گیا

۱۹۶۷ء کے انتخابات میں، لسانی تحریک کے لیڈروں کے فیض سے ڈی ایم کے نے نفسیاتی رکاوٹوں کو توڑا، اور مدراس میں الیکشن میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ اس تحریر کے لکھے جانے کے وقت تک تحریک کو شکست نہیں ہوئی تھی، آج ہندی اور تامل ناڈ کے درمیان باہم گفتگو کرنے والے تعلقات نہیں ہیں۔ ہندی کا ریاست کے کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری کاروبار میں تذکرہ نہیں ہے، لیکن بہر حال ہندی، قومی شعور میں بتدریج اہم کردار ادا کرتی جا رہی ہے، مگر اب کوئی لسانی سامراج کا نعرہ لگاتا ہوا سڑکوں پر نہیں نکلتا۔ ۱۹۶۵ء کے بیس سال بعد، لوگ یہ بھول گئے ہیں کہ بہت عرصہ نہیں گذرا کہ ملک کے مستقبل کو زبان پر ہونے والے مباحثے سے خطرہ لاحق تھا۔



(۱۱)

ماضی اور مستقبل

پانچویں اور چھٹی دہائی میں، ہندوستان سے متعلق خبروں میں، بے یقینی اور "ظلمت کا علاقہ" جیسے استعاروں کے استعمال کا بڑا زور رہا، ہندوستان کی غربت، آپس کی پھوٹ، اس کی گندگی اور سب سے زیادہ اس کے ماضی کی شان پر عظیم آہ و بکا کا دور دورہ تھا۔ اس بات پر زیر لب مسکراہٹیں تھیں کہ ہندوستان اپنا ہاتھ محض بھیک مانگنے کے لیے بڑھاتا ہے حالانکہ اسے کسی بہتر کام کے لیے مثلاً منہ بند کرنے کے لیے استعمال ہونا چاہیے اور یقیناً اس جیسے جاہل اور ننگے بھوکے ملک میں جمہوریت کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بہترین حالات میں زیادہ سے زیادہ یہ ایک ناٹک ہو سکتا تھا، بدترین صورت حال میں افراتفری کا شور و غل جو ان تمام پوشیدہ اور تخریبی قوتوں کی حوصلہ افزائی کرے گا جو ملک کی فوری تباہی و بربادی کی ضامن ہوں گی۔ گمشدہ سلطنت کی اذیت نے برطانیہ کی آنکھوں کی یرقانی کیفیت کو اور بڑھا دیا اور امریکہ میں، ہندوستانی خارجہ پالیسی نے نظر کو اور مسخ کر دیا۔ وہ زمانہ سیدھے سادے تصورات کا زمانہ تھا اور مشہور سیٹو اور بغداد معاہدے کا رکن پاکستان اب بہتر لوگوں کے ساتھ تھا۔ یہ بڑی قابل توجہ بات ہے کہ ہندوستان میں ناگزیر موت کی پیشین گوئی کرنے والی کتابوں کی تو کمی نہیں تھی مگر کوئی ایسا "عالم" نہیں تھا جو پاکستان کی موت کی پیش بینی کرتا۔

ہندوستان پہلے سے طے کیے ہوئے رویوں کے شکنجے میں تھا، یہ رویے آج بھی دماغوں کو متاثر کرتے ہیں آج ملک، بھوک کی لعنت ختم کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکا ہے (اگرچہ غریبی اس کا آج بھی سب سے بڑا مسئلہ ہے) اچھی خاصی صنعتی بنیاد قائم کر لی ہے، تیل کے معاملے میں بھی اس کی حیثیت کے اچھے ہونے کے امکانات ہیں، اور

۱۹۸۴ میں بین الاقوامی مانیٹری فنڈ کے قرضے کی آخری قسط کے لینے سے انکار کے تیور بھی نظر آتے ہیں۔ مگر واشنگٹن کے حکام اور امریکی سیاح کے لیے ہندوستان آج بھی "بھکاری انڈیا" ہے مگر یہ بات آپ واشنگٹن میں کہیں تو شاید لوگ ہنس دیں۔ یہ لوگ تو کلکتہ میں مرنے والوں، آگرہ کے تاج محل اور جے پور کے راستے میں ملنے والے بیپروں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ (ٹھیک ہے۔ کلکتے میں اب لوگ مر نہیں رہے ہیں۔ آگرہ میں تاج محل کے قریب تیل صاف کرنے کا سب سے بڑا کارخانہ لگ گیا ہے، بیپرے اب لگتا ہے کہ وزارت سیاحت میں شریک ہو گئے ہیں۔)

نائی پال کی کتاب "این ایریا آف ڈارک نس" جیسی کتابوں پر ہمیں بہت وقت دینے کی ضرورت نہیں ہے یہ تو خوب صورت انگریزی کے پردے میں محض تعصب تھا۔ زیادہ صحیح شاید "سیلگ ہیریسن" کی کتاب "دی موسٹ ڈینجرس ڈکیڈس" پر نظر ثانی کرنا ہوگا۔ ہیریسن دہلی میں ایسوسی ایٹڈ پریس کے ایک قابل احترام نامہ نگار تھے جو ہندوستان، پاکستان نیپال، سری لنکا اور افغانستان کے بارے میں لکھا کرتے تھے۔ (اس وقت تک ظاہر ہے کہ بنگلہ دیش وجود میں نہیں آیا تھا) اس کتاب کے انتخاب کی وجہ صرف وہ اثر نہیں ہے جو اس کتاب نے اعلیٰ سیاسی حلقوں پر ڈالا تھا۔ اس انتخاب کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں اس علاقے کے لیے ایک ہمدردانہ رویہ بھی ملتا ہے۔ ہیریسن نے ان شکوک و شبہات کو پیش کرنے میں ان دلائل کو استعمال کیا ہے جو پانچویں دہائی میں بہت عام تھے اور جنھیں مفاد پرست آج بھی اس ملک کے بارے میں دنیا کے نقطہ نظر کو دھندلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں، آخری بات یہ ہے کہ ہیریسن کی کتاب پرنسٹن یونیورسٹی پریس نے ۱۹۶۰ میں شائع کی تھی اور ظاہر ہے کہ اس کتاب کے پیش نظر "موسٹ ڈینجرس ڈکیڈس" میں چھٹی ساتویں اور آٹھویں دہائی کا شمار ہوتا تھا اس وقت تک کل کی پیشین گوئیوں کا آج کی حقیقتوں سے موازنہ کرنے کا وقت آچکا تھا۔

ہیریسن نے جو سب سے بڑا خطرہ محسوس کیا وہ لسانی قوم پرستی کا خطرہ تھا، ہیریسن نے اپنی کتاب کا آغاز ایک ممتاز بنگالی پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی کے ایک اقتباس سے کیا ہے، چیٹرجی سنسکرت کے ایک بڑے عالم اور بنگالی قوم پرست تھے۔ ۱۹۵۷ میں، ہندوستان کے اتحاد کے دوام پران کو بھروسہ نہیں تھا۔ انھوں نے کہا کہ "ہندوستان کے لیے متعدد آمرانہ قوموں میں بٹ جانے کا بہت خطرہ ہے" انھوں نے جس جذبے کا اظہار کیا ہے وہ یہ تھا کہ نو ممتاز لسانی گروہ، جن پر غیر ہندی ہندوستان مشتمل ہے، ملک کے غالب مرکزی علاقے کے ساتھ مل کر نہ رہ سکیں گے۔ سیاسی افراتفری ہوگی اصلی سیاست علیحدگی کی طرف لے جائے گی اور پنجاب، راجستھان، گجرات، مہاراشٹر، کرناٹک، کیرالا، تامل ناڈو، آندھرا اور اڑیسہ، بنگال، آسام اور کشمیر کی راجدھانیوں میں کم حیثیت ڈکٹیٹروں کو براجمان کرا دے گی۔ اور یہ صورت حال ضروری نہیں ہے کہ آخری ہو کیونکہ دوسرے چھوٹے چھوٹے ضمنی گروہ اپنی خود مختاری کے مطالبات شروع کر دیں

گے اور اس طرح کے سلسلے چلتے رہیں گے"۔

ہیریسن نے پانچویں دہائی کا ہندوستان دیکھا تھا اور اس نے یہ کتاب اس صدی کے نصف میں لکھی تھی۔ اس نے پوٹی سری راما لو کی قربانی سے پیدا ہونے والے جذبات دیکھے تھے۔ ای۔ وی۔ راما سوامی نائیکر کا وہ مطالبہ بھی اس کے سامنے تھا جس کا ابھی کوئی حل نہ نکلا تھا۔ بنگالیوں کے شکوک اور ان کا جنون اور کشمیر سے متعلق کیے گئے وعدے کے ایفا میں نئے شبہات پر بھی اس کی نظر تھی۔ ہیریسن نے نہرو کو بار بار یہ آگاہی دیتے بھی سنا تھا کہ لسانی ریاستیں، اجان متی کا پٹارا کھول دیں گی جس سے ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ (نہرو نے انگریزوں پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ یہاں رہے تو تقسیم کرو اور حکومت کرو کے سہارے، اور اب ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے جانا چاہتے ہیں۔) اس نے جناح کے کامیابی کے ساتھ دکھائے ہوئے سبز باغ کے اثرات سے سینکڑوں سینوں کو پھوٹتے بھی دیکھا تھا۔ بہت سوں کو یقین تھا کہ وہ بھی اپنے یہاں وزیر اعظم اور گورنر جنرل بن سکتے ہیں۔ وہ جب اپنی کتاب لکھ رہا تھا اس وقت مہاراشٹر اور گجرات بمبئی کی ریاست کا حصہ تھے۔ اپنی علیحدگی حاصل کرنے کے لیے انھیں ۱۹۶۰ کے عوامی تشدد کی ضرورت تھی اور ہیریسن نے ملک کی ایک اقلیت سکھوں کو اس خطرے کے پیش نظر کہ وہ اسے خالصتان بنالیں گے جغرافیائی علاقہ نہ دے سکنے میں کانگریس کی بے بسی بھی دیکھی تھی۔ شیر کشمیر شیخ عبداللہ جنھوں نے اپنے حمایتیوں کو مذہبی پاکستان سے دور رکھا تھا جیل میں قیدی کی زندگی گزار رہے تھے۔ بیلگ ہیریسن نے اس مجموعہ اضداد صورت حال کو دیکھا اور پانچویں دہائی میں مایوس ہونے کا کافی سرمایہ بہم پایا مگر یہ سارے مسائل تو یکے بعد دیگرے وقت اور جمہوریت کے ساتھ ساتھ غیر محسوس طور پر حل ہوتے گئے۔ ایشیا کے دوسرے عظیم ملک چین نے، اپنے آپ کو دنیا سے الگ کر کے ایک پارٹی کے اقتدار اور اعتدال کا سنگم تخلیق کرنا شروع کر دیا تھا، ہندوستان ساری دنیا کے سامنے اپنے تجربے میں مصروف تھا۔ اس نے ہر شخص کے لیے اپنے دروازے کھول رکھے تھے اور ہر فرد کو آزادی تھی کہ وہ آئے اور اس کے پھپھولوں کو دیکھے۔ اور اگر چاہے تو اصلی چہرے پر نظر ڈالے بغیر، صرف اس کے پھپھولوں ہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھے۔

ہندوستان کی اپنی قومی بقا کی جد و جہد خود اپنے خلاف جد و جہد ہے، ایک تمدن اور گتھے ہوئے تہذیبی کل کی حیثیت سے ہندوستان نے اپنے وجود کو باقی رکھنے کی اس توانائی کا مظاہرہ کیا ہے جس کی نظیر صرف چین میں ملتی ہے، اگر ہمہ لسانی ہندوستان کے بکھرے ہوئے علاقے یورپ کی طرح کسی سیاسی اتحاد کی مدد سے اپنے آپ کو مجتمع رکھنے میں لگاتار ناکام ہوئے ہیں..... ہندوستان خود ایک دنیا ہے، لسانیاتی اعتبار سے مختلف لوگ، ان میں سے ہر ایک اپنے سے واقف، لاکھوں کروڑوں میں ان کی گنتی، ایسا شاید ہی کہیں ہوتا ہو کہ یہ سب لوگ ایک واحد سیاسی اکائی کے اندر

رہ کر ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہوں۔ سیلگ ہیریسن نے ۱۹۶۰ میں لکھا تھا: "یہ امکان کہ طوائف الملوکی، فاشزم اور چھوٹے چھوٹے آمرانہ ممالک" میں سے ہر ایک اس سیاسی اکائی "کو آنے والی دھائیوں میں آج نہیں تو کل، ابھی نہیں تو پھر کبھی، اذیت پہنچائے گا۔ یہ امکان ہندوستان کی کسی پیدائشی نا اہلیت کا نہیں ہندوستانی قوم پرستی میں مضمر چیلنج کا پیمانہ ہے اور یہ ہیریسن کے نکالے ہوئے نتائج کا سب سے زیادہ مایوس کن حصہ نہیں تھا۔

مگر کثیر لسانی ہندوستان کے الگ الگ علاقے ۱۹۶۰ سے چوتھائی صدی کے بعد بھی بکھرنے اور معدوم ہونے میں ناکام ہوئے ہیں۔ طوائف الملوکی ایک ایسا لفظ ہے جو ہندوستانی سیاست کو بیان کرنے کے لیے کبھی کبھی استعمال ہوتا رہا ہے مگر اب اسے کوئی بھی اس مقصد کے لیے استعمال نہیں کرتا اور جہاں تک فاشزم سے پینگیں بڑھانے کا تعلق ہے اس کا آغاز ہیریسن کے خوف ناک کمیونسٹوں کی طرف سے نہیں بلکہ ایک ڈیموکریٹ کی طرف سے ہوا جس نے بڑی سمجھ داری کے ساتھ جمہوریت کی طرف رجوع کرنے کا فیصلہ کیا اور نہایت کامیابی کے ساتھ کیا اور یہ ڈیموکریٹ تھیں مسز اندرا گاندھی۔

جنوب میں بسنے والی قومیتوں میں ڈکٹیٹروں —— کے سامنے آنے کی بجائے مسٹر ہیریسن کے زمانے کے بعد ہندوستان میں اگر کوئی غیر معمولی لہر پیدا ہوئی تو وہ تھی دو فلمی اداکاروں کی وجہ سے جنھوں نے دو طرح کے ڈراموں کے درمیانی خط فاصل کو اپنی اپنی ریاستوں کے وزیر اعلیٰ بننے کے لیے پار کر لیا۔

ہندوستان کو جو حقیقی خطرہ درپیش ہے وہ ان مذہبی مفادات کی طرف سے ہے جنھوں نے ۱۹۴۷ میں پاکستان کی تخلیق کی تھی۔ دوسرے خطرات یا تو دور کیے جا چکے ہیں یا دور کیے جا رہے ہیں اس صدی کی چوتھی دہائی میں مسلم مذہبی رہنماؤں نے مختلف حلقوں کے تعاون سے تقسیم اور تفریق کا کھیل کھیلا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ایک جمہوری اور سیکولر ریاست میں ان کا مستقبل تاریک تھا۔ آٹھویں صدی میں سکھ مذہبی رہنماؤں نے اسی طرح ایک جنگ کو مزید شدید بنایا۔ مسلم کامیابی کی کلید کا جزوی سبب تو یہ ہوا کہ سیکولر سیاست داں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ان کا مقابلہ کیوں کر کرے۔ سکھ سنت کو یہ توقع ہے کہ یہی صورت حال دوبارہ ہو گی۔ مذہبی رہنما کی آرزو صرف ایک ایسا عارضی غصہ ہے جو اس کی کمیونٹی کو اپنی لہر میں بہا لے جائے، اس فتنے کو اتحاد کو تباہ کرنے اور ایک اور علاقے کو مذہبیت کے ہاتھوں میں دے دینے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف، سیاست داں کے لیے یہ چیلنج ایک غیر معمولی چیلنج ہے۔ ایک اقلیت کی اقتصادی ضرورتوں کو پورا کرنے اور اس کے جذباتی اور مذہبی خدشات کے درمیان ایک توازن تلاش کرنا ہوگا اور ایک ایسی جمہوری فضا برقرار رکھنا ہو گی جس میں اکثریت، اقلیت کو دی جانے والی خصوصی توجہ کو بھی برا مان سکتی ہے۔ پنجاب کے باب میں ہم اسی صورت حال کے ہزاروں لاکھوں دھاگوں کے تانے بانوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

ایک طرف پاکستان، بنگلہ دیش اور نیپال اور دوسری طرف ہندوستان کے باہمی تعلقات میں، ۱۹۴۷ء میں ملنے والی امید اور خوف کے ورثے کا پرتو ہمیشہ نظر آئے گا۔ دلی پر بڑا بھائی بننے کی کوشش کرنے کا الزام لگتا رہا ہے اور یہ الزام محض اسلامی ڈھاکہ اور اسلام آباد ہی نہیں بلکہ خالص ہندو کھٹمنڈو اور بدھ متی کولمبو کی طرف سے بھی عاید کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ صرف ہندو ہندوستان کے مسلم پاکستان کے خلاف ہونے ہی کا سوال نہیں ہے۔ ہندوستان کی سرحدوں پر چین اور برما کے علاوہ اسلامی جمہوریہ پاکستان، عوامی اسلامی جمہوریہ بنگلہ دیش، نیپال کی ہندو سلطنت اور بھوٹان کی چھوٹی سی بادشاہت ہے۔ ایک چیز ہے جو ان تمام ملکوں میں مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی بھی ملک میں جمہوریت نہیں ہے؟ اگر ایک طرف بھوٹان خود اپنے خیال میں مست ملک ہے تو دوسری طرف دوسرے ایک بین الاقوامی نظام کا حصہ ہیں۔ خود برصغیر کی قومیں یا ضمنی قومیں ایک دوسرے کے ساتھ نہ صرف تاریخ مذہب زبان اور تہذیب کے ذریعے ملی ہوئی ہیں بلکہ وہ ان اقتصادی تعینات سے بھی ایک دوسرے سے منسلک ہیں جو ان دریاؤں کی طرح بین الاقوامی معاملات میں رواں دواں رہتے ہیں جن کا پانی باہمی کشمکش کا ایک مستقل ذریعہ ہیں۔

پاکستان، بنگلہ دیش اور نیپال ہندوستان سے ایک منفی توانائی حاصل کرتے ہیں اپنے ایک الگ تشخص کو قائم رکھنے کے لیے وہ خود اپنے سامنے اور دنیا کے سامنے اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ وہ ہندوستان سے نسلی اور ثقافتی طور پر مختلف ہیں اور اسی لیے سیاسی طور پر بھی الگ ہیں ان کی یہ کوشش مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے۔ ایک سطح پر مثال کے طور پر بنگلہ دیش کی وہ کوشش ہے جو وہ بول چال کی بنگالی زبان میں 'اسلامی' کی ہلکی سی جھلک کو برقرار رکھنے کے لیے کرتا ہے اسی طرح دوسری طرف پاکستان کے طبقہ اشراف کی لکھنؤ کی گلیوں کے بجائے اپنے مغرب میں عرب کے صحراؤں میں یا ایران کے کشت زاروں میں، اپنے تہذیبی رشتوں کی تلاش و جستجو کی کوششیں ہیں۔ یہ سب عارضی، ناپائیدار اور بے ضرر ہو سکتا تھا اگر "دشمن ہندوستان" سے اپنے آپ کو دور رکھنے کی مسلسل کوشش نہ ہوتی کہ یہ خطرناک جغرافیائی سیاست کی طرف لے جا سکتی ہے۔

یہ ہندوستان کی صرف طویل و عریض جسامت ہی نہیں ہے جو اس کے پڑوسیوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کرتی ہے بلکہ یہ ان کے حکمرانوں کا مالیخولیا بھی ہے جنھیں یہ خوف گھیرے رہتا ہے کہ کہیں اس سے دوستی اور جمہوریت ان کے عوام کے لیے ضرورت سے زیادہ دلکش و دل فریب ثابت نہ ہو اور خصوصاً اس وقت جب ایک مشترک تہذیب کی حقیقت بھی روز روشن کی طرح موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حکومتوں کو رکاوٹوں کی، بندشوں کی ضرورت ہے۔

جمہوری آرزوؤں کی نسیم، سرحدوں کے پار پہنچ کر ان مفاد پرستوں کا تختہ پلٹ سکتی ہے جنھوں نے

پاکستان اور بنگلہ دیش دونوں پر قبضہ جما رکھا ہے۔ اگر ہندوستان اپنے لامحدود مسائل کے باوجود اپنے یہاں جمہوری نظام نافذ کر سکتا ہے تو پاکستان یا بنگلہ دیش ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ یہی سوال ہے جو مشرق اور ہندوستان کے مغرب دونوں میں ملا اور فوج کے گٹھ جوڑ کو پریشان رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر ہندوستان اپنے یہاں فرسودہ جاگیردارانہ نظام کو ختم کر سکتا ہے تو نیپال بدستور ۱۹ویں صدی میں آخر کیوں رہے؟ اسی لیے برصغیر میں بڑے توانا مفادات موجود ہیں جو ہندوستان میں جمہوریت کی ناکامی اور اس کے اتحاد کی تباہی کو دیکھ کر خوش ہوں گے۔

برصغیر کے دل اور دماغ کے لیے لڑی جانے والی لڑائی ابھی اپنے انجام سے بہت دور ہے۔



دُوسرا حصّہ

پنجاب

(۱)

مسئلے کی نوعیت

۱۹۸۴ کے پنجاب میں، ہندوستان کی تمام دوسری ریاستوں کے مقابلے میں، ٹیلی ویژن سیٹوں اور ویڈیو کیسٹ ریکارڈوں کے اشتہارات کہیں زیادہ ہوتے تھے۔ ہندوستانی بازاروں کی ہر چیز کے لاتعداد اشتہار پنجاب کی سڑکوں اور عمارتوں پر نظر آتے تھے اور یہ سب کچھ اس حقیقت کا بیّن ثبوت تھا کہ پنجاب ہندوستان کے باقی اکثر حصوں کے برعکس اب تیسری دنیا کا حصّہ نہیں رہا ہے۔ وہاں گاؤوں میں اب مٹی اور پھونس کی جھونپڑیوں کی جگہ اینٹ اور پتھر سے بنے ہوئے پختہ مکانات تھے۔ عوام جفاکش تھے انھوں نے سخت محنت کی تھی۔ کھیت سرسبز و شاداب تھے۔ قریب ہی واقع ہمالیہ کی اونچائیوں سے پانی آتا تھا۔ بیج اور کھاد کی نئی قسموں نے پنجاب کو ہندوستان کے غلے کا گودام بنا دیا تھا۔ ملک کے کسی حصّہ کا قصّہ اگر کامیابی کا قصہ تھا تو وہ پنجاب کا تھا۔

متضاد اور یقین نہ آنے والی حقیقت یہ تھی کہ یونین آف انڈیا میں پنجاب ہی وہ واحد ریاست تھی جہاں دہشت پسندوں کی بندوقوں کے سامنے ملک کے وجود کی آزمائش تھی۔ اچھی طرح سے منظم اور پورے طور پر ایک مسلح گروپ سامنے آیا تھا اس کا مطالبہ اور اس کا مطمح نظر سیدھا سادا تھا۔ سکھوں کے لیے ایک خودمختار ملک، جس کا فی الوقت نام خالصتان رکھ لیا گیا تھا (پاک لوگوں کی سرزمین، حسن اتفاق دیکھیے کہ پاکستان کے معنی بھی یہی ہیں) ۱۹۴۷ء میں جس طرح مغربی پنجاب پاکستان بنا تھا اسی طرح اگر مشرقی پنجاب اپنے آپ کو خالصتان کی مذہبی ریاست میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو متحدہ ہندوستان کے وفاق کے سارے تجربے کو ایک ایسا دھکا لگے گا جس سے شاید ہندوستان پھر کبھی پنپ نہ سکے۔ اگر پنجاب نکل گیا تو کشمیر بھی نکل جائے گا۔ نقشے پر سرسری نظر اس بات کی تصدیق کر سکتی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ یہ دونوں ریاستیں پاکستان سے ملی ہوئی ہیں بلکہ ہندوانڈیا، پنجاب کے جنوب میں ختم ہو جاتا ہے۔ پنجاب سکھوں کی کثرت والی ریاست ہے اور جموں و کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ سکھوں اور ہندوؤں کے قریبی تعلقات نے

اس حقیقت پر پردہ ڈال رکھا تھا ہندوؤں نے سکھ ازم کو ایک الگ مذہب نہ سمجھتے ہوئے اسے ہندو ازم ہی کی ایک ذرا مختلف شکل سمجھا، سکھ ۔ ہندو پنجاب کو نہیں بلکہ مسلم کشمیر کو ہندوستان کے اتحاد کے لیے ایک خطرہ تصور کیا گیا۔

سکھ ازم کتنا ہندو تھا یہ بحث پرانی ہے سکھوں نے اپنے مذہب کی ہندو تاویل کو کبھی نہیں مانا مگر اس مسئلے نے کش مکش اور تنازعے کی شکل صرف اس وقت اختیار کی جب، بیسویں صدی کے آخر میں سکھوں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ نہ صرف ان کی عبادت گاہوں کا کنٹرول غیر سکھوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے بلکہ خود ان کے مذہب کا وجود ہی خطرے میں آ گیا ہے ۔ سکھ ہندو دھرم کی طرف اسی طرح واپس لوٹ رہے تھے جس طرح کبھی جینیوں اور بدھ متیوں نے کیا تھا، جذب ہونے کا خطرہ مبلغین کے ان وعظوں سے اور بڑھ گیا جن میں اس بات پر اصرار ہوتا تھا کہ سکھ ہندو ہیں مگر ایک دوسرے نام سے ۔ ایک سکھ کو ہندو کہنا ویسا ہی ہے جیسے آپ ہر مسلمان کو یہودی کہنے لگیں ۔ مسلمان اور یہودی بلکہ عیسائی تینوں کے مابین اتنا ہی سب کچھ مشترک ہے جتنا کہ ہندوں اور سکھوں میں ۔ تینوں یہودیانہ مذاہب، ایک خدا اور پیغمبروں کے ایک سلسلے پر یقین رکھتے ہیں ان کا جھگڑا خدا کا رسول کون تھا کے سوال پر مرکوز ہے ۔

سکھ اور ہندو کے درمیان فاصلہ جوں جوں بڑھتا گیا ویسے ہی اس خیال کو بھی تقویت ملتی رہی کہ سکھ ازم کی بقا کی کوئی صورت نہیں ہے سوائے اس کے کہ اسے ایک الگ ملک کی چھتر چھایا مل جائے اس تحریک میں آگے آگے ظاہر ہے کہ مذہبی رہنما تھے ۔ کیوں کہ اگر خدانخواستہ لوگوں نے مذہب کو چھوڑا تو سب سے زیادہ نقصان اسی گروہ کا تھا ۔ اور ایک مذہبی ریاست کے قیام سے فائدہ بھی سب سے زیادہ ان ہی کو ہونا تھا ۔

دلی کے لیے ایک معاندانہ پنجاب ناقابل قبول تھا اگر ہندوستان کو باقی رہنا تھا تو اس پنجاب کو انڈین یونین ہی میں رکھنا تھا ۔ سمجھا بجھا کر یا پھر زور زبردستی سے ۔ دلی جو ایک زمانے میں ایک ایسے ہندوستان کا قلب تھا جو درہ خیبر کے قرب وجوار کے پہاڑوں سے لے کر برما کے جنگلوں تک پھیلا ہوا تھا اگر پنجاب اس سے الگ ہو جاتا، تو یہ محض ایک سرحدی شہر رہ جاتا اس کے بعد کون حکمراں اتنا طاقت ور ہوتا جو برصغیر میں سرگرم مختلف قوتوں کو کسی ایک صحیح سمت کی طرف لے جا سکتا اور ان پر قابو بھی رکھ سکتا؟ ہندوستان نے عہد مغلیہ کے انحطاط کے آخری زمانے میں ایک کمزور دلی کے تباہ کن اثرات دیکھے تھے، جب ملک کسی کا بھی منتظر ، وہ چاہے دیسی ہو یا بدیسی کے رحم وکرم پر تھا ۔ ہندوستان نے اسی وقت ترقی دیکھی تھی جب مرکز بغیر جابر اور عیاش بنے مستحکم اور مضبوط تھا ۔

ظاہر ہے کہ ہر عہد کے اپنے اپنے خیالات اور نظریات ہوتے ہیں رشتوں اور تعلقات کی نئی نئی شکلیں ہوتی ہیں اور زندگی کی کیفیت کو بہتر کرنے کی تازہ آرزوئیں ۔ اور یہ سب عوامل حکمرانی کے مختلف ڈھانچے تخلیق کرنے اور سماجی

رشتوں کو تبدیل کرنے کی کوششوں کو جنم دیتے ہیں مگر بہت سے ناگزیر طریقوں سے، حال، ماضی کی عکاسی کرتا ہے اور بعض ضرورتیں، جمہوریت، استعمار یا جاگیرداری کی سیاست سے بھی قدیم ہوتی ہیں، آدمی کو اپنی شناخت اور عقیدے کی اسی طرح ضرورت ہوتی ہے جس طرح اسے روٹی کی۔ پنجاب کا بحران آرزوؤں، خطروں اور ضرورتوں کا ایک بڑا پیچیدہ عکس نما ہے ہاتھ کی خفیف سی جنبش اتصال اور اتحاد کے نئے نئے نمونے تخلیق کر دیتی ہے۔ مسئلے کو سمجھنے کے لیے اجزا کو سمجھنا بہت ضروری ہے تاکہ کُل کو صحیح تناظر کے ساتھ دیکھا جا سکے۔ پنجاب کا زخم بھرا جا سکتا ہے مگر متعصب اور غلط تشخیص سے نہیں۔

۱۹۴۷ میں تقسیم ہند کے بعد، آئین ہند کی مدد سے قائم رکھا جانے والا ہندوستان، کیا اتنا مضبوط ہو گیا ہے کہ وہ بغیر ظالم و جابر بنے نہایت چست و چالاک مذہبی مجنونوں کے چیلنجوں کو جذب کر سکے، جھیل سکے؟ کیا ہندوستان، پنجاب کے مسئلے اور پنجاب کے دہشت پسندوں دونوں سے زیادہ بڑا اور زیادہ مضبوط ہے؟ کیا سکھ واقعی ایک نئے ملک کے لیے لڑ رہا ہے یا وہ مسائل کا حل چاہتا ہے جو علیحدگی کے بغیر بھی ممکن ہے؟ کیا سکھ قیادت کی موجودہ مایوسی ہندوؤں سے اس کے تعلقات میں مضمر ہے یا سکھوں میں پیدا ہونے والے اور نظر آنے والے نئے رجحانات میں پنہاں ہے یا دونوں میں۔ ہندوازم کہاں ختم ہوتا ہے اور سکھ ازم کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ تعلیم اور چھٹی اور ساتویں دہائی کی نئی خوش حالی کے کیا اثرات پڑے ہیں؟ کیا سکھوں کی سمت دستعدی نے اسے بدل دیا ہے؟ سب چھوٹے چھوٹے سوالات ہیں مگر ان کے جواب ذرا طویل ہوں گے۔ ان سوالوں پر، سکھ تاریخ داں اور صحافی خشونت سنگھ نے اپنی کتاب "اے ہسٹری آف سکھس" (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، جلد دوم، صفحہ ۳۰۲) میں بخوبی روشنی ڈالی ہے۔ "سکھ معاملات کا ایک طالب علم دونوں تحریکوں کی مستقبل کی سمت کے بارے میں قیاس آرائیاں کر سکتا ہے۔ یہ دو تحریکیں ہیں، ہندوازم میں ضم کر لینے کے خطرے کے خلاف سکھ تحریک اور سکھ ریاست کے لیے چلائی جانے والی مہم۔ یہ دونوں تحریکیں ایک دوسرے سے اس سے کہیں زیادہ قریب ہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا اور تسلیم کیا جاتا ہے۔



۲

ایک پُرانا خوف

پانچویں صدی قبل مسیح سے پانچویں صدی عیسوی تک ایک ہزار سال سے زیادہ برسوں کی بات ہوگئی۔ آریاؤں کا اپنایا ہوا دھرم جو بعد کو ہندو دھرم کے نام سے جانا گیا، بڑے خطرے میں رہا۔ معقول تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ آریا اس برصغیر کی طرف ۱۵۰۰ قبل مسیح کے آس پاس ہی آئے تھے۔ جب روسی قبائلیوں کے ترکِ وطن نے جو انھیں یونان، ایشیا اور ایران پہنچانے والا تھا، افغانستان سے پرے ہندوکش کی پہاڑیوں کے دروں سے گزر کر وہاں پہنچ گئے جو آج پنجاب کے نام سے جانا جاتا ہے۔

پنجاب کا مطلب ہے "پانچ دریاؤں کی سرزمین" وہ پانچ دریا ہیں جہلم، چناب، راوی، بیاس اور ستلج، شاید زیادہ صحیح نام ست آب ہوتا — یعنی سات دریاؤں کی سرزمین اس لیے کہ جس وقت آریا یہاں آئے اس وقت دریاؤں کی یہی تعداد تھی۔ دریائے سندھ جو مغربی سرحد کی نشان دہی کرتا تھا اسے گنتی سے نکال دیا گیا اور ساتواں دریا "سرسوتی" خشک ہوگیا (سرسوتی، علم کی ہندو دیوی کا بھی نام ہے، اور بعض مخبوط الحواس افراد کا خیال ہے کہ اس نام کے دریا کا سوکھنا، آج آٹھویں دہائی میں پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی علامت ہے۔)

آریا وحشیوں کی کسی سرزمین پر نہیں آئے تھے ان کا ورود یہاں اس وقت ہوا جب ایک عظیم تمدن جو وادی سندھ کی تہذیب کے نام سے جانا جاتا ہے نزع کے کرب سے گزر رہا تھا۔ شہروں کا ایک سلسلہ تھا جو مشہور ہڑپا اور موہنجو داڑو سے سندھ میں کوٹ دیجی، راجستھان میں کالی بنگن، گجرات میں لوتھل اور پنجاب میں روپڑ تک پھیلا ہوا تھا۔ آریا سب سے پہلے پنجاب میں قیام پذیر ہوئے اور ان کے پروہتوں اور مذہبی رہنماؤں نے ہمیں "رگ وید" کے وہ ایک ہزار اٹھائیس اشلوک تدوین کیے جو آریائی عہد کی ابتدائی زندگی کے اولین ریکارڈ ہیں۔ دلی کے شمال میں اسی زمانے میں وہ تاریخی لڑائی مہابھارت لڑی گئی جو دنیا کی طویل ترین نظم کا موضوع بنی۔ دو رزمیہ داستانوں مہابھارت اور رامائن میں جس کے

خالق بالترتیب ویاس اور والمیکی بتائے جاتے ہیں، خیال ہے کہ ایک ہزار اور سات سو سال قبل مسیح کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں رزمیے ہندو مذہبی صحیفوں کا مرکزی متن ہیں۔ ہندو تصورات کو وجود بخشنے والی زیادہ تر علامتیں انہی دونوں سے ملی ہیں۔ مثال کے طور پر رام کی حکومت، جو دوسرے اور بعد کے رزمیے کے ہیرو ہیں، طاقت کے منصفانہ اور مساوی استعمال کی مثال ہے انگریزوں کے جانے کے بعد گاندھی جی نے بھی ہندوستان میں ایسے ہی رام راجیہ کا خواب دیکھا تھا۔ بہر حال یہ کوئی ایسا تصور نہیں تھا جس کے بارے میں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ بیسویں صدی کی مسلم قیادت میں بھی شرف قبولیت حاصل کر سکتا تھا۔ مسلم قیادت نے اسے ہندو غلبہ کو "قابل قبول" بنانے کی کوشش قرار دیا اور بالآخر ۱۹۴۷ میں پنجاب اور بنگال کو بانٹ کر اپنا پاکستان تخلیق کر لیا۔

دھاتوں کے زمانہ کے آغاز سے جو ٹکنالوجیکل ترقی شروع ہوئی اس نے آریاؤں کے برصغیر کے مشرق اور جنوب کے سفر کی راہ کو ہموار بھی کیا اور ان کی رفتار کو نسبتاً تیز بھی کر دیا۔ رام کی سلطنت جو کوسلا کے نام سے مشہور تھی، مشرقی اتر پردیش اور مغربی بہار کے علاقے میں تھی اور رزمیہ میں رام، سری لنکا کے مہاراجہ راون سے سیتا کے اغوا پر اپنی عظیم جنگ لڑنے کے لیے جنوب جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آریا اس وقت تک جنوب کی فتوحات بھی شروع کر چکے تھے جیسا کہ ہم نے پچھلے صفحات میں کہا ہے جنوبی ہندوستان کی ریاست تامل ناڈو میں جب مشاہیر کی حیثیتوں پر نظر ثانی ہوئی تو اس میں راون ایک ایسا مقامی دراوڑ ہیرو بن گیا جو ان آریائی آبادکاروں کے خلاف نبرد آزما تھا جن کی نمائندگی رام کر رہے تھے۔ بہر حال اگرچہ جنوب نے جواز تلاش کر لیے اور جزوی طور پر رزمیہ کو رد بھی کر دیا مگر یہاں روایات اور ان عقاید کو ہمیشہ چیلنج نہیں کر پائے جنھیں لے کر آریہ سارے برصغیر میں پھیلے تھے۔

ایک روایت، آریاؤں کے ہندوستان کے اولین تجربات (اس نئے پنجاب سے باہر) کے نتیجے کے طور پر تھی۔ گائے کا احترام اور اس کا تحفظ۔ آریہ ہندوستان میں چرواہوں کی طرح آئے تھے، جن کی گزر بسر مویشیوں اور ان سے ملنے والی دوسری اشیا پر ہوتی تھی اور گائے ان کے آرام و آسایش کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی دولت کا بہترین پیمانہ بھی تھی۔ یہ جانور اتنا متبرک سمجھا جاتا تھا کہ عام زندگی میں اس کا کھانا ممنوع تھا، بڑے خصوصی موقعوں پر اس کا یہ استعمال روا تھا۔ مذہبی رہنماؤں نے جلدی ہی گائے کو مقدس بنا دیا اور اس کا گوشت کھانے کی فہرست سے یکسر خارج ہو گیا۔ گائے کے اس تقدس کی جڑیں بڑی گہرائی تک پہنچیں اور اسے بدھ اور مہاویر جیسے ویدانت پر اعتراض کرنے والوں نے بھی کبھی چیلنج نہیں کیا۔

گائے ایک سیاسی مسئلہ صرف اس وقت سے بنی جب سے مسلمان یہاں آئے۔ مسلمان گائے کے گوشت کو بکرے اور مرغی کے گوشت سے مختلف نہیں سمجھتے تھے۔ نئے ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین سب سے

زیادہ کشت وخون کا ذمہ دار گائے کو گوشت میں بدلنے کے علاوہ کوئی دوسرا مسئلہ نہیں رہا۔ اس وقت جب کہ یہ تحریر لکھی جا رہی ہے سیکولر ہندوستان میں گائے کا ذبیحہ جاری ہے۔ اس کا سہرا مارکسیوں کے سر ہے جو مغربی بنگال اور کیرالا دونوں جگہوں پر حکومت کرتے ہیں انھوں نے باقی ملک کی طرح اپنے یہاں گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگانے سے اتفاق نہیں کیا جب کہ مسلمانوں کی اکثریت والی ریاست کشمیر بھی ذبیحہ گاؤ کی اجازت نہیں دیتی اور مسلمانوں سے بھیڑ بکری کا گوشت کھانے پر اکتفا کرنے کو کہتی ہے۔ کشمیری برہمن وہاں کے لوگوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے سور کا گوشت جس سے مسلمانوں کی طرح یہودی بھی پرہیز کرتے ہیں، نہیں کھاتے (حالانکہ کشمیری برہمن اپنی ذات کے دوسرے لوگوں کی طرح سبزی خور نہیں ہیں) دہلی اور پنجاب کے مسلم حکمرانوں کے خلاف اپنی لڑائی کے زمانے میں سکھوں نے گائے کے تحفظ کی اپنی خواہش کا بہت مظاہرہ کیا مگر آٹھویں دہائی میں تعلقات کی نوعیت میں تبدیلی آجانے کی وجہ سے تشدد پسند سکھوں نے ہندو مندروں میں گائے کے سروں کو رکھ کر ہندوؤں کو بھڑکانا شروع کیا۔

ہندوستان کے ذات کے عجیب وغریب نظام میں پنجاب کے آریاؤں کا خاصہ حصہ ہے۔ رومیلا تھاپڑ (اے ہسٹری آف انڈیا۔ پنگوئن بکس ۱۹۶۶) جیسی تاریخ داں خاتون نے اس تعصب اور عدم رواداری کو آریاؤں کے اس تعصب کا براہ راست نتیجہ قرار دیا ہے جو ان کے دلوں میں، ان نسبتاً کالی نسلوں کے لیے تھا جن سے برصغیر میں ان کا مقابلہ ہوا تھا اور جنھیں انھوں نے محکوم بنایا تھا۔ آریاؤں کی تین اعلیٰ ذاتیں تھیں، برہمن یا مذہبی رہ نما، کشتری یا سپاہی اور ویش یا تاجر اور کسان ان سب کے نیچے شودر تھے یا سیاہ فام اس سرزمین کے اولین باشندے جنھیں سب سے پہلے تو بے زمین کھیت مزدور بنایا گیا اور بعد کو انتہائی جسمانی اور اخلاقی تحقیر ان کا مقدر بنی۔ جلد ہی یہ سب سے نچلی ذات اچھوت قرار پائی اور اس ظلم وجبر کا شکار ہوئی جس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔ بعد کا کوئی نظریہ ذات کے اس تعصب کو مٹا نہ سکا۔ کچھ لوگوں کو اسے کم کرنے میں کچھ کامیابی ضرور ہوئی۔ بدھ مت نے اپنی برہمنیت اور ذات مخالف رجحان کی وجہ سے شودروں میں بہت سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا مگر خود یہ مذہب ہندوستان میں باقی نہیں رہ پایا کیوں کہ اعلیٰ ذات کے جن لوگوں نے تبدیل مذہب کیا تھا وہ بالآخر پھر ہندوازم کی طرف لوٹ گئے۔ اسلام اپنے مساوات اور برابری کے پیغام اور اللہ کے سامنے مساوات کے کھلم کھلا مظاہرے کے باوجود، ذات پات کے نظام کی پرفریب ترغیبات کا شکار ہو گیا۔ اگرچہ ہندوستانی مسلمانوں نے ذات پات کے لیے اپنے تعصب کو اتنا جابر نہیں بنایا جتنا کہ ہندوؤں نے اسے بنا دیا تھا مگر ان میں بھی، وہ اخوت اور بھائی چارگی مفقود تھی جو ان کے ایمان کا مسلّم نظریہ تھی۔ گرونانک کے مذہب سکھ ازم نے بھی ذات پات کو ممنوع قرار دیا مگر اچھوتوں میں سکھ ازم کو اپنانے والوں کو اونچی ذات

کے ان کے ہم مذہب بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں

آریائی مذہبی رہنماؤں اور پنڈتوں نے کسی تاخیر کے بغیر سود و زیاں کا حساب لگایا اور فوراً اپنے آپ کو اعلیٰ ترین مقام پر فائز کر لیا۔ جواز یہ پیش کیا کہ یہ صرف برہمن ہی ہے جو غیر محفوظ راجاؤں کو مقدس توثیق کی سند عطا کر سکتا ہے۔ برہمن، کمیونٹی کا دماغ اور اس کی زبان بن گیا۔ سپاہی دست و بازو اور کسان زانو ہو گئے۔ رہا اچھوت تو وہ پاؤں تلے کچلا جانے لگا۔ دماغ نے کرم اور دھرم کے نظریات تخلیق کیے۔ اوّل الذکر کے ذریعے ذات پات کی اس ناانصافی کو سیدھی سادی یہ وضاحت کر کے کہ یہ آدمی کی پچھلی زندگی کے اعمال کے مطابق سزا یا جزا ہے حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ موخر الذکر نے فطری نظام، کا ایک مذہبی غلاف فراہم کر دیا جس کے اندر ہر چیز کی اپنی ایک حیثیت تھی اور اپنا ایک مقام تھا اور ذات بھی ظاہر ہے ان ہی چیزوں میں شامل تھی۔

بظاہر، ذات پات کا نظام اس صدی تک جاری رہا مگر اس وجہ سے نہیں کہ اس کے سامنے چیلنج نہیں تھے۔ پچھلے تین ہزار برسوں کے عمل اور ردّ عمل پر ایک سرسری نظرڈالنا بہت ضروری ہے کیوں کہ وہ انگریزوں کے عہد کے بعد کی ہندوستانی جمہوریت کے ڈرامے کی سیاست میں بار بار سامنے آتا ہے۔ اپنے جغرافیائی محل وقوع کے طفیل، پنجاب خاص طور پر، نظریات کے اختلاط اور ان کو پروان چڑھانے کے معاملے میں ایک انوکھا مقام رکھتا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کے علاوہ ہر حملہ آور پنجاب کی سرزمین ہی میں داخل ہوا۔ ان میں وہ بھی تھے جو یہاں مستقل قیام کی نیت سے آئے جیسے آریا، تورانی، ترک افغانی اور مغل اور یونانیوں اور ایرانیوں جیسے وہ لوگ بھی تھے جو آ کر واپس لوٹ گئے (موخر الذکر دارا یس کے عہد ۴۸۵ – ۵۲۱ ق م میں آئے اور تقریباً سو سال تک اس علاقے پر حکومت کرتے رہے جس میں پشاور، ٹیکسلا اور راولپنڈی شامل ہے۔ یہ جگہیں آج، پاکستان میں ہیں) اگر ویدانت ہندو ازم پنجاب میں سن بلوغ کو پہنچا تو دو سو سال سے کچھ زیادہ کے بعد اسلام کو بھی یہیں جڑیں پکڑنا تھیں۔ یہاں کے لوگوں کے ذہن اور تہذیب میں اپنا حصہ شامل کرنا تھا اور یہ بات کہ جذبات اور نظریات کے ملن کا نتیجہ ایک نئے مذہب سکھ ازم کی پیدائش کی شکل میں سامنے آئے غالباً صرف پنجاب ہی جیسی سرزمین میں ممکن تھی۔

ہندو ازم کے لیے اوّلین خطرات پانچویں صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئے دونوں خطرات کی قیادت کرنے والے دو ہم عصر مہاویر اور گوتم بدھ تھے۔ مہاویر نے برصغیر کو اہنسا یا عدم تشدد کی تعلیم دی جو جین مت کا بنیادی عقیدہ ہے، ہندوستان میں اس وقت اس مذہب کو ماننے والے بھی تقریباً بیس لاکھ افراد ہیں مگر یہ بدھ ازم تھا جو اپنے شجاع بادشاہوں اور مخلص مشنریوں کی مدد سے نہ صرف یہ کہ برصغیر میں پھیلا بلکہ ایران اور جاپان جیسے دور دراز ملکوں میں اپنے پیرو بنا کر

ایشیا کا ایک اہم مذہب بن گیا۔ مذکورہ دونوں مذاہب کو اپنانے والے زیادہ تر لوگ تیسری اور چوتھی ذات کے ملے جو سپاہی اور برہمن، دو اعلیٰ ذاتوں کے اتحاد کے نیچے پس رہے تھے۔ عروج پذیر تاجر طبقوں کو جین مت میں نئی حیثیتوں کو حاصل کرنے کا موقع نظر آیا اور اچھوت، برہمنوں کے جبر و تشدد سے چھٹکارا پانے کے لیے کسی بھی متبادل کے لیے بے چین تھے۔ بدھ مت نے ترقی زیادہ کی اور اس کی ترقی کی اصل وجہ اس کی جاگیردارانہ معاونت تھی، خصوصاً موریہ راجا اشوک کی۔ اشوک ایک بہاری تھے جنھوں نے اپنی حکومت سارے برصغیر میں پھیلا دی اور ایک ایسا وقت بھی آیا جب برہمن ازم اور ویدانت دونوں کے یکسر معدوم ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

اس صورت حال میں برہمنوں کا رد عمل تغیر اور بقا تھا۔ رومیلا تھاپر نے اپنی کتاب (اے ہسٹری آف انڈیا پنگوئن بکس ۱۹۶۶ء) میں اس ارتقائی عمل کو یوں بیان کیا ہے۔ "ان تمام صدیوں کے دوران برہمن ازم تبدیلیوں اور ترمیموں سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکا اور نہ ہی بدھ مت اور جین مت سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکا کچھ ویدک دیوتا نہایت خاموشی کے ساتھ گمنامی میں چلے گئے اور کچھ نے مزید خصوصیات کے ساتھ نئے دیوتاؤں کی شکل میں جنم لیا۔ یہی زمانہ تھا جب برہمنی مذہب نے وہ خد و خال حاصل کیے جو آج ہندو ازم کی حیثیت سے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس منزل پر اسے ہندو ازم کہنا ایک تاریخی غلطی ہو گی کیوں کہ یہ اصطلاح در اصل آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں کی رائج کی ہوئی تھی جو وہ ہندوستان کے رائج مذہب اور شیو اور وشنو کی عبادت کرنے والوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ہندو ازم کی بنا کسی وحی یا الہام کے نتیجے کے طور پر کسی تاریخی شخصیت نے نہیں رکھی۔ یہ کوئی الہامی مذہب بھی نہیں ہے۔ یہ مختلف النوع مسلکوں اور عقاید سے پیدا ہوا اور پروان چڑھا جن میں کچھ تو ویدک مذہب سے مستعار تھے اور کچھ وہ مقبول عام مسلک تھے جو اس ترقی یافتہ مذہب سے منسلک ہو گئے تھے کیونکہ پروہتوں کو عوام میں مقبول عقائد اور رسومات کو اپنے مذہب میں بطور رعایت جگہ دینی پڑی تھی۔

ہندو دھرم لاتعداد عوامل سے مل کر ایک مخصوص دھرم کی شکل میں وجود میں آیا۔ برہما خالق، وشنو محافظ اور شیوا تباہ کرنے والا۔ اس تثلیث سے ایک باقاعدہ نصاب بنا لوگوں کے ذہنوں میں ان تینوں دیوتاؤں کی الگ الگ عظیم حیثیتیں تھیں اس لیے الگ الگ بھی ان کے لاتعداد پیرو ہوئے ان ہی کے گرد ہندوؤں کے دو اہم فرقے وجود میں آئے۔ ہندو دھرم، ایک دیوتا یا دیوی کے گرد عقاید کی مرکزیت کی وجہ سے یک دیوتائی کی طرف بڑھ رہا تھا اور بھگوان اور عبادت گزار کے درمیان جائز بچولیے یعنی برہمن کو ناپسند کرنے کا جو رجحان لوگوں میں تھا وہ عوام کو ایک ایسے خیال اور ایک ایسی سمت کی طرف لے گیا جو ملک پر بڑا گہرا اثر ڈالنے والی تھی یعنی فرد اور بھگوان کے درمیان ایک شخصی

اورانفرادی رشتے یا پرہیزگاری یا بھگتی کا خیال۔ برہمن اور رسوم کی اہمیت کو اس طرح کم کر کے ہی ہندو دھرم بدھ مت کے چیلنج کا مقابلہ کر سکا۔ ہندو دھرم کی آخری اور قطعی فتح کا اظہار اس وقت ہوا جب بدھ دھرم کی شکست ہوئی اور بدھ کو وشنو کی نویں تجسیم نو قرار دیا گیا جو انسان کی شکل میں وقتاً فوقتاً دنیا کو برائیوں سے بچانے کے لیے آسمانوں سے زمین پر آتا ہے۔ بہرحال ہندوازم کو درپیش سب سے بڑے خطرے کے تدارک کے لیے یہ سودا سستا تھا۔

یہ بدھ مت ہی کی کامیابیاں تھیں جو آج بھی ہندوستان کی ان اقلیتوں پر منڈلاتی رہتی ہیں جنھیں ایک غیر متعین ہندو ثقافت کی گود میں رہنا ہے۔ یہی سبب ہے جو اقلیتی لیڈروں کو اپنی شناخت اپنی علامتوں اور اپنے سماجی قوانین کو باقی رکھنے کے سلسلے میں ضرورت سے زیادہ چوکس بنائے رکھتا ہے۔ یہ لوگ اس قوت جذب سے سہمے رہتے ہیں۔ یہ ایک بتدریج عمل ہے جو غلامی اور ماتحتی کے بجائے دھیرے دھیرے ختم کرنے کے اصول پر کاربند ہوتا ہے اور لڑائی کو اور تیکھا اور مشکل بنا دیتا ہے جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔ آٹھویں دہائی کے سکھ بحران کے پیچھے یہی سبب کارفرما ہے۔



(۲)

ایک عقیدہ اور دو مذہب

اس میں وقت بھی لگا اور درد اور کوشش کی ضرورت بھی پڑی۔ لیکن "قانون کے پہیے کی گردش" کے موضوع پر پہلے وعظ اور سارناتھ کے ہرن پارک میں ہونے والے الہام کو جس کی تبلیغ مہاتما بدھ نے سب سے پہلے اپنے محض پانچ چیلوں کے سامنے کی تھی، بالآخر ہندو ازم نے تحلیل کر لیا۔ عرب کے ریگستانوں میں بی بی آمنہ اور عبداللہ کے بیٹے محمدؐ پر نازل ہونے والی وحی کا ہضم کرنا نسبتاً زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ اسلام کا پیغام ۶۱۰ء میں آیا اور ۶۲۲ء تک محمدؐ کو مفاد پرستوں کے غیض و غضب سے بچنے کی خاطر اپنی جائے پیدائش مکے کو چھوڑ کر مدینہ جانا پڑا۔ دو سال بعد بدر کے مقام پر ہونے والی اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے لڑی جانے والی اہم جنگ میں فتح نصیب ہوئی مگر ۶۳۰ء میں یہ ہوا کہ شہر مکہ نے نئے عقیدے' اسلام کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ۶۳۲ء میں حضرت محمدؐ کا وصال ہو گیا۔ مگر ان کا پیغام طوفان کی سی تیزی کے ساتھ پھیلا۔ محض گھوڑوں اور اونٹوں کی رفتار تھی مگر ایک سو سال کے اندر اندر اسلام کی فوجیں، مغرب میں پیرس کی طرف جانے والی سڑکوں پر تھیں اور مشرق میں چین کے دروازوں پر۔ عرب تاجر عقیدے کو مالابار کے ساحل پر لائے اور رسولؐ کے انتقال کے دس برسوں کے اندر یہاں اور مغربی ساحل کے مختلف مقامات پر لوگوں نے مذہب تبدیل کیے اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ مالابار کے مسلمانوں کے لیے آج بھی "موپلا" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ موپلا (مہاپلائی) ایک عرب مشتق ہے جس کا ترجمہ "عظیم بچہ" کیا جا سکتا ہے (نویں صدی عیسوی میں، عام عقیدے کے مطابق خود مالابار کے راجہ نے اسلام قبول کیا۔ وہاں اسلامی فوجیں نہیں تھیں، اسی لیے (اتفاق سے) تبدیلیٔ مذہب کے لیے کسی جبر و تشدد کا سوال نہیں اٹھتا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو پہلا قبضہ اس وقت حاصل ہوا جب ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے بلوچستان سے گزر کر سندھ کو اپنے تصرف میں لیا مگر عرب کوششیں، سندھ کے سرحدی ریگستانوں پر آ کر رک گئیں۔ مسلمانوں کے ان حملوں کو جنھوں نے شمالی

ہندوستان کی عام آبادی، تہذیب، سیاست اور انتظامیہ پر ان مٹ اور راسخ نقوش مرتب کیے ایک ایسے شخص کے حملوں سے تقریباً ڈھائی سو سال بعد شروع ہوتا تھا جس کا نام آج بھی جذبات میں ہلچل مچادیتا ہے۔ ہندوستان میں وقت مرہم کا کام نہیں کرتا۔

یہ شخص تھا محمود غزنوی، ایک ترک جس کے باپ نے اس مقام پر اپنی حکومت قائم کی تھی جسے آج افغانستان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بحیثیت حکمرانی کی اس کی توقعات مرکوز تھیں وسط ایشیا پر، مگر چوں کہ افغانستان انتہائی بنجر علاقہ تھا، اس کے خوابوں کا رخ ایک ایسے ملک کی طرف ہونا ناگزیر ہوگیا جس کی دولت خود اس کے پڑوسیوں میں رشک و حسد کے جذبات بیدار کردیتی تھی۔ ۱۰۰۰ء کے بعد وہ تقریباً ہر سال ایک انتہائی تربیت یافتہ اور برق رفتار فوج کی معیت میں جنوب میں وہاں تک گیا جہاں تک وہ جاسکتا تھا۔ لوٹا جتنا وہ لوٹ سکتا تھا اور پھر اسی برق رفتاری سے واپس ہوا۔ اور افغانستان اور ترکستان یا وسط ایشیا میں مزید علاقوں کو فتح کرنے کی کوششوں میں سرگرم ہوگیا۔ پہلے دس برسوں کی لوٹ مار میں اس نے پنجاب کے ملتان جیسے اہم شہروں اور مرفہ حال کسانوں پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ ۱۰۱۰ء تک اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اصل دولت ان شہروں میں ہے جہاں مندر ہیں بلکہ خود مندروں کے اندر ہے۔ جو عوام سے سونے اور نقد کی شکل میں نذرانے اور چڑھاوے پاتے ہیں۔ ۱۰۲۶ء تک محمود نے مندروں اور متھرا، قنوج، تھانیسر جیسے مندروں والے شہروں کو لوٹا اور بالآخر گجرات کے ساحل پر واقع ان میں سب سے مالدار مندر سومناتھ کو تاراج کیا۔ محمود غزنوی اپنی اس حرص کو چونکہ اسی لوٹ مار کی وجہ جواز نہیں بناسکتا تھا اس لیے اس نے مندروں پر اپنے ان حملوں کو مذہبی رنگ دیا۔ ایک "اہل ایمان" مشرکین کے بتوں کو توڑ رہا تھا۔ اس کی اس لوٹ کھسوٹ اور سومناتھ کے مندر کی بے حرمتی آج بھی متعصب ہندوؤں کے لیے نوحۂ جنگ کی حیثیت رکھتی ہے۔ بہر حال یہ ایک دوسرا ہی فرقہ تھا جسے ہندوستان پر پائیدار اثرات چھوڑنے تھے۔ یہ غوریوں کا افغانی قبیلہ تھا، محمد غوری بارھویں صدی عیسوی کے آخر میں آیا، رومانی ہیرو پرتھوی راج کو ۱۱۹۲ء میں ترائن کی دوسری جنگ میں شکست دے کر قتل کیا اور دہلی میں وہ حکومت قائم کی جو مسلم سلطنت کے نام سے جانی گئی۔ دہلی پر مسلم حکمرانی کے اس دور کو ساڑھے سات سو سال تک چلنا تھا۔

ملک کے مانے ہوئے سیاسی مرکزوں میں جاگیردارانہ بارسوخ شخصیتوں کی عدم موجودگی ممتاز (اعلیٰ) ہندوؤں کے لیے کسی حد تک بے بسی اور بے چارگی کا سبب رہی ہے۔

جاگیردارانہ طاقتوں کے مختلف گروہوں نے جنھوں نے اقتدار کی خاطر تمام ہتھیاروں یہاں تک کہ مذہب کے استعمال سے بھی گریز نہیں کیا ہے عروج و زوال کی کہانی کے بجائے ہندو قوم پرستوں اور بدیسی مسلم حملہ آوروں کے حوالے

سے اس برصغیر کی تاریخ مرتب کرنا دراصل ایسی بے بسی اور بے چارگی کا ردّ عمل رہا ہے۔ بعد کو یہاں آنے والوں نے حالانکہ وہی راستے استعمال کیے جو ان سے پہلے سفید چمڑی کے آریاؤں نے استعمال کیے تھے مگر آریہ نہیں بعد میں آنے والے بدیسی کہلائے۔

ظاہر ہے کہ ترک، افغان اور ترک منغل حملہ آور پہلے لوٹ کھسوٹ کے لیے آئے اور بعد کو حکمرانی کرنے کے لیے نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے یہاں مقامی آبادی سے اتحاد کیا ان کی اطاعت حاصل کی جس نے ان کو سلطنتیں قائم کرنے اور ایسے انتظامی ڈھانچے کھڑے کرنے کے لائق بنایا جنھوں نے نئے ہندوستان پر اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ شکست کے بعد بھی وہ ہندوستان میں ٹھہرے رہے۔ حملہ آور اور آباد ہونے والوں کا فرق بابر اور تیمور کے رویّوں سے بڑا صاف سامنے آتا ہے۔ ۱۳۹۸ء میں تیمور نے شمالی ہندوستان کی جاگیردارانہ طاقتوں کو تباہ و برباد کیا، اس کی فتوح اور لوٹ مار کا اختتام دلی میں تباہی و بربادی اور اتلاف جان کی شکل میں ہوا۔ ملک کو تاراج کرنے کے بعد وہ واپس چلا گیا۔ اس کا خلف بابر جو سو اسو سال بعد آیا اس نے اپنے سپاہیوں کو یہ سمجھایا کہ ہندوستان کو ان کا نیا گھر ہونا ہے۔ دلی کو کبھی کسی آباد ہونے والے نے لوٹا اور برباد نہیں کیا۔ یہ کام تو صرف تیمور، نادر شاہ، احمد شاہ ابدالی اور ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے مغلوں کے ساتھ کیا۔ ہر مصیبت کا شکار مسلم طبقہ امرا ہوتا تھا اور اس کی وجہ بھی تھی۔ حکومت اور دولت میں ان ہی کا حصہ سب سے بڑا تھا۔ تیمور نے ترکی سلطنت کو تباہ کیا اور نادرشاہ، ابدالی اور انگریزوں نے زوال پذیر مغلوں کو ختم کیا۔ انگریز ۱۹۴۷ء میں واپس گئے جب کہ قلمرو دوں کے پچھلے معمار ترک، افغان یا مغل اپنے آبائی ملکوں کو کبھی واپس نہیں ہوئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انھوں نے ۱۵۰۰ قبل مسیح میں آریوں کی طرح وطن کا تصور ہی کھو دیا تھا۔ کٹر ہندوؤں نے یہ بات "ثابت" کرنے کی حماقت کی حد تک کوشش کی ہے کہ آریہ، مسلمانوں کی طرح ہندوکش کی پہاڑیوں کو پار کر کے یہاں نہیں آئے ان میں ایک نے تو انتہائی سنجیدگی سے یہ بھانے کی کوشش کی ہے کہ قطب شمالی کا وہ علاقہ جس سے آریہ اپنے ترک وطن کے سفر پر نکلے تھے۔ ایک زمانے میں دنیا کے الٹ پلٹ ہونے سے پہلے ہندوستان کے بیچ میں واقع تھا۔ بدیسی اور دیسی مذہب (عقاید) کے نظریے کا پرتو پنجاب کی صورت حال میں بھی ہے چونکہ سکھوں پر بدیسی ہونے کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا، معکوس منطق کے سہارے ان کے مذہب کو ہندوازم کا حصّہ بنایا جاتا ہے۔

تیمور نے شمال میں کوئی مضبوط حکمراں نہیں چھوڑا، مرکز منہدم ہو گیا اور اس صورت حال سے پیدا ہونے والی

افراتفری نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بدترین پہلوؤں کو بے نقاب کر دیا، دو حریف مذہبوں کے باہمی تعلقات پر رائے زنی کرتے ہوئے عالم ڈپلومیٹ کے آر نرائن اپنی کتاب "ایسیز ان انڈر اسٹینڈنگ" (صفحہ ۴۷، حکومت ہند کی شائع کی ہوئی) میں لکھتے ہیں "ہندوستان میں اسلام کی کہانی نہ تو کسی ایسی زبردست عسکری قوت کی کہانی ہے جو ایک پرانی تہذیب پر چھا گئی اور نہ ہی پرانی تہذیب کے اسے نگلنے اور ہضم کرنے کا قصہ ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک طویل عمل رہا ہے باہمی صلح پسندی اور باہمی رواداری کا جس میں بیچ بیچ میں دشمنی اور کشمکش کے دور آتے رہے۔

اٹھارہویں صدی کی طرح پندرھویں صدی بھی ایک طوفانی صدی تھی جس میں اعلیٰ طبقے کی سطح پر کشمکش شروع ہوئی۔ اور چوں کہ جاگیردار سرپرستوں نے عوام کے ذہنوں کو زہر آلود کر دیا تھا اس لیے یہ کشمکش عوام کی سطح تک سرایت کر گئی۔ مسلم حکمراں جو تیمور کے خالی کیے ہوئے خزانوں کو بھرنے کے لیے بے چین تھا، مذہب کے نام پر کافر ہندو تاجر پر حملہ آور ہوا ظاہر ہے کہ ہندوؤں نے جواب دیا۔ خشونت سنگھ نے اپنی کتاب "اے ہسٹری آف سکھس" (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس جلد اول، صفحہ ۲۹) میں گرو نانک کی ایک عبارت کا بڑا موثر اقتباس نقل کیا ہے۔ "زمانہ ایک چاقو کی طرح ہے، بادشاہ قصائی ہے، مذہب نے پر لگائے اور اڑ گیا، کذب کی اندھیری رات میں میں نہیں دیکھ پا رہا ہوں کہ سچ کا چاند کہاں اور کدھر طلوع ہو رہا ہے۔"...... یہ نانک اور کبیر جیسے ولی اور بزرگ ہی ہوں گے جو کذب کی اندھیری رات کے بعد روشنی فراہم کریں گے۔

ہندو اور مسلمانوں کی تلواروں کے ٹکراؤ کے ساتھ ساتھ خیالات و نظریات کا خلط ملط بھی تھا اور بالکل اسی طرح جس طرح حملہ آور کی تلوار بالآخر بدیسی نہ رہ کر ہندوستانی تلوار ہو گئی، اسلام خود بھی ہندو ذہن اور ہندو رسوم و رواج سے متاثر ہوا اور انھیں بھی متاثر کیا۔ ہزار سالہ عہد کے اختتام پر ایک زبردست ہندو احیا شروع ہوا جس کی قیادت خاص طور پر کیرالا کے ایک برہمن شنکر نے کی۔ انھوں نے سارے ملک کا سفر کیا اور مغربی گھاٹ پر دوارکا میں، ہمالیہ میں بدری ناتھ، اڑیسہ کے مشرقی ساحل پر پوری اور شمال میں سرنگیری میں ادارے قائم کیے۔ انھوں نے برہمنوں کی رسوم کو چیلنج کیا اور الوہیت کی ثنویت کی تردید کی اس سلسلے میں اپنے عقاید کے جواز میں انھوں نے اپنشد کو استعمال کیا اور بہت ممکن ہے کہ ان پر اسلام کا اثر بھی ہو رہا ہو۔ یہ شنکر ہی تھے جنھوں نے بدھ مت کی قطعی ہزیمت میں بہت مدد کی۔ عبادت کرنے والے اور خدا کے درمیان شخصی رشتے کے تصور نے بھکتی کی تحریک کی شکل میں بڑا عروج پایا۔

پندرھویں صدی ایک سیاسی دلدل تھی اور اس سے ہندوستان کو بچایا حقیقی معنوں میں ایک انٹلیکچول نشاۃ

ثانیہ نے جو مردوں اور عورتوں کے ایک ایسے گروہ کو منظر عام پر لایا جنھوں نے ہندوستانی شعور پر ایک اَمِٹ چھاپ چھوڑی، جن کے گیت عوامی زندگی کا حصہ ہیں، جن کا پیغام اگرچہ اب وہ اعتقادی اصولوں میں مدغم ہو چکا ہے، آج بھی، ہندو قومی خصوصیت کو کٹّرپن کی طوفانی لہروں سے بچانے میں ایک بند کا کام کرتا ہے۔ بھگتی کی تحریک نے برہمن کو ختم نہیں کیا مگر ہندوؤں کو برہمن ازم سے بچا ضرور لیا۔ اس تحریک کا ایک مُثنیٰ اسلام میں صوفیا کے پیغام میں ملتا ہے، جو مذہبی رہنماؤں یعنی علما (جن کا ہندو متبادل یقیناً برہمن ہوگا) کے مقابلے میں صحیح معنوں میں عوامی لیڈر تھے۔ خواجہ معین الدین چشتی، قطب الدین بختیار کاکی، فرید گنج شکر، نظام الدین اولیا اور علی مخدوم جیسے اولیا کے مزارات، اجمیر، دہلی، لاہور اور پاک پٹن میں آج بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے مقدس زیارت گاہوں کی حیثیت رکھتے ہیں، علما کی کوششوں کے مقابلے میں، ان مذہبی لیڈروں نے اختلافی عناصر کے بجائے مشترک عوامل پر زور دے کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین سماجی ہم آہنگی کی تبلیغ کی اور اس کے لیے کوشاں رہے۔

آسام میں شنکر دیو، بنگال اور اڑیسہ میں چیتنیہ مہاپربھو، شمال میں راما نند، راجستھان میں میرابائی، سندھ میں سادھنا، مہاراشٹر میں تکارام، نام دیو اور پرمانند، جنوب میں ولبھ سوامی تھے۔ مگران ہی میں عظیم ترین دو ہم عصر تھے (زمانے کے لحاظ سے ایک دوسرے کے اتنے ہی قریب جتنے کہ مہابیر اور گوتم بدھ تھے) جنھوں نے تیمور کے عہد کی صدی کی ملبوں کے درمیان، خدا کی وحدت، عبادت گزار کی ریاضت اور لگن اور گرو یا مرشد کے اہم رول پر مبنی مذہبوں کو پروان چڑھایا۔ یہ دو ہم عصر تھے کبیر (۱۴۴۰-۱۵۱۸) اور گرو نانک (۱۴۶۹-۱۵۳۹) انھوں نے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کش مکش جھوٹی ہے کیونکہ خدا تو ایک تھا۔ نانک نے کہا کہ "جھوٹ کا بول بالا ہے.... مسلمان ملّا اور ہندو پنڈت اپنے فرائض کو بھول گئے ہیں۔ شادی کے عہد نامے شیطان پڑھتا ہے۔ کبیر نے اپنے آپ کو اللہ اور رام کا بچہ کہا اور چار سو برس سے زیادہ عرصے کے بعد گاندھی نے یہی تشبیہیں استعمال کیں اور ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کی اپنی کوششوں میں کبیر کے گیت گائے۔

کبیر ایک ناجائز اولاد تھے اور ان کے رضاعی باپ ایک جولاہے تھے۔ ایک روایت کے مطابق وہ مسلمان پیدا ہوئے، کبیر ہندوستان میں آج بھی ایک مسلم نام کی حیثیت سے رائج ہے۔ بہرحال کبیر محض ایک مصلح نہیں تھے انھوں نے ایک باقاعدہ نظام کبیر پنتھی کی بنیاد ڈالی جس کی حیثیت ایک نئے مذہب کی سی تھی جس نے دونوں قدیم مذہبوں سے کچھ مستعار لیا تھا اور کچھ نئے پہلوؤں کا اضافہ کیا تھا۔ سماجی طور طریقوں میں کبیر نے اچھے خاصے اپنے ماننے والے بنائے، خصوصاً دست کاروں اور کاشت کاروں میں، اگرچہ ان کے نظریات و خیالات زندہ رہے مگر ان کے

مذہب کی عمر کم تھی۔ ہندوازم نے ایک اور خطرے کو ٹال دیا تھا۔

گرونانک ۱۴۶۹ء میں، لاہور سے جو اب پاکستان میں ہے، چالیس میل دور ایک گاؤں تلونڈی رائے بھوئیں پیدا ہوئے، وہ گاؤں کے ایک خزانچی، مہتا کلیان داس بیدی کے بیٹے تھے انھوں نے ہندی ایک پنڈت سے اور فارسی اور عربی ایک مُلا سے پڑھی۔ بارہ برس کی عمر میں شادی ہو گئی اور ۱۹ برس کی عمر پر وہ بیوی کے ساتھ رہنے لگے ان کے دو لڑکے ہوئے۔ (سری چند کی پیدائش ۱۴۹۴ء میں اور لکھمی داس کی پیدائش ۱۴۹۷ء میں ہوئی) ۱۴۹۹ میں انھوں نے اپنے مشن کا اعلان کیا "نہ کوئی ہندو ہے اور نہ کوئی مسلمان" انھوں نے بھگتی روایت کے مطابق اپنے گیت لکھے۔ تحریک کی کچھ اصطلاحات آج سکھ ازم میں سنی جا سکتی ہیں مثال کے طور پر سنت کا لفظ آج بھی سکھ مذہبی لیڈر کے لیے استعمال ہوتا ہے بھگتی تحریک کے مرد لیڈر جیسے تکارام سنت کہلاتے تھے جس کا مطلب لائق اور نیکوکار ہوتا ہے۔ (آج جن چند ناموں کے ساتھ یہ لقب لگایا جاتا ہے ضروری نہیں ہے کہ ان میں لیاقت اور نیکوکاری بھی ہو)

نانک اور کبیر کے فلسفوں میں یقیناً فرق تھا۔ دونوں خدا کو مختلف ہندو اور مسلمان روایتی ناموں سے پکارتے تھے (سکھوں کا گولڈن ٹیمپل، ہری مندر کہا جاتا ہے جو خدا کا ایک ہندو نام ہے) مگر نانک ایک کٹر اور سخت توحید پرست تھے انھوں نے خدا کو "ست کرتار" کا نام دیا جس کے معنی ہوتے ہیں، خالق حقیقی، سچائی خدا تھی۔ مزید اور بڑی اہمیت کی حامل حقیقت یہ تھی کہ انھوں نے اپنے پیروؤں کو خصوصی اصول دیے جنھیں سکھ اپنے روزانہ کے عمل میں تبدیل کر سکتے تھے نام (لفظ) دان (خیرات) اسنان (صفائی) سیوا (خدمت) اور سمرن (عبادت) انھوں نے ایسے ادارے بنائے جن کے ذریعے ان کے ماننے والے ان کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کر سکتے تھے انھوں نے ذات پات کا جواب "گرو کا لنگر" کے تصور سے دیا جس کا مطلب گرو کے نام پر کھانا، جو ہر گردوارے میں ملتا ہے اور ہر شخص کو اس کی ذات پوچھے بغیر دیا جاتا ہے۔ آپ نے ایک بار مختلف ذات والوں کو ایک جگہ کھانے پر بٹھا دیا تو ذات کا امتیاز خود بخود ختم ہو گیا جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا ہے کہ سکھوں میں ذات پات اب بھی رائج ہے مگر کھانے اور چھوت چھات کی منزل تک نہیں پہنچتی اس کا اثر اگر کچھ ہوتا ہے تو وہ شادی بیاہ تک محدود ہے۔

مگر یہ سب کچھ شاید نانک پنتھیوں کو کبیر پنتھیوں کے جیسے انجام سے بچا نہ سکتا اگر انھیں جلدی ہی ان کا سینٹ پال نہ مل گیا ہوتا۔



۴

پنجاب اور دہلی کا مقابلہ

سکھوں کا پہلا وطن

گرو نانک نے ۱۴۹۹ء میں اپنے مذہبی مشن کا اعلان کیا اس کے تقریباً ۲۵ سال بعد مغل بابر نے دہلی میں، افغان لودھی کی انحطاط پذیر سلطنت پر حملہ کیا۔ چھوٹی مگر بہتر قیادت اور زیادہ پرجوش مغل فوج نے ۲۱ اپریل ۱۵۲۵ میں پانی پت (دہلی کے شمال میں ۵۶ میل دور) کی مشہور پہلی لڑائی میں، اپنے سے کہیں بڑی افغانی بادشاہ ابراہیم لودھی کی فوج کو شکست دی۔ دوسرے سال، ۱۶ مارچ ۱۵۲۷ء کو کنوایا کی نسبتاً کم مشہور اور مگر اہم جنگ میں بابر نے، دس لاکھ سپاہیوں کی، افغان۔ راجپوت اتحاد کی فوج کو، جس کی قیادت ہوا کارانا سانگا کر رہا تھا، شکست دی اور اس سے پہلے کہ ۱۵۳۰ء میں اس کا انتقال ہوتا، بابر نے ایک عظیم سلطنت کی مستحکم بنیاد ڈالی۔ اس کے بیٹے ہمایوں کی غیر یقینی صلاحیتوں کی وجہ سے تھوڑا سا وقفہ انحطاط و زوال کا ضرور آیا مگر اکبر نے اپنے دادا کے خوابوں کو پورا کر دیا۔

دوسرے الفاظ میں، سکھ مذہب اور مغل قوت کا ساتھ ساتھ اور ایک جغرافیائی قربت میں فروغ و استحکام ہوا۔ نانک کا پنجاب، شاہانہ دہلی کے بالکل شمال میں تھا۔ دونوں کا ایک دوسرے کا رابطے میں آنا، وہ چاہے پرامن ہو یا پرتشدد لازمی تھا۔ ابتدا میں تعلقات یکسر خوش گوار تھے۔ مگر جوں جوں سکھوں کی طاقت بڑھتی گئی دوستی میں تلخی پیدا ہوتی گئی۔ حقیقتاً ہوا یہ تھا کہ پہلی طویل جنگ جو سکھوں نے لڑی اور جس نے کیر پنتھیوں کو ہضم کر لیا تھا وہ سکھوں کے خلاف نہیں بلکہ ان مسلمانوں سے لڑی تھی جو سلطنت کی حفاظت کر رہے تھے۔ یہ جنگ شروع بھی کسی وجود کے تحفظ کی لڑائی کی حیثیت سے نہیں ہوئی تھی یہ تو بہت سی شرارتوں کا نتیجہ تھی۔ علاقائی ہوس اور جاگیردارانہ طور طریقوں کے محرکات

نے اس کا انجام بھی ویسا ہی کیا۔ سکھوں اور مغل سلطنت کے مابین جب تک رشتہ ایک نئے مذہب اور ایک نئی قوت کا رہا اس وقت تک تعلقات غیر معمولی حد تک دوستانہ رہے۔ یہ تو جب سکھوں نے ایک جغرافیائی علاقہ کی تلاش شروع کی تاکہ ان کا نیا مذہب سلامتی کے ماحول میں پروان چڑھ سکے اس وقت جنگ نے موت اور زندگی کی کشمکش کا رنگ اختیار کیا۔ قدیم سلطنت، کسی دوسرے کو بغیر لڑے عروج کا موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھی اور نئے مذہب کو بھی اس بات کا پورا یقین تھا کہ بغیر ایک محفوظ وطن کے وہ بھی کبھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ نانک کے بعد نو گرو اور ہوئے، آخری گرو، گرو گوبند سنگھ نے گروؤں کے نظام کو جو خود جاگیردارانہ نظام کی خرابیوں میں ملوث ہو چکا تھا ختم کر کے اپنے مذہب کو بچا لیا۔ گرو کو اپنا جانشیں منتخب کرنے کا حق تھا جیسے جیسے سکھ علاقہ حاصل کرتے گئے ویسے ہی ویسے گرو روحانی کے ساتھ ساتھ دُنیاوی ہوتے گئے اور پشتینی جانشینی کے بارے میں فیصلہ کن جنگیں شروع ہو گئیں۔ بہر حال اس وقت تک بہت کچھ کامیابیاں حاصل کی جا چکی تھیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ گرو نانک کے پہلے جانشیں گرو انگد تھے جنھوں نے سکھوں کی ایک الگ شناخت قائم کرنے کے لیے ایک مختلف رسم خط گورمکھی متعارف کرایا اور گرو نانک کے سارے مذہبی گیتوں کو اس رسم الخط میں منتقل کیا۔

دلی اور نیا مذہب ایک دوسرے کے دوست تھے۔ یہ بات اس وقت بالکل ظاہر ہو گئی جب اکبر سکھوں کے تیسرے گرو امر داس سے ملاقات کرنے گیا اور ان کے لیے اپنی عقیدت کے اظہار کے طور پر حکم دیا کہ بہت سے گاؤں سے حاصل ہونے والا لگان گرو کی بیٹی بھانی کو اس کی شادی کے تحفے کے طور پر دے دیا جائے۔ ان کے دوسرے گرو رام داس کو شہنشاہ اکبر نے پانچ سو بیگھے زمین کا عطیہ دیا جس پر آج ان کا مقدس شہر امرتسر بسا ہوا ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں سکھوں کے پانچویں گرو ارجن نے ہری مندر یا گولڈن ٹیمپل کی تعمیر کی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان بہت دوستی تھی۔ خود گولڈن ٹیمپل کی بنیاد لاہور سے مدعو کیے ہوئے ایک مسلمان بزرگ میاں میر نے رکھی۔ گرو ارجن کی وزارت کے ۲۵ برسوں میں گرنتھ صاحب کی تدوین مکمل ہوئی اور سکھ مذہب پورے طور پر قائم ہو گیا۔ برہمنوں اور ملاؤں کے غصے اور خفگی کے باوجود تبدیلی مذہب کے واقعات میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ چار نئے شہر بسے اور عوام نے ارجن کو "سچا بادشاہ" کے نام سے پکارنا شروع کیا۔

مسائل اس وقت سے پیدا ہونے شروع ہوئے جب گرو ارجن، قوت کی سیاست کی کشمکش سے اپنے آپ کو بچا نہ سکے۔ اپنے روز افزوں اثر و رسوخ کے ساتھ گرو ارجن مغل جانشینی کے تنازعوں کے بھنور میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے جہانگیر کے بیٹے خسرو کی بغاوت کی حمایت کی۔ اگر خسرو کامیاب ہوتا تو گرو ارجن یقیناً دلی

کے دربار میں چاند اور سورج کی مانند ہوتے، قدر دانی اور انعام یقینی تھے اور ہو سکتا تھا کہ راج پوت مغل اتحاد کی طرح سکھ مغل اتحاد بھی وجود میں آجاتا۔ اس سب کے بجائے انھیں جہانگیر کا غم و غصہ دیکھنا پڑا جس کی شدت اور ظلم کا ذکر ہر تاریخ داں نے کیا ہے۔ گرو ارجن کے دشمنوں کو خصوصاً مذہبی رہ نماؤں کو اس ابھرتے ہوئے شخص کو تباہ کرنے کا بہترین موقع ہاتھ آیا۔ سکھ تاریخ گرو ارجن کو اذیت پہنچانے والوں میں ایک نام ایک ساہوکار چندو شاہ کا لیتی ہے جس کی بیٹی کی شادی گرو ارجن نے اپنے لڑکے کے ساتھ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ گرو ارجن کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کو اذیتیں پہنچائی گئیں اور ۱۶۰۶ء میں قید میں ہی ان کی موت واقع ہوئی۔ گرو ارجن کی شہادت اور بعد کو اورنگ زیب کے عہد میں نویں گرو تیغ بہادر (جنھوں نے ایک مسلمان فقیر حافظ آدم کے ساتھ مل کر لوگوں سے نذریں وصول کرنا شروع کر دی تھیں) اور دسویں گرو گوبند سنگھ کے دو لڑکوں کا قتل مسلمانوں کی طرف سے سکھوں کی نفرت کی علامت بن گیا، جو تین سو سال تک چلتی رہی۔

جاگیردار طبقے کے اسلحہ خانے میں ایک مزید ہتھیار مذہب تھا جسے ایک بادشاہ، اپنی ضرورتوں کے پیش نظر لیے گئے فیصلوں کے مطابق بیش و کم کامیابی کے ساتھ استعمال کر سکتا تھا۔ تاریخ کے ساتھ مشکل دراصل یادداشت کی ہوتی ہے حقائق کی نہیں۔ واقعات کی ایک شعوری طور پر منتخب کی ہوئی تصویر عوامی ذہنوں میں حکمراں طبقے کے مفادات کی تکمیل کے لیے بٹھا دی جاتی ہے، اس کوشش میں وہ حلقہ زیادہ کامیاب ہوتا ہے جس کے پاس ضروری پروپگنڈے کے لیے، ہراول دستے کے طور پر تعلیم یافتہ متوسط طبقہ ہوتا ہے۔ ایسی جزوی تاریخ سکھوں کی نفسیات میں بھی ڈالی گئی خصوصاً ۱۹ ویں صدی کے نصف آخر میں جب ہندو احیا پرست، مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ کی تشکیل کے لیے بے چین۔ تھے۔ پاکستان کے وجود میں آنے تک، یہ صورت حال، سکھ قیادت کے لیے بڑی سازگار رہی اور سکھوں کے ذہنوں پر، گرو تیغ بہادر کے کٹے سر سے بہتے ہوئے خون اور اس سے بھی زیادہ بھڑکانے والی گرو گوبند سنگھ کے دو معصوم بچوں کے قتل کی تصویریں نقش ہو گئیں۔ ۱۹۱۹ء میں جلیان والا باغ کے قتلِ عام کے بعد، انگریز بھی بدمعاشوں کے ساتھ شمار ہو گئے۔ ماضی کی تمام رفاقتیں پس پشت ڈال دی گئیں۔ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کی خبریں ذرا مختلف ہیں، شرارت کرنے والا اب ہندو ہے۔

پہلے سکھ لیڈروں نے مسلمانوں اور مسلم جاگیردارانہ مفادات کے باہمی امتیازات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ گرو گوبند سنگھ، سکھوں کے ایک زبردست سپاہی سردار تھے جن کے والد اور چار بیٹے مغل ظلم کا شکار ہوئے تھے لیکن خود ان کی فوج میں مرکزی حیثیت پانچ سو مسلمان پٹھانوں کی تھی۔ ایک موقع پر جب مغل فوجی دستوں نے انھیں گھیر لیا تھا ان

کی جان ان کے دو پٹھان وفاداروں نے اس طرح بچائی کہ انھیں پردہ پڑے ہوئے ایک فینس میں بٹھا کر مغل محاصرین سے یہ کہہ کر نکال لے گئے کہ وہ اس فینس میں اپنے پیر صاحب کو لیے جا رہے ہیں۔ یہ شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کہ سکھ فوج اور مسلم فوج کے درمیان کوئی براہ راست معرکہ پیش آئے۔ اورنگ زیب نے سکھوں کی سرکوبی کے لیے جو افواج بھیجیں اگرچہ ان کی قیادت سرہند کا صوبے دار وزیر خاں کر رہا تھا مگر اس میں راج پوت بھی تھے۔ مثال اس دستے کی دی جا سکتی ہے جس کی قیادت راجہ بلاس پور نے کی تھی۔ اسی وزیر خاں کا سب سے زیادہ معتمد مشیر اس کا ہندو دیوان سُچانند تھا جس نے گرفتاری کے بعد گرو گوبند سنگھ کے دونوں لڑکوں کو قتل کرنے کے لیے وزیر خاں پر زور ڈالا تھا (اسی لیے سکھوں کے لیڈر کی حیثیت سے گوبند سنگھ کے جانشیں بندا بہادر نے جب ۲۴ مئی ۱۷۱۰ء میں سرہند پر قبضہ کیا تو سچانند اس کا خاص نشانہ تھا) گرو گوبند سنگھ، اورنگ زیب کے بیٹے بہادر شاہ کے دوست تھے اور انھوں نے جانشینی کی جنگ میں اس کی مدد کی تھی۔ انھیں بہادر شاہ کے دربار میں اعزاز بھی ملا تھا وہ اس وقت تک شاہی افواج کی معیت میں رہے ـــــ جب تک کہ ان کے پٹھان سرپرست نے انھیں قتل نہیں کیا تھا۔ اسے اتفاق ہی کہیے کہ یہ پہلا موقع تھا جب سکھوں نے مغلوں کی جانشینی کی لڑائی میں صحیح انتخاب کیا تھا اس سے پہلے انھوں نے اورنگ زیب کے بجائے دارا شکوہ کی مدد کی تھی اور اس طرح عالمگیر کی خفگی مول لی۔ تاریخ بالکل دوسری ہوتی اگر گرو گوبند سنگھ کو حاسد وزیر خاں کے، جو مغل بادشاہ پر گرو کے اثرات سے سہما ہوا تھا، زر خرید قاتلوں نے قتل نہ کر دیا ہوتا۔

عظیم سکھ مہاراجہ، رنجیت سنگھ نے سب سے پہلے جن تین ماہرین فن کو تنخواہ پر رکھا تھا وہ تھے بخارا کے رہنے والے تین بھائی عزیز الدین، امام الدین اور نور الدین۔ ان سے موخرالذکر رنجیت سنگھ کا ذاتی طبیب (ظاہر ہے کہ یہ عہدہ انتہائی معتمد آدمی ہی کو دیا جا سکتا تھا) بھی بنا۔ عزیز الدین وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوا اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ مہاراجہ کے قریب ترین دوستوں میں اس کا شمار ہوا۔ اس نے رنجیت سنگھ اور اس کے بعد اس کے جانشیں کھڑک سنگھ دونوں کا زمانہ دیکھا۔ رنجیت سنگھ کے توپ خانے کا عملہ بھی مسلمان تھا جس کی قیادت غوث محمد خاں اور شیخ الٰہی بخش کرتے تھے۔ اول الذکر ہی ہے جو روایتوں میں میاں غوثا کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۸۶۹ء کی انگریزوں اور سکھوں کی فیصلہ کن جنگ جس میں سکھ سلطنت کا خاتمہ ہوا، محض سکھ فوجوں کی جنگ نہیں تھی جو انھوں نے انگریز افسروں اور ان کے بنگالی سپاہیوں کے خلاف لڑی تھی بلکہ خود انگریزوں کے قول کے مطابق یہ سکھ مسلمان فوج تھی۔* اس بات کا بالکل امکان ہے کہ لفٹیننٹ جنرل سر جارج میکمن تاریخی تفصیلات کے سلسلے میں بہت زیادہ

قابلِ اعتبار نہ ہوں۔ مگر رجمینٹل یادداشتوں کی صحت پر شبہہ کرنے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ انھوں نے اپنی کتاب "مارشل ریسیز آف انڈیا (متل پبلیکیشنز، نئی دہلی ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۱۴) میں چلیان والا کے مقام پر انگریزوں کی فتح بیان کرتے ہوئے لکھا ہے "ہتھیار ڈالنے کا یہ قابلِ دید منظر تھا جب سکھ فوج کے نڈر اور جری سکھ اور مسلمان سپاہیوں نے سُرخ وردی والوں کو سلامی دی، کمانڈر اِن چیف کو سلام کیا اور میدانِ جنگ سے، غمگین مگر زیادہ سمجھ دار ہو کر شکست خوردہ مگر باعزّت رہ کر نکل گئے۔..." پنجابی مسلمانوں کے علاوہ انگریزوں کے خلاف لڑنے والی فوجوں کے شانہ بشانہ لڑنے کے لیے افغان بھی آئے۔ (شمالی پنجاب میں) گجرات کی جنگ میں امیر دوست محمد کا بیٹا سردار اکرم خاں پانچ ہزار افغانیوں کا ایک دستہ لایا تھا۔ ایسی لاتعداد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں اور صرف سکھوں اور مسلمانوں سے متعلق ہی نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان تعلقات کے سلسلے میں بھی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ تاریخ، عوام کی سطح پر آ کر ان لوگوں کے ہاتھوں مسخ ہو جاتی ہے جو ہندوستان کو بنانے سے زیادہ تباہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ عظیم مراٹھا سلطنت کے معمار، شیواجی کو ہمیشہ ایک ایسے ہندو لیڈر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جس نے اپنی ساری زندگی 'بدیسی مسلمان' حملہ آوروں سے اپنے مادرِ وطن کی حفاظت کی خاطر لڑتے ہوئے گزار دی لیکن شیواجی کو گرفتار کرنے اور اورنگزیب کے دربار میں لانے والا کوئی مسلمان کمانڈر نہیں بلکہ راجا جے سنگھ تھا جو ایک راج پوت سردار تھا اور ہندو سپاہی طبقے سے اپنے تعلق پر ناز کرتا تھا۔ ہندوستان خود اپنے ماضی کے بارے میں زیادہ سچائیوں کو جان لیتا تو شاید آج اس کے مسائل کچھ کم ہوتے۔

گرو گوبند سنگھ ۷ اکتوبر ۱۷۰۸ء کو شہید ہوئے۔ اور یہ صرف انہی کا چھوڑا ہوا ورثہ تھا جس نے اس بات کو یقینی بنایا کہ سکھ ازم ایک الگ مذہب کی حیثیت سے باقی رہے گا۔ انھوں نے سکھ تشخص کو ایک ظاہری شکل عطا کر دی۔ یہ اگرچہ بالکل سیدھی سادی تکنیک تھی مگر تھی انتہائی موثر۔ گرونانک نے اگر مواد فراہم کیا تو گرو گوبند سنگھ نے ہیئت یا شکل و صورت۔ ۱۶۹۹ء میں موسمِ بہار کے تہوار بیساکھی کا دن تھا، گرو گوبند سنگھ نے گرونانک کے پیروؤں کو آنند پور آنے کا بلاوا بھیجا۔ انھوں نے اس دن معتقدین سے کہا کہ انھیں پانچ ایسے رضاکار چاہئیں جو، اپنے مذہب کے نام پر ان کی تلوار سے اسی لمحہ اور خود ان کے ہاتھ سے مرنے کے لیے تیار ہوں۔ پانچ افراد جو اس قربانی کے لیے تیار ہوئے، وہ بہرحال مارے نہیں گئے، اور ان کا نام "پانچ پیارے" رکھ دیا گیا۔ گرو کی بیوی نے شربت بنایا جس میں اس نے ایک دودھاری تلوار سے شکر ملائی ان پانچوں کو یہ شربت پلا کر ان کا بپتسمہ کیا گیا۔ سنگھ (شیر) کا لقب ملا اور یہ خالصہ (پاک) کہلائے۔ فرقے کے یہ پہلے لوگ تھے جنھیں سکھ مذہب کے تحفظ اور اس کی بقا کو یقینی بنانے کے

لیے ایک ایسے ملک کے قیام کی ذمہ داری سونپی گئی جس پر سکھوں کی حکمرانی ہو گی (کہ خفیہ کے ایجنٹوں نے دلی کے مغل دربار میں اطلاع دی تھی کہ اس دن بیس ہزار لوگ خالصہ بنے تھے) پانچ چیزوں سے خالصہ کی پہچان ہوتی تھی۔ کیس، کنگھا، کچھ، کڑا اور کرپان اور یہ سب چیزیں یہ انھیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا تھیں۔ سکھ جسے ہم آج اتنی آسانی سے پہچان لیتے ہیں وہ گرو نانک کے تبلیغی کام کے آغاز سے دو سو سال بعد کی تخلیق ہے۔ "راج کرے گا خالصہ" کا جو نعرہ ہم ان کی پرارتھنا کے وقت ہمیشہ سنتے ہیں اسی وقت سے شروع ہوا۔ نعرہ اپنی پوری شکل میں نیت کے سلسلے میں کسی شک و شبہے کی گنجایش نہیں چھوڑتا۔

دلی تخت پر بیٹھے گی آپ گرو کی فوج
چھتر پھرے گا سیس پر بڑھی کرے گی فوج
راج کرے گا خالصہ آقی رہے نہ کوئے
خوار ہوئے سب ملیں گے بچے سرن جو ہوئے

پنجاب کو فتح کرنے کے بعد انگریزوں کو یہ بات مناسب نہیں معلوم ہوئی کہ دلی پر خود اپنے طور پر کوئی حکمرانی کرے چنانچہ انھوں نے اس نظم کو ممنوع قرار دے دیا۔ سکھ لیڈروں نے عام استعمال میں پہلی دو لائنیں حذف کر کے مصالحت کی: آخری دو لائنوں کے لیے انھوں نے یہ جواز پیش کیا کہ پاک (خالصہ) کی صرف روحانی حکمرانی ہو گی دنیاوی نہیں۔ یہ ایک پرانی چال تھی ایک خواب کو خیال کہہ کر زندہ رکھنے کی۔ انگریزوں نے اسے اسی طرح رہنے دیا۔ یہ نعرہ آج بھی دلی اور امرت سر میں دیواروں پر لکھا ہوا دیکھا جا سکتا ہے اور سکھوں کی پرارتھنا کا ایک حصہ ہے۔

خالصہ لوگوں کو گرو گوبند کا ایک چیلا کر تو سکھ لچھمن داس، لیڈر کی حیثیت سے مل گیا اس نے اپنا نام بندہ بہادر یعنی بہادر غلام رکھا۔ ۱۹ جون ۱۷۱۶ میں اپنی حراست اور قتل تک بندہ نے خالصہ جھنڈا تقریباً پنجاب کے کونے کونے میں پہنچا دیا تھا ان میں وہ مقامات بھی تھے جنھیں وہ محکوم کرنے کے بعد قبضے میں نہیں رکھ سکا تھا۔ اس کا اصل ہدف وہ لوگ تھے جنھیں وہ سکھ ازم کا خصوصی دشمن سمجھتا تھا۔ ان لوگوں میں سر فہرست نام مسلمانوں کا تھا۔ اس ساری کارروائی میں وہ اندھا دھند تباہی و بربادی میں ملوث ہو گیا۔ اور عوام کو خصوصاً مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی کو اپنا دوست نہیں بننے دیا۔

اٹھارویں صدی، ہندوستان کی تاریخ میں ایک غیر مطیع اور بے قابو عہد رہا ہے۔ ایسے حالات میں مغلوں کے علاوہ کوئی بھی حکومت کہیں جلدی ختم ہو گئی ہوتی۔ لیکن مغلوں کے غیر معمولی زوال پذیر جانشین بھی، بابر سے لے کر اورنگ زیب تک چھ بادشاہوں کی قائم کی ہوئی سلطنت کو تباہ نہ کر سکے۔ عظیم مغل سلطنت کے ختم ہونے کے لیے تو

بلکہ سو سے بھی کچھ زیادہ ہی برسوں کی ضرورت پڑی مگر اس دوران دہلی میں شمال اور جنوب کی علاقائی حرص و ہوس ہی کی نہیں بلکہ بیرونی لٹیروں کے مقابلے کی بھی سکت کم ہو چکی تھی۔ نادر شاہ ایران سے آیا اور واپسی میں لاتعداد مال غنیمت جس میں تختِ طاؤس اور مشہور زمانہ کوہ نور ہیرا بھی شامل تھا، لے گیا۔ (ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھوں تک پہنچنے اور ملکہ کے تاج کی زینت بننے تک کوہ نور ہیرے کی قسمت میں بھی بڑا طول طویل سفر لکھا تھا) یہ بات بھی بہت دلچسپ ہے کہ جن لوگوں کو ایرانی، ترکی اور افغانی حملوں کے تسلسل پر حیرت ہو انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایران اور دہلی کا درمیانی فاصلہ جنوبی ہند کی ریاست کیرالا اور دہلی کے درمیانی فاصلے کے مقابلے میں کہیں کم ہے۔

نادر شاہ کے قابل ترین جنرل احمد شاہ ابدالی کے حملے سے ملک کو بدترین مصیبت کا سامنا کرنا تھا۔ احمد شاہ ابدالی افغانستان کا وہ حکمراں تھا جس کے قبیلے کا نام درّانی پڑا۔ ابدالی آیا، اس نے دیکھا اور لوٹ مار دوبارہ پھر آیا۔ ۱۷۴۷ اور ۱۷۶۹ کے درمیان افغانوں نے ہندوستان پر نو حملے کیے، بغیر کسی روک ٹوک کے لوٹ مار کی اور مقامی مہروں اور جموروں کے ساتھ سیاسی کھیل کھیلتا رہا۔ ایک قوت جو ابدالی کا مقابلہ کرسکتی تھی وہ تھی مراٹھوں کی، مگر یہ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری جنگ میں شکست کھا چکی تھی اور ان کے بعد درّانیوں کے مقابلے کے لیے صرف سکھ رہ جاتے تھے جنھوں نے مثلوں (ایک لفظ جس کے معنی مثال کے بھی ہوتے ہیں اور برابر کے بھی) کے تحت اپنی صف بندی کی تھی۔ اپنے چھٹے حملے کے دوران ابدالی نے امرت سر میں قتل عام کا حکم دیا تھا اور مال غنیمت سے لدے ہوئے واپس ہوتے ہوئے قافلوں کو لوٹنے کی پاداش میں گولڈن ٹیمپل مسمار کر دیا تھا، اس کی یاد سکھوں کے ذہن میں آج بھی دہشت کا سبب تھی۔ اس وقت افغانستان کی مجموعی قومی پیداوار ایسا لگتا ہے کہ صرف ہندوستان سے لوٹے ہوئے مال غنیمت پر ہی منحصر تھی۔

خالصہ ایک ایسی تحریک تھی جو ایک قائد کی تلاش میں تھی۔ ایک ایسے قائد کی تلاش میں جو گرو گوبند کے ایک وطن اور ایک سلطنت کے خیال کو حقیقت میں بدل سکتا۔ یہ آدمی ۱۳ نومبر ۱۷۸۰ء کو، لاہور کے مغرب میں، ایک شہر گجرانوالہ میں جو اب پاکستان میں ہے، پیدا ہوا۔ اس کی عمر ابھی بارہ برس ہی تھی کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ خشونت سنگھ کے الفاظ میں بیٹے کے لیے اس نے پنجاب کے بالکل بیچ میں ایک بڑا ضلع اور ایک ایسی خواہش جس کی کوئی حد نہیں تھی، ورثے میں چھوڑی، ایسے جذبے اور خواہش کے لیے وقت نہایت سازگار تھا۔

۱۷۶۱ء میں مغل بادشاہ نے ابھرتے ہوئے مراٹھوں سے دہلی کو افغان لٹیرے ابدالی سے بچانے کی درخواست کی۔ اگر اس وقت انھوں نے ایسا کرنے کی کوئی صورت نکال لی ہوتی تو دہلی پر قبضہ ان کا اگلا منطقی قدم ہوتا اور ہمیں دہلی کے تخت پر مراٹھوں کی فرمانروائی نظر آتی۔ مگر ابدالی نے پانی پت میں صرف یہی نہیں کہ مراٹھا فوج کو شکست دی بلکہ اس نے

مراٹھا فرائم اور سارادوں کو بھی پست کر دیا۔ جیشوا کی زیر قیادت ایک وفاق کے بدلے مراٹھا پانچ خود مختار سلطنتوں میں (پیشوا، گائیکواڑ، بھونسلے، سندھیا اور ہولکر) بٹ گئے یہ تقسیم ہوئے اور زیر ہوئے اس زمانے میں مغل سلطنت کی حالت کی صحیح تصویر کشی شاہ عالم کے انجام سے ہوتی ہے جسے ایک افغان سردار نے ۱۷۸۸ء میں اندھا کر دیا تھا اور جو پہلے سندھیاؤں کا وظیفہ خوار ہوا بعد کو انگریزوں کا۔ لیکن اگر دہلی کمزور تھی تو ویسے ہی حکومت کے دعویدار بھی کمزور تھے۔ ان میں سے کسی میں بھی اتنی قوت نہیں تھی جو مغلوں کو حکمران کی جگہ لے سکتا۔ کچھ مدت تک دہلی کے قرب و جوار میں بسنے والے جاٹوں نے سورج مل کی دلکش قیادت میں (۶۳-۱۷۰۷) ایسا ضرور ظاہر کیا کہ گویا وہ اس خالی جگہ کو پر کر سکتے ہیں مگر راج پوت، جاٹ، مراٹھا اور حکومت کے مسلمان متمنیوں نے (روہیلوں کی طرح) ایک نئی صبح کے لیے مغلوں کے طویل غروب آفتاب کا انتظار کرنے کو ترجیح دی۔ یہ کام انگریزوں کے لیے چھوڑ دیا گیا کہ وہ بنگال سے داخل ہوں اور ۱۸۰۵ء تک مسئلے کو قطعی طور پر حل کر دیں مگر انگریزوں کی آمد سے پہلے شمالی افق پر ایک ستارہ چمکا، اس کی آمد بالکل اچانک تھی، اس کی چمک نے سارے افق کو پر نور کر دیا اور پھر وہ بالکل اسی طرح پلک جھپکتے میں غائب ہو گیا جس طرح اچانک وہ نمودار ہوا تھا۔ پیشوا نے پانی پت میں ابدالی کے ملنے سے پہلے کہا تھا کہ مراٹھا اٹک کی دیواروں کو پار کر جائیں گے۔ یہ مقام دریائے سندھ پر خیبر درّہ سے آنے والی اس سڑک پر تھا جہاں سے افغان آئے تھے۔ اگر یہ اعزاز رنجیت سنگھ کی سکھ فوجوں کو ملنا تھا، جنھوں نے خالصہ پرچم اٹک کی دیواروں کے پرے افغانستان اور کابل تک پہنچا دیا۔

اولین اور شاید واحد سکھ سلطنت نے ایک بار پھر یہ بات ثابت کر دی کہ نشوونما، ترقی، توسیع اور استحکام صرف اسی عہد میں ہوتے ہیں جب حکمراں کی پالیسی مذہبی جنون سے ہٹ کر تعاون و اشتراک کی طرف مائل ہو جاتی ہے جو تلخی اور تشدد سکھوں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی خصوصیت رہی ہے اس کے پیش نظر اس بات پر کوئی تعجب نہ ہوتا اگر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے آپ کو مسلمانوں سے انتقام لینے میں مصروف کر لیا ہوتا لیکن پھر ایسی صورت میں اسے مغرب میں دریائے سندھ سے لے کر مشرق میں جموں تک پنجاب کی عجیب و غریب یکجہتی نصیب نہ ہوئی ہوتی۔ رنجیت سنگھ نے مسلمانوں اور ہندوؤں سے دوستی کی شعوری کوشش کی، حکومت میں انھیں حصّہ دیا اور وہ تمام رویّے اختیار کیے جو لوگوں میں اعتماد و یقین پیدا کرنے میں بہت موثر ثابت ہوتے ہیں۔ فقیر عزیز الدین کو جو غیر معمولی اختیار اور حیثیت دی گئی اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ جموں کا ایک ڈوگرہ ہندو، دھیان سنگھ رنجیت سنگھ کا وزیر اعظم تھا، وزیر مالیات دینا ناتھ، ایک ہندو برہمن تھا۔ اس کے توپ خانے کے کمانڈر میاں غوثا کو کمانڈر اور یار وفادار کا خطاب

دیا گیا تھا دوسرے اور مسلمان افسر بھی تھے جن میں جنرل الٰہی بخش، خدا یار اور سلطان محمد شامل تھے اس کی بائیس بیویوں میں بیوی گل بہار بیگم بہت چہیتی تھیں۔ لاہور کو فتح کرنے کے بعد رنجیت سنگھ نے جو پہلا کام کیا وہ تھا لاہور کی بادشاہی مسجد، وزیر خاں کے مقبرے اور داتا گنج بخش کے مزار پر حاضری۔ داتا گنج بخش کا مقبرہ بعد کو اس کی سکھ بیویوں نے دوبارہ تعمیر کرایا۔ رنجیت سنگھ نے جب اپنی فوج کی تنظیم نو کی تو اس میں اعلیٰ عہدوں پر ہندو اور مسلمان بھی رکھے گئے۔ جب سکھ فوج سری نگر میں داخل ہوئی تھی فوج کا جھنڈا ایک ڈوگرا ہندو جنرل زور آور سنگھ کے ہاتھ میں تھا، اسی طرح جب ۱۸۳۹ میں (رنجیت سنگھ کی موت کے فوراً بعد) فاتح سکھ دستے کابل میں داخل ہوئے تو خالصہ پرچم ان مسلمان سپاہیوں کے ہاتھوں میں تھے جن کی قیادت کرنل شیخ لبھاون کر رہا تھا۔ ریاست میں ہر پنجابی برابر تھا، یہاں تک کہ مسلمانوں کو قرآن کے احکامات کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کرانے کے لیے اپنے قاضی اور جج مقرر کرنے کی اجازت تھی۔

رنجیت سنگھ نے یہ سب کچھ کسی ریاکاری یا لغویات میں مبتلا ہوئے بغیر کیا۔ ان کی سلطنت بالاعلان ایک سکھ سلطنت تھی، مہاراجہ کا خطاب دہلی یا کابل کا دیا ہوا نہیں بلکہ خالصہ پنتھ (سکھ مذہبی قیادت) کا عطا کیا ہوا تھا۔ اولین سکھ سکوں پر مہاراجہ کی تصویر کے بجائے سرکار خالصہ جی لکھا جاتا تھا مگر رنجیت سنگھ کا سیاسی فلسفہ جیسا کہ اس نے اپنے دوست عزیز الدین کو بتایا تھا، غیر جانب دار تھا۔ بچپن میں چیچک کے مرض میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے چہرہ برا ہو گیا تھا اور اس پر دانوں کے گہرے گہرے نشانات پڑ گئے تھے، ایک آنکھ بھی اس مرض کی نذر ہو گئی تھی۔ رنجیت سنگھ نے ایک دفعہ عزیز الدین کو بتایا تھا کہ یہ سب کیوں ہوا؟ اس نے کہا تھا کہ "خدا چاہتا تھا کہ میں سارے مذاہب کو ایک آنکھ سے دیکھوں اسی لیے اس نے ایک آنکھ کی بینائی چھین لی۔"

سکھ سلطنت شمال میں تبت کی سرحدوں تک تھی، مغرب میں افغانستان تک اور جنوب مشرق میں دریائے ستلج سے پرے تک پہنچ گئی تھی ۱۸۳۹ میں رنجیت سنگھ کی موت کے کچھ ہی عرصے بعد سلطنت کے انتشار نے سکھ نفسیات پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ مختلف ماؤں سے پیدا ہونے والے رنجیت سنگھ کے بیٹوں نے اپنے ورثے کی تحقیر کی۔ ان کے جائز یا ناجائز ہونے پر انگریزوں کو کوئی سوال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ انھوں نے خود ایک دوسرے پر ناجائز ہونے کے الزامات لگائے۔ سلطنت کی صحت مند پختگی نے بوسیدگی کی شکل اختیار کر لی۔ سکھوں کے معاملات میں دخل نہ دینے کے معاہدے کے باوجود، انگریز صورت حال کی ترغیب سے اپنے آپ کو بچا نہ سکے۔ اور خواہ مخواہ کے بہانوں کا سہارا لے کر ۱۸۴۰ کی جنگوں کا آغاز کر دیا جنھوں نے وسیع و عریض پنجاب کو ان کے ہاتھ

میں پہنچا دیا۔ سکھوں کو سب سے بڑا نفسیاتی دھکا غالباً عظیم رنجیت سنگھ کے بیٹے مہاراجہ دلیپ سنگھ کے تبدیلی مذہب کر کے عیسائی بن جانے اور ملکہ وکٹوریہ کے دربار میں ایک کھلونے کی حیثیت اختیار کرنے سے پہنچا (یہ دلیپ سنگھ ہی تھا جسے کوہِ نور ہیرے کو ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں پیش کرنے پر مجبور کیا گیا تھا حالانکہ اس کے باپ رنجیت سنگھ نے ہی اسے افغانوں سے واپس لے کر ہندوستان کو دیا تھا ملکہ وکٹوریہ نے اس "کوہِ نور" کو ترشوا کر ایک تہائی سائز کا کر دیا۔)

سکھ وطن جو ایک حقیقت بن چکا تھا ایک بار پھر خواب بن گیا۔ خود مذہب بھی خطرے میں تھا۔ مہاراجہ عیسائی بن گیا تھا اور عیسائی مشینریوں کا پنجاب کی طرف تانتا لگ گیا تھا جو عوام میں دلیپ سنگھ کے تبدیلی مذہب کو اپنی اخلاقی فوقیت کے ثبوت کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ دنیاوی فائدے ایک عملی ترغیب کا کام دیتے تھے۔ جلد ہی ہندو مبلغین آئے انھوں نے سکھوں کو اپنے اصلی مذہب کی پاکیزگی اور طہارت کی طرف واپس آنے کی دعوت دی۔ ان کا کہنا تھا کہ خالصہ تو ہندو عقیدے کا ہی ایک مختلف روپ ہے اور یہ آریہ سماج ہی کا ایک حصہ ہے۔ آریہ سماج نام کی ایک تنظیم کے قائد دیانند سرسوتی دوبارہ تبدیل مذہب کرانے کے لیے نانک کے بلکہ اسلام تک کے نظریات کے لیے بعض ضروری رعایتوں (ذات پات اور بت پرستی کی تردید اور ایک خدا کی پرستش کرنا) پر راضی تھے۔ آریہ سماج کا مقابلہ کرنے میں مسلمانوں کے سامنے کوئی بڑی دشواری نہیں تھی۔ ان کے مقابلے میں سکھ لیت و لعل میں تھے اور پست ہمت تھے یوں کہنا چاہیے کہ وہ پہلی دفعہ اپنی شناخت کے بحران میں مبتلا ہو گئے تھے۔ سوال یہ تھا کہ کیا گرو نانک کے ماننے والے بھی مہاویر، سدھارتھ اور کبیر کے ماننے والوں کی طرح معدوم ہو جائیں گے؟

۱۴۹۹ میں گرو نانک نے اپنے مشن کا اعلان کیا۔ ۱۶۹۹ء میں گرو گوبند سنگھ نے سکھوں کو خالصہ کی شناخت دی۔ ۱۷۹۹ میں سکھوں کی پہلی خود مختار سلطنت قائم ہوئی اور ٹھیک پچاس سال کے اندر اندر ۱۸۴۸ تک یہ پشتی سلطنت دھوئیں کی طرح تحلیل ہو گئی۔ مسلمانوں کے خلاف اپنی خوف ناک جنگ کو سکھ جھیل گئے۔ کیا وہ ہندو ذہن سے لڑی جانے والی جنگ میں اپنے وجود کو قائم رکھ سکیں گے؟



۵

تشخص کا بحران

تاریخ میں، برتری اور رفعت کا مضحکہ خیز حد تک ایسا زوال شاذ و نادر ہی ہوا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ترجیح اس بات کو دی کہ انھیں سنگھ صاحب کہا جائے، حالانکہ وہ صحیح معنوں میں ایک بادشاہ تھے۔ ان کے بڑے بیٹے کھڑک سنگھ نے بے انتہا چاہا کہ وہ بادشاہ بنے۔ سخت بات کہنے سے پرہیز کرتے ہوئے اگر نرم الفاظ استعمال کیے جائیں تو یہ کہا جائے گا کہ وہ ایک سادہ لوح تھا اور افیون کی لت نے اس کے ذہن کو مزید کند کر دیا تھا۔

تخت پر اپنے حق کو جتانے کے لیے وہ سب سے بڑی جو دلیل دیتا تھا وہ یہ تھی کہ اس کے چھ بھائی، شیر سنگھ، تارا سنگھ، کاشمیرا سنگھ، پیشورا سنگھ، ملتانا سنگھ اور دلیپ سنگھ ناجائز اولاد تھے۔ ان کی ماؤں کی نیک نامی یا بدنامی کو پیش نظر رکھتے ہوئے سکھ شرفا، غالباً اس بات پر یقین کرنے کے لیے تیار تھے۔ بڑے لڑکے کی حیثیت سے اس کا دعویٰ بہر حال سب سے زیادہ زبردست تھا۔ ایک طرف کھڑک سنگھ کے بیٹے نونہال سنگھ نے جلد ہی ذمہ داریوں کو اپنے ہاتھ میں لیا اور باپ کے چہیتے اور حکومت کے پس پشت اصل قوت جیت سنگھ باجوا کو اپنے ہاتھوں مار دیا دوسری طرف اس کے باپ نے اپنا سارا وقت لوگوں کو یہ یقین دلانے میں صرف کر دیا کہ وہ بیوقوف اور احمق نہیں ہے۔

۵ نومبر ۱۸۴۰ء میں شراب، پیچش، افیون اور تیز بخار (امراض کی ترتیب کیا تھی کون جانے؟) میں مبتلا ہو کر کھڑک سنگھ کی موت افسوس سے زیادہ ایک اطمینان و سکون کا موقع تھی۔ توقع تھی کہ جیسے ہو نونہال سنگھ حالات پر قابو پالے گا۔ مگر اسی دن جس دن اس کے باپ کی آخری رسوم ادا کی گئیں، اس پر ایک پتھر گرنے کی وجہ سے اس کی موت ہو گئی۔ انگریزوں کی منظوری سے، کھڑک سنگھ کے بھائی شیر سنگھ کو جانشینی ملی۔ لاہور کی درباری سیاست میں انگریزوں نے حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں تھی کیونکہ مختلف گروہوں نے جانشینی کے تنازعے میں ان کی مدد مانگنا شروع کر دی تھی۔

کھڑک سنگھ کی ایک بیوی، بی بی چاند کور، کو اس کے دل میں مرحوم شوہر کے لیے محبت کے جذبات، وہ چاہے کم ہوں یا زیادہ، ستی پر اکسا نہ سکے (ستی کی رسم سکھوں میں ممنوع کی جا چکی تھی، مگر اب پھر واپس آگئی تھی) چاند کور نے اس الزام کا اعادہ شروع کیا کہ شیر سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا نہیں بلکہ ایک انگریز (شیرد کوبا) کا خون ہے، اور اسی لیے اس نے تخت پر اپنے حق کا دعویٰ کرنا شروع کیا۔ ۲ دسمبر ۱۸۴۰ء تک اس نے اچھی خاصی قوت غصب کر لی تھی اور ملکۂ مقدس، کہی جانے لگی تھی۔ نجومیوں کے لیے تباہی و بربادی کی پیش گوئی کرنے کے لیے اتنا کافی ہے اور وہ صحیح تھے۔ کیونکہ جلد ہی نہ تو کوئی ادب و احترام باقی رہا اور نہ ہی کوئی سلطنت۔ شیر سنگھ (غالباً اولین سکھ تو ڈی – وہ تبیلہ جو بعد کو بہت پھولا پھلا) نے انگریزوں سے مدد لی اور لاہور پر چڑھائی کر دی، دونوں فریقوں نے سپاہیوں کی تنخواہوں میں اضافے کی لالچ دلائی۔ شیر سنگھ کی بات پر لوگوں کو یقین آیا، ملکہ پر نہیں۔ کیونکہ فوج کی ابھی پچھلی تنخواہیں بھی کافی باقی تھیں۔ ملکہ نے جموں کے ہندوؤں سے امداد طلب کر کے حالات کو خرابی سے بچانے کی کوشش کی۔ ان کے لیڈر گلاب سنگھ ڈوگرا کو اپنا کمانڈر ان چیف مقرر کیا، مگر شیر سنگھ نے فتح حاصل کی اور ۱۷ جنوری ۱۸۴۱ء کو اطاعت پر مجبور کر لیا۔ رات کے پچھلے پہر ڈوگرا سردار، سکھوں کا تمام سونا اور جواہرات لے کر لاہور کے قلعے سے بھاگ گیا۔ اس چوری نے اسے جواہرات کے کامیاب ترین چور کا مرتبہ عطا کر دیا۔ (اس لوٹ کا کچھ حصہ سری نگر کے سرکاری خزانے میں آج بھی موجود ہے۔ بعض سکھوں کا دعویٰ بھی ہے کہ یہ چیزیں کشمیریوں کی نہیں ان کی ہیں۔ اگر ان چیزوں کی کوئی اہمیت ہے تو ان سکھوں کے اس دعوے میں جان ہے)

یہاں سے پنجاب میں انگریزوں کی حکومت کے قیام تک ایک چھوٹے قدم کا فاصلہ تھا۔ ۱۸۴۳ء میں سر چارلس نیپیئر نے بغیر کسی جواز کے سندھ پر قبضہ کر لیا اسی سال ستمبر میں اجیت سنگھ سندھاوالا نے جو ایک زمانے میں قابل احترام ملکہ کا حامی تھا اور اس وقت انگریزوں کا تنخواہ دار ہو گیا تھا، عریاں غداری کی مثال پیش کرتے ہوئے اس نے شیر سنگھ اور اس کے بڑے لڑکے پرتاپ سنگھ کو مار دیا۔ اس نے ان کے سروں کو نیزوں پر چڑھایا اور قلعے پر قابض ہونے سے پہلے انھیں لاہور کی سڑکوں پر گھمایا۔ وفادار سکھ فوجی دستوں نے غصے میں آ کر قلعے پر حملہ کیا اور سرکشوں کو قتل کر دیا۔ ایک اکیلا خوش قسمت جو بچا وہ تھا اجیت سنگھ سندھاوالا۔ اسے اس کے آقاؤں یعنی انگریزوں نے فوراً پناہ دی۔ رنجیت سنگھ کے سب سے چھوٹے بیٹے، سات سالہ دلیپ سنگھ کو تخت پر بٹھایا گیا اور اس کی خوب صورت ماں جندن کور نے اب فیصلے لینے شروع کیے۔

انگریزوں کے پنجاب کو ہتھیانے تک کی کہانی، ناقابل یقین کمینگی اور سازش کی کہانی ہونے کے ساتھ ساتھ

اس بات کی اچھی توضیح ہے کہ انگریزوں نے کس طرح پہلے ہندوستان کو فتح کیا اور پھر اس پر اپنا تسلط قائم کیا۔ ہندوستانی جاگیردار جو اب ذہنی اور جسمانی عیاشی میں مبتلا تھے، انھوں نے بغیر کسی پس و پیش کے ملک ان کے حوالے کر دیا۔ (بعد کو ہندوستانی متوسط طبقے نے سلطنت کے استحکام میں ان کی مدد کی) اس عہد میں لاہور دربار کی پیچیدگیوں کو بیان کرنے سے فحش بیانی کے علاوہ کوئی دوسرا کوئی مقصد حاصل نہیں ہوگا اور باقی ساری کتاب اسی میں پوری ہو جائے گی۔ علامت کے طور پر مشتے از خروارے، ایک مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ حالات اب قابو سے اتنے باہر ہو چکے تھے کہ محل میں سب سے زیادہ طاقت ور شخصیت دلیپ سنگھ کے چچا کی داشتہ منگلا، ایک تیس سالہ خوب صورت ملازمہ کی ہو گئی تھی۔ منگلا ایک سقے کی لڑکی تھی۔ دلیپ سنگھ پر لگائے جانے والے الزامات میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ وہ رنجیت سنگھ کا اصلی بیٹا نہیں تھا بلکہ اس کی پیدائش بی بی جندن کور اور سقے کے تعلقات کا نتیجہ تھی۔

۱۸۴۵ کے اوائل میں انگریزوں نے ڈوگرا سردار گلاب سنگھ سے اتحاد قائم کیا اور موسم خزاں تک پنجاب پر حملہ کرنے کے لیے اپنی فوجوں کی صف بندی شروع کر دی۔ ہندوستانی جاگیرداروں کے روایتی فن غداری نے فتح حاصل کرنے میں انگریزوں کی ایک دفعہ پھر اس وقت مدد کی جب سکھ سردار تیج سنگھ جو کمک کے طور پر موقع پر پہنچا تھا۔ لارڈ گف کی فوجوں کو جو ۲۱-۲۲ دسمبر ۱۸۴۵ء کی جنگ میں تقریباً ہار مان چکی تھیں، ختم کرنے کے بجائے اپنی فوجوں کو لے کر پسپا ہو گیا۔ انگریزوں نے گلاب سنگھ کے اتحاد کا انعام یہ دیا کہ اسے وہ علاقہ خریدنے کی اجازت دے دی جو آج جموں اور کشمیر کی ریاست کہلاتا ہے اور جس پر اس کے وارث حکومت کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۹۴۷ کی کش مکش میں ہری سنگھ خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلا۔

۲۹ مارچ ۱۸۴۹ کو، ایک ناکام بغاوت کے بعد، انگریزوں نے سکھ سلطنت کے خاتمے کا باقاعدہ اعلان کر دیا اور مہاراجہ دلیپ سنگھ نے کوہ نور واپس کر دیا۔ مسن سکھوں کا کہنا تھا کہ آج "رنجیت سنگھ مرے ہیں، وہ مرے اور ان کے ساتھ اس نئے مذہب کی روح کا ایک حصہ مر گیا۔

اسی دوران دہلی میں، سلطنت کے ناٹک کو بڑی مضحکہ خیز تفصیلات کے ساتھ دہرایا جا رہا تھا۔ مغلوں کے آخری ایام کی حقیقت تخیل سے ہم آہنگ نہیں ہوتی۔ آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر جنھیں ۱۸۳۷ میں تاج شاہی پہنایا گیا تھا اب بھی اپنے آپ کو "شاہ عالم" کہتے تھے اور سرسید کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" کے مطابق انھیں یقین تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایک مکھی یا ایک بھڑ کے روپ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس خیال کی توجیہ فرائڈ کے یہاں شاید مل جائے۔ عظمت و شکوہ کے فریب کا مخالف یا اُلٹ شاید یہی ہو سکتا تھا لیکن ایک سال میں چار مرتبہ عید، بقرعید،

نئے سال اور انگلستان کی ملکہ کے یوم پیدائش پر، انگریزوں کے نمائندے، ایک خیالی سلطنت کے اس حکمراں کے سامنے ننگے پیر کھڑے ہو کر نذریں پیش کیا کرتے تھے۔ درحقیقت انگریز دھوکہ دیتے تھے۔ تحقیر اور ذلت کی علامت، برہنہ پائی کے لیے وہ اپنے آپ کو تیار نہیں کر پاتے تھے اس لیے وہ اپنے جوتوں پر موزے چڑھا کے سامنے آتے تھے۔ جہاں تک بادشاہ کا تعلق ہے، جب انھیں اپنا مرثیہ لکھنے سے فرصت ملتی تھی تو وہ انگریز سے اپنی پنشن بڑھانے کی درخواست کرتے رہتے تھے۔

مگر بادشاہ کا سحر ابھی تو تمام نہیں تھا۔ دلی کا تخت جس پر کبھی بابر، کبھی اکبر، کبھی شاہ جہاں اور کبھی اورنگ زیب بیٹھا تھا اس پر ایک بے کار محض آدمی کے بیٹھنے کے باوجود وہ آج بھی حقیقی قوت کی علامت تھا۔ ہولکر کے سکوں پر تکاجی راؤ کے عہد (۹۶-۱۷۹۴ء) تک مغل بادشاہ کا نام ہوتا تھا۔ انگریزوں نے اس وقت تک تمام ان جاگیردار خاندانوں کو شکست دے کر جلاوطن کر دیا جن سے ہندوستان میں ان کی فوقیت کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ مراٹھا پیشوا کو شمالی ہندوستان کے ایک گاؤں میں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ ٹیپو سلطان کے ورثا کلکتہ کے ایک نواح میں، اودھ کے حکمراں کلکتے میں، اور رنجیت سنگھ کے تبدیلِ مذہب کرنے والے لڑکے کو انگلستان کے ایک کنٹری ہاؤس میں رکھ دیا گیا تھا۔ انگریز کی راہ میں اگر کوئی چیز اب بھی باقی تھی تو وہ دلی میں نحیف و نزار یادگار تھی۔

۱۱ مئی، ۱۸۵۷ء کی صبح کو پچھلے دن کی کامیابیوں سے سرشار میرٹھ کی کالی پلٹن کے سپاہیوں نے کلکتہ گیٹ اور شاہی محل کے درمیان سے دلی میں داخلے کے لیے، کشتیوں کے ایک پل کے ذریعے دریائے جمنا کو پار کیا۔ جیسا کہ لوگ عام طور پر جانتے ہیں کہ اس بغاوت کا فوری سبب ہندوؤں اور مسلمانوں کی وہ ناراضگی تھی جو انھیں نئی این فیلڈ رائفل کے کارتوسوں میں چربی کے استعمال سے ہوئی تھی۔ ان کارتوسوں کو رائفل میں ڈالنے سے پہلے اپنے دانتوں سے کھولنا ہوتا تھا لیکن بغاوت کی آگ تو بہت دنوں سے سلگ رہی تھی۔ دلی کے نواح کے کسان (جنھیں چربی کا مزہ لینے کا موقع کبھی نہیں ملا تھا) بغاوت میں شامل ہو گئے اور یہ بغاوت عوامی سطح پر ایک انوکھی بغاوت کی شکل اختیار کر گئی جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں نے اپنے باہمی اختلافات بھول کر سفید چمڑی والوں کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا۔ شمالی ہندوستان میں اسے ایک وسیع حلقے سے تعاون ملا۔ سنتھالوں اور بھیلوں جیسے قبائل کی جنھوں نے ذات پات کو کبھی تسلیم نہیں کیا لیکن بدیسی کو جانتے تھے، حمایت بغاوت کو حاصل ہوئی۔ بہرحال باغیوں کی دشواری یہ تھی کہ لاتعداد قومیں لاتعداد مختلف چیزوں کے لیے نبرد آزما تھیں اور ان میں سے بہت سوں کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ فتح کے بعد کیا ہوگا۔ اس پر مزید طرہ جاگیردارانہ قیادت کی نااہلی تھی۔

جب سپاہی پہلی بار بہادر شاہ کے محل پر پہنچے اور انھوں نے مطالبہ کیا کہ بادشاہ ان کی قیادت کرے تو انھوں نے

انگریز ریزیڈنٹ کیپٹن ڈگلس سے کہا کہ وہ انھیں کسی طرح ٹال دے۔ جب سپاہیوں نے اصرار کیا تو انھوں نے کہا کہ میں تو محض وظیفہ خوار ہوں اور وہ ان کو تنخواہ دینے کی بھی استطاعت نہیں رکھتے۔ سپاہیوں نے کہا کہ وہ تنخواہ نہیں چاہتے۔ بعض لوگوں پر عظمت تھوپ دی جاتی ہے۔ مغل خاندان کا یہ آخری چشم و چراغ بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ مگر اس وقت جذبات اتنے شدید تھے کہ انھوں نے بہادر شاہ جیسے آدمی کو متاثر کیے بغیر نہیں چھوڑا اور وہ قیادت کرنے کے لیے راضی ہو گئے۔ سپاہیوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔

انگریز نے اس اتحاد کو تباہ کرنے کے لیے مذہبی اختلافات پیدا ہونے کا انتظار کیا، خصوصاً بقرعید کے دن کا کہ جس دن مسلمان اللہ کے نام پر جانوروں کی قربانی کرتے ہیں۔ انھیں یہ توقع تھی کہ اس موقع پر گائے کاٹنے پر ہندو مسلمان میں روایتی دشمنی ہو گی اور اس اتحاد کو توڑا جا سکے گا۔ ہوا اس کے بالکل برعکس، مسلمان لیڈروں نے ذبیحہ گاؤ کو ممنوع قرار دیا اور خود بہادر شاہ نے بکرے کی قربانی کر کے لوگوں کے سامنے ایک مثال رکھ دی۔ جنگ کے دوران انگریزوں کے محاصرے کو توڑنے کے لیے ہندوستانیوں نے بڑی جانبازی اور بہادری دکھائی۔ ایک مسلمان عورت نے اپنے آپ کو ایک مجاہدہ کہا اور سبز صافہ باندھ کر توپوں سے کیے جانے والے ایک حملے کی قیادت کی۔ وہ گرفتار کر کے قیدی بنائی گئی مگر حراست سے پہلے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے دو انگریزوں کو مار ڈالا۔ بہر حال ۱۴ اگست کو جان نکلسن کا دستہ انگریزوں کی امداد کے لیے آ گیا۔ ۱۳ ستمبر تک قلعہ دہلی کی دیواروں میں رخنے پیدا کر لیے گئے اور ۲۰ ستمبر تک انگریزوں نے اپنی سلطنت کو بچا لیا تھا۔ اگرچہ اس سودے میں ان کے تین ہزار آٹھ سو سینتیس افسر اور جوان مارے گئے یا لاپتہ یا زخمی ہوئے۔ اکیس مغل شہزادے پھانسی پر لٹکائے گئے، فوجی دستوں نے دہلی کے جتنے باشندوں کو چاہا موت کے گھاٹ اتارا۔ دہلی کو انگریزوں نے بالکل اسی طرح جس طرح پہلے فاتحین نے کیا تھا جی بھر کر لوٹا اور تاراج کیا۔ برطانوی دستاویزات کے مطابق، ہر افسر اس لوٹ مار کے بعد نوکری سے سبکدوش ہو سکتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ افسروں کی ایک غیر معمولی تعداد نے مالِ غنیمت دے کر اپنے عہدوں سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ مشہور اردو شاعر غالب نے "میرے سامنے خون کا سمندر" اسی کے بارے میں لکھا ہے اور اس طرح انگریزوں نے دہلی سے اپنی حکومت کا وہ دور شروع کیا جو ٹھیک نوے سال بعد ایک خون خرابے پر ختم ہوا۔ مگر اس دفعہ یہ خون خرابہ ایک ایسی جنگ میں ہوا جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ لڑی گئی۔

اسی بغاوت کے دوران سکھوں نے یہ دکھا دیا کہ وہ ایک فرقہ کی حیثیت سے خود اپنے مفادات اور محرکات رکھتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے مختلف ہیں۔

۱۱ اور ۱۲ مئی کی نصف شب کو سپاہیوں اور نوجوان شہزادوں نے بالآخر متامل بیر و بہادر شاہ ظفر کو بغاوت کی قیادت کرنے پر مجبور کر دیا اور شاہی توپوں نے ایک فرض سمجھ کر اکیس گولے داغ کر بے بسی اور مجبوری کے اس عارضی خاتمے کا اعلان کیا۔

پنجاب کی فوج میں اس وقت ساٹھ ہزار سپاہی تھے اور ان میں انگریز محض دس ہزار تھے۔ ۱۳ مئی کو ہندوستانی فوجی دستوں کو ہتھیار جمع کر دینے کا حکم دیا گیا۔ انگریزوں کی حکومت داؤں پر لگی ہوئی تھی، یہاں تک کہ شملہ کی پہاڑی چوکیوں میں رکھے گئے گورکھا سپاہیوں نے بھی شکوہ شکایت شروع کر دی، جو سپاہی کسولی میں تھے انھوں نے وہاں خزانے کو لوٹ لیا اور اپنی اپنی بیرکوں میں واپس جانے سے پہلے بہت سی رعایتیں حاصل کر لیں۔ یہی وہ وقت تھا جب سکھ، کشمیری ڈوگرا، پنجابی اور پنجابی مسلمان انگریزوں کے تحفظ کے لیے سامنے آئے۔ ان سب کے پاس اپنے اس عمل کی اپنی توجیہیں تھیں۔ سب سے پہلے تو یہی کہ نئے نئے باغی سپاہی وہی فوجی تھے جنھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں کی حیثیت سے کوئی دس سال قبل سکھ، پنجابی اور ڈوگرا سلطنت کو تباہ کیا تھا۔ اس اتحاد کے اہم عنصر، سکھ نہ تو دہلی میں ایک مراٹھا راجہ کے وجود کی ہندو آرزو کی تکمیل کے لیے کوئی اشتیاق دکھا سکتے تھے اور نہ ہی مغل عظمت کی بحالی کی مسلمانوں کی توقع ان میں کوئی جوش و خروش پیدا کر سکتی تھی۔ بنارس اور اس کے قریب جون پور میں سکھوں کے ان سپاہیوں کا ساتھ دینے کے اکا دکا واقعات کے علاوہ، سکھ سپاہی، سارے شمالی ہندوستان میں بغاوت کے اہم مرکزوں میں، انگریزوں کو بچانے کے لیے لڑے انگریزوں نے دہلی پر سکھوں اور انگریزوں کے قبضے کے خیال کی ہمت افزائی کر کے اس میں مدد کی۔ درحقیقت یہ ہوا بھی مگر انگریزوں کو حکومت ملی اور سکھوں کو شاباشی اور کچھ وہ مالِ غنیمت جو ستمبر میں دہلی پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد ان کے ہاتھ آیا تھا۔

سکھ شہزادوں کو، انگریز دشمن جاگیرداروں سے چھینی ہوئی زمین کا کچھ حصہ بھی ملا۔ مثلاً نواب جھجر ایک مسلمان کو پھانسی دی گئی اور ان کی املاک کو پٹیالہ اور نابھا کی سکھ ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا (اول الذکر کو دہلی میں بہادر شاہ ظفر کی بیوی بیگم زینت محل کا ایک گھر بھی ملا) خالصہ، فوج کے نئے چہیتے بن گئے۔ ابھی تک رجمنٹ میں سکھوں کی تعداد سو تک محدود تھی (برطانوی فوج میں ۴، رجمنٹیں تھیں) بغاوت کے بعد ہونے والی تنظیم نو میں عسکری نسلوں کے نظریے کی تجدید ہوئی۔ سکھ، پنجابی، مسلمان، راجپوت، جاٹ، ڈوگرا اور مراٹھا اب نوکر رکھے جائیں گے اور اس کے پیچھے اصول یہ بتایا گیا آریا ہیں یا کم و بیش آریا ہیں اور اس لیے بنیادی طور پر یورپی ہیں۔ بہاریوں کو جنھوں نے درحقیقت انگریزوں کو ان کی پہلی فتوحات دلائی تھیں، مگر ۱۸۵۷ء میں بغاوت کی تھی۔ ایک غیر عسکری نسل قرار دیا گیا اور سکھ، گورکھا

اور ڈوگرا عسکری نسل مانے گئے۔ سکھوں کو مزید انعام پنجاب میں نہروں کی تعمیر کے پروگرام میں ملا۔

حالات کی یہ عجیب و غریب کروٹ تھی کہ یہی چیز تھی جس نے اپنا پہلا بحران پیدا کرنے میں سکھوں کی مدد کی تھی۔ جیسا کہ خشونت سنگھ نے لکھا ہے۔ "شاہی فوجوں کو ترقی سے جو خوش حالی نصیب ہوئی اس کا کمیونٹی کے مستقبل اور ذات پات کے ڈھانچے پر بڑا اہم اثر پڑا۔ سکھ ہونے کے اقتصادی فوائد نے سکھوں کے منتشر ہونے اور ہندو ازم کی آغوش میں ان کی مراجعت کو روک لیا۔ (عبارت کو خط کشیدہ مصنف نے کیا ہے۔) اس کے برعکس انیسویں صدی کی آخری دہائی اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں سکھوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا..... اس طرح سکھوں کے معدوم ہو جانے کی لارڈ ڈلہوزی کی افسردہ پیشین گوئی کو سچ ہونے سے خود ڈلہوزی کی شروع کی ہوئی اور پنجاب کے کمانڈروں اور دوسرے منتظمین کی تقویت پہنچانے والی پالیسیوں نے بچا لیا۔"

انگریزوں نے سکھ ہونے کو نفع بخش بنا دیا۔ نہروں کے جال نے بنجر زمین کو سونا اگلنے والی زمینوں میں بدل دیا۔ بہترین زمینوں کے قطعے سکھ کسانوں کو دانستہ دیئے جانے کے بڑے دوررس اثرات پڑنے تھے۔ اکیلی چناب سے نکلی ہوئی نہر نے تقریباً تیس لاکھ ایکڑ زمین کو کاشت کے قابل بنا دیا جس سے ۸ء ملین روپیہ سالانہ سے زیادہ کا یا یوں سمجھیے کہ نہر کی تعمیر پر آنے والی لاگت کا تین گنا لگان آیا۔ مفلس ترین سکھ بسنے والے کو ۱۴ سے ۱۶ ایکڑ تک زمین مفت دی گئی۔ متوسط درجے کے کسانوں کو ۶ سے ۹ روپیہ فی ایکڑ کے حساب سے ۱۱۱ سے ۱۳۹ ایکڑ تک اور امیروں کو دس سے بیس روپیہ فی ایکڑ کے حساب سے ۱۶۷ سے لے کر ۵۵۶ ایکڑ تک زمین عطا ہوئی۔ نہروں کی تعمیر کے پروگرام سے پہلے جو زمین دس روپیہ فی ایکڑ تھی اس کی قیمت اب ۴۰۰ روپیہ فی ایکڑ ملنے لگی۔ گیہوں کی برآمد دس لاکھ ٹن سالانہ سے بھی بڑھ گئی۔ اگرچہ سکھ پنجاب کی آبادی کا محض بارہ فی صدی حصے تھے مگر ہندوستان کی شاہی فوج میں وہ بیس فی صدی سے زیادہ تھے۔ بغاوت کے بعد سکھ ہونا اچھی بات تھی۔

مگر قابل غور سوال یہ ہے کہ لارڈ ڈلہوزی نے آخر کیوں یہ پیشین گوئی کی تھی کہ سکھ معدوم ہو جائیں گے اور تاریخ دانوں نے یہ کیوں کہا کہ ہندو ازم کی طرف مراجعت شروع ہو گئی تھی؟ اس کا سوال نہیں ہے کہ ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان تعلقات بہت قریبی تھے اور وہ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک بہت قریبی رہے تھے۔ اس دوستی اور محبت پر مسلمانوں سے مشترکہ دشمنی نے صیقل کیا اور روزمرہ کے معاملات میں اس نے مثال کے طور پر گائے کے احترام کی شکل اختیار کی۔ (اگرچہ خود سکھ مذہب میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کی بنا پر ایک آمدنی دینے والے جانور سے زیادہ احترام کی ضرورت پیش آئے) ہندوؤں نے سکھ گردواروں میں عبادت کرنا شروع کی، اور اس کی وجہ سے

بہت جلد اگرو نانک کے سختی سے ممنوع کیے ہوئے بُت وہاں بھی متعارف ہو گئے۔ ۱۹ ویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں یہ ایک طریقہ رائج ہو گیا تھا کہ ہندو اپنے بڑے لڑکے کو سکھ بنا دیتے تھے۔ بعض سرپھروں کا خیال ہے کہ یہ فیاضی، ان فوائد کا براہ راست نتیجہ تھی جو سکھوں کو انگریزوں سے پہنچ رہے تھے اور ہندو بھی ان فائدوں سے محروم نہیں رہنا چاہتے تھے۔ اس صورت حال کا بہر حال سبب کچھ بھی ہو دونوں کے تعلقات اتنے قریبی ضرور تھے کہ دیکھنے والے یہ پیش گوئی کر سکیں کہ نانک پنتھی، وہ دن دور نہیں، جب ہندو ازم کی طرف لوٹ آئیں گے۔ تغیرات کے اس زمانے میں، مختلف اقسام کی مذہبی تحریکیں شروع ہوئیں۔ نانک اور گرو گوبند سنگھ ازم اور برہمنوں کے ہندو ازم کے درمیان، مختلف فرقے وجود میں آئے۔ ان ہی میں سے ایک فرقہ نرنکاریوں کا تھا جس کی قیادت پشاور کا ایک تاجر دیال داس کرتا تھا۔ اسی طرح ایک ہندو ساہوکار شیو دیال نے رادھا سوامیوں کا فرقہ قائم کیا۔

مگر انگریزوں کی دی ہوئی مراعات اور ترغیبات نے سکھوں کی چاہے جتنی امداد کی ہو، وہ بہر حال ہندو ازم کے چیلنج اور عیسائی مشنریوں کی دل کش پیش کشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی نہیں تھیں۔ تبدیل مذہب کی عیسائی تحریک ۱۸۳۵ء میں اس وقت سے شروع ہوئی جب لدھیانہ میں ایک امریکن پریسبیٹیرین مشن قائم کیا گیا، یہاں سے پھر یہ تحریک باہر نکلی۔ تبدیل مذاہب کرانے میں، عیسائیوں کو ابتدا میں کامیابی اچھوتوں میں ملی بعد کو انھوں نے اعلیٰ طبقہ میں بھی کچھ کامیابیاں حاصل کیں ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر راجہ ہرنام سنگھ کا تبدیل مذہب ہے۔ یہی راجہ ہرنام سنگھ تھے جن کی بیٹی راج کماری امرت کور آزاد ہندوستان میں ایک وزیر بنیں۔

آریہ سماج، کی بنیاد ایک گجراتی برہمن سوامی دیانند سرسوتی نے رکھی جنھوں نے ویدانت ازم کی طرف لوٹنے کی تبلیغ کی۔ ظاہر ہے کہ انھیں اس سرزمین سے خصوصی دل چسپی تھی جہاں ویدوں کی تدوین ہوئی تھی۔ وہ اپنی موت سے چھ سال قبل، ۱۸۷۷ء میں پنجاب آئے اور اپنا اچھا خاصہ اثر پیدا کر لیا۔ بہت سے سکھوں نے ہندو ازم کی طرف پھر واپس لوٹ جانے کے لیے شدھی کرائی۔ دیانند نے اپنے عقائد کے سلسلے میں کسی کو فریب یا غلط فہمی میں نہیں رکھا۔ ان کی کتاب ستیارتھ پرکاش میں جو ۱۸۷۴ء میں طبع ہوئی تھی انھوں نے حضرت محمدؐ، حضرت عیسیٰؑ اور گرو نانک کو ایک ہی شدت سے برا کہا ہے۔ نانک کے لیے جن پر بدیسی ہونے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا تھا، سوامی جی ایک مخصوص نفرت رکھتے تھے اور انھیں ریاکار اور ٹھگ بھگت کہتے تھے۔ سکھ دانش وروں نے جواب دینے کی کوشش کی اور آریہ سماج کی تبلیغ کے جواب میں ریاست نابھا کے کاہن سنگھ نے دیواروں پر "ہم ہندو نہیں ہیں" لکھوا دیا۔

سکھوں کو جس چیز نے حقیقتاً کمزور کیا وہ باہر والوں کے حملے نہیں بلکہ خود ان کی کمزوریاں اور کمیاں تھیں جو

انتہائی تیزی کے ساتھ ان کے اندر پھیل گئی تھیں ۔ ابھی صرف پچاس سال قبل تک خالصہ کی تعداد بڑھ رہی تھی، اور اب وہ بڑی تیزی کے ساتھ گھٹنے لگی تھی ۔ ۱۸۸۱ء کی مردم شماری میں لکھا ہے کہ اگرچہ بحیثیت مجموعی آبادی میں پچھلی مردم شماری کے بعد سے بیس فی صدی کا زبردست اضافہ ہوا ہے مگر "سکھ ازم روبہ انحطاط ہے" وہ تمام عیوب خصوصاً ذات پات، اگرو نانک نے جن کے خلاف جنگ کی تھی، پھر عام ہو گئے تھے ۔ برابری اور مساوات کے مندر امرت سر کے مقدس ہری مندر میں نیچی ذات کے سکھوں کو داخل ہونے کی اجازت صرف مخصوص اوقات میں تھی اور انھیں کڑا پرشاد چھونے کی اجازت نہیں تھی اگرچہ یہ ایک ایسا کھانا تھا جو عوامی باورچی خانے سے ہر معتقد کو ملتا تھا اور شروع بھی ذات پات کی تفریق کو مٹانے کے لیے ہوا تھا ۔ مگر مذہب کی حالت سکھ گردواروں کی حالت سے بڑی اچھی طرح ظاہر ہوتی تھی ۔ انحطاط کا یہ وہ عالم تھا کہ اگر اسے روکنے کی سعی نہ ہوتی تو وہ خود فرقہ ہی کو نیست نابود کر دیتا ۔



(٦)

پگڑی سنبھال جٹّا

صدی کے اختتام پر، پنجاب میں مخرب اخلاق ادب، طوائفوں سے ملاقات، یا جوئے کی سہولتیں آدمی کی صلاحیت اور شوق کے مطابق فراہم تھیں اس اختلاط نے مقدس ترین مقام کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔

دل چسپ بات یہ تھی کہ سکھ گردواروں کے مہنتوں کا سکھ ہونا بھی ضروری نہیں تھا۔ ان میں سے بہت سے ہندو تھے، جنھوں نے عیاشی کے ساتھ ساتھ وہاں یعنی ایک ایسی جگہ پر جہاں بُتوں کی پوجا صاف طور پر ممنوع تھی، بت پرستی بھی شروع کر دی تھی۔ درحقیقت مقدس ترین گردوارے گولڈن ٹمپل سے بُت ۱۹۰۵ میں سکھوں کے بہت دباؤ ڈالنے پر ہٹائے گئے۔ مہنتوں کی یہی شہرت تھی جس کی وجہ سے نظام حیدرآباد نے ایک قانون نافذ کر دیا تھا کہ ناندیڑ (جو نظام کی قلمرو میں آتا تھا) گردوارے میں صرف ایک 'بااخلاق برہمچاری' ہی مہنت ہو سکتا ہے۔ ناندیڑ کا گردوارہ گرو گوبند سنگھ کے مارے جانے کی جگہ کی نشان دہی کے لیے بنایا گیا تھا۔ ظاہر ہے برہمچاری اور اچھا اخلاق اپنی عدم موجودگی سے پہچانے جاتے تھے۔ مہنتوں کے ہندو یا غیر سکھ ہونے کے اسباب تاریخ میں ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے نصف اوّل نے سکھوں کے خلاف پنجاب کے ذکریا خان، یحییٰ خان، اور میر منّو جیسے مسلمان

گورنروں کا زبردست ظلم وستم دیکھا اس سے گھبرا کر اکثر ایسا ہوتا تھا کہ خالصاؤں کو شہر چھوڑ دینا پڑتا تھا۔ اسی وقت گرونک کے بڑے بیٹے بابا سری چند نے 'اداسی' نام کے ایک فرقے کی بنیاد ڈالی (اداسی نام گرونانک کی ان طول طویل سیاحتوں کے نام پر رکھا گیا کہ ان سیاحتوں کو اس وقت اداسیاں ہی کہا جاتا تھا۔)

یہ اداسی فرقہ گردواروں کے تحفظ میں مدد دینے کے لیے کھڑا ہوا۔ اداسی چوں کہ نہ تو لمبے بال رکھتے تھے اور نہ ہی ان کے پاس سکھوں کی کوئی دوسری ظاہری علامات ہوتی تھیں، اس لیے وہ اذیت سے بچ گئے۔ بہرحال جب مسلمانوں کی طرف سے خطرہ ختم ہوگیا تو انھوں نے گردواروں کو سکھوں کو واپس کرنے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ سکھ حکومت کے قیام کے بعد گردواروں کو بے انتہا زمینیں دی گئیں تاکہ مہنت اس کی آمدنی سے کمیونٹی کے لوگوں کی امداد کریں اور گردواروں کی دیکھ بھال میں ان رقموں کو استعال کریں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے جو کیا وہ یہ تھا کہ اس رقم سے خود انھوں نے اپنی مدد کی اور جاگیرداروں کا تحفظ کیا۔ لاہور ہڑپ لینے کے بعد انگریزوں نے جب ناموں کی تجدید شروع کی تو ان مہنتوں نے ان ساری زمینوں کو اپنی موروثی املاک لکھوا دیا۔

یہ بالکل صاف تھا کہ سکھوں نے اپنی آزادی، امتیازی علامتوں، اپنے گردواروں اور اپنے مقدر پر سے بھی اپنا اختیار کھو دیا تھا۔ گردواروں کے ہندو مندروں میں تبدیل ہو جانے یا برائیوں کے گڑھ بن جانے یا بیک وقت دونوں تبدیلیاں ہونے کے ساتھ ہی ہندو ازم کی طرف مراجعت میں بھی تیز رفتاری آگئی تھی۔ سکھ قیادت نے مرض کی تشخیص، مذہبی اور سیکولر تعلیم میں کمی اور اس کی وجہ سے سکھ عقاید اور سکھ شناخت پر فخر و ناز کے معدوم ہو جانے میں کی۔ اگر سکھوں کو ایک الگ خود مختار مذہب کی حیثیت سے باقی رہنا تھا تو انھیں یہ معلوم ہونا ضروری تھا کہ ان کے مذہب کا مطلب کیا ہے؟۔ یکم اکتوبر ۱۸۷۳ کو امرت سر میں سری گرو سنگھ سبھا قائم ہوئی۔ سکھ اعتماد کو بحال کرنے اور آریہ سماج اور عیسائی مشنریوں کے اثرات سے اپنے عقائد کو محفوظ کرنے کا کام سب سے پہلے اسی تنظیم نے کیا۔ سبھا نے تاریخی اور مذہبی کتابیں شائع کرنے، پنجابی زبان میں نئی تعلیم پھیلانے اور مرتدوں کو واپس لانے کا فیصلہ کیا۔ تحریک نے جلدی ہی خالصہ اسکولوں اور کالجوں کا ایک جال سا بچھا دیا۔ ۵ مارچ ۱۸۹۲ میں، سب سے بڑا خواب اس وقت پورا جب امرت سر میں، سر جیمس لائل نے خالصہ کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ کالج میں باقاعدہ تدریس ۲۲ اکتوبر ۱۸۹۳ء سے شروع ہوئی۔ ۱۹۰۸ تک مغربی تعلیم کو جس کی شدید ضرورت تھی، پھیلانے، پنجابی زبان کے علم اور سکھ عقائد کی ترویج کے لیے سکھ ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۷۳ کا سال، جس میں سکھ سبھا وجود میں آئی، سکھ تاریخ میں ایک اہم سال ہے۔ سیاسی بازو، چیف خالصہ دیوان ۱۸۸۷ء میں قائم کیا گیا لیکن اس پر جلد ہی ان لوگوں کا تسلط ہوگیا جو سمجھتے

تھے کہ سکھ خوش حال صرف انگریزوں کی سیاسی غلامی ہی کے ذریعے ہو سکتے ہیں مگر تعلیم نے نئے خیالات بیدار کیے اور نوجوان نسل نے اپنے آپ کو تحریک آزادی سے وابستہ کرنا شروع کیا۔ مشہور برطانوی سی آئی ڈی (اسنٹرل انوسٹی گیٹو ڈیپارٹمنٹ) نے پنجاب گورنمنٹ کو آگاہ کیا تھا کہ خالصہ کالج، ۱۹۰۷ تک طالب علموں میں قومی جذبات پیدا کرنے کا اہم مرکز بن چکا تھا"۔ ۱۹۰۷ میں جب گوپال کرشن گوکھلے خالصہ کالج آئے تو وہاں کے طالب علموں میں اتنا جوش و خروش پیدا ہوا کہ انھوں نے ان کی گاڑی کے گھوڑے کھول دیئے اور ان کی جگہ پر ریلوے اسٹیشن سے کالج تک خود انھوں نے گاڑی کھینچی۔

اسی دوران مختلف بوجھوں تلے دبے ہوئے کسانوں کی ناراضگی اس وقت اور بڑھ گئی جب ۱۹۰۷ء میں کالونائزیشن بل پاس ہوا اور جس نے زمین کے لگان میں مزید اضافہ کر دیا۔ اعداد و شمار بڑھتی ہوئی مفلسی اور غریبی کے آئینہ دار ہیں۔ قرضہ دینے والے ساہوکاروں کی تعداد جو ۱۸۶۸ء میں ۵۲۲۶۳ تھی۔ ۱۹۱۱ء میں بڑھ کر ۱۹۳۸۹۰ ہو گئی۔ زمین کی خرید و فروخت جو انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں اوسطاً ۸۸۰۰۰ ایکڑ سالانہ تھی اس میں بھی اضافہ ہوا اور دہ ۱۹۱۰-۲۰ کے دوران ۳۳۸۰۰۰ ایکڑ ہو گئی۔ رہن کے کاروبار میں بھی یہی صورتِ حال تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب بانکے دیال کا مشہور گیت "پگڑی سنبھال جٹا" ہر سمت گونجنے لگا۔ بہر حال کالونائزیشن بل کو بالآخر وائسرائے نے اپنے ووٹ سے رد کر دیا۔ اس وقت تک جوان مرد سکھ جو روزگار کی تلاش میں ہندوستان چھوڑ کر برطانوی سلطنت کے دوسرے حصوں اور امریکا میں آباد ہو گئے تھے۔ رنگ کے امتیاز کی لپٹ محسوس کرنے لگے تھے۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران سفید چمڑی والوں کے خلاف ان کی ناراضگی نے ناکام غدر کی شکل اختیار کی۔ پنجاب کے سکھ شاید اس بغاوت کا ساتھ نہ دیتے مگر انھوں نے بھی ایک نوآبادکار حاکم سے اپنے رشتوں کی نوعیت کو سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ بہر حال انھوں نے بھی عالمی جنگ میں یورپ، افریقہ اور ترکی میں لڑ کر اپنا فرض پورا کیا اور ہندوستانیوں کو ملنے والی بہادری کے بائیس ملٹری کراس میں سے چودہ ملٹری کراس حاصل کیے۔ مگر حالات میں تبدیلی آنا تھی جیسا کہ خود انگریزوں کو بھی پتہ چلتا تھا، خصوصاً دوسری عالمی جنگ میں، جب وفادار سکھوں کے غول کے غول، سبھاش چندر بوس کی باقی ماندہ انڈین نیشنل آرمی (آزاد ہند فوج) میں چلے گئے۔

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ کی تاریخ بہر حال وہ تاریخ ہے جب حالات نے پلٹا کھایا۔ بریگیڈیر جنرل آر۔ ای۔ ایچ ڈائر، جو ۹ اکتوبر ۱۸۶۴ کو ہندوستان میں مری کے مقام پر پیدا ہوا تھا، وہ شمالی ہندوستان کے ایک شراب کشید کرنے والے خاندان ڈائر میکن اینڈ کمپنی کا ایک فرد تھا (یہ کمپنی اب ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے اور اس کا نام اب موہن میکن

ہوگیا ہے) اس نے شملہ میں بشپ کاٹن اسکول میں تعلیم حاصل کی ۔ وہاں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ہیبت ناک کہانیوں پر اس کی پرورش ہوئی ۔ ۱۹۱۹ء میں اس نے جلیان والا باغ کے مقام پر ایک نہتے مجمع میں شامل مردوں عورتوں اور بچوں کے، جس میں زیادہ تر سکھ تھے، قتل عام کا حکم دیا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس قتل عام میں ۳۷۹ افراد مرے تھے اور ۲۰۰۰ سے زیادہ زخمی ہوئے تھے۔ (خود سامراجی ونسٹن چرچل بھی بدحواس ہو گیا تھا) جلیان والا باغ میں ڈائر نے صرف بادشاہ کے انتہائی خیر خواہ ملازم کی وفاداری ہی نہیں دکھائی بلکہ اس نے غلاموں کے لیے آقاؤں کی تحقیر کے جذبات کا بھی پورا اظہار کیا تھا۔ سرکاری سکھ لیڈرشپ کے رویے کے پیش نظر اس بات کا سمجھ لینا بہت آسان ہے کہ گولڈن ٹمپل کے سربراہ اروڑ سنگھ جیسے سکھوں نے جلیان والا باغ کے قتل عام کے بعد جنرل ڈائر کی عزت افزائی کیوں کی ۔ دراصل جنرل ڈائر کی خدمت میں اعلیٰ ترین نذرانہ سروپا اور تلوار پیش کی گئی اور اسے ایک اعزازی سکھ بنایا گیا۔ مہندر سنگھ کی کتاب دی اکالی موومنٹ (میکملن ۱۹۷۸) میں جس گفتگو کا اقتباس پیش کیا گیا ہے وہ ایک ایسے چاپلوس خوشامدی کی جس کے لیے کوئی بھی تحقیر کافی نہیں تھی اور ایک ایسے آقا کی جو ہونٹوں پر طنزیہ تبسم کے ساتھ توڑیوں کے ساتھ کھیل کرتا ہے، ایک مثالی بات چیت ہے۔ گفتگو کا اقتباس یہ ہے۔

"صاحب، آپ بھی نکلسین صاحب کی طرح سکھ ہو جاؤ" (نکلسین، جان نکلسن کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ یہ شخص ۱۸۵۷ کا ایک انگریز ہیرو تھا) جنرل (ڈائر) نے اعزاز کے لیے شکریہ ادا کیا اور کہا مگر ساتھ ہی یہ اختلاف بھی کیا کہ "وہ انگریز افسر ہونے کی حیثیت سے اپنے بال نہیں بڑھا سکتا" جنرل ڈائر نے ایک اور اختلاف بھی کیا "میں سگریٹ بھی نہیں چھوڑ سکتا"۔ "یہ تو آپ کو کرنا چاہیے۔" اروڑ سنگھ نے کہا "نہیں" جنرل نے کہا "مجھے بہت افسوس ہے مگر میں سگریٹ نہیں چھوڑ سکتا" مہنت نے مفاہمت کرتے ہوئے کہا "ہم آپ کو اسے آہستہ آہستہ چھوڑنے کی اجازت دے دیں گے"۔ "یہ میں وعدہ کرتا ہوں" جنرل نے کہا "ایک سال میں ایک سگرٹ کے حساب سے۔"

مگر اب سکھ اور ان کے قائد ایک نئے عہد کے اوائل میں تھے جس میں وہ خودداری کے معنی از سر نو سیکھ رہے تھے جلیان والا باغ کے بعد پنجاب انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ مہاتما گاندھی نے پنجاب کا دورہ کیا اور ان کی ہمت افزائی سے، انگریز دوست چیف خالصہ دیوان کے مقابلے میں ۱۹۱۹ کے موسم سرما میں سنٹرل سکھ لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ لیگ نے کانگریس کے ساتھ مل کر کام کیا اور ۱۹۲۱ء میں یہ اعلان کیا کہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا اس کا اصل مقصد ہے۔ اس نے اروڑ سنگھ کا استعفیٰ طلب کر لیا۔ جب اس نے استعفیٰ دینے سے انکار کیا تو سکھوں نے اس کا ایک علامتی جنازہ نکال کر اپنے ارادوں کا واضح اظہار کر دیا۔ بات اروڑ سنگھ کی سمجھ میں آ گئی اور وہ ۲۹ اگست ۱۹۲۰ کو مستعفی ہو گیا۔

اس کے بعد اس نئی سکھ قیادت نے عیاش مہنتوں کی طرف توجہ مبذول کی۔ ایک تحریک شروع کی گئی جسے نہ صرف ان سکھ سیاسی اداروں کو قائم کرنا اور کوئی شکل دینا تھا جو آج بھی موجود ہیں، بلکہ اسے الحاد کے سیلاب پر بھی بند ھ باندھنا تھا۔ یہ تھی ۱۹۲۰ اور ۱۹۲۵ کے درمیان گردوارہ ریفارم موومنٹ۔

اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ سکھ مصلحین، سامراجی حکومت کے لیے نسبتاً زیادہ خطرے کا باعث ہیں انگریزوں نے لالچی مہنتوں کی کھلم کھلا حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنرل ڈائر اور پنجاب کے گورنر سر مائیکل نے نہ صرف قتل عام ہی کے دن سکھوں کا خون نہیں بہایا تھا بلکہ اس کے بعد سات مہینوں تک ہونے والے احتجاج کے دوران بھی خوب خون خرابہ کیا تھا جس میں سینکڑوں افراد سڑکوں پر مارے گئے تھے اور ۵۱ کو سرسری عدالتوں کے فیصلوں کے مطابق پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ جیل بھر گئے تھے اور ہزاروں کو کوڑوں کی سزا دی گئی تھی۔ پیٹ کے بل چلایا گیا تھا اور ذلت و تحقیر کے نہ جانے کتنے طریقے استعمال کیے گئے تھے۔ سکھ اب گاندھی جی کے "نربھے" یعنی بے خوف ہونے کے نعرے کی پیروی کرنے پر تیار تھے۔ سنٹرل گردوارہ مینیجمنٹ کمیٹی (یا جو آج کل شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی، ایس جی پی سی کے نام سے معروف ہے) سکھ گردواروں کو مہنتوں سے اپنے اختیار و اہتمام میں لینے کے لیے بنی تھی۔ ۱۵ نومبر ۱۹۲۰ء کو ۱۷۵ اراکین کی ایس جی پی کمیٹی کا الیکشن ہوا۔ (ایس جی پی سی کی حیثیت سکھ پارلیمنٹ کی سی تھی اور اس کے انتخابات میں زبردست مقابلے ہوتے تھے) ۱۴ دسمبر کو رضاکاروں کی ایک جماعت شرومنی اکالی دل کی تشکیل ہوتی، جو بالآخر ایک باقاعدہ سیاسی جماعت بن گئی جسے ہم لوگ آج جانتے ہیں۔ اکالی کا مطلب ہوتا ہے "غیر فانی" یہ اصطلاح سب سے پہلے گرو گوبند سنگھ نے ان لوگوں کے لیے استعمال کی تھی جو سکھ ازم کے تحفظ کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے پر راضی ہوتے تھے۔ ان لوگوں کی پگڑیوں کا رنگ گہرا نیلا ہوتا تھا جو بعد کو اکالی پارٹی والوں کے بلّوں کا رنگ قرار پایا۔ اکالیوں کو نہنگوں سے ملانا نہیں چاہیے۔ ان کا یہ نام فارسی زبان کا ہے اور اس کا مطلب ہوتا ہے "گھڑیال" یعنی مگر مچھ۔ نہنگ قدیم سپاہیوں کے باقیات ہیں اور اکالی ایک سیاسی پارٹی جس نے اپنے آغاز سے آج تک ایس جی پی سی کو کنٹرول کیا ہے۔

مہنت ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان میں جو زیادہ طاقت ور تھے انھوں نے لڑنے کا فیصلہ کیا۔ دو مقابلوں کی کہانی اس عجیب و غریب تحریک کے کردار اور اس کی کامیابی کو بڑی اچھی طرح ظاہر کرتی ہے۔ ہندوستانیوں کے ذہنوں پر گاندھی جی کا اثر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ چار سال سے زیادہ کے عرصے میں اور انتہائی ظلم و زیادتیوں کو برداشت کرنے کے باوجود گردوارہ تحریک غیر متشدد رہی، حقیقت تو یہ ہے کہ سکھوں نے عدم تشدد کے بڑے بے خوف مظاہرے کیے۔

۱۹۲۱ء میں انگریزوں نے ایک مصالحتی بل پیش کیا جس میں گردواروں سے متعلق فیصلے کرنے کا حق کمشنروں کے ایک بورڈ کو سونپا گیا۔ بہت سے مہنتوں نے فوراً ہی یہ اعلان کر دیا کہ ان کے مذہبی مقامات سکھ گردوارے نہیں بلکہ ہندو مندر ہیں۔ انگریزوں نے حیلہ جوئی کی ہمت افزائی کی۔ اس صورتِ حال سے سکھ خوف زدہ ہوئے اور ہندو اندر اندر خوش۔ اکالی احتجاج جاری رہا مگر پہلے ہی کی طرح پرامن۔ انگریزوں نے جب ایس جی پی سی کے نئے صدر پرجوش بابا کھڑک سنگھ سے جو بے تاج کے بادشاہ کہلاتے تھے، گولڈن ٹمپل کی چابیاں لے لیں تو اکالیوں نے اپنے کو گرفتاری کے لیے پیش کیا اور ان کے مسلسل احتجاج نے بالآخر انگریزوں کو چابیاں واپس کرنے پر مجبور کر دیا۔ گاندھی جی نے اس جیت کو قومی تحریک کی حقیقی فتح کہا مگر دراصل بڑی کامیابی اگست ۱۹۲۲ میں، گرو کا باغ گردوارے پر قبضہ کرنے کے لیے کیا جانے والا احتجاج تھا۔

امرت سر سے تیرہ میل دور واقع یہ مقام اس جگہ کی یادگار ہے جہاں پانچویں گرو ارجن گئے تھے۔ اس کے مہنت سندر داس کو بھی وہی عادتیں تھیں جن سے قاری اب واقف ہو چکے ہیں۔ بہر حال جنوری ۱۹۲۱ میں اس نے ایس جی پی سی سے کچھ مصالحت کر لی وہ خالصہ سکھ بننے پر راضی ہو گیا اور اپنی عادتوں اور شوق کا کچھ جواز پیدا کرنے کے لیے اس نے اپنی ایک داشتہ اشر دے سے شادی کو بھی منظور کیا۔ مگر جب اس تعاون اور اس امداد پر اس کی نظر پڑی جو انگریزوں نے نرائن داس کو دی تھی تو اس نے معاہدہ توڑ دیا۔ ۹ راگست کو گرو باغ کے مقام پر سکھوں نے اپنا پرامن احتجاج شروع کیا۔ اس بار ان کے مقابلے پر مہنت کے غنڈے نہیں انگریز سامراج کی فوجیں تھیں۔

سکھوں نے اپنے کو جتھوں کی شکل میں منظم کیا۔ ہر جتھے میں زیادہ سے زیادہ سو افراد ہوتے تھے۔ جتھا صبح کے وقت گولڈن ٹمپل میں عدم تشدد پر قائم رہنے کی قسم کھاتا تھا اور پھر اپنے آپ کو گرفتار کرانے کے لیے گردوارے کی طرف پیش قدمی کرتا تھا۔ شروع شروع میں تو پولیس نے جتھوں کو گرفتار کرنا شروع کیا مگر جب جتھے ایک دوسرے کے بعد لگاتار آنے لگے تو پھر پولیس والوں نے لاٹھیوں اور لاتوں کا استعمال شروع کر دیا۔ سکھ خاموش کھڑے پٹتے رہے یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر گرتے تھے اور انھیں اٹھا کر جیل پہنچا دیا جاتا تھا۔ پرامن مدافعت کے اس غیر معمولی مظاہرے نے نہ صرف ہندوستان بلکہ باہر کی دنیا پر بھی اثر ڈالا۔ ایک امریکی فلم ساز کیپٹن اے ایل ورگیز آیا اور اس نے ایک دستاویزی فلم "ہندوستانی شہادت کی خصوصی تصویر" بنائی۔ (انگریز حکام نے اس فلم پر پابندی لگانے کی بہت کوشش کی لیکن انھیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی) سوامی شردھانند اور حکیم اجمل خاں جیسے قوم پرست ہندو اور مسلمان لیڈر سکھوں کی حمایت میں ایک بار پھر کھڑے ہو گئے۔ موقع واردات پر ان لوگوں نے تقریریں کیں۔ کانگریس نے ایک تحقیقی کمیٹی تشکیل دی جس نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ "ہر جگہ اور ہر موقع پر ضرورت سے زیادہ قوت استعمال کی گئی اور بعض مقامات پر تو

اس کا انتہائی بے رحمانہ استعمال ہوا تھا۔" (اس کمیشن میں امریکی مشنری ریورنڈ ایس ای اسٹوک بھی تھے) پنڈت مدن موہن مالویہ نے کہا کہ اس کے بعد حکومت کی کارروائی کے لیے نفرت اور تحقیر کا اظہار ہر ہندوستانی کا فرض تھا۔ مہاتما گاندھی کے دوست ریورنڈ سی ایف اینڈریوز جو ہندوستانی مقلدوں کو اہلِ کتاب بنانے آئے تھے خود اپنے ہم وطنوں سے آزادی دلوانے کے لیے یہیں رک گئے" (۶۹ سال کی عمر میں ان کا انتقال ۵ اپریل ۱۹۴۰ء میں کلکتے میں ہوا۔) اور گرو کے باغ کا دورہ کیا اور وہاں انھوں نے جو کچھ دیکھا اس کے بارے میں کہا کہ "غیر انسانی، بے رحم اور بزدلی کی کارروائی تھی اور یقین نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ انگریزوں کی ایک اخلاقی شکست ہے۔ انھوں نے پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر ایڈورڈ میکلاگن سے احتجاج کیا۔ اس مارپیٹ کو روکنے کے لیے اس پر زور ڈالا۔ چار دن بعد ۱۷ ستمبر کو پولیس ہٹا دی گئی اس ساری کارروائی میں ۵۶۰۵ سکھ گرفتار اور ۹۳۶ کی مرہم پٹی ہوئی لیکن انھیں ایک اہم مورچے پر کامیابی حاصل ہوئی اور ۱۹۲۵ء تک وہ اپنی جنگ بھی جیت چکے تھے۔ سکھ گوردوارہ ایکٹ جس کی رو سے مہنتوں کی جگہ منتخب نمائندوں کو لینا تھی، قانون بن گیا تھا۔

گوردوارہ احتجاج نے وہ راہ متعین کر دی جس پر سکھ تحریکوں کو مستقبل میں چلنا تھا۔ چھوٹے چھوٹے جتھوں میں اپنے آپ کو پُرامن طور پر گرفتاری کے لیے پیش کرنے کی یہ حکمت عملی ۱۹۷۵-۷۷ء میں نافذ ہونے والی ایمرجنسی میں بھی بہت موثر ثابت ہوئی۔ جب ہر روز گولڈن ٹمپل سے، مسز اندرا گاندھی کی حکومت کے خلاف ایک جتھہ نکلتا تھا۔ مگر اسی کے ساتھ سکھ سیاست کا ایک متشدد پہلو بھی تھا۔ گوردوارہ احتجاج کے دوران ایک گروہ نے جو اپنے آپ کو ببر اکالی کہتا تھا اور جس کی قیادت حوالدار میجر کشن سنگھ بیدانگ اور ماسٹر موتا سنگھ کر رہے تھے تشدد کو اپنایا۔ ببر کی قوت ہمیشہ محض اضافی رہی مگر انھوں نے (آج کے شدت پسندوں کی طرح) سکھ مفاد کے خیالی یا حقیقی "غداروں سے" "انتقام" لینے کے معاملے میں خصوصی مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ انگریزوں نے باسٹھ ببر گرفتار کے ان میں سے بائیس سرکاری گواہ بن گئے۔ چھ کو خود اپنے ساتھیوں کی گواہیوں کی بنا پر پھانسی ہوئی باقی کو یا تو چھوڑ دیا گیا یا پھر مختلف مدتوں کی سزائیں ہوئیں۔

تحریک کا اصل نتیجہ وہ خلیج تھی جو پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں کے مابین اب پختہ ہو گئی تھی۔ انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں شروع ہونے والی کش مکش میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لالہ لاجپت رائے جیسے پنجابی ہندو لیڈروں کی حمایت کے باوجود، گرو کا باغ کے واقعے جیسے موقعوں پر ہندو عوام کے بڑے حصے کی ہمدردیاں مہنتوں کے ساتھ رہی تھیں جو خود بھی اپنے قبضے کو قائم رکھنے کے لیے گوردواروں کو ہندو عبادت گاہ کہنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ سر گوکل چند نارنگ جیسے مقامی ہندو لیڈروں کا اصرار تھا کہ سکھ ہندوؤں ہی کی ایک شاخ ہیں۔ راجہ نریندر ناتھ جیسے دوسرے

لیڈر نے پنجاب لیجس لیٹو کاؤنسل میں تقریر کرتے ہوئے (۵ اپریل ۱۹۲۱) پریوی کونسل کے ۱۹۰۳ کے اس فیصلے کا حوالہ دیا، جس نے سکھوں کے ہندو ہونے سے اتفاق کیا تھا اور کہا کہ "میں سکھ ازم کو اعلیٰ سطح کا ہندو ازم سمجھتا ہوں....گرنتھ صاحب عوامی زبان میں ویدوں اور اپنشدوں کی تعلیمات سے نہ تو کچھ کم ہے اور نہ زیادہ..... اس بات سے آج سب ہی واقف ہیں کہ دو بھائیوں میں ایک ہندو ہو سکتا ہے اور دوسرا سکھ...." راجہ نریندر ناتھ کی یہ بدقسمتی تھی کہ سکھوں نے نہ کم نہ زیادہ کسی بھی شکل میں ہندو نہ ہونا چاہا۔ سکھ، ہندو سلسلہ مراتب میں اپنے مقام سے متعلق کسی بحث میں پڑے بغیر وہ نہ صرف یہ کہ سکھ ہونے پر مطمئن تھے بلکہ سکھ رہنے کے لیے بے چین بھی تھے۔ انھوں نے ہندوؤں کی اس سعی کو، انھیں اپنے اندر ضم کر لینے کی ایک اور کوشش ہی سمجھا۔ سکھوں نے صرف اپنی شناخت کو برقرار رکھنا چاہا اور ان کی یہ خواہش بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں بھی ان کی اصل محرک ہے۔ گردوارہ تحریک کے ایک لیڈر مہتاب سنگھ نے ۸ اپریل ۱۹۲۱ء کو اسی بحث میں حصہ لیتے ہوئے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، پنجاب لیجس لیٹو اسمبلی میں بڑے واضح طور پر کہا تھا "جہاں تک میرا سوال ہے میں کہتا ہوں کہ سکھ اگر ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے تو ہندو اس سلسلے میں ان پر زور کیوں ڈالیں۔ زبردستی انھیں ایسا کرنے پر مجبور کیوں کریں؟ ناراضمند لوگوں کو اپنی کمیونٹی میں شامل کر کے انھیں کیا فائدہ ہوگا؟ حضور والا یہی چیز ہے جو اس سارے جوش و خروش کی تہ میں ہے۔ ہندو کہہ سکتے ہیں کہ ہم تمھارے معاملات کا تمھارے لیے انتظام کریں گے کہ تمھارے گردوارے کچھ تمھارے ہیں اور کچھ ہمارے۔ ہم کہتے ہیں کہ اپنے معاملات کو ہم خود سنبھالنا چاہتے ہیں اور ایسا کرنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں۔"

اور جناب والا! ۱۹۲۰ کے جوش و خروش کی تہ میں حقیقتاً یہی تھا اور بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کے ہیجان کی تہ میں بھی یہی عنصر ہے اور مہتاب سنگھ معتدل گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ سکھ شعور کی بیداری نے کمیونٹی اور اس کے پیروؤں پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ اکالیوں نے درحقیقت سکھ ازم کو بچا لیا۔ ۱۸۸۱ کی مردم شماری میں پنجاب کی (شاہی ریاستوں کو چھوڑ کر) ۴۳ر۸۴ فی صدی آبادی نے اپنے آپ کو ہندو لکھوایا۔ ۴۷ر۵ فی صدی مسلمان اور محض ۲۲ر۸ فی صدی سکھ۔ اور سکھ مزید کم ہوئے۔ ۱۸۹۱ء میں ۸٫۰۹ فی صد سکھوں کے مقابلے میں ہندو ۴۳ر۸ فی صد تھے۔ آریہ سماج کے اثرات کے بعد یہ ہندو ازم کا نقطۂ عروج تھا مسلمان بھی اس دہائی میں ۵۶ ر۴۷ فی صد سے کم ہو کر ۳۹ ر۴۷ فی صد رہ گئے مگر ۱۹۰۱ء میں سنگھ سبھا کی کوششیں بارآور ہونے لگی تھیں۔ اب سکھ ۸٫۶۳ فی صد ہو گئے تھے۔ ۱۹۱۱ میں ان کی تعداد ۱۲ر۱۱ فی صدی، ۱۹۲۱ء میں ۱۲٫۳۸ فی صد اور ۱۹۳۱ء میں ۱۴ر۲۹۔ اور ۱۹۴۱ء تک بڑھ کر ۱۴ر۶۲ فی صد تک پہنچ گئی۔ مسلمانوں کی (شمشیر بکف بادشاہ کی مدد کے بغیر) جو تعداد ۱۸۹۱

میں ۳۹ر۴۷ فی صد تھی، بڑھ کر ۱۹۴۱ء میں ۸۸ر۵۲ فی صدی ہو گئی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں پنجاب میں ہندو آبادی محض ۷۹ر۲۹ فی صدی تھی اور وہ زیادہ تر شہروں میں بسی ہوئی تھی، صرف ۳۶ر۸ فی صد سکھ شہری علاقوں میں رہتے تھے اس وقت تک صرف چھ فی صدی ہندو اپنے آپ کو آریہ سماجی کہتے تھے۔

اس بال بال بچنے کے بعد، اکالی سیاست صرف اپنے عقائد کے خصوصاً ہندوازم سے تحفظ کے سہارے زندہ رہے گی۔ اسے الفاظ میں کہا جائے یا نہ کہا جائے، اکالی ذہن کے پیچھے یہی یقین ہے جس کا اظہار سب سے پہلے گرو گوبند سنگھ نے کیا تھا کہ عقائد کی حفاظت، سیاسی قوت پر قبضہ کیے بغیر نہیں ہو سکتی اور چوں کہ ایسی قوت کا امکان ایک ایسے علاقے کے بغیر نہیں ہے جہاں سکھوں کی اکثریت ہو، اسی لیے ایک سکھ وطن کا حصول ناگزیر ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں بھی اور اس کے بعد بھی سوال یہ تھا کہ آیا یہ وطن ہندو اکثریت والے ہندوستان کی حدوں کے اندر واقع ہوگا یا اس کے باہر۔ سکھوں کا ایک حلقہ اس سوال کا جواب دینے میں ہمیشہ مختلف درجوں کا ابہام رکھتا ہے۔ اس کے اولین لیڈر ماسٹر تارا سنگھ تھے۔



۷

پیچیدہ اقلیت

اس صدی کی چوتھی دہائی میں سکھوں کے سامنے ایک مسئلہ تھا - ان کی تعداد بہت نہیں تھی - غیر منقسم ہندوستان کی آبادی کا محض ایک فی صدی حصہ اور غیر منقسم پنجاب میں بکھرے ہوئے چودہ فی صدی - اس دہائی کی سب سے بڑی بحث "تقسیم ہوں یا تقسیم نہ ہوں"، میں انھوں نے اپنے آپ کو کناروں پر کھڑا ہوا پایا - انگریز اگرچہ اپنے عہد کی آخری منزل میں یا بنتے مگر نئے گھروں کی بات سننے پر تیار ہو جاتے تھے - اکالیوں نے محسوس کیا کہ نظری طور پر وہ ایک تاریخی دعویٰ رکھ سکتے ہیں مگر ان کے پاس کوئی جغرافیائی علاقہ نہیں ہے جہاں وہ اپنے خواب کی تجسیم کر سکیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ صوبۂ پنجاب میں سکھوں کی اکثریت والا کوئی علاقہ تھا ہی نہیں اور یہ بات کانگریس، مسلم لیگ اور انگریز سب جانتے تھے۔

۱۹ ویں صدی کے نصف آخر کے تجربے اور اس کے بعد ۱۹۴۱ء کی مردم شماری میں قابل لحاظ چودہ فیصدی ہونے کے لیے کی جانے والی جدوجہد نے مسیحاؤں (اکالی لیڈروں) کو مریض کی حالت پھر سے خراب ہو جانے کے امکانات کی طرف سے بہت محتاط کر دیا تھا مزید یہ کہ سکھ ازم کو ختم کرنے کے لیے محض آریہ سماج کا ویدک احیاء ہی نہیں بلکہ نو آبادیاتی نظام کے بعد کی زندگی کی حقیقتیں بھی تھیں انگریزوں کا راج ختم ہونے والا تھا اور اندیشہ تھا کہ خالصہ تشخص کی بنا پر ملازمتوں میں ریزرویشن جلدی ہی ختم ہو جائے گا - شہری نوکریاں صلاحیت اور سیکولر تعلیم کی بنیاد پر مہیا ہوں گی - ایک نئی نسل میں اپنے آپ کو شیونگ بلیڈ سے بچا کر رکھنے یا خاموشی سے کرپان باندھ لینے کے لیے شاید کافی مستحکم عقائد نہ ہوں (جیسا کہ وقت نے ثابت کر دیا کہ، ہائی جیکنگ کے اس دور میں تلوار انتہائی غیر علمی چیز بن گئی) تو پھر سکھ کہاں ہوں گے؟ کہیں بھی نہیں اگر دگوبند سنگھ کی عطا کی ہوئی شناخت کے بغیر کوئی سکھ اور ہندو میں تمیز کیسے کرے گا؟ ان حقائق میں ایک اور معمولی سی حقیقت شامل کر لیجیے اور وہ یہ کہ اگر سکھ ازم پنجاب سے معدوم ہو گیا تو پھر وہ روئے زمین ہی سے ناپید ہو جائے گا - اگر ہندوستانی مسلمان تباہ ہو جائے، اسلام زندہ رہے گا وہ چاہے جنوب مشرقی ایشیا میں ہو یا وسطی اور

مغربی ایشیا میں یا افریقہ میں۔ مگر سکھ ازم کی پنجاب کے علاوہ کوئی جغرافیائی بنیاد نہیں ہے اور خود سلیمان رینج سے دریائے جمنا تک پھیلے ہوئے انتیس[۲۹] اضلاع کی اس سرزمین میں، جس پر ابھی محض سو سال قبل سکھوں نے بڑے فخر کے ساتھ حکومت کی تھی، ایک ضلع بھی ایسا نہیں جسے سکھ اپنا کہہ سکے۔ یہ ایک انوکھا اور پیچیدہ اقلیتی مسئلہ تھا اور جس کا حل اکالی قیادت کے ایک گروہ کے مطابق ایک سکھ مذہبی ریاست کے قیام کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا، اور یہی گومگو کا عالم تھا جس نے بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں وجود میں آنیوالی سکھ قیادت کو ایک خود مختار سکھ ملک کے خیال کو زندہ رکھنے کی خاطر اپنائے رکھنے پر مجبور رکھا۔ سکھ ایک ایسے آبادیاتی اور سیاسی ماحول میں رہ رہے تھے جس میں انھیں اپنے ان جذبات کے کھلم کھلا اظہار کا موقع نہیں ملا مگر ان کی یہ محرومی اس کے وجود پر پردہ نہیں ڈالتی ہے۔

چوتھی دہائی میں سکھوں کا مسئلہ یہ تھا کہ انھیں ایک طرف مسلم لیگ کے عفریت اور دوسری طرف ہندو اکثریت والے ہندوستان کے بہت گہرے اور بہت نیلے سمندروں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ اپنی پسند کے انتخاب کا کوئی بہت موقع بھی نہیں تھا۔ ۱۹۴۲ء میں سر اسٹفورڈ کرپس کی خدمت میں ایس جی پی سی نے ایک میمورنڈم رکھتے ہوئے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ سائمن کمیشن کے تجزیے کو پیش کیا تھا "سکھ ازم ایک صلح جویانہ مسلک تھا مگر مسلمانوں کے سیاسی ظلم اور ہندوؤں کی سماجی زیادتیوں نے اسے ایک عسکری مسلک میں تبدیل کر دیا۔ دو استبدادوں کے درمیان انتخاب کی صورت میں ہندو استبداد ترجیحی تھا۔ تقسیم سے پہلے پنجاب ایک واضح مسلم اکثریت کا صوبہ تھا (۵۳ فی صدی) یہ فوقیت مزید توانا ہو جاتی تھی۔ مغرب میں ملحقہ علاقوں کی مسلم اکثریت کی وجہ سے۔ یہ علاقے تھے، ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ، میانوالی، اٹک، جہلم، راولپنڈی، شاہ پور، گجرات، جھنگ، ملتان، بہاول پور، لائل پور، منٹگمری لاہور اور گوجرانوالا کے۔ اسی طرح حصار، روہتک، گوڑگاؤں، کرنال، ہوشیار پور اور مشرق کے پہاڑی علاقوں میں ہندوؤں کو (۳۰ فی صدی) برتری حاصل تھی۔ سکھ ہر جگہ اقلیت میں تھے یہاں تک کہ ان مرکزی اضلاع میں بھی جہاں ان کی سب سے زیادہ تعداد مرکوز تھی۔ وہ، امرت سر، فیروز پور، گورداس پور، لدھیانہ اور پٹیالہ میں ۲۰ سے ۴۳ فی صدی تک تھے۔ (گورداس پور میں مسلمانوں کی اکثریت ۵۰.۴۱ فی صدی تھی) مگر یہ ضلع تقسیم کے وقت، جموں کشمیر کو ملانے والی سڑک فراہم کرنے کے لیے ہندوستان کو دیا گیا۔ (یہی وہ سڑک ہے جسے پاکستان ہندوستان سے ہونے والی ہر جنگ میں کاٹنے کی کوشش کرتا ہے) مزید خرابی کی بات یہ بھی ہے کہ سکھ تقسیم ہونے والے پنجاب کے دونوں حصوں میں تقریباً برابر برابر بٹے ہوئے تھے۔ تقریباً بیس بیس لاکھ۔ ان میں سے ایک حصے کو ہندوستان میں آنا تھا اور دوسرے کو پاکستان میں۔ اور ان کے متمول ترین علاقے، مغرب کے وہ حصے تھے جہاں آب پاشی کے لیے نہریں تھیں اور جن کو

اگر پاکستان حقیقت بنا تو انھیں چھوڑنا پڑے گا۔

سکھ تعداد میں کم تھے مگر خوش حال تھے۔ غدر کے بعد کی انگریزوں کی عنایتیں تھیں جن کی وجہ سے مرکزی اضلاع میں سکھ سب سے بڑے زمیندار تھے۔ مثلاً لاہور ڈویژن میں زمین کے کل لگان کا تقریباً ۴۶ فی صدی حصہ یہ لوگ دیتے تھے۔ تجارت اور سود پر روپیہ چلانے کے کاروبار میں اپنی فوقیت کی وجہ سے ہندو دوسرے نمبر پر آتے تھے (سود کا کاروبار کرنے والے فرقے سکھوں میں بھی تھے جیسے اروڑہ) تقسیم سے پہلے لاہور میں ۲۹، ۹ کروڑ روپیوں کا سرمایہ لگا تھا اس میں ہندوؤں اور سکھوں کے قبضے میں ۱۲ اور ۵ کروڑ روپیے تھے۔ بنکوں کی نوّے شاخوں میں سے صرف تین مسلمانوں کی ملکیت تھیں اور بیمہ کمپنی کی نوّے شاخوں میں سے محض دو[۲] کے مالک مسلمان تھے۔ کرپال سنگھ اپنی کتاب "دی پارٹیشن آف پنجاب" (پنجاب یونیورسٹی، پٹیالہ) میں لکھتے ہیں۔ "زراعت کے بعد ساہوکاری سب سے اہم تجارتی سرگرمی تھی۔ مغربی پنجاب کے مسلمان کاشت کار من حیث الجماعت ملتان اور راولپنڈی ڈویژن کے ہندو اور سکھ ساہوکاروں کے قرض دار تھے۔ اس اقتصادی تسلط نے مسلمانوں کے اس خیال کو مزید تقویت پہنچائی تھی کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کے اقتصادی استحصال کے خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۵، لاکھ مسلمان مشرقی پنجاب میں ۴۷ لاکھ ایکڑ زمین چھوڑ کر پاکستان گئے۔ دوسری طرف ۶۹ لاکھ سکھ اور ہندو ۶۷ لاکھ ایکڑ زمین پاکستانی پنجاب میں چھوڑ کر ہندوستان آئے۔ اس حقیقت کو اگر نظرانداز بھی کر دیا جائے کہ مغربی پنجاب کی زمین کوالٹی کے اعتبار سے بہتر تھی، تب بھی یہ اعداد و شمار فرق کو ظاہر کرتے ہیں۔ آخر میں بنگال کی طرح مسلم لیگ نے ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی زرخیز زمینوں کا لالچ دے کر مشرقی پنجاب کے مسلمان کاشت کاروں کو پاکستان کی طرف رجوع کیا۔ اُس وقت ظاہر ہے کہ ان بے چاروں کو یہ کسی نے نہیں بتایا تھا کہ اس تسلط کی جگہ ایک نیا تسلط لے لے گا۔

پنجاب کے اس سہ رکنی مسئلے کے حل کی کوششوں کی بازگشت فضا میں بہت دنوں سے تھی۔ ۱۹۳۲ء کی گول میز کانفرنس میں سکھوں نے ایک بڑا سیدھا اور سہل حل تجویز کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اسی فی صد سے زیادہ مسلمان آبادی والے علاقے راولپنڈی اور ملتان کے بارہ اضلاع کو خارج کر دیا جائے تو مسلمان اور غیر مسلموں کے مابین توازن برابر ہو جائے گا۔ مسلم لیگ ایسی تجویزوں پر کان دھرنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلم لیگ ایک ایسے پاکستان کا خواب دیکھ رہی تھی جو مغرب میں افغانستان کی سرحدوں سے، دہلی کے مشرق میں علی گڑھ تک، شمال میں کشمیر چین کی سرحد اور تبت سے لے کر جنوب میں راجستھان کے جیسلمیر تک پھیلا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی جو جناح صاحب نے پاکستان حاصل کرنے کے بعد کہا تھا کہ انھیں ایک "کرم خوردہ" پاکستان ملا ہے۔

۱۹۴۰ء تک، پنجاب کے لیے چار حل پیش کیے جا رہے تھے۔ کانگریس ایک غیر منقسم ہندوستان چاہتی تھی مگر اس نے سکھوں کی اضافی شرط یعنی پنجاب کو بھی تقسیم کر دیا جائے، مان لی تھی۔ مگر یہ یقینی تھا کہ بہر حال دونوں حصے ہندوستانی وفاق میں رہیں گے۔ مسلم لیگ پاکستان چاہتی تھی۔ تیسرا اور چوتھا حل ایک غیر منقسم خود مختار پنجاب تھا، وہ چاہے انڈین یونین میں ہو چاہے اس سے باہر، اس میں سے جو بھی صورت ممکن ہو۔ آخری صورت کی وکالت یونین پارٹی کے ناقابل تسخیر سر سکندر حیات خاں بالکل اس طرح کر رہے تھے جس طرح ان کے ہم رتبہ، فضل حق بنگال میں، لیگ اور کانگریس کے مابین ایک متوسط اور خود مختار حل کے لیے کوشاں تھے۔ یونینسٹ ایک شہری مخالف، کسانوں کی پارٹی تھے ان کی اپیل، بلا امتیاز مذہب زمین کے جوتنے والے سے تھی۔ سکندر حیات نے، سر چھوٹو رام کے ساتھ مل کر، بڑی کامیابی کے ساتھ ہندو اور مسلمان کسانوں کا ایک ایسا اتحاد قائم کر لیا تھا جس نے مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کو دیہی پنجاب سے دور دور رکھا۔ سر سکندر حیات ملتان لیگ میں اس وقت تک بہت سر گرم تھے۔ جب تک کہ مسلم لیگ کے علیحدگی پسندانہ جوش و خروش نے انھیں اس کی طرف سے مایوس نہیں کر دیا۔ جناح صاحب نے شعوری طور پر انھیں اس ریزولیوشن کا مؤید بنایا جو بعد کو پاکستان ریزولیوشن کے نام سے مشہور ہوا۔ اور جسے مسلم لیگ نے اپنے ۱۹۴۰ والے لاہور سیشن میں منظور کیا تھا مگر اس بات کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے کہ اس ریزولیوشن میں خود پاکستان کا ذکر بالکل نہیں تھا۔ سر سکندر حیات خاں نے ۱۱ مارچ ۱۹۴۱ء کی پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کی اپنی مشہور اور بار بار دہرائی جانے والی تقریر میں یہ نکتہ بار بار دہرایا کہ جب یہ ریزولیوشن پاس ہوا تھا اس وقت اسے لاہور ریزولیوشن کہا گیا تھا، پاکستان کا لفظ استعمال نہیں ہوا تھا..... "سر سکندر حیات کو پاکستان کے خیال سے بالکل ہمدردی نہیں تھی جو خود مسلمانوں کے نقطہ نظر سے ناپسندیدہ تھا۔ انھوں نے پنجاب کے کسانوں کو تقسیم کے خطرات سے متنبہ کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا "ہم آزادی کا مطالبہ اس لیے نہیں کر رہے ہیں کہ یہاں ایک مسلم حکومت ہوگی اور دوسری جگہ ایک ہندو راج۔ اگر پاکستان کا مطلب یہی ہے تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے.... اگر آپ پنجاب کے لیے حقیقی آزادی یا دوسرے لفظوں میں ایسا پنجاب چاہتے ہیں جس میں ہر فرقے کو اقتصادی اور انتظامی امور میں، مشترکہ ساتھیوں کی طرح واجب حصہ ملے گا تب پنجاب پاکستان نہیں ہوگا بلکہ وہ صرف پنجاب ہوگا۔ پانچ دریاؤں کی سرزمین پنجاب ہے اور کوئی کچھ بھی کہے وہ ہمیشہ پنجاب رہے گا۔ یہی وہ سیاسی مستقبل ہے جو میں کسی بھی نئے آئین کے تحت اپنے صوبے اور اپنے ملک کا دیکھتا ہوں"

آپ اس سے زیادہ مطلق اور منطقی نہیں ہو سکتے۔ سر سکندر حیات خاں نے ایک سات منطقوں میں بٹے ہوئے متحدہ ہندوستان کی تجویز رکھی تھی جس میں ہر منطقہ (زون) میں ایک مضبوط نیم خود مختار علاقائی اسمبلی تھی اور مرکز کے پاس دفاع،

امور خارجہ، رسل و رسائل اور کرنسی کے محدود اختیارات تھے انھوں نے اپنے بس بھر کوشش کی کہ مسلم لیگ ان کے اس خیال کو مان لے، جب مسلم لیگ نے اسے ماننے سے انکار کر دیا تو انھوں نے ۱۹۴۲ء میں مسلم لیگ سے استعفا دے دیا۔ وہ اب بھی ۱۹۴۶ کے انتخابات میں اپنے رول سے پنجاب یعنی ہندوستان کے مستقبل کو ایک بڑا ڈرامائی موڑ دے سکتے تھے مگر دسمبر ۱۹۴۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا ان کے جانشین پنجاب کے وزیر اعظم سر خضر حیات خاں اس فضا کا مقابلہ نہ کر سکے جو جناح صاحب اور ان کے جاگیردار اور ملا ہراول دستے نے پھیلا دیا تھا۔

بدقسمتی سے سکھ، سر سکندر حیات کی طرف سے ہمیشہ مشکوک رہے، وہ مسلمانوں کی تاریخی غیر معتبری پر حاوی نہ آسکے وہ نئے اورنگ زیب اور نئے جناح کو تو سمجھ سکتے تھے مگر نئے اکبر اور نئے رنجیت سنگھ سر سکندر کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔

آزادی کا مژدہ فضا میں تھا کہ انھوں نے اور کسی سے نہیں، جناح صاحب سے لین دین کرنے کی کوشش کی۔ ایک مال دار اکالی مالیات کار سردار بلدیو سنگھ جو اس وقت تک سکھوں کے اصل نمائندے بن چکے تھے اور جلدی ہی، وزیر دفاع کی حیثیت سے نہرو کی کابینہ میں شامل ہونے والے تھے اور مہاراجہ پٹیالہ (جو ایک ریاست کے سربراہ ہونے کی وجہ سے پاکستان میں شامل ہونے کا تکنیکی حق رکھتے تھے) دونوں نے جناح صاحب اور لیاقت علی خاں سے پاکستان کی حدود کے اندر ایک سکھ ریاست کے قیام کے امکان پر تبادلۂ خیال کیا۔ جناح صاحب اور لیاقت علی خاں نے تجویز کو مان لیا اور اس حد تک کہ سکھوں کو، ایک مسلم سکھ پاکستان میں اپنے فوجی ادارے بھی قائم کرنے کی اجازت دی مگر سکھوں نے الگ ہونے کے حق پر اصرار کیا جس کی جناح صاحب جیسا مقنن کسی صورت میں بھی اجازت نہیں دے سکتا تھا (اگر جناح صاحب میں کچھ لیک ہوتی تو یا تو پاکستان نہ بنا ہوتا یا پھر اس سے کہیں بڑا ہوتا جیسا وہ بنا) ہندوستان نے بہر حال سیاسی پارٹیوں کو الگ ہونے کے حق کی تبلیغ و تلقین کی اجازت دی۔

اس وقت تک اکالی قیادت پورے طور پر ماسٹر تارا سنگھ کے ہاتھ میں آچکی تھی جنھوں نے ۱۹۲۵ء میں داجب التعظیم بابا کھڑک سنگھ کی قائم مقامی اختیار کر لی تھی۔ تارا چند، ملہوترا ذات کے ایک ہندو کے گھر میں راولپنڈی ضلع کے ایک گاؤں ہریال میں ۲۴ جون ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ابھی اسکول ہی میں تھے جب وہ سکھ ہو گئے اور اسی وجہ سے ان کے نام کے ساتھ سنگھ لگ گیا۔ ۱۹۰۷ء میں انھوں نے پنجاب کے گورنر سر چارلس ریواز کے خلاف ایک مظاہرے کو منظم کر کے خالصہ کالج میں ایک طالب علم کی حیثیت سے خاصی چپقلش پیدا کر دی تھی۔ انھوں نے معلمی کا ڈپلوما لیا اور ایک مقبول ماسٹر بن گئے۔ یہی ماسٹر کا لفظ تھا جو تا حیات ان کے نام کے ساتھ لگا رہا۔ ریاستی سطح پر انھیں امتیاز ان کے اس رول کی وجہ سے ملا جو انھوں نے گردوارہ اصلاح تحریک میں ادا کیا۔ ۱۹۳۵ء تک وہ نقطۂ عروج پر پہنچ چکے تھے۔ تقسیم اور بازآبادکاری کے مشکل

ایام میں سب سے زیادہ بااختیار اور با اثر اکالی سیاست داں تھے۔ ان کا یہ اختیار اور اثر ۱۹۶۱ء میں ان کے ایک مرن برت پر ختم ہوگیا جب ان کا ۔ برت شہادت کے بجائے ایک کھانے پر اختتام پذیر ہوا۔

جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ سکھ وطن کی، جس کا کہ سکھ مطالبہ کر رہے تھے، نوعیت کے سلسلے میں وہ غیر واضح تھے اور ان کی اس غیر واضح کیفیت میں بڑا تسلسل تھا۔ در حقیقت اکالیوں اور قابل احترام مہاتما گاندھی کے درمیان جو خلیج پیدا ہوئی وہ اسی مسئلہ پر ہوئی، جب گاندھی جی نے اکالیوں سے ایک "سکھ راج" کے خیال کو باقاعدہ ترک کرنے کے لیے کہا۔ اکالیوں نے گاندھی جی سے ایسا کوئی وعدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ ماسٹر تارا سنگھ نے اپنی ساری عمر سکھوں کے مذہبی اور سیاسی مطالبات کو خلوط کرنے میں لگا دی۔ اور شعوری طور پر، سکھوں کو کانگریس سے دور کرنا شروع کر دیا جو چاہتی تھی کہ سکھ، مذہب کو سیاست سے الگ رکھیں۔ اور اپنے گردواروں کو سکھوں کے سپرد کر دیں اور ووٹ کانگریس کو دیں۔ ۱۹۳۷ کے انتخابات میں ماسٹر تارا سنگھ کانگریس کے ساتھ کسی طرح کے بھی تعاون کے خلاف تھے۔ اگرچہ اکالی پارٹی کی اکثریت نے ایک متحدہ محاذ کے حق میں فیصلہ کیا (اس الیکشن میں یونینیسٹ پارٹی نے زبردست کامیابی حاصل کی تھی اور اکالیوں کو صرف دو نشستیں ملی تھیں) بالآخر بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں، ماسٹر تارا سنگھ اکالیوں کو ایک ایسے مسئلے پر کانگریس سے الگ کرنے میں کامیاب ہوگئے جسے سکھ اپنے مفادات کے لیے لازمی سمجھتے تھے۔ یہ مسئلہ تھا مسلح افواج میں بھرتی کا۔ اگر ایک طرف مہاتما گاندھی اور کانگریس نے برطانیہ کی جنگی کوششوں میں شریک ہونے سے انکار کیا تو دوسری طرف ماسٹر تارا سنگھ نے دوسری جنگ عظیم کو سکھوں کے لیے شاہی افواج میں اپنی اس پرانی حیثیت کو بحال کرنے کا ایک سنہری موقع تصور کیا، جو ان کی "غیر وفادار" گردوارہ ریفارم موومنٹ کی وجہ سے سزا کے طور پر کم ہوگئی تھی۔

۱۹۴۲ تک اکالیوں کو اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ انگریز ان کی حق تلفی کر رہے ہیں۔ یورپی جنگوں میں اپنے آپ کو ایندھن بنا دینے پر راضی ہونے کے باوجود انھیں انگریزوں کے بعد کے ہندوستان میں ایک سکھ وطن کی کوئی ضمانت نہیں مل رہی تھی۔ شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی (ایس جی پی سی) نے ۳۱ مارچ ۱۹۴۲ کو سر اسٹفورڈ کرپس کو ایک میمورنڈم دیا جس میں یہ شکایت کی گئی تھی کہ سب سے زیادہ وفادار ہندوستانیوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک منصفانہ نہیں ہے۔

"سکھ فرقے کے مفادات سے بڑے افسوس ناک طریقے پر غداری کی گئی ہے۔ انگریزوں کے آنے کے بعد سے ہمارے فرقے نے ساری قلمرو کے ہر میدان کے ہر معرکے میں انگلستان کے لیے لڑائی لڑی ہے۔ اس کا ہمیں یہ انعام ملا ہے کہ پنجاب میں ہماری حیثیت، جسے قائم رکھنے کا انگلستان نے وعدہ کیا تھا، اور جس میں ہمیں ایک ممتاز اور مقتدر مقام حاصل تھا، قطعی طور پر ختم کر دی گئی۔"

سکھ سہمے ہوئے تھے کہ ان کے بیس لاکھ افراد ایک مسلم اکثریت والے ملک میں چھوڑ دیئے جائیں گے۔ انھوں نے کانگریس پر بھی اپنی طرف سے بے توجہی برتنے کا الزام لگانا شروع کیا۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ سکھ ہمیشہ کانگریس کے مقابلے میں انگریز کے کہیں زیادہ وفادار رہے، یہ ایک عجیب وغریب الزام تھا۔ ۲۰ اگست ۱۹۴۴ء کو امرتسر میں مہاتما گاندھی اور مسٹر جناح کو مطعون کرنے کے لیے سکھوں کا ایک جلسہ ہوا۔ گیانی کرتار سنگھ (اگلے دن کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں رپورٹ) نے عام جذبات کا اظہار کیا تھا جب انھوں نے کہا "اگر برطانوی سنگینوں کے زور پر پاکستان سکھوں کے سر پر مسلط کر دیا گیا تو ہم اسے اس طرح چیتھڑے چیتھڑے کر دیں گے جس طرح گرو گوبند سنگھ نے مغل سلطنت کو پارہ پارہ کیا تھا" گرو گوبند سنگھ بھی مغل سلطنت کو پورے طور پر پارہ پارہ نہیں کر پائے تھے اور نہ ہی گیانی کرتار سنگھ پاکستان کے قیام کو روک سکے۔ یہی جلسہ تھا جس میں ماسٹر تارا سنگھ نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ پاکستان بہرحال بن کر رہے گا، ایک خود مختار سکھ ملک کا باقاعدہ مطالبہ کیا۔ یہ خیال ایک ناممکن مطالبہ سمجھ کر اسی وقت رد کر دیا گیا۔ مگر اپنے ساتھیوں کے تمام شکوک وشبہات کے باوجود، ہم دیکھیں گے کہ کم ازکم تارا سنگھ، اپنی ساری زندگی چولے بدل بدل کر ایک ناممکن بات کو ممکن بنانے میں صرف کر دیں گے۔

پاکستانی پنجاب کے چالیس لاکھ ہندوؤں اور سکھوں اور ہندوستانی پنجاب کے اتنے ہی مسلمانوں کا مسئلہ سیاست دانوں کے اُن تنخواہ دار ٹھگوں اور مجرموں کے ذریعے طے کر دیا گیا جنھیں ان لوگوں نے دنیا کی تاریخ کے بدترین جرموں میں ملوث رہنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ مسلم لیگ تبادلہ آبادی کی بات بہت دنوں سے کر رہی تھی مگر اس پر کسی نے بھی کان نہیں دھرے یہاں تک کہ مسلمانوں نے بھی اسے نہیں سنا۔ پنجاب مسلم لیگ کے صدر مسٹر افتخار حسین نواب آف ممدوٹ کا ایک بیان ۱۲ دسمبر ۱۹۴۶ کے پارٹی کے ترجمان "ڈان" میں شائع ہوا تھا اس میں انھوں نے کہا تھا کہ تبادلہ آبادی مسلمانوں کی کثیر الانواع مسائل کا انتہائی عملی حل تھا۔ آبادی کا تبادلہ، ______ پاکستان کے خلاف کانگریس کی طرف سے بار بار پیش کی جانے والی دلیل کا مسکت جواب ہوگا۔ ایک دلچسپ اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ پاکستان کے قیام سے چند ماہ قبل تک، مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے (اگرچہ یہاں کے مسلمان ملک بھر میں سب سے زیادہ غیر محفوظ تھے) اس وطن کی سرزمین کی طرف جانا شروع نہیں کیا تھا جو جناح صاحب انھیں پیش کر رہے تھے۔ دوسرے پنجاب میں ہندو اور سکھ بھی اس مخمصے میں گرفتار تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان میں سے کسی کو بھی اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ گاؤں جن میں وہ صدیوں سے رہتے چلے آ رہے تھے ان کے لیے شمشان بن جائیں گے یا پڑوسی، پڑوسی کی جان لیں گے، بچے قتل ہوں گے، ماؤں اور بہنوں کی عصمت دری ہوگی اور انھیں نیزوں کی سنانوں سے لہولہان کر کے مارا جائے گا اور یہ سب کچھ چند مٹھی بھر سیاست دانوں کی حرص کی بنا پر ہوگا۔

تاریخ میں ۱۹۴۷ء جیسے منظم ظلم و ستم کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

پنجاب کی تقسیم کا سب سے بڑا راز اور غور کرنے کی بات یہی ہے کہ یہاں کے عوام نے اپنے نئے ملکوں کا رخ پروپگنڈے اور اشتعال انگیزی کے باوجود ہندوستان کی تقسیم سے قبل نہیں بلکہ اس کے بعد ہی آخر کیوں کیا۔ اس کا منطقی جواب یہی ہے کہ وہ اپنی زمینوں کو اس وقت تک نہیں چھوڑنا چاہتے تھے جب تک کہ سیاست داں ان کے لیے کوئی دوسرا راستہ کھلا ہی نہ چھوڑیں۔ مارچ ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ نہ تو چالیس لاکھ مسلمان اور نہ ہی چالیس لاکھ ہندو اور سکھ ان گاؤں کو چھوڑنے والے تھے جہاں ان کی پیدائش ہوئی تھی چنانچہ مارچ ہی کے مہینے میں مسلم لیگ نے اس علاقے میں ہندو اور سکھ مخالف فسادات شروع کروا دیے جواب پاکستان ہے۔ تین مہینے بعد سکھوں نے مسلمانوں کو مار بھگانے کے لیے اپنے بدمعاشوں کو منظم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ جون میں تقسیم کا اعلان ہوا اس کے بعد بھی مایوسی اور ناامیدی کے قافلوں نے وسط اگست تک انتظار کیا۔ غالباً نہ ہندو، نہ مسلمان، نہ سکھ کوئی بھی یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ تقسیم کا دراصل کیا مطلب ہوگا۔

جیسا کہ وی پی مینن نے اپنی کتاب "ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا" (صفحہ ۴۳۶) میں لکھا ہے کہ اگست کا مہینہ کچھ عجیب و غریب ڈھنگ سے برطانوی مقدر سے جڑا ہوا ہے۔ یہ ۱۷۶۵ء میں اگست کا ہی مہینہ تھا جب شہنشاہ شاہ عالم دوم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کا حق عطا کیا تھا۔ ۱۸۵۸ء میں بھی یہ اگست ہی کا مہینہ تھا جب برطانیہ کے تاج شاہی نے ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے اپنے ہاتھ میں لی تھی (مینن ایک اضافہ اور کر سکتے تھے اور وہ یہ کہ اگست ۱۸۵۷ء ہی میں دلی کے سپاہیوں سے جنگ میں اگلے نوے سال کے لیے ہندوستان کا مقدر طے ہوا تھا) اور اگست ۱۹۴۷ء میں انگریز ہندوستان سے چلے گئے۔ اگست کے آخر میں پنجاب کے کھیت خون سے لالہ زار ہو گئے۔ پناہ گزیں جو ابھی تک پندرہ اگست سے پہلے اکے دُکے تھے اب ان کے قافلوں کے قافلے سرحد پار کرنے لگے۔ ہولناک تفصیلات کے اعادہ سے کوئی فائدہ نہیں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ قافلے اور وہ ٹرینیں، لاریوں اور بسوں کے وہ کارواں اپنے اندر اتنا زہر لے کر چلے جو آج بھی برصغیر میں، زندگی کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہے لیڈروں نے بہت کچھ کہا اور اسے بار بار دہرایا ہے۔ یہاں پر مصنف ایک جمعدار (فوج میں ایک نان کمیشنڈ افسر) کی تحریر کا حوالہ دینا چاہے گا جو اس نے جالندھر میں اپنے ایک گاؤں سے مشرقی کمانڈ کے اپنے میجر کو ۲۳ اگست ۱۹۴۷ء کو بھیجی تھی۔ (یہ اقتباس سر فرانسس ٹکر کی خود نوشت سوانح عمری "وائل میموری سروز" سے لیا گیا ہے۔) "یہ ملک ۱۲ اگست سے میدان کارزار بن گیا ہے۔ ایک گاؤں دوسرے گاؤں پر حملہ کرتا ہے اور ایک کمیونٹی دوسری کمیونٹی پر۔ ایک ہفتے تک کوئی بھی سو نہیں سکا۔ گاؤں تباہ کیے جا رہے ہیں اور ہزاروں مارے

جا رہے ہیں یا زخمی ہو رہے ہیں۔ میرے گاؤں میں ہر طرف آگ ہے اور دھواں۔ ملک میں ہر روز لاتعداد اموات ہو رہی ہیں۔" جمعدار نے نہایت صفائی سے لکھا اور صحیح لکھا۔ ۱۵۔ اگست کو یہ ایک ملک تھا، ۱۶ اگست کو یہی ایک میدانِ جنگ بن گیا۔ سکھ اور مسلمان دیہاتی جو ابھی ۱۵ اگست تک جہانگیر سے ابدالی اور ابدالی سے جناح تک تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود ساتھ ساتھ رہے تھے، چشم زدن میں بٹ گئے۔ اور اس کا انجام بس وہ تھا جسے جمعدار اس کرب اور تعجب کے ساتھ دیکھتا رہا جو ایک ناقابلِ یقین چیز کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ ہر روز اور آج بھی ملک میں بے شمار حادثات ہوتے رہتے ہیں۔

کبھی کبھی خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جن لوگوں نے ہندوستان کو تقسیم کرایا تھا آیا وہ بھی اس ادبار کے بعد کبھی احساسِ جرم کا شکار ہوئے ہیں؟ ۱۹۱۹ کے بعد جنرل ڈائر سکون کی نیند نہ سو سکا، مگر وہ تو صاحبِ ضمیر تھا، کیا ان لوگوں کی بھی، جنھوں نے ہزاروں اور لاکھوں (جو تخمینے دیے گئے وہ دو لاکھ سے پانچ لاکھ تک کے ہیں) مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتلِ عام کرایا تھا کسی ایک رات کی نیند اڑی۔ ان لوگوں کی نیند اڑنے کی کوئی شہادت نہیں ملتی، نہ ہندوستان میں اور نہ ہی پاکستان میں، مگر پھر کون ہے جو خود اپنے بارے میں سچی باتوں کو یاد رکھنا چاہتا ہے۔ نفرت کے محضر میں سرفہرست کسی گوری چمڑی والے کا نام رکھ دینا اور نہایت خاموشی کے ساتھ برصغیر کے سانولے بدمعاشوں کو جو بدترین قسم کے مجرم تھے، نظر انداز کر دینا بہت آسان ہے۔

ہندوستان کو پنجاب کے ۲۹ اضلاع میں سے ۱۳ اضلاع اور ۳۸ فی صدی زمین ملی، جو راستے میں مارے گئے ان کے علاوہ، انھیں ملا کر بیس لاکھ سکھ اپنی زمینیں اور ۱۵۰ مذہبی مقامات چھوڑ کر اُدھر سے اِدھر آئے۔ بیساکھی کے دن (۱۳ اپریل ۱۹۴۷) کو ماسٹر تارا سنگھ اور ان کے ۲۸۰ پیروؤں نے گولڈن ٹمپل میں جنگ کا عہد کیا اور نعرہ لگایا "پاکستان کے لیے موت" اس نعرے نے اور کچھ حاصل کیا ہو یا نہ کیا ہو، اگلی تین دہائیوں میں، ایک چیز کو ضرور روک دیا اور وہ تھا ہندوستان کے خلاف سکھ اور پاکستانیوں کے مابین کوئی خفیہ معاہدہ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سکھ ہندوستان کی سرحدوں کے زیادہ سے زیادہ پُرجوش پاسبان بن گئے اور ان کے اس جذبے نے انھیں ایک وطن فراہم کر دیا۔



(۸)

سودے باز

پنجاب میں اس دو طرفہ ترکِ وطن نے بھی سکھوں کا بنیادی مسئلہ حل نہیں کیا۔ اب بھی پنجاب میں ان کی تعداد کافی نہیں تھی۔ تقسیم سے پہلے کے پنجاب کے سہ رکنی حساب میں وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ میں توازن کو برقرار رکھنا ان کے ہاتھ میں ہے۔ تقسیم کے بعد کا لیکھا جوکھا یہ ہے کہ وہ سارے پنجاب میں سابق شاہی ریاستوں کو شامل کرنے کے بعد ۱۹۵۱ کی مردم شماری کے اعداد و شمار کی رو سے ۶۲/۳ فی صدی ہندوؤں کے مقابلے میں ۳۵ فی صدی کی ایک واضح اقلیت تھے۔ اقتصادی تعلقات کی نوعیت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہندو شہری مرکزوں کے چاروں طرف کی دیہی زمینیں اب بھی سکھ کاشتکاروں کے قبضے میں تھیں۔ مغرب سے آنے والے سکھ، پنجاب میں ہر چہار طرف بکھرے نہیں بلکہ انھوں نے شمال مغرب میں بسنے کو ترجیح دی (جنوب مغرب میں پہلے ہی سے سکھوں کی تعداد اچھی تھی) اور پہلی دفعہ یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک مخصوص علاقے میں سکھ اکثریت بنانے کی یہ ان کی ایک شعوری حکمتِ عملی تھی۔

کانگریس سے اپنے کو دور رکھ کر انگریزوں سے ایک الگ معاملہ کرنے اور پھر مسلم لیگ کے ساتھ پینگیں بڑھانے کی سکھوں کی کوشش ہم دیکھ چکے ہیں (مثلاً تقسیم سے ذرا قبل، شمال مغرب سرحدی صوبے میں مسلم لیگ کی اقلیتی حکومت میں ایک اکالی موجود تھا) جب ۱۶ جولائی ۱۹۴۶ کے کیبنٹ مشن پلان میں سکھستان کے مطالبے کا کوئی ذکر نہیں ہوا تو سکھ کانگریس سے، خصوصاً ۱۹۴۶ کے اہم انتخاب کے پیشِ نظر معاملہ کرنے کی کوشش کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے اس کو روکنے کے لیے اپنے بس بھر کوشش کی اور آخر میں یہ اتحاد برائے نام ہی رہا۔ کانگریس جو سکھ نشستوں کے خیال ہی سے متنفر تھی، مصالحت کرنے سے منکر ہوئی اور ۳۳ سکھ حلقہ ہائے انتخاب میں سے صرف چار پر مصالحت ہو سکی۔ پنجاب کی سیاست جو باقی ماندہ شمال سے مختلف رہی تھی اب ویسے ہی ہو گئی، اور

یونینیسٹ پارٹی کے زوال سے جو خلا پیدا ہوا تھا وہ مذہبی بنیادوں پر پُر ہوا۔ مسلم لیگ نے ۸۶ مسلم نشستوں میں سے ۷۵ پر قبضہ کر کے زبردست کامیابی حاصل کی۔ کانگریس نے بھی ۵۱ نشستیں جیتیں اور ہندو محفوظ نشستوں کا ایک اچھا خاصہ حصہ حاصل کر لیا۔ لیکن کانگریس جس نے کُل اکیاون نشستیں حاصل کی تھیں، مسلم لیگ یا اکالیوں کی طرح کسی ایک مذہب کی پارٹی نہیں تھی۔ اکالیوں میں ایک خالص سکھوں کی جماعت ہونے کے باوجود کانگریس نے اکالیوں کی بائیس نشستوں پر کامیابی کے مقابلے میں دس سکھ نشستیں حاصل کیں۔ کانگریس نے ایک مسلم نشست پر بھی کامیابی حاصل کر لی۔ یونینیسٹ پارٹی جو اپنے دو عظیم معماروں سر سکندر حیات خاں اور سر چھوٹو رام کی موت کے بعد اپنے ماضی کا محض ایک عکس رہ گئی تھی، اب بھی اپنے نظریات کی پیرو تھی، اس کی حمایت مذہبی تفریق سے بلند تھی، جس نشستوں پر کامیاب ہونے والے اس کے امیدواروں میں ایک عیسائی بھی تھا۔

انتخابات کے نتائج اس لیے اہمیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے اکالیوں کے اس دعوے کو کہ سکھوں کی نمائندگی وہی اور صرف وہی کرتے ہیں، چیلنج کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آزاد ہندوستان کے انتخاب میں رائے دہندگی کی جو صورت سامنے آتی ہے وہ ایسے دعووں کی قلعی کھول دیتی ہے مگر خود انگریزوں کے کرائے ہوئے انتخابات میں جب نشستوں کی تقسیم مذہب کی بنیاد پر کی جاتی تھی اور مذہبی جذبات اپنی بدترین شکل میں سامنے آ رہے تھے، اس وقت بھی اکالی دل، دس سکھ نشستوں پر کانگریس کی کامیابی کو روک نہیں سکی۔ یعنی انتہائی سازگار حالات میں بھی اکالیوں نے محض ساٹھ فی صدی سکھ نشستیں جیتیں۔ باقی سکھ ووٹ سیکولر پارٹیوں (جیسے کانگریس یا کمیونسٹ) نے حاصل کیے۔

یہ مسئلہ سکھوں کے لیے خصوصاً آزادی کے بعد سے بنیادی مسئلہ رہا ہے۔ اس کا جواب ان کے پاس صرف یہ ہے کہ وہ مذہبی جذبات کو بھڑکا کر زیادہ سے زیادہ سکھوں کو اکالی صفوں میں لے آئیں۔ ہر شکست سے پیدا ہونے والی ان کی بے بسی اور مجبوری انھیں روز افزوں عسکریت کی طرف دھکیلتی ہے۔ سکھوں کے ساتھ دشواری یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو نہیں مان پاتے ہیں کہ جمہوریت میں مقدرات بدلتے رہتے ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق سکھوں کو مستقل طور پر اکالی کے ماتحت رہنا چاہیے، کیوں کہ یہ وہ غلامی ہے جسے گرو گوبند سنگھ کی تائید حاصل ہے اور عقیدہ اسے توانائی بخشتا ہے۔

مگر دنیا بدل گئی ہے اور اکالیوں نے اس تبدیلی کا ساتھ نہیں دیا ہے ایک جمہوری نظام، جد وجہد کی سیاست کو مان بھی سکتا ہے اور اس پر لبیک بھی کہہ سکتا ہے، اگر جھگڑے کی ہمت افزائی نہیں کر سکتا۔ دلی میں نہ تو جاگیردار ہیں اور نہ ہی نوآبادکار۔ اکالی لیڈروں نے اس طرح عمل کیا ہے گویا وہ سکھ ازم کے محافظ ہیں، اس لیے وہ جو اس تحفظ سے انکار کرتا ہے، سکھ نہیں ہے مگر سکھ عوام نے اپنے وجود کو اکالیوں کے وجود سے وابستہ نہیں کیا۔ بیسویں صدی

کی آٹھویں دہائی میں بحران کا ایک بہت بڑا سبب یہی تھا کہ عوام اکالیوں کو جیتنے نہ دیں گے اور اکالی اپنے آپ کو ہارنے نہ دیں گے۔

سکھ ووٹ بھی ایک رُخا نہیں ہے۔ سکھ بھی بٹے ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کی طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں نہیں بلکہ باہمی طور پر معاندانہ اور حریفانہ طور پر ان میں تین واضح اور طاقت ور گروہ ہیں۔ کسان (جاٹ) شہری اہل حرفہ، دکان دار اور تاجر (کھتری، اروڑہ اور رام گڑھیا) اور تبدیلِ مذہب کیے ہوئے اچھوت (مذہبی) شیڈولڈ کاسٹ سکھ جاٹوں کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ تورانی قبائل کی اولاد ہیں، جو آریاؤں کے کچھ ہی عرصہ بعد ان ہی راستوں سے ہندوکش کو پار کر کے آئے اور افغانستان اور راجستھان کے درمیانی علاقے میں آباد ہو گئے، یہ لوگ، پنجاب کے تینوں بڑے مذاہب اسلام، ہندوازم اور سکھ ازم میں معتدبہ تعداد میں دیکھے جا سکتے ہیں، اور یہی لوگ دولت اور تعداد دونوں لحاظ سے سکھوں کے غالب طبقے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ بڑی تعداد میں تبدیلِ مذہب کرنے والے اوّلین لوگوں میں تھے۔ کہتے ہیں کہ خود گرو ارجن نے ان لوگوں کو اپنی صفوں میں شامل کیا تھا، یہی لوگ تھے جو ابتدائی سکھ افواج کے ہراول ہوئے۔ بعد کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے قیام سے بڑے زمیندار امرا میں ان کا شمار ہونے لگا اور ان کی خود اپنی ایک حیثیت ہو گئی۔ انگریزوں کی ہندوستانی فوج میں بھرتی اور زمینوں کے بڑھتے ہوئے نرخوں نے معمولی معمولی کسانوں کو بھی خوش حال بنا دیا اور پورے فرقے پر جاٹوں کو غالب کر دیا۔ شہری اہلِ حرفہ اور تاجر سکھ ازم کو بعد کو قبول کرنے والوں میں تھے اور ہندوؤں سے ان کے تعلقات برابر کم ہندو طبقوں میں شادی بیاہ کے رواج کی وجہ سے بڑے قریبی رہے۔ اور پھر اچھوتوں میں سے بھی تبدیل مذہب کرنے والے تھے۔ یہ وہ بدقسمت ہندوستانی تھے جن کا مقدر وہ پستی تھی جو اگر نہ ہوتی تو اس پر کسی کو یقین نہیں آسکتا تھا۔ سکھ ازم میں مساوات کے دعوے نے ان کو اپنی طرف رجوع کیا۔ جلدی ہی انھیں پتہ چل گیا کہ اگرچہ صورت حال اتنی بری نہیں ہے جتنی کہ ہندوازم میں تھی مگر ساتھ ہی ان کو یہ احساس بھی ہوا کہ یہ بھی بہر حال وعدہ ہی ہے۔ جاٹ اب گرودواروں میں مذہبیوں کے ساتھ عبادت کرتے تھے اور مشترک رسوئی میں کھانا کھاتے تھے مگر قبولیت کا اثر صرف یہیں تک محدود تھا۔ اچھوتوں کی سماجی اور اقتصادی حیثیت بدستور پہلے ہی جیسی رہی۔

اکالی سیاست کو توانائی ملتی رہی ہے جاٹوں سے اور مذہبی سکھ ہمیشہ سے اکالی مخالف رہے ہیں، انھیں اس سلسلے میں کبھی کوئی خوش فہمی نہیں رہی ہے کہ بے زمین مذہبی سکھوں کے ساتھ ایک ایسے ملک میں جہاں جاٹوں کا غلبہ ہو کیا سلوک ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی سکھوں نے، جو سکھ آبادی کا تقریباً پانچواں حصہ ہیں، ہر شکل میں سکھ ریاست کی

مخالفت کی۔ انھوں نے تو، انڈین یونین کے اندر ایک سکھ اکثریت والے صوبے کے سکھ مطالبے کو بھی، جو ۱۹۶۶ء میں مان لیا گیا تھا، رد کرانا چاہا۔ مذہبی سکھوں نے، انتخابات میں بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ اکالیوں کے خلاف ووٹ دیئے اسی لیے سچ تو یہ ہے کہ اکالی سکھ ووٹ حاصل کرنے کا کام اسّی فی صد ووٹوں کی بنیاد سے شروع کرتے ہیں اور پھر شہری اور دیہی کش مکش اپنے تضادات پیدا کرتی ہے۔ شہری سکھ سوائے غیر معمولی موقعوں کے، اپنی ترجیح کانگریس کے لیے ظاہر کرتے ہیں اور ان سب سے اوپر سکھ کاشت کاروں میں کمیونسٹوں کے زیر اثر مضبوط حلقے ہیں۔ نشستوں کی تعداد کو اگر سامنے نہ رکھا جائے تو کمیونسٹوں نے دس فی صدی ووٹ بڑے تسلسل کے ساتھ حاصل کیے ہیں۔ اس صورت حال میں اگر مزید یہ حقیقت اور شامل کرلی جائے کہ خود جاٹ کاشت کاروں میں ایک حلقہ ہے جو اکالیوں کے ایک مذہبی ریاست کے خواب میں شرکت نہیں کرتا تو ہمیں یہ نظر آنے لگتا ہے کہ اکالیوں کے لیے خود سکھ اکثریت والے پنجاب میں جمہوریت کے ذریعے حکومت میں آنا کتنا مشکل ہے اور اصل مسئلہ تو ہندوؤں کا ہے جو اکالیوں جیسی خالص سکھوں کی کسی جماعت کو کبھی بھی ووٹ نہیں دیں گے۔

بہر حال جمع تفریق کا یہ حساب ۱۹۴۷ء میں اکالی ذہن سے بہت دور تھا، خواب عوامی یادداشت کے طاق نسیاں پر سجا دیئے گئے تھے اور پناہ گزینوں کی باز آبادکاری کا کام انتہائی سنجیدگی سے ہاتھ میں لے لیا گیا تھا۔ دہلی بھی ایک گراں قدر کوشش کے ساتھ کام میں شامل ہوا۔ مسلمانوں کی چھوڑی ہوئی زمینوں کی از سر نو تقسیم سے، زمینوں کی ملکیت کے معاملے میں ایک انقلاب آگیا۔ غیر حاضر امیر مالکان زمین غائب ہو گئے اور زمین کے مالکانہ حقوق زمین جوتنے والے کاشت کار کے پاس آگئے۔ پناہ گزینوں کو معاوضہ "معیاری ایکڑ" یعنی زمین کی پیداواری صلاحیت کے لحاظ سے دیا گیا۔ ایک معیاری ایکڑ سے مراد اس ایکڑ زمین کے قطعے سے ہوتی تھی جس میں دس گیارہ من گیہوں پیدا ہو جاتا ہو۔ اس عمل سے پہلی بار یہ ہوا کہ مذہبی سکھوں کا بھی کچھ فی صدی حصہ زمینوں کا مالک بن گیا۔ اکالی بھی اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ حکمراں کانگریس پارٹی سے سکھوں کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی صورت صرف یہ ہے کہ ان کا شریک بن جایا جائے۔ چنانچہ کچھ ممتاز اکالی لیڈروں نے اس نظریئے کے پیش نظر باقاعدہ کانگریس میں شرکت کرلی کہ اب اکالیوں کا کام ختم ہو چکا ہے اور اب کانگریسی کی حیثیت سے ان کی افادیت کا زمانہ شروع ہوا ہے

اکالی جوں جوں کانگریس کے قریب آتے گئے ماسٹر تارا سنگھ عارضی طور پر سیاست سے سنیاس لیتے رہے اور اپنی ساری توجہ مذہبی بیداری کی طرف مبذول کردی۔ چوبیس پچیس اپریل ۱۹۴۸ میں سکھ اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی دوسری کانگریس میں، انھوں نے اکالیوں کو اپنی الگ حیثیت کو برقرار رکھنے پر مائل کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ اس خالص سکھ

سیاسی پارٹی کے خود مختار کردار کو باقی رکھنے کی ضمانت ہو جائے مگر اکالیوں نے ۱۰ مارچ کو ہونے والی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کے کانگریس میں شامل ہونے کے فیصلے کو ترجیح دی اب جب کہ ان کے ایک الگ قوم ہونے کے مطالبے کو نظر انداز کر دیا گیا تھا، ان کا اصل مقصد اپنے وجود کو برقرار رکھنا تھا۔

کیبنٹ مشن کی آمد سے دو دن قبل ۲۲ مارچ ۱۹۴۶ء کو اکالی دل نے "سکھستان" کا مطالبہ کرتے ہوئے باقاعدہ ایک تجویز منظور کی تھی، اس میں سکھستان کا جواز یہ بیان کیا گیا تھا کہ سکھوں کے وجود کو ایک طرف تو مسلمانوں کے پاکستان کے مسلسل مطالبے کی وجہ سے اور دوسری طرف ہندوؤں کے انھیں اپنے اندر جذب کر لینے کے خدشے کے پیش نظر سخت خطرات پیدا ہو رہے ہیں۔ ۲۴ مارچ کو سر اسٹیفورڈ کرپس لارڈ پیتھک لارنس اور اے وی الیگزینڈر دہلی پہنچے تاکہ وہ یہ معلوم کر سکیں کہ ہندوستانی کیا چاہتے ہیں۔ سکھوں کے نمایندے کرپس کمیشن کے سامنے "سکھستان" کا مقدمہ معقول طور پر پیش نہ کر سکے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے آخر میں تمام فرقوں کی ملی مرکزی حکومت کے ساتھ ایک متحدہ ہندوستان کی وکالت کی اور کہا کہ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر ایک الگ سکھ صوبہ دے دیا جائے اور اسے یہ حق بھی دیا جائے کہ وہ ہندوستان یا پاکستان جس کے ساتھ چاہے الحاق کرلے۔ گیانی کرتار سنگھ ایک ایسا صوبہ چاہتے تھے جس میں سکھ غالب یا تقریباً غالب ہوں گے۔ ہرنام سنگھ تقسیم کے مخالف تھے اور سکھوں کے لیے مختلف ضمانتیں چاہتے تھے۔ بلدیو سنگھ نے سکھستان کی امکانی سرحدوں کی نشان دہی کی مگر آخر میں ان کا مطالبہ بھی " جو بھی سیاسی فریم ورک بنے اس میں خصوصی تحفظ" تک رہ گیا مگر جلدی ہی سکھوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے سودا کرنے میں کسی کو کوئی دل چسپی نہیں ہے، نہ کانگریس کو، نہ مسلم لیگ کو اور نہ ہی انگریزی حکومت کو۔ انھوں نے الیکشن اور عارضی حکومت کا بائیکاٹ کرنے کی دھمکی دی۔ سودے بازی کی خواہش میں بے بسی اور بے چارگی کا رنگ آنے لگا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے، ایک پیش کش کی۔ جو زیادہ سے زیادہ سکھوں کو ایک کمزور یقین دہانی تھی مگر اس یقین دہانی کو سکھ لیڈر آج بھی، زیادہ بڑی چیزوں کا وعدہ کہہ کر دہراتے رہتے ہیں۔ ۷ جولائی کو روزنامہ اسٹیٹس مین میں پنڈت نہرو کا ایک بیان شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا "پنجاب کے بہادر سکھ، خصوصی مراعات کا حق رکھتے ہیں، مجھے شمال میں ایک ایسے علاقے اور ایک ایسے نظام میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی جس میں سکھ آزادانہ طور پر آزادی کی چمک دمک کا تجربہ کر سکیں۔" یہ بات سننے میں اچھی لگتی ہے مگر جیسا کہ سکھوں پر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد منکشف ہو گیا کہ یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں ہوئی تھی۔ اور وہاں آزادی کی چمک دمک کے بجائے محض ایک ہندو اکثریت کا سایہ تھا۔

۱۹۴۸ء میں جب ہندوستان کے داخلی نقشے کے بننے کا طول طویل عمل شروع ہوا تو پنجاب کو دو انتظامی اکائیوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ سکھ شاہی ریاستوں (بشمول مالیر کوٹلہ اور نالاگڑھ) کو پٹیالہ اینڈ ایسٹ پنجاب اسٹیٹس یونین (PEPSU) بنانے کے لیے ایک الگ اکائی میں شامل کر دیا گیا۔ پیپسو میں سکھ اور ہندو تعداد کے لحاظ سے برابر تھے۔ (۴۸٫۸ کے مقابلے میں ۴۹٫۳ فی صدی) مگر پہلی دفعہ ایک علاقہ ایسا بنا تھا جس میں سکھ آبادی غالب یا تقریباً غالب تھی۔ سکھ پناہ گزینوں نے پیپسو سے ملحق اضلاع میں بسنا شروع کیا۔ اس وقت امور داخلہ اور باز آباد کاری کی وزارتوں کے سربراہ ایسے سکھ تھے جو تقسیم سے قبل ممتاز اکالی رہ چکے تھے چنانچہ آبادکاری کے اس نہج پر کچھ ہندوؤں نے فوراً ہی شعوری نیت کے عمل دخل کا شبہہ شروع کر دیا۔ دونوں فرقوں کے درمیان کش مکش پیدا ہونے لگی اور سکھ ہندو معرکہ زبان کے مانوس مسئلے کے نام پر شروع ہوا۔ تین حرفِ "گاف" سکھ عقیدے کے مرکزی عوامل ہیں : گرو، گرنتھ اور گرومکھی۔ پنجابی رسم الخط گرومکھی ہے۔ یہی وہ رسم الخط ہے جس میں سکھ مذہبی صحیفے لکھے گئے ہیں، اس رسم الخط کو اسی مقصد کے لیے دوسرے گرو انگد نے بنایا اور یہ بالآخر مذہب کا ایک جزو لاینفک بن گیا، مگر تقسیم کے کچھ ہی دنوں بعد سے، ہندوؤں نے جو عام طور پر پنجابی بولتے ہیں، پنجابی زبان کو ریاستی حکومت کی سرکاری زبان بننے سے روکنے کے لیے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ ان کی مادری زبان ہندی ہے۔ سکھ چونک پڑے، جذب کرنے کا عمل شروع ہو چکا تھا اور پہلا حملہ پنجابی کو ختم کرنے کی اس سازش سے شروع ہوا تھا انھوں نے ایک چھوٹے پنجاب کا مطالبہ شروع کیا جس میں گرومکھی رسم الخط کے ساتھ پنجابی سرکاری زبان ہو سکے۔ "ڈیڑھ سو سال میں پہلی مرتبہ، سکھوں اور ہندوؤں کے درمیان ۱۹۵۱ میں مردم شماری کے وقت فسادات شروع ہو گئے۔ متنازعہ مسئلہ زبان تھا۔ (ان فسادات سے پہلے ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان تشدد ۱۷۹۶ میں اس وقت ہوا تھا جب پٹیالہ کے صاحب سنگھ اور دوسرے سکھ سرداروں کے لشکروں نے کمبھ کے میلے کے موقع پر ہندو مہنتوں اور زائرین پر حملہ کیا تھا، کمبھ کا میلا متبرک شہر ہری دوار کے مقام پر ہونے والا ایک عظیم ہندو تہوار ہے) سیکولر ہندوستان میں، پنجاب کے ہندوؤں نے ہندی، ہندو، ہندوستان کا نعرہ لگا کر ہندی زبان، ہندو مذہب اور ہندوستان کی خطرناک تثلیث کو جنم دے دیا۔ سکھوں نے اس کے جواب میں "دھوتی، ٹوپی جمنا پار" کا نعرہ لگایا وہ اکالی جو ۱۹۴۷ کے بعد سے نسبتاً خاموش تھے۔ اب ایک بار پھر ان کے کٹر عناصر نے مذہبی اقلیت کو زندہ کر دیا۔ چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں "سکھ بغیر اپنی ریاست کے محفوظ نہیں رہ سکتے"۔ نعرہ تھا "پنجابی صوبہ"

پنڈت جواہر لال نہرو کسی طرح بھی کٹر اور متعصب نہیں تھے، ان کے دشمن بھی کبھی ان پر انتہا پسند فرقہ پرست ہونے کا الزام نہیں لگا سکے۔ مگر ایک چیز ضرور تھی جس کے لیے وہ کٹر ہو گئے تھے اور وہ تھی ہندوستان کی علاقائی سالمیت۔

ان کے نزدیک پنجاب کی ایک اور تقسیم اور ایک چھوٹے سے صوبے کا ایک غیر یقینی اور نامعتبر اقلیت کے ہاتھ میں ہونا اور پھر ایسی صورت میں کہ اس کے مغرب میں اسلامی پاکستان اور شمال میں مسلم اکثریت والا کشمیر ہو، خودکشی سے کم نہیں تھا۔ اور احتجاجات اور زور دباؤ کے باوجود مرتے دم تک نہرو کے پائے ثبات لڑکھڑائے نہیں، انھوں نے سکھوں کی اکثریت والا پنجاب وجود میں نہیں آنے دیا یہ تو ۱۹۶۴ میں ان کے انتقال کے بعد ہوا اور وہ بھی ان کی بیٹی اندرا گاندھی کی عنایت تھی کہ سکھوں کو ان کا پنجاب مل گیا۔ اکالی پریس نے نہرو کو بدنام کیا، خصوصاً ۱۹۵۵ء میں، جب اسٹیٹس ری آرگنائزیشن کمیشن نے دوسرے لسانی گروہوں کو تو صوبے دے دیے مگر سکھوں کے مطالبے کو انتہائی سطحی بنیادوں پر رد کر دیا، سردار حکم سنگھ نے جو ستم ظریفی دیکھیے کہ بعد کو کانگریسی بھی ہوئے اور پارلیامنٹ کے اسپیکر بھی، نہرو کو عسکری ہندو وطن پرستی کا کا قائد کہا جو باتیں قوم پرستی کی کرتا ہے ۔ایک جابر جو جمہوریت کے گن گاتا ہے وہ گوبلز کی طرح جھوٹا ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ ایک سیاسی مکار اور دھوکے باز ہے اور ہندوستانی رجعت پسندی کی خدمت گذاری کے لیے ایک فریبی" اتنی تلخ اور ترش باتوں سے بہرحال نہرو پریشان بالکل نہیں ہوئے اور پنجاب کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی بجائے جیسا کہ سکھ چاہتے تھے، نہرو کی حکومت نے پنجاب کو ۱۹۵۶ء میں نسبتاً بڑی ریاست بنا دیا۔

اکالی دل نے ایک ریزولیوشن پاس کیا جس میں کہا گیا تھا کہ "جمہوریت کی حقیقی آزمائش، شرومنی اکالی دل کی رائے میں یہ ہے کہ اقلیتیں درحقیقت اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتی ہوں اور ملک کے مقدر میں اپنے آپ کو برابر کا شریک تصور کرتی ہوں۔ شرومنی اکالی دل سارے ہندوستان میں لسانی اور ثقافتی بنیادوں پر صوبوں کی تشکیل کا حامی ہے مگر سکھ ایک نئے پنجاب کو جو تشکیل دیا جانے والا تھا، موت اور زیست کا مسئلہ سمجھتے ہیں ..... دل ہندوستان کی ایک خود مختار اکائی کی حیثیت سے پنجابی بولنے والوں کے ایک صوبے پر یقین رکھتا ہے۔" اسٹیٹس ری آرگنائزیشن کمیشن نے نظری طور پر اس سے اتفاق کیا اس نے کہا کہ "لسانی ریاستوں کے مطالبے کا مطلب ثقافتی احیا پرستی نہیں ہے اس کا مقصد زیادہ وسیع ہے جس میں ہر مختلف لسانی گروہوں کے لیے سیاسی اور اقتصادی انصاف کا متلاشی ہے۔ ہر لسانی ریاستوں میں سیاسی قیادت اور انتظامی اختیارات عام طور پر غالب لسانی گروہ کی جاگیر ہوتے ہیں۔ اور ریاست کے انتظامی معاملات میں اقلیتیں موثر آواز سے محروم رہتی ہیں۔" مگر عملی طور پر اسی کمیشن نے یہ کہا کہ سکھ، ایک الگ لسانی گروہ ہونے کے باوجود خود اپنا صوبہ رکھنے کے حق دار نہیں ہیں۔ پنجاب سے کہا گیا کہ وہ اپنے یہاں زبان کے مسئلے کو پنجابی / گورمکھی اور ہندی دونوں کو استعمال کر کے خوش اور مطمئن رہے۔ کمیشن نے سکھوں کو ایک چھوٹا لسانی صوبہ دینے کے بجائے پنجاب میں پیپسو اور ہماچل پردیش کو ملا دینے کی تجویز رکھی۔

تارا سنگھ جواب دینے کھڑے ہوئے "سکھوں کی بربادی کا ایک فرمان منظور ہو چکا ہے اور اس وقت ۱۹۴۷ کی تباہی سے بڑی تباہی ہمارے سامنے ہے۔ ۱۹۴۷ کی تباہی نے ہزاروں سکھ ختم کیے اور اسٹیٹ ری آرگنائزیشن کمیشن کی رپورٹ انھیں صفحہ ہستی سے محو کر رہی ہے۔ (اسپوکس مین ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۵ء کمیشن کی رپورٹ ۳۰ ستمبر ۱۹۵۵ء کو حکومت ہند کے سامنے پیش کی گئی تھی) ماسٹر تارا سنگھ مبالغہ آمیزی سے کبھی نہیں گھبرائے اور ان کے جانشینوں نے بھی ان سے یہی سیکھا تھا، مگر اس خطابت اور چرب زبانی کے پیچھے حقیقی خفگی بھی پنہاں تھی اور وہ یہ کہ سکھوں پر کبھی بھروسہ نہیں کیا گیا ہے اور انھیں کبھی ان کا حق نہیں ملنے والا ہے۔ اکالیوں کے سامنے اب مقصد یہ تھا کہ وہ سکھ عوام کو اس بات کا یقین دلائیں کہ کانگریس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور اب اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

ابھی تک انتخابات میں، سکھوں نے کم و بیش اکثر اکالیوں کے مقابلے میں کانگریس کو ترجیح دی تھی۔ اس ترجیح کا مظاہرہ انھوں نے ایک بار پھر ۱۹۵۴ میں پیپسو کے وسط مدتی انتخابات میں کیا، پچاس فی صدی آبادی کے باوجود ان انتخابات میں اکالیوں کو صرف ۶ر۲۷ فی صد ووٹ ملے اور جن ۳۳ نشستوں پر انھوں نے اپنے امیدوار کھڑے کیے ان میں سے صرف دس پر انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ دوسری طرف کانگریس کو ۴ر۴۰ فی صدی ووٹ ملے اور اسے ۲۲ نشستوں پر کامیابی ملی پنجاب میں اکالیوں کے سامنے نسبتاً بڑا مسئلہ تھا۔ ایک سرگرم اور ذہین کانگریسی سکھ لیڈر پرتاپ سنگھ کیروں جو مشی گن یونی ورسٹی کے پولیٹیکل سائنس کے گریجویٹ تھے۔ گاؤوں کے اقتدار کے یونینیٹ پارٹی کے نعرے کو دہرا کر دیہی علاقوں میں ووٹروں کو اپنے ساتھ شامل کرتے جا رہے تھے۔ کانگریس کے سکھ وزرا، اعلیٰ اکالیوں کے لیے ہمیشہ مسئلہ رہے ہیں۔ کیروں سے کم تر درجے کے لیڈر جیسے ساتویں دہائی میں گیانی ذیل سنگھ (جو بعد کو صدر جمہوریہ ہوئے) اور دربارا سنگھ بھی سکھوں میں اپنی حمایت کا مظاہرہ کرتے رہے تھے۔ کیروں کی زیر قیادت کانگریس سے شکست کھانے کے خیال سے اکالی اتنے خوف زدہ تھے کہ نہرو کی پالیسیوں کے خلاف آہ و بکا کرنے کے باوجود اکالی دل نے کانگریس سے ایک انتخابی سمجھوتہ کیا جس کی شرائط ماسٹر تارا سنگھ جیسے لوگوں کے لیے محض حقارت آمیز تھیں۔ ۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو ماسٹر تارا سنگھ کی صدارت میں اکالی دل نے "کانگریس اور اس کے لیڈروں پر اپنے اعتماد کے اظہار کا فیصلہ کیا اور طے کیا کہ خود دل اپنے آپ کو، سکھوں کی، مذہبی، تعلیمی، ثقافتی اور سماجی فلاح کے کاموں تک محدود رکھے گا۔ مزید یہ کہ انھوں نے دل کے آئین سے وہ تمام دفعات خارج کر دیں جن سے کسی طرح بھی ایک الگ سکھ ملک کی خواہش کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ ماسٹر تارا سنگھ کے لیے روایتی آخری تنکا تھا۔ وہ اس اتحاد کو توڑنے کی کوشش سے اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکے اور انھوں نے ۱۹۵۷ء کے عام انتخابات میں خود اپنے امیدوار کھڑے

کیے اور کانگریس کے خلاف پروپگنڈے کی مہم چلائی ۔ وہ کسی ایک نشست پر بھی کامیابی حاصل نہ کرسکے ۔ کانگریس کو کل ووٹوں میں سے ۵ر۴۷ فی صدی ووٹ ملے ۔ کمیونسٹوں نے بھی اچھے خاصے ۶ر۱۳ فی صدی ووٹ حاصل کر لیے ۔ ان کے یہ ووٹ، کانگریس ۔ اکالی اتحاد کی عنایت تھی جس نے جاٹ مخالف مذہبی سکھوں کو لال پرچم کے نیچے جمع کردیا۔

عین اس وقت جب کہ اکالیوں کی خواہشات کی شدت کو کیروں نے کچھ کم کر دیا تھا ۔ ہندو کٹرپن کے ایک نئے دھاکے نے اکالیوں کے لیے ایک بہانہ فراہم کر دیا جس کے سہارے اپنے آپ کو ایک بار پھر بحال کرنے کا انھیں موقع مل گیا ۔ " ہندی بچاؤ " کی ایک تحریک شروع کی گئی ۔ بظاہر ہندی کے تحفظ کے لیے اور بہ باطن شہری پنجابی ہندو کے وقار کو بحال کرنے کے لیے جسے ، ۱۹۵۷ء میں کیروں کی کابینہ جس میں کانگریسی تھے ، اکالی تھے اور ہندو کاشت کاروں کے لیڈر تھے مگر اسے کوئی نمائندگی نہیں ملی تھی ۔ تحریک بہت کم دن زندہ رہی ، مگر ماسٹر تارا سنگھ کو وہ موقع ہاتھ آگیا جس کا انھیں انتظار تھا ۔ انھوں نے کہا کہ کیروں سکھوں کے حقوق کے تحفظ میں ناکام رہے ہیں سکھوں کو ان کا اپنا پنجاب ملنا چاہیے ۱۲ ۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو امرت سر میں پہلی پنجابی صوبہ کانفرنس منعقد ہوئی ۔ جدوجہد کی "ڈکٹیٹرشپ" کی ذمہ داری جس شخص کو سونپی گئی وہ ماسٹر تارا سنگھ کے چہیتے لیفٹیننٹ اور اکالی دل کے نائب صدر سنت فتح سنگھ تھے (تمام سکھ احتجاج کی قیادت "ڈکٹیٹر" کرتے ہیں ۔ اکالیوں کو فوجی اصطلاحات پسند ہیں ۔)

جنوری ۱۹۶۰ء میں ماسٹر تارا سنگھ نے شرومنی گرودوارہ پربندھک کمیٹی کے مذہبی انتخابات میں پنجابی صوبے کے نام پر کامیابی حاصل کی اور اپنے ۱۳۱ فتح یاب حمایتیوں کے ساتھ انھوں نے یہ عہد کیا کہ وہ سب ، پنجابی صوبے کے خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے اپنے جسم ، اپنی روح اور اپنی جائدادیں (اسی ترتیب سے) قربان کر دیں گے ۔ اپریل ۱۹۶۰ء میں پنجابی صوبے کے لیے احتجاجی مہم شروع ہوئی اور اس کی نوعیت اکالی دل کے ریزولیوشن کے مطابق تھی " ابھی یا پھر کبھی نہیں "

جہاں تک جواہر لال نہرو کا تعلق تھا یہ "کبھی نہیں" کا معاملہ تھا ۔ کیروں نے جو نہرو ہی کی طرح سخت گیر آدمی تھے فوراً ہی تارا سنگھ کو گرفتار کر لیا ۔ سنت فتح سنگھ نے ان کی جگہ سنبھالی ۔ گاؤوں سے کہا گیا تھا کہ وہ پُرامن مدافعت کریں ، اکالیوں کے تخمینے کے مطابق اس سلسلے میں ستاون ہزار سکھ جیل گئے ۔ حکومت کے اعداد و شمار کے لحاظ سے جیل جانے والے سکھوں کی تعداد ۲۶ ہزار تھی ۔ جذبات کو مہمیز لگانے کے لیے سنت فتح سنگھ نے نومبر ۱۹۶۰ء میں مرن برت رکھنے کا اعلان کیا اور ۱۸ دسمبر سے یہ برت شروع بھی کر دیا ۔ اس وقت تک چیلے کی مقبولیت کچھ اتنی بڑھ گئی کہ گرو کے لیے پریشانی کا سبب بننے لگی چنانچہ ان دونوں کے درمیان کش مکش کے آثار پیدا ہونے لگے ۔ کیروں نے اس بات کو محسوس کر لیا

اور ماسٹر تارا سنگھ کو رہا کر دیا۔ ماسٹر تارا سنگھ نے اعلان کیا کہ سنت فتح سنگھ کے بعد وہ خود مرن برت رکھیں گے۔ حصول مقصد کے لیے جان و دل کی پیش کش پھر ہونے لگی۔ بہر حال تقابہ کہ روح گریزاں تھی اور جسم یقیناً کمزور۔ ہر برت کا خاتمہ موت پر نہیں بلکہ سنترے کے مفرح ایک گلاس پر ہوا۔ ہر دفعہ ایک برت پر بیٹھے اکالی لیڈروں کی جان بچانے کے لیے مصالحت کا ایک کمزور سا معاہدہ ہوا اور اسے نام دیا گیا فتح و کامیابی کا۔ حکومت ہند کو بھی اس بات کا یقین ہونے لگا اور جس کا بہت سے سکھوں کو شبہ بھی تھا کہ ان فاقہ کشیوں میں خفیہ طور پر غذا بھی پہنچائی جاتی ہے۔ حکومت کے پاس موجود ایک طبی رپورٹ کے مطابق ایک ایسے ہی برت کے دوران سنت فتح سنگھ کے وزن میں اضافہ ہو گیا تھا (دھرم ویر (ایک سول سرونٹ) کے ذمے ۱۹۶۶ء میں پنجاب کے معاملات کیے گئے تھے، انھوں نے اس بات کا ذکر خود مصنف سے کیا تھا) سنت فتح سنگھ کے دسمبر ۱۹۶۰ء کے برت کو ۹ جنوری کو بغیر کچھ حاصل کیے ہوئے ختم کرنے کا اعلان ہو گیا۔

اب ماسٹر تارا سنگھ کی باری تھی۔ ان کا برت یوم آزادی ۱۵ اگست ۱۹۶۱ء کو ایک جشن کی طرح شروع ہوا۔ مگر اب ماسٹر تارا سنگھ کے سامنے ایک انتہائی عجیب مسئلہ آ گیا تھا۔ حکومت ان کو مرن برت رکھنے کی اجازت دینے پر بالکل راضی تھی اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ یہ برت صحیح معنوں میں برت ہو، انتہائی وسیع پیمانے پر تفصیلی احتیاطی انتظامات کیے گئے اور چوری چھپے کھانا پہنچنے کے سلسلے میں مسلسل نگرانی کا انتظام کیا گیا۔ یکم اکتوبر کو ماسٹر تارا سنگھ نے فیصلہ کیا کہ پنجابی صوبہ ان کی زندگی کا بدل نہیں ہے اور انھوں نے کھانا شروع کر دیا۔ اس سے زیادہ تضحیک اور کسی کی نہیں ہوتی جب کسی شہید کے بارے میں یہ انکشاف ہوا کہ وہ بھی ایک عام انسان ہے۔ "اگر میں نے غداری کی ہے تو مجھے سزا دو،" ماسٹر تارا سنگھ نے اعلان کیا۔ سکھوں نے سزا دی، اور ماسٹر تارا سنگھ کو حکم دیا گیا کہ وہ پانچ دن تک گولڈن ٹیمپل میں ہر آنے والے کے جوتے صاف کریں۔ کچھ عرصے بعد انھیں شرومنی گرودوارہ پربندھک کمیٹی اور اکالی دل دونوں سے نکال دیا گیا۔ ان کے جانشیں سنت فتح سنگھ ہوئے۔ ماسٹر تارا سنگھ کا ردعمل سمجھ میں آنے والا تھا انھوں نے اپنے نظریات میں اور شدت پیدا کر لی اور اکالی دل سے اپنے کو اور دور کر لیا۔

اکالی دل نے اپنی چار سالہ کوششوں کے باوجود، ۱۹۶۲ء کے عام انتخابات میں، جو اس نے تنہا لڑا تھا اپنے ووٹوں کی تعداد کو کم پایا۔ ۱۹۵۲ء میں اکالیوں کو سکھ علاقوں میں ۲۴ فی صدی ووٹ ملے تھے اب انھوں نے صرف ۲۰٫۷ فی صدی ووٹ حاصل کیے۔ دوسری طرف کانگریس نے سکھ علاقوں میں ۴۵٫۷ فی صدی ووٹ حاصل کیے یہ تعداد اسے ہندوؤں سے ملنے والے ووٹوں کی تعداد سے زیادہ ہے کیونکہ پنجاب میں ان کا اوسط ۴۳٫۷ فی صدی تھا۔ اکالی ووٹ، دیہی سکھوں کے ایک حلقے میں مرکوز ہو گیا تھا۔ اقلیتی ووٹ کی بنا پر

قائم اور مشتہر کی ہوئی ایک تحریک کی یہ بوالعجبی اظہر من الشمس تھی۔

ماسٹر تارا سنگھ نے جولائی ۱۹۶۲ء میں اپنے علیحدہ اکالی دل کے قیام کا اعلان کیا اور اس میں بالکل واضح طور پر ایک الگ سکھ ملک کا مطالبہ کیا لیکن ایک دفعہ پھر سکھ عوام نے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ شدت پسندوں کے ساتھ ہیں یا اعتدال پسندوں کے ساتھ۔ ۱۹۶۴ء میں پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے لیے پٹی کے حلقہ انتخاب سے ہونے والے ایک ضمنی چناؤ میں سنت فتح سنگھ کے امیدوار کو ملنے والے ۱۸۷۰۴ ووٹوں کے مقابلے میں ماسٹر تارا سنگھ کے امیدوار کو صرف ۴۵ ۲۷ ووٹ ملے۔ سکھوں کو جب بھی موقع ملا انھوں نے جمہوری ووٹنگ کے ذریعہ یہ دکھا دیا کہ وہ یا تو کانگریس کے ساتھ ہیں یا پھر اعتدال پسند اکالیوں کے ساتھ اور یہ کہ وہ بہر حال تشدد اور علیحدگی کی وکالت کرنے والوں کے ساتھ ہرگز نہیں ہیں۔ مگر ہوتا یہ تھا کہ اخباروں کی شاہ سرخیاں شدت پسندوں سے متعلق ہوتی تھیں اس کی وجہ ایک غلط تاثر یہ ضرور پیدا ہوا کہ یہی تشدد پسند سکھوں کی حقیقی آواز ہیں۔

بہر حال یہ اُن مذہبی لیڈروں کی جنھوں نے اپنے اپنے بستروں میں پرامن طریقے پر اپنی جانیں، جان آفریں کے سپرد کیں۔ جرأت اور بہادری نہیں تھی جس کی وجہ سے سکھوں کو اپنا پنجاب ملا۔ یہ تو ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء کی اہم جنگوں میں ان کی حب الوطنی تھی جس نے ہندوستان کی حکومت کو اس بات کا یقین دلایا کہ سکھ قوم پرست تھے ان دونوں جنگ میں سکھوں نے بڑے پرجوش اور شان دار طریقے پر لبیک کہا اور ملک کے دفاع میں آدمی، سرمایہ اور جرأت سب ہی کچھ دے دیا۔ سب سے بڑا خطرہ ۱۹۶۵ء میں سامنے آیا۔ سنت فتح سنگھ نے پنجابی صوبے کے لیے احتجاج کی تجدید کی اور ریڈیو پاکستان نے اپنے باقاعدہ نشریاتی سلسلوں میں اگر سکھ خود مختار ملک کا مطالبہ کرتے ہیں تو اپنی امداد اور اپنے تعاون کا یقین دلانا شروع کیا۔ پاکستان کو اس وقت یقیناً پنجاب میں ایک مضبوط پانچویں کالم کی توقع رہی ہوگی جب یکم ستمبر ۱۹۶۵ء میں ان کی فوجوں نے چھمب جوریاں کے مقام پر بین الاقوامی سرحد پار کی ہوگی مگر پاکستان کی یہ توقع تو پوری نہیں ہوئی بلکہ اس کی جگہ انھیں ایک بہت بڑا دھکا لگا۔ پنجاب میں پاکستانی جارحیت کے خلاف جوابی حملوں کی قیادت سکھوں نے کی، شہریوں کی حیثیت سے بھی اور فوجیوں کی حیثیت سے بھی۔ انھوں نے ہی پاکستان کی اسلحہ اور پیدل فوج دونوں کو ناکارہ بنا دیا۔ سکھ ایک اہم گھڑی میں آزمائش میں پورے اترے تھے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ بندی کے دو دن بعد، وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے پرانے عسکری اکالی اور پارلیمنٹ کے موجودہ اسپیکر سردار حکم سنگھ کی سربراہی میں بائیس اراکین پر مشتمل ایک پارلیمانی کمیٹی بنائی اور ایک سہ رکنی کمیٹی مسز اندرا گاندھی کی سربراہی میں ان دونوں کمیٹیوں کے ذمے پنجابی صوبے کے مطالبے کا

از سرِ نو جائزہ لینے کا کام کیا گیا۔

۱۰ مارچ ۱۹۶۶ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ایک ریزولیوشن پاس کیا جس میں کہا گیا کہ "ایک صوبہ جس میں پنجابی سرکاری زبان ہو، بنایا جائے"۔ اس فیصلے کا نفاذ ہوگیا۔ پنجاب ایک بار پھر تقسیم کیا گیا اس بار تین حصوں میں۔ ایک ہندو اکثریت والا صوبہ، ہریانہ قائم کیا گیا جس کا علاقہ ۱۶۸۳۵ مربع میل اور جس کی آبادی ۵۳ر۷ ملین تھی۔ (اس میں پانچ فی صدی سکھ تھے) ۲۱۵ر۱۰ مربع میل اور ۰۲ر۱ ملین افراد (اس کے دو فی صدی) پر مشتمل دوسرا حصہ ہماچل پردیش ہوگیا اس تخفیف کے بعد پنجاب محض ۲۰۲۵۴ مربع میل کے علاقے میں اور جالندھر، امرت سر، ہوشیار پور، لدھیانہ، فیروزپور، گرداس پور، پٹیالہ، بھٹنڈا اور کپورتھلہ کے اضلاع اور کچھ دوسری چھوٹی چھوٹی جگہوں پر مشتمل ہوگیا اس کی کل آبادی ۵۸ر۱۱ ملین تھی اور اب بہر حال ایک جگہ ایسی ہوگئی تھی جہاں سکھ اکثریت میں تھے جہاں ان کی تعداد ۵۶ فی صدی تھی۔ چنڈی گڑھ کو اس وقت تک کے لیے ہریانہ اور پنجاب کی مشترکہ راجدھانی بنا دیا گیا جب تک ہریانہ اپنی نئی راجدھانی تعمیر نہ کرلے۔ سنت فتح سنگھ بہت خوش تھے۔ انھوں نے کہا کہ "میرے گھر میں ایک خوب صورت بچہ پیدا ہوا ہے" (سنت غیر شادی شدہ تھے) "پنجابی صوبہ ہمارا آخری مطالبہ ہے انھوں نے کہا اور ایک آزاد و خود مختار سکھ ملک کے لیے جدوجہد کو جاری رکھنے کی ماسٹر تارا سنگھ کی اپیل کو "بے کار محض" کہہ کر رد کر دیا۔ ماسٹر تارا سنگھ زیادہ سنکی تھے۔ انھوں نے کہا کہ سنت ایک مذہبی آدمی ہیں اور سیاست کو نہیں سمجھتے ہیں۔ دلی میں یہ امید ظاہر کی جانے لگی کہ اب جب کہ ان کا مقصد پورا ہوگیا ہے اکالی اپنے دَل کو ختم کر دیں گے مگر اکالی فوراً ہی ایک دوسری مہم میں لگ گئے اور یہ مہم تھی انتخابات جیت کر اپنی صوبے میں حکومت خود بنانے کی۔

سکھ پنجاب کے قیام کے وقت وزیر اعظم تھیں مسز اندرا گاندھی، جن کی قسمت میں، بیاسی مقدر کے نہ جانے کتنے ڈرامائی نشیب و فراز دیکھنے کے بعد اس صدی کی آٹھویں دہائی میں سکھ انتہاپسندوں کے تشدد کا مقابلہ کرنا اور بالآخر ایک بڑی قیمت چکانا لکھا تھا۔ ایک پرانے کانگریسی لیڈر جنھوں نے ۱۹۶۶ء میں ایک الگ سکھ صوبے کے قیام کی بڑی سختی سے مخالفت کی تھی وہ نائب وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ حالات کیسے کیسے پلٹے کھاتے ہیں۔ مرارجی ڈیسائی کے سیاسی مقدر میں اندرا گاندھی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ڈرامائی نشیب و فراز آئے مرارجی ہندوستان کے وزیر اعظم بنے اور انھوں نے ان ہی اکالیوں کو وہ قبولیت عطا کر دی جو ہندوستان کی سیاست میں ابھی تک اعلیٰ ترین ہے۔ مرارجی ڈیسائی نے ۱۹۷۷ میں تشکیل ہونے والی مرکزی کابینہ میں دو نشستیں ان لوگوں کو دے دیں۔



(۹)

عقیدے کی سیاست

جشن ختم ہوا تو سکھوں نے محسوس کیا کہ ان کے بنیادی مسئلے میں تو کوئی تبدیلی آئی ہی نہیں۔ وہ اب بھی کافی نہیں تھے ۵۶ فی صدی کی تعداد کو دیکھنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ اس خیال سے مطمئن ہو جائیں کہ آپ اکثریت میں ہیں اور دوسرا طریقہ یہ ہوگا کہ آپ کو یہ پریشانی لاحق رہے کہ آپ کی اس حیثیت کو کسی وقت بھی دھکا لگ سکتا ہے گرو گوبند سنگھ نے، جنھوں نے سکھوں کو یہ بتایا تھا کہ تم حکومت کرنے کے لیے پیدا کیے گئے ہو، سکھوں میں ایک ایسی ہوس پیدا کر دی تھی جو ان کی تعداد کو دیکھتے ہوئے بہت زیادہ تھی۔

اکالیوں کی ۵۶ فی صدی تعداد کا مطلب تھا رائے شماری کے ذریعے فرماں روائی کی ایک ناکافی ضمانت۔ تامل ناڈو میں ڈی ایم کے اپنے آپ کو علیحدگی پسند تحریک سے الگ کر کے ایک حکمراں قوت میں بدل سکی اس کی وجہ یہی تھی کہ وہاں آبادی کی کوئی جھنجھٹ یا افراتفری نہیں تھی۔ اکالیوں کو تامل ناڈو جیسی پرسکون تبدیلی نصیب نہیں ہو سکی کیوں کہ ان کی عوامی بنیاد بہت وسیع نہیں تھی کانگریس کو شکست دینے کی توقع اکالی صرف اسی حالت میں کر سکتے تھے جب وہ کسی بڑے ہندو حزب اختلاف کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیں۔ یہ صورت حال اگرچہ فطری طور پر ممکن ہو سکتی ہے، اور ایسا ہوا بھی، مگر یہ صورت حال کبھی خوش گوار نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ ایسا کرنے میں بہت سی ناگوار مصالحتیں اور مفاہمتیں ناگزیر تھیں جیسا کہ ۱۹۶۷ اور ۱۹۷۱ کے مابین ہونے والے تجربات نے ظاہر کر دیا۔ اکالیوں کی مایوسی اور ان کی بیزاری سمجھ میں آنے والی ہے۔ ان کے سامنے اپنے ہی بنائے ہوئے صوبے میں انتخابات میں کامیابی نہ حاصل کر سکنے کی ایک حماقت آمیز مگر حقیقی صورت حال تھی۔

اسی لیے سکھ انتہا پسندوں کو دوسری تقسیم کے مطلب کے سلسلے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ یہ اگلے معرکے کا محض ایک مرحلہ تھا وہ ایک خود مختار سکھ ملک چاہتے تھے جہاں صرف خالصہ حکومت کریں گے ("راج کرے گا خالصہ"

وہ اپنی ہر مذہبی عبادت کے بعد اپنے آپ کو یاد دلاتے رہتے ہیں) مگر چالیس فی صدی سے زیادہ ہندوؤں کی تعداد ہضم کرنے کے لیے بہت بڑی تھی۔ اتنی بڑی، خوش حال اور جنوب مشرق میں ہمدرد پڑوسی کی قربت میں رہنے والی اقلیت کی موجودگی میں ایک مذہبی ریاست ناممکنات میں سے تھی اور پھر علیٰحدگی پسند اس علاقے میں سے کچھ چھوڑنے پر بھی راضی نہیں تھے جو ۱۹۶۶ء میں پنجاب کے حصے میں آگیا تھا وہ تو اگر کچھ چاہتے تھے تو اس علاقے میں مزید کچھ اضافہ ہی چاہتے تھے ان کے خواب کے خدوخال تشکیل پا چکے تھے۔ کام پنجاب کو خالصتان میں تبدیل کرنے کا بچا تھا۔ انھوں نے ایک لائحہ عمل وہ تیار کیا جو جناح صاحب نے ۱۹۴۷ء سے پہلے کے پنجاب میں ایسے ہی مسئلے کے حل کے طور پر پیش کیا تھا یعنی تبادلہ آبادی اور بالکل مسلم لیگ کی طرح سکھ انتہا پسند جانتے تھے کہ پنجاب میں ہندوؤں سے چھٹکارا پانے اور باقی ہندوستان میں رہنے والے سکھوں کو "اپنے وطن" میں واپس لانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے تشدد۔ یہ ایک ایسی حکمت عملی تھی جس کی کامیابی کے لیے وقت درکار تھا در حقیقت ایک دہائی سے زیادہ کا وقت۔ اور اس دوران مسلح رضاکاروں کی پرورش ہوتی رہی۔

مسلمانوں کے خلاف، ہندوؤں اور سکھوں کے مشترکہ محاذ کا زمانہ دونوں کے تعلقات کا نقطۂ عروج تھا جو بہر حال روبہ زوال تھا۔ مگر اس صدی کے نصف اوّل کے اتار چڑھاؤ میں جذبات بدستور رہے۔ دھرم ویرا ۱۹۶۱ء میں پنجاب کے گورنر تھے۔ انھوں نے مصنف کو ۱۹۸۴ء میں ایک گفتگو کے دوران بتایا "پچاس سال قبل جب لاہور میں میری شادی ہوئی تو میرے والدین نے جو پہلی بات مجھ سے کہی وہ تھی امرت سر میں گولڈن ٹیمپل جانے کی اور وہاں جا کر گرنتھ صاحب کے سامنے متھا ٹیکنے کی۔ اس زمانے میں یہ بات بالکل عام تھی کہ ہندوؤں کے خاندان کا ایک فرد سکھ ہو جائے۔ یہ سلسلہ تقریباً ابھی تیس سال قبل اس وقت تک جاری رہا جب ہندوؤں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ سکھوں کی آبادی میں اضافہ خود ان کے مفادات کے لیے براہ راست خطرہ ہے۔

دوسرے الفاظ میں دلوں کی یہ تبدیلی ۱۹۴۷ کے بعد ہوئی جب پنجاب کے مسلمان "اپنے" پاکستان چلے گئے تھے۔ جب ہندو اور سکھ میل جول کی ضرورت کم ہو گئی تھی اور جب نئے تنازعے کی کشاکش کا بوجھ ہر دماغ پر پڑنے لگا تھا۔ اب تاویلیں زیادہ مجبور نہ ہو گئی تھیں۔ بعض سکھوں کا کہنا تھا کہ ہندوؤں نے خود اپنے لیے ایک نہایت حسین اور خوش گوار انتظام کر لیا ہے، سکھوں کے ذمے زمین جوتنے، غلہ اگانے اور دلی اور کابل کے حملہ آوروں سے پنجاب کی حفاظت کرنے کا سخت کام کر دیا گیا ہے، جب کہ خود شہری ہندو، شہروں میں بستے ہیں، اقتصادیات پر قابو رکھتے ہیں، روپیہ قرض پر چلا کر موٹے ہوتے ہیں اور قانون، اور تعلیم جیسے ہلکے ہلکے کام اپنے ذمے رکھتے ہیں اس کے

بدلے میں سکھوں کو ایک نامعتبر امتیاز یہ ملا کہ وہ ہندوازم کے ایک ادنیٰ درجہ کے رکن کہلائے۔ آزادی کے بعد کی سیاست نے اس فرق کو صرف واضح ہی نہیں کیا بلکہ اس نے اس پر تیز دھار رکھ دی۔

سکھوں کی نفسیات کا سب سے اہم عنصر عسکری روح، جسمانی قوت اور اپنی مردانگی پر ایمان ہے۔ اس عقیدے کی بنیاد مسلمان حکمرانوں کے خلاف اپنے وجود کی بقا کے لیے لڑی جانے والی جنگ میں ہے۔ گرو ہرگوبند سنگھ کی دی ہوئی جنگ کی اجازت میں ہے۔ گرو ہرگوبند سنگھ خود بھی دو تلواریں لٹکاتے تھے۔ ان میں سے ایک تلوار ان کی روحانی قوتوں (پیری) کا مظہر تھی اور دوسری دنیا کے لیے لڑی جانے والی جنگوں کے واسطے (میری) اس عقیدے کی بنیاد خالصہ کی تخلیق میں بھی تھی، بندہ بہادر کی لڑی ہوئی جنگوں اور مسلسل جھڑپوں میں اور رنجیت سنگھ کے تحت ایک عظیم سلطنت کے کامیاب قیام میں بھی تھی اور پھر انگریز آئے اور انھوں نے اس خیال کے گرد "عسکری نسلوں" کے نظریے سے دانش ورانہ بیرونی ڈھانچہ بھی کھڑا کر دیا۔ انگریزوں کی نیت بالکل واضح تھی۔ جن لوگوں نے ۱۸۵۷ء میں ان کی سلطنت کی بقا میں مدد کی تھی۔ ان کی توصیف و مدح ہوئی تھی، دوسری طرف دوسرے لوگوں کے جذبات کا پہلے تو مذاق اڑانا تھا اور پھر انھیں یکسر ٹھنڈا کر دینا تھا۔ سکھ "عسکری نسلوں" میں سرفہرست تھے۔

انگریزوں کے نظریات کی قلعی کھولنے والی ایک کتاب "دی مارشل ریسز آف انڈیا" ۱۹۳۲ء میں لیفٹیننٹ جنرل سر جارج میکمن، کے سی بی، کے سی ایس آئی، ڈی ایس او، کرنل کمانڈنٹ آف رائل آرٹیلری نے لکھی تھی۔ اس کو متل پبلیکیشنز، نئی دہلی نے ۱۹۷۹ء میں دوبارہ شائع کیا۔ اس کتاب کے چند اقتباس کافی ہوں گے کیوں کہ یہ خود اپنی وضاحت کر دیتے ہیں "ہندوستان میں دوسرے ہر ملک کے برعکس، غیر عسکری لوگوں کا ہجوم ہے۔ ہندوستان کی عسکری نسلیں کون سی ہیں اور کیا ہیں، اور کس نازک موقع پر کسی آزمائش کی گھڑی میں اور درد کی کس شدت میں ہندوستانی سپاہی کھڑا ہوتا ہے اس سپاہی کو بابا گاندھی (مراد مہاتما گاندھی سے ہے) نے یقیناً جنم نہیں دیا ہے .... ہم برطانیہ کی، عسکری نسلوں کا ذکر وہاں کی غیر عسکری نسلوں سے الگ نہیں کرتے ہیں، نہ جرمنی اور نہ ہی فرانس کا ذکر اس طرح ہوتا ہے، مگر ہندوستان میں، ہم عسکری نسلوں کا اس طرح سے تذکرہ کرتے ہیں گویا وہ عوام کی بڑی اکثریت سے الگ کوئی چیز ہیں کیوں کہ یہاں کے عام لوگوں میں نہ تو کوئی عسکری رجحان ہے اور نہ ہی جسمانی صلاحیت، صلاحیت جسے ہم اپنے روزمرہ میں "گٹس" کہتے ہیں ...... قرض کا موروثی لین دین کرنے والوں کو نیک طبع مگر بے رحم نسل کو جس سے لالہ گاندھی بھی تعلق رکھتے ہیں، کبھی کبھی کھال کھینچ کر یا جلا کر قابو میں رکھا گیا، وہ کبھی بھی خود نہ تو اپنے لوگوں کا تحفظ کر سکے اور نہ انھوں نے کبھی اس کی کوشش کی...... "قاری کو آزادی ہے وہ چاہے جتنی کراہیت محسوس کرے مگر سر جارج تو

'بادشاہ' یا 'پادشاہ' سے متعلق اس عظیم سفید بادشاہ سے متعلق جس کے گورے افسر انھیں (ہندوستان کی عسکری نسلوں کو) بین الاقوامی عظمت دلائیں گے۔ بعض عام سمجھ کر پیش کر رہے تھے اس صورت حال میں اگر آپ کو کچھ غصہ ہو تو اسے ان لوگوں کے لیے محفوظ رکھیے جنھوں نے لالہ گاندھی کی وقتاً فوقتاً کھال کھینچنے اور جلانے کا عظیم کارنامہ انجام دینے پر رضامندی ظاہر کی۔

بہر حال یہی خیال کہ وہ عسکری نسل سے ہیں (اور اس معاملے میں سکھ، راج پوتوں اور پنجابی مسلمانوں میں اپنے جاٹ بھائیوں کی طرح ہی ہیں جن کی اپنے بارے میں یہی رائے ہے) ہتھیاروں کے لائسنس ختم کر دیئے جانے یا کم از کم ان کی آزادانہ تقسیم کے حکومت سے اکالیوں کے باقاعدہ مطالبے کا سبب ہے (سکھوں کو لائسنس صرف بندوقوں کے لیے چاہیے کیوں کہ تلواروں اور خنجروں کے سلسلے میں تو آئین ہند کی دفعہ ۲۵ کی رو سے کرپان لے کر چلنا سکھوں کا بنیادی حق ہے۔ "کرپان رکھنا اور رکھ کر چلنا سکھ مذہبی عقیدے میں شامل سمجھا جائے گا") ہندوستان میں، عسکری نسلوں کے نظریئے کے بارے میں لوگ زیادہ بات نہیں کرتے غالباً اس رویئے کے پیچھے یہ عقل مندی کارفرما ہے کہ بھڑوں کے چھتے کو کیوں چھیڑا جائے مگر اس نظریئے نے سکھ عوامی تحریک میں ایک انتہا پسندی کا عنصر شامل کرنے میں ضرور مدد کی ہے۔ اس عنصر کو مذہبی جواز کی وجہ سے مزید تقویت مل جاتی ہے۔ گرو گوبند سنگھ کی تعلیم تھی کہ دھرم یعنی عقیدے کا تحفظ راج (حکومت) کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے انتہا پسند تشدد پر فخر کرتے ہیں اور اسے اپنے عقیدے اور اپنی روایات کا ایک حصہ کہتے ہیں۔ بہر حال اس اصلی انقلاب کا رنگ، جو پنجاب کی سکھ اکثریت میں، اس صدی کی چھٹی دہائی میں ہوا سرخ نہیں سبز تھا۔

آزاد ہندوستان میں سکھوں کے تجربات کا سب سے دل چسپ منظر، چھٹی دہائی کے آخر اور ساتویں دہائی میں سامنے آیا۔ یہ اثر تھا خوش حالی کا جس نے اس سخت جان کیمونٹی کی مختصر مگر گہما گہمی والی تاریخ میں بڑی ڈرامائی تبدیلیاں رونما کر دیں۔ یہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں زرعی انقلاب کی وجہ سے پیدا ہونے والی دولت ہی تھی جس نے پنجاب کو تیسری دنیا سے نکال کر پہلی دنیا کی راہ پر لگا دیا۔ جن لوگوں نے اس سبز انقلاب کا اہتمام کیا اس میں تامل ناڈ کے ایک کانگریسی سی سبرامنیم تھے جو نہرو کے انتقال کے بعد لال بہادر شاستری کی کابینہ میں وزیر زراعت ہو گئے تھے۔ سبرامنیم کئی برسوں تک سنیر منسٹر رہ چکے تھے۔ ان دنوں ترجیحات خاصی بے محل ہوا کرتی تھیں۔ وزارت زراعت اتنی کم مرتبہ سمجھی جاتی تھی کہ سبرامنیم جیسے سنیر آدمی کے شایان شان تصور نہیں کی جاتی تھی۔ یہ رویہ ظاہر کرتا ہے کہ ایسے ملک میں جو غذا کے معاملے میں پس ماندہ تھا کیا چیز اہمیت رکھتی ہے اور کیا نہیں رکھتی۔ وزیر اعظم

ساتھیوں میں سے کسی کو بھی اس بات کا یقین نہیں دلا سکے کہ وہ وزارت زراعت کی اہمیت کو بڑھانا چاہتے ہیں نہ کہ اپنے ایک ساتھی کو وزیر زراعت بنا کر اس کے رتبے میں کمی۔ آخر میں صرف سبرامنیم ہی نے یہ سمجھ کر نئے وزیر اعظم کی خواہش کیا ہے انھوں نے اس عہدے کو قبول کر لیا اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ غیر معمولی تھا۔ پانچ سال کی مدت میں، بھوکے ہندوستان نے اپنی غذائی پیداوار کا مسئلہ حل کر لیا تھا۔

دوسرے پنج سالہ پلان کے وسائل کو بھاری اور بنیادی صنعتوں میں لگا دیا گیا کیوں کہ آب پاشی کی نئی اسکیموں نے پہلے پنج سالہ پلان یعنی ۵۷-۱۹۵۲ کی درمیانی مدت میں زرعی نشانوں کو حاصل کرنے میں حکومت کی بہت مدد کی تھی مگر وسائل کو زراعت کے بجائے صنعت میں لگانا غلطی بھی ہو سکتی ہے اس کا انتباہ، اس وقت ہوا جب پانچویں دہائی کے آخر میں ملک کو انتہائی بھیانک خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا۔ چھٹی دہائی کے وسط میں ملک دوسرے قحط سے اپنے آپ کو بچا نہ سکا۔ اس بوجھ میں مزید اضافہ، وسائل کو جذب کرنے والی جنگوں کے اخراجات نے کر دیا۔ ایک عام سال میں، غذائی قلت کو پورا کرنے کے لیے دس گیارہ ملین ٹن غذائی اشیاء کی درآمد کرنا پڑی۔ اس کے علاوہ بڑے پیمانے پر بھکمری کو روکنے کے لیے غذائی امداد کی ضرورت پڑی۔ صرف امریکا یہ امداد دے سکا۔ عالی ہمتی اور فیاضی دکھانے کے بجائے امریکی صدر لنڈن جانسن نے ہندوستان کو دبانے اور تنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ سی سبرامنیم نے خود اس حقیقت کو بتایا کہ اس وقت ملک کے سامنے بھکمری اور امریکہ کا طفیلی ملک بننے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ سبرامنیم کے لہجے میں جو خود کوئی بہت بڑے روس دوست نہیں تھے صدر جانسن کے اس رویے کو بیان کرتے وقت بھی تلخی تھی۔ خوراک بہرحال امریکا سے آئی مگر دونوں ملکوں کے تعلقات کو بہتر کرنے کے بجائے اس نے باہمی تلخی کو مزید بڑھا دیا اور جلد از جلد غذائی معاملے میں خود کفیل ہونے کا ہندوستان میں ایک مصمم عزم پیدا کر دیا۔

سی سبرامنیم نے وزیر زراعت ہونے کے فوراً بعد دو فیصلے کیے۔ پہلا تو یہ کہ انھوں نے ہندوستانی سائنس دانوں سے کہا کہ وہ ہندوستان کے خصوصی حالات میں بیجوں اور کھادوں کے میدان میں جدید ترین ٹکنالوجی کو استعمال کرنے سے متعلق اپنی تحقیقی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیں۔ اس سلسلے میں آغاز ۱۹۶۳ء میں اس وقت ہو چکا تھا جب ڈاکٹر این ای بورلوگ نے میکسیکو کی اپنی لیبوریٹریز سے، پنجاب اور مغربی اتر پردیش کے کھیتوں میں تجرباتی طور پر بوئے جانے کے لیے گیہوں کے چھوٹے پودوں کی تقریباً ڈیڑھ سو قسموں کے نمونے یہاں بھیجے تھے۔ لدھیانہ ایگریکلچرل یونیورسٹی اس پروگرام پر پہلے ہی بہت کچھ کام کر چکی تھی مگر یہ سبرامنیم ہی کا عہد تھا جب گیہوں کی ان نئی نسلوں کو بہترین کھاد دیا فراہم

کرکے زبردست فروغ دیا گیا اور یہی نہیں بلکہ گیہوں کی ان نئی نسلوں کی کاشت سے متعلق کسانوں کے لیے تجرباتی مظاہروں کا اہتمام کیا گیا اور ساتھ ہی یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ اگر ان تجربوں میں ان کی فصلیں خراب ہو جائیں گی تو انھیں اس کا پورا پورا معاوضہ دیا جائے گا۔ سکّہ کاشت کاروں نے تجربے کرنے کا حوصلہ دکھایا اور خوش حال ہوئے۔

دوسرا فیصلہ زیادہ متنازعہ فیہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ جب تک ملک کی سستے غلے کی پالیسی بدلی نہیں جائے گی۔ اس وقت تک غذائی پیداوار بڑھ نہیں سکتی ہے۔ انھوں نے چاہا کہ حکومت کسانوں کو یہ یقین دلائے کہ ان کی پیداوار کے لیے گورنمنٹ کی حمایت کی بنیاد پر ایک قیمت ہوگی۔ جو پیداوار میں ان کی لگائی ہوئی لاگت کی واپسی کی بھی ضامن ہوگی اور ایک مناسب منافع کی بھی۔ اس تجویز پر کابینہ میں ہنگامہ مچ گیا کیونکہ اس تجویز میں دوسرے وزیروں کو یہ نظر آیا کہ اس پر عمل درآمد کے نتیجے میں ملک گیر پیمانے پر غلے کی قیمتیں بڑھ جائیں گی۔ جنوبی ہندوستان کے رہنے والے ایک اور وزیر ٹی ٹی کرشنا چاری نے اس تجویز کو ایک ایسی "تباہی" قرار دیا جو شہریوں کو ناراض کردے گی۔ سبرامنیم کا کہنا تھا کہ حکومت کو غذا کے معاملے میں خود کفیل ہونے اور شہری بے چینی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ کابینہ نے وزیر زراعت کی تجویز مان لی۔ غلے کی قیمتوں میں فوری طور پر پندرہ فی صدی کا اضافہ منظور کیا گیا اور قیمتوں کے سارے ڈھانچے پر غور کرنے کے لیے ایک یک نفری (ایل کے جھا) کمیشن مقرر کیا گیا۔ زرعی پیداوار کی قیمتوں سے متعلق ایک کمیشن کی تشکیل ہوئی جو ہر سال زراعتی پیداوار کی اعانتی قیمتیں متعین کرتا ہے۔ خشک سالی اب بھی آتی ہے مگر اب ہندوستان کو غذا کے لیے کاسۂ گدائی لے کر واشنگٹن نہیں جانا پڑتا۔ ایک بُرے سال میں، جب محفوظ ذخائر خالی ہو جاتے ہیں تو ملک بین الاقوامی غلہ منڈیوں میں جاتا ہے۔ نقد رقم دیتا ہے ضرورت کے مطابق غلہ خرید لیتا ہے۔

پارلیمنٹ کے ۱۹۸۴ کے بجٹ سشن میں وزیر زراعت راؤ بریندر سنگھ کے دیے ہوئے بیان کے مطابق ہندوستان میں اناج کی پیداوار ۱۴۰ ملین ٹن تک پہنچ گئی تھی جب کہ ۵۶-۱۹۵۵ میں یہ محض ۶۹٫۳۸ ملین ٹن تھی اور ۶۱-۱۹۶۰ میں ۸۲٫۲۱ ملین ٹن۔ ۶۶-۱۹۶۵ میں خشک سالی کے حالات نے اسے گھٹا کر یعنی ۷۲٫۳۵ ملین ٹن تک پہنچا دیا تھا۔ اگلے سال یعنی ۶۷-۱۹۶۶ء میں پیداوار ۷۴٫۲۳ ملین ٹن یعنی تقریباً اتنی ہی رہی تھی۔ ۶۸-۱۹۶۷ تک، حکومت کی دل چسپی، سائنس دانوں کی کوششیں اور کسانوں کی محنت بڑے ڈرامائی انداز سے رنگ لانے لگی۔ اناج کی پیداوار بے مثال حد تک بڑھ کر ۹۵٫۰۵ ملین ٹن ہوگئی۔ ۷۰-۱۹۶۹ تک تقریباً سو ملین ٹن (۹۹٫۵) کی مقدار کو چھونے لگی اور اگلے سال اس نے بالآخر سو کی گنتی پار کرلی اور بڑھ کر ۱۰۸٫۴۲ ملین

ٹن ہوگئی۔ آر ایک کیسن (انڈیا پاپولیشن، اکانومی سوسائٹی۔ میکملن ۱۹۷۸) اس کامیابی کو ممتاز تاریخ داں ابن خلدون کے ایک اقتباس کی مدد سے بیان کرتے ہیں: "قحط بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کی زمین میں صلاحیت نہ ہونے کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ وہ نتیجہ ہوتے ہیں سیاسی افراتفری اور طبعی زیادتیوں کے، جو دورِ انحطاط میں ملک میں در آتی ہیں۔" ہندوستان کی قسمت کا رخ اب اوپر کی طرف تھا، قحط کی مبارز طلبی کا جواب دیا جا رہا تھا۔

انگریزی تجارتی بیڑے جب پہلی بار ہندوستان کے ساحلوں سے آکر لگے تھے اس وقت یہ ملک وبائی امراض اور قحط سالی کا مترادف نہیں تھا۔ ہم عصر یورپ میں مغل سلطنت ایک داستان بن چکی تھی۔ مغرب والے جس سے کاروبار کرنے اور ایک خوش حال اور متمول طبقۂ اعلیٰ سے کچھ کمانے کی غرض سے ہندوستان آئے۔ برصغیر اپنی کپاس، ریشم اور مصالحوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ اور یہاں کی خوش حالی کی عام سطح بوربن، ٹیوڈر اور تاتاریوں کی ہم عصر سلطنتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اونچی تھی۔ مگر کمزور حکومت، سیاسی افراتفری اور طبعی جبر بڑی تباہیاں لایا۔ قدرت کی تلون مزاجیاں سمجھ میں بھی آتی ہیں اور ان سے نپٹا بھی جا سکتا ہے مگر جابر حکمرانوں کے ظلم کا مقابلہ کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ سیاسی بدنظمی اور ابتری کے ازلی شکار، پنجاب کو قحط اور بیماریاں ہمیشہ ہی گھیرے رہتی تھیں۔ (ہری رام گپتا، ہسٹری آف سکھس، جلد چہارم، منوہر لال پبلشرز ۱۹۸۲) ایک ایسے کو یوں بیان کرتے ہیں: "۱۷۸۱، ۱۷۸۲ اور ۱۷۸۳ء میں بارش بالکل نہیں ہوئی۔ قحط نے سارے شمالی ہندوستان کو متاثر کیا، مگر اس کا سب سے زیادہ اثر پنجاب میں تھا...... ہزاروں مویشی بھوک اور پیاس سے ضائع ہو گئے۔ لاتعداد افراد مر گئے۔ ایک ہم عصر ہرچرن داس کے قول کے مطابق پانچ یا چھ دنوں کے اندر صرف دہلی میں ہزاروں آدمی لقمۂ اجل بن گئے۔ بچے اپنا پیٹ بھرنے کے لیے بیروں کی تلاش میں جنگلوں میں جاتے اور وہ اُن جنگلی جانوروں کا شکار ہو جاتے جو آس پاس کے گاؤوں میں دن کی روشنی میں بھی اِدھر اُدھر گھومتے رہتے تھے...... ایسی بھی کہانیاں سننے میں آئی ہیں کہ والدین نے خود اپنے بچوں کو کھا لیا...... اور اس بات میں تو شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے کہ اس مہلک سال میں بچے کے بدلے مٹھی بھر اناج اچھا سودا سمجھا جاتا تھا۔"

آٹھویں دہائی میں خوراک کے قومی ذخیرے میں اناج کا ساٹھ فی صدی حصہ اکیلے اسی پنجاب نے فراہم کرنا شروع کر دیا۔ اس کی ۲۷۶۸ روپے کی فی آدمی اوسط آمدنی (تمام اعداد و شمار ۸۱-۱۹۸۰ کے ہیں)۔ ہندوستان میں فی آدمی ۱۷۱۵ روپیوں کی آمدنی کے عام اوسط سے کہیں زیادہ تھی صرف ہریانہ اور مہاراشٹر کے اعداد و شمار کچھ کچھ پنجاب کے قریب آتے ہیں۔ ۱۹۵۱ کے بعد سے پنجاب میں فصلوں کی پیداوار میں چھ گنا اضافہ

ہوگیا ریاست کی آمدنی کا ۱۲ر۵۸ فی صدی حصہ زراعت کی دین تھا اور کام کرنے کے لائق لوگوں کی کل تعداد کے ۱ر۵۹ فی صدی لوگوں کو اس پیشے نے روزگار فراہم کر رکھا تھا۔ دھان کی پیداوار جو (۵۱-۱۹۵۰) میں ۸۹۲ کلوگرام فی ہیکٹر تھی وہ تیس سال بعد بڑھ کر ۲۹۵۷ کلوگرام فی ہیکٹر ہوگئی اسی طرح گیہوں جو ۱۹۵۱ میں ۹۰۱ کلوگرام فی ہیکٹر پیدا ہوتا تھا، اب ۲۴۳۲ کلوگرام فی ہیکٹر ملنے لگا تھا۔ پھر خوش حالی خود اپنے جلو میں بے شمار فائدے لائی۔

تعلیم میں اضافہ، کمیت میں بھی نظر آتا ہے اور کیفیت میں بھی۔ مثلاً ۶۸-۱۹۶۷ء میں ابتدائی اسکولوں کی تعداد ۷۱۸۲ تھی جو ۱۹۸۱ء میں بڑھ کر ۱۲۳۸۴ ہوگئی۔ مڈل اسکول ۸۶۳ سے ۱۴۱۰ ہو گئے۔ ہائی اسکول جو ۶۸ء میں ۷۸۹ تھے ۱۹۸۱ میں ان کی تعداد ۲۱۵۸ ہوگئی۔ آرٹس اور سائینس کے کالجوں کی تعداد ۱۹۶۸ میں ۱۷ تھی۔ ان میں بھی اضافہ ہوا۔ یہ ۱۹۸۱ء میں ۱۶۱ ہو گئے۔ اور جہاں تک میڈیکل کالجوں کا تعلق ہے۔ ۱۹۶۸ء میں تو ان کا وجود ہی نہیں تھا لیکن ۱۹۸۱ میں ۸ میڈیکل کالج قائم ہو چکے تھے۔ کسانوں کی ایک معتد بہ تعداد نے اپنے بچوں کو شہر کے اچھے اسکولوں میں بھیجنا شروع کیا۔ خود پنجاب میں انگریزی زبان کے ذریعے تعلیم دینے والے نجی اسکولوں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اور ایک تعلیم یافتہ متوسط طبقہ پیدا ہو رہا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں ۴۵ ہزار بے روزگار گریجویٹوں (ناخواندہ بے روزگار وہاں تھے ہی نہیں) میں سے نصف دیہی علاقوں کے تھے۔ بائیں بازو کے ماہرین اقتصادیات ابھی تک اگرچہ اس بحث میں پڑے ہوئے تھے کہ آیا "سبز انقلاب" نے چھوٹے اور معمولی کسانوں کو مفلس کر دیا تھا اور متوسط درجے اور بڑے درجے کے کاشت کاروں کو سرمایہ داروں میں تبدیل کر دیا تھا مگر کسی ماہر اقتصادیات نے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا کہ بہ حیثیت مجموعی خوش حالی آئی ہے۔ یہ خوش حالی دین تھی انفرادی حوصلوں کی، آبپاشی کے یقینی اہتمام کی اور جدید زرعی سائنس کے حیرت انگیز کارناموں کی۔ پنجاب کا کسان اس لحاظ سے بھی کافی سمجھ دار تھا کہ اس نے اپنی فاضل آمدنی کو تجارت، ٹرانسپورٹ اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں لگایا۔

مگر تموّل اپنے ساتھ اپنے مسائل بھی لایا۔ سب سے بڑا مسئلہ سب سے قدیم مسئلہ تھا یعنی سکھوں کی آبادی کے تناسب کا مسئلہ۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری میں ان کی آبادی ۶۱ فی صدی کے بلند ترین نقطے تک پہنچ گئی تھی مگر وہ پھر پیچھے آنا شروع ہوگئی۔ سکھ لیڈر شپ کو اس سلسلے میں ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے اعداد و شمار سے کسی تصدیق کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ وہ اس زوال کو خود دیکھ سکتے تھے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ خوش حالی، ترک وطن میں اضافہ کر رہی تھی کیوں کہ سکھوں کے پاس اتنے پیسے تھے کہ وہ بیرونی ملکوں میں جا سکتے تھے جہاں بہتر روزگار مہیا تھے۔ آزادی کے بعد کی تین دہائیوں میں صرف سرکاری اعداد و شمار کے مطابق دو لاکھ سے زیادہ سکھ نوجوان ہندوستان سے باہر مستقل طور پر سکونت اختیار کر چکے ہیں۔

بہت سے اور لوگ ڈالر کمانے کے لیے تھوڑے عرصے کے لیے باہر گئے۔

ترکِ وطن ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ قانونی ہی ہو۔ اگرچہ دیہی پنجاب کے قلب میں واقع روڈ جیسا چھوٹا گاؤں بھی اس حقیقت پر فخر کرتا ہے کہ وہاں دو یا تین ٹریول ایجنسیاں ہیں۔ سکھوں کے لیے یہ باہر جانا چیتھڑوں سے کمخواب بلکہ یوں کہیے کہ سوٹ سے فرکوٹ تک کا سوال نہیں تھا۔ خواہشات اور حوصلوں میں تبدیلی آنے کی ایک بہترین مثال جالندھر کنٹونمنٹ کے قریب کے ایک گاؤں سنسار پور میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ گاؤں ہاکی کے لاتعداد ممتاز کھلاڑی پیدا کرنے کی وجہ سے بہت شہرت یافتہ ہے۔ ایک کھلاڑی تربیت دینے والے نے روشن آنکھوں والے بچوں کو تربیت دے دے کر انھیں اپنی جانشینی کے لائق بنا دیا۔ اولمپکس میں شریک ہونے والے بیس سے زیادہ ہاکی کھلاڑی اسی گاؤں سے آئے تھے۔ ہاکی کا کھیل شہرت کے ساتھ ساتھ اتنی دولت کا ذریعہ بنا کہ آرام دہ گھر بنایا جا سکے۔ مزید یہ کہ سرکاری نوکری، سرحدی حفاظتی فوج، پنجاب پولیس یا ریلویز میں نوکری کی بھی ضمانت ہوتی۔ ہاکی کے عظیم ہندوستانی کھلاڑیوں میں سے ایک بلبیر سنگھ (جونیئر) نے مصنف کو کسی قدر تاسف کے ساتھ بتایا تھا کہ اب کوئی بھی ہاکی نہیں کھیلنا چاہتا۔ اب سب لوگ یورپ میں کسی کام کا خواب دیکھتے ہیں کیونکہ وہاں کے کام کے بعد بڑی سی کار ہے، شان دار مکان ہے اور یقیناً ایک گوری میم۔ گاؤں کے ایک آدمی نے یہی بات ذرا مختلف انداز سے یوں کہی تھی کہ آٹھویں دہائی میں سب سے قیمتی چیز جو پنجاب سے برآمد ہو رہی ہے وہ ہے یہاں کا مرد۔

اس کے برعکس دوسری طرف ریاست کی خوش حالی کی کشش سے کھنچ کر بڑی تعداد میں ہندو پنجاب آ رہے تھے۔ کھیت پر کام کرنے والے مزدوروں کی ضرورت غیر معمولی حد تک بڑھ گئی تھی۔ دستیاب سکھ اور مقامی ہندو (جن میں زیادہ تر اچھوت تھے) مزدور سب کے سب روزگار سے لگے ہوئے تھے۔ مزید ضرورت سے پیدا ہونے والے خلا کو ہندوستان کے نسبتاً غریب علاقوں جیسے اتر پردیش، بہار اور مدھیہ پردیش سے آنے والے لوگوں نے پُر کیا۔ ۱۹۸۱ء تک ان باہر سے آنے والوں کی تعداد کھیتوں پر کام کرنے والے کل مزدوروں کی تعداد کے ۲۳٫۷ فی صدی حصے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ ان فصلی مزدوروں کا ایک معتد بہ حصہ اگرچہ بووائی یا کٹائی کے کاموں کے بعد اپنے اپنے گاؤں کو لوٹ جاتا ہے، مگر اچھے خاصے ایسے بھی ہوتے ہیں جو پنجاب کو اپنا نیا گھر بنانے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اپنے آبائی گاؤں جانے کے لیے کوئی ترغیب بھی نہیں ہوتی کیونکہ وہاں یہی نہیں کہ انتہائی افلاس ہوتا ہے بلکہ سماجی تناؤ بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ سکھ اعلیٰ طبقے کے ہندوؤں کے مقابلے میں ذات پات کے امتیاز کو نسبتاً کم محسوس کرتا ہے۔ پنجاب میں یہ رشتہ مالک اور مزدور کا تھا اور ذات پات کو ماننے اور برتنے والی ریاست بہار کے برخلاف جہاں یہ رشتہ مالک اور جانور جیسا ہوتا

ہے۔ یہاں ان دونوں کے درمیان نسبتاً زیادہ انس اور گرم جوشی پائی جاتی تھی۔

آبادی اور بستیوں کے توازن کو جو ہمیشہ ہی متلون رہا تھا، ایک بار پھر خطرہ تھا کہ سکھوں کے خلاف رخ نہ اختیار کر جائے۔ آٹھویں دہائی تک سکھ خود اپنی ریاست میں آبادی کا ۵۲ فی صدی تھے اور یہ مسئلہ نئی خوش حالی اور امن کے نتیجے کے طور پر ایک دوسرے مسئلے کی وجہ سے مزید پیچیدہ ہو گیا تھا۔

دوسرا خطرہ جو سکھوں کے سامنے آ رہا تھا وہ تھا شناخت کا جو نئے اثرات کی ہانڈی میں پک رہا تھا اس دفعہ دوش ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھی نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ اس دفعہ سبب تھا عموری دور کی صنعت اور جدیدیت، وہ چاہے مفید ہو یا تباہ کن، کے اثرات۔ اگر سکھ نوجوان، نودریافت عیش اور دولت کی وجہ سے نشہ آور دواؤں اور شراب کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں (ہندوستان میں آئینی طور پر جائز پھلتی پھولتی صنعت ہے۔ شراب کی اور حشیش پاکستان میں غیر آئینی مگر ترقی کرتی ہوئی تجارت ہے) تو یہ کسی دوسرے کی غلطی نہیں تھی۔ لہراتی ہوئی داڑھیاں بھی اب نسبتاً کم نظر آنے لگی تھیں۔ سکھوں کی کافی بڑی تعداد اب اپنے بالوں کو کٹانے کا آسان طریقہ اپنا رہی تھی۔ صورتِ حال بیچ کی تھی، نہ بالکل صاف شیو اور نہ ہی آزادانہ نشوونما۔ مگر رجحان بالکل واضح تھا۔ پنجاب جانے والا ہر شخص خود دیکھ سکتا تھا کہ آٹھویں دہائی میں ترشی ہوئی داڑھیاں اتنی ہی عام ہو گئی تھیں جتنی کہ وہ کسی زمانے میں عنقا تھیں۔ یہ تبدیلی گاؤوں تک میں ہو رہی تھی۔ خطرے کی گھنٹی ایک بار پھر سنائی دینے لگی تھی۔

اور اس گھنٹی کو سب سے زیادہ زور سے بجانے والے، قدرتی طور پر، اکالی تھے جن کے نزدیک وجود کا جواز ہی خصوصی خالصہ شناخت کا باقی رہنا تھا۔ بہرحال اکالی ایک مذہبی تحریک کا سیاسی بازو تھے اور عقیدے کی ذرا سی بھی کمی اور ارتداد کا شائبہ بھی بڑی بنیادی سطح پر چوٹ پہنچا سکتا تھا یہاں تک کہ گاؤوں کے جاٹ سکھ جنھوں نے ہمیشہ اکالیوں کو ووٹ دیا تھا ان نئے رجحانات سے متاثر ہو رہے تھے۔

آزاد ہندوستان نے، سکھوں کی خوش حالی کو زراعت تک محدود نہیں رہنے دیا۔ وہ اگرچہ ملک کی آبادی کا صرف دو فی صد حصہ ہیں مگر مرکزی حکومت کی ملازمتوں میں ان کا تناسب، وہاں کے تمام ملازمین کی تعداد میں آٹھ فی صدی ہے انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس میں (پرانے آئی سی ایس، امپیریل انڈین سول سروس کا بدل) براہ راست منتخب کیے گئے چار ہزار افراد میں ۲۵۶ یا (یا ہر سولہ میں ایک) افراد سکھ ہیں، اسی طرح انڈین پولیس سروس میں، ۱۵۲۷ افراد میں اکیاسی افراد سکھ ہیں۔ ہماری فوج میں آج بھی سکھوں کی تعداد ۷٫۵ فی صدی سے کچھ زیادہ ہی ہے اس وقت جب کہ یہ تحریر لکھی جا رہی ہے، صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ، ہوائی فوج کے چیف دلباغ سنگھ اور ریزرو بینک کے گورنر منموہن

سنگھ، سب سکھ ہیں۔ تجارت اور کاروبار میں بھی ملک کے دوسرے لوگوں کے ساتھ سکھوں نے بھی اپنا ایک اہم مقام بنالیا ہے۔ اوران کا پانچواں حصہ پنجاب سے باہر رہتا ہے اور خوش حالی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ملک کی دوسری اقلیتیں، اگر ایسے اعداد و شمار ان کے بارے میں مل جائیں تو بہت کچھ نثار کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ صدارت کے اس رسمی عہدے کے لیے باری باری مختلف لوگوں کو منتخب کرنے کی جو پالیسی ہے اس کی وجہ سے مسلمانوں کو بھی اس عہدے تک پہنچنا نصیب ہوتا ہے مگر جہاں تک حقیقی طاقت (اقتدار) انتظامیہ صنعت یا تجارت کی بات ہے اس کا سکھوں سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ اسی لیے یہ حلقہ ایک اہم اور بااثر حلقہ ہے جس کو سکھ کٹرپن سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ حلقہ یا گروہ اکالیوں کے وجود کو صرف اس حد تک مانتا ہے کہ یہ پارٹی دباؤ ڈالنے والے گروپ کی حیثیت سے مفید ہو سکتی ہے یا پھر کسی حقیقی بحران کے وقت اس کا سایہ ایک نعمت ثابت ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد معتدل اکالی ہیں۔ ہندوستان کی جغرافیائی سالمیت خالصہ شناخت اور مذہب کے لیے وقف۔ مگر پنجاب جیسے صوبے میں جمہوریت کے تضادات اور دشواریوں کے پیش نظر سیاسی قوت کیوں کر حاصل کی جائے۔ اس کے بارے میں غیر یقینی۔ مذہبی نظریات اور جمہوری عقائد کی درمیانی پھسلواں زمین پر چلنا اکالیوں میں الجھن، جلد بازی اور پھر مایوسی پیدا کر دیتا ہے۔ اور ان کی چرب زبانی اور لفاظی اپنی قیمت کا مطالبہ کرنے لگتی ہے۔ سکھ عقائد رکھنے والوں کا آخری گروہ ظاہر ہے انتہا پسندوں کا ہے جو سکھوں کو ہندوستان سے الگ لے جانا چاہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ بندوق کے زور اور پاکستان کی تھوڑی سی مدد پر ایسا کر سکتا ہے۔ اس گروہ کو ایک فوقیت اس اعتقاد کی صورت میں حاصل ہے جو سیدھے سادے، صاف اور سرفروشی کا جذبہ رکھنے والوں کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ لوگ سوچتے نہیں اور اسی لیے باقی ہیں۔



(۱۰)

خالصتان کی تلاش میں

یہ کیمبرج کے پڑھے ہوئے ایک صاحب تھے۔ چودھری رحمت علی جنھوں نے پہلی بار برصغیر میں ایک مسلمان ملک کی، جو پاکستان کہلائے گا، تجویز رکھی تھی۔ اور یہ آکسفورڈ کے ایک طالب علم کپور سنگھ تھے جن کی پیدائش ۱۹۰۹ء میں ہوئی تھی، آئی سی ایس کے لیے ان کا انتخاب ہوا تھا اور پھر، بعض الزامات کی بنا پر ان سے ریٹائر ہونے کی درخواست کی گئی تھی۔ انھوں نے چھٹی دہائی میں، سکھوں کو ان کے مجوزہ آزاد ملک خالصتان (پاک لوگوں کا ملک اور خالص قوم) کے بارے میں یاد دہانی کرانا شروع کی۔ ۱۹۴۱ء میں پنجاب کے (وزیراعلیٰ) وزیراعظم سر سکندر حیات خاں نے پنجاب کی لیجس لیٹو اسمبلی میں، نظریۂ پاکستان پر اعتراضات شروع کیے تو چودھری رحمت علی کی اسکیم سے متعلق ان کے طنزیہ جملوں پر ایوان کے تمام حصوں سے قہقہوں کی آواز آئی تھی۔ چھٹی اور ساتویں دہائی میں کپور سنگھ کے خیالات کی تواضع بھی کچھ اسی طرح ہوئی وہ لوگ جو سیاسی مقابلے کے بجائے طنز کو ترجیح دیتے ہیں انھوں نے خالصتان کے معنوں میں لطف کا پہلو ڈھونڈ نکالا ہندی میں خالی کا مطلب ہوتا ہے جس میں کچھ نہ ہو اور استھان کے معنی ہوتے ہیں جگہ کے۔

اکالی دل ماسٹر تارا سنگھ نے مئی ۱۹۶۵ اور دسمبر ۱۹۶۶ میں دو تجویزیں منظور کیں جن میں جمہوریہ ہند کے دائرے کے اندر ایک خود مختار حیثیت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ تجویز میں جمہوریہ ہند کا تذکرہ بڑا ملکا پردہ تھا۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں جب برصغیر پاکستان میں ہیجان کے عروج پر پہنچنے کے ساتھ ایک ڈرامائی کیفیت سے گذر رہا تھا، اسلام آباد نے خود دہلی کے ساتھ سیاسی شطرنج کی بازی کھیل رہا تھا، ہندوستان کی دور رس چالوں کے مقابلے کے لیے پنجاب میں کچھ پیادوں کو آگے بڑھا دیا۔ اکالی دل کے ایک سابق سکریٹری اور ایک قلیل مدت کے لیے ہونے

والے پنجاب کے وزیر مالیات ڈاکٹر جگجیت سنگھ چوہان نے، جو تارا سنگھ گٹ کی عسکری آواز بن گئے تھے (ماسٹر تارا سنگھ کا انتقال ۱۹۶۸ میں ہو گیا اس کے بعد ان کے کام کو ان کے شاگردوں نے آگے بڑھایا) اب ملک چھوڑ دیا، برطانوی پاسپورٹ حاصل کیا اور گرو نانک کی جائے پیدائش اور ننکانہ صاحب میں جو پاکستان میں تھا ایک "باغی سکھ حکومت" کے قیام کے ایک منصوبے کا اعلان کر دیا۔ (مشرقی پاکستان میں مارچ کے مہینے کی فوجی کارروائی کے بعد ۱۹۷۱ میں دہلی، ہندوستانی علاقے میں بنگلہ دیش کی ایک باغی حکومت کی یقیناً حمایت کر رہا تھا) ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو دی نیویارک ٹائمز میں ڈاکٹر چوہان نے نصف صفحہ کا اشتہار شائع کرایا جس میں ڈاکٹر صاحب نے ان اسباب کی وضاحت کی تھی کہ وہ خالصتان کیوں چاہتے ہیں۔ ان میں سے ایک سبب کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ یہ تھا فوج میں سکھوں کا حصہ۔ سکھ لیڈر فوج میں بھرتی سے متعلق حکومت ہند کی نئی پالیسی سے بہت پریشان تھے اس نئی پالیسی کا اعلان ۱۹۷۴ء میں وزیر دفاع جگ جیون رام نے کیا تھا اور جس میں بھرتی میں آبادی کے لحاظ سے تناسب کو مدنظر رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ پنجاب کا حصہ ۲٫۵ فی صدی تھا اور جمہوری ہندوستان نے بالآخر فوج کی ملازمتوں میں "عسکری نسلوں" کی قومیت کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

پنجاب میں ۱۹۶۷ء کے بعد کی سیاسی اتھل پتھل، اکالیوں کے لیے کسی حد تک تلخ تجربہ ثابت ہوئی تھی۔ اس اتھل پتھل نے اکالیوں پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ ضروری نہیں کہ طاقت و اختیار ایک کامیاب سیاسی تحریک کا ناگزیر اجر ہو۔ آٹھویں دہائی میں سکھوں کے تذبذب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی مایوسی اور ناامیدی کے حقیقی سبب یعنی انتخابات جیتنے میں دشواری، اور اگر جیت لیں تو پھر حکومت کو قائم رکھنے میں ان کی پریشانی کو سمجھ لیا جائے۔

سارے شمالی ہندوستان میں امرت سر سے کلکتے تک مسز اندرا گاندھی کی پہلی شکست ۱۹۷۷ کی ایمرجنسی کے بعد نہیں ہوئی تھی جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، ان کی اصل شکست ٹھیک دس سال قبل ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں ہوئی تھی۔ عظیم سوشلسٹ لیڈر اور نظریہ ساز ڈاکٹر رام منوہر لوہیا مسز اندرا گاندھی کی اس شکست کے اصلی محرک تھے۔ انھوں نے حزب اختلاف کے تمام لوگوں سے یہ کہا کہ انھیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ اکیلے کبھی بھی کانگریس کو ہرا نہیں سکتے، کانگریس منقسم رائے شماری میں ہمیشہ سرخرو ہو کر نکلے گی، انھوں نے ایک حلقہ انتخاب سے حزب اختلاف کے صرف ایک نمائندے کو کھڑا کرنے کی تجویز پیش کی، اس حکمت عملی نے کام کیا۔ کانگریس کسی نہ کسی طرح مرکز میں حکومت بنانے میں کامیاب ہوئی اس کی کامیابی زیادہ تر جنوب کی ریاستوں آندھرا پردیش اور کرناٹک میں اور مغربی ریاست مہاراشٹر میں زبردست کامیابیاں حاصل کرنے کی وجہ سے ہوئی لیکن چنڈی گڑھ، شملہ، جے پور، لکھنؤ،

بھوپال، بھونیشور، پٹنہ اور کلکتہ میں متعدد مختلف پارٹیوں نے جلدی جلدی متحدہ محاذ کی حکومتیں قائم کرنے کا بندوبست کرلیا۔ اپنی صلاحیتوں کو ثابت کرنے کا مخالف پارٹیوں کے لیے یہ بہترین موقع تھا مگر انھوں نے یہ موقع گنوا دیا۔ ۷۲-۱۹۷۱ میں دوبارہ برسر اقتدار آنے کا زمانہ کانگریس نے مخالف جماعتوں کی ان متحدہ محاذوں کی مشترکہ حکومتوں سے دل بدلی، اور غیر کانگریسی جماعتوں کی ساکھ کو ختم کرنے کا کھیل بڑی کامیابی کے ساتھ کھیلنے میں صرف کیا۔ صرف ایک جگہ جہاں کانگریس اس کھیل میں کامیاب نہ ہوسکی وہ تھی جنوبی ہندوستان کی ریاست تامل ناڈو جہاں ڈی ایم کے نے کانگریس کو بالکل کچل کر رکھ دیا تھا۔ اور خود ایک غیر متنازعہ فیہ متبادل کی طرح سامنے آئی تھی۔

سکھ اکالی دل، ہندو جن سنگھ، اور دہریہ کمیونسٹوں کے درمیان موجود سخت نظریاتی اختلافات کے پیش نظر پنجاب کی ان اہم مخالف پارٹیوں کے مابین الیکشن سے قبل یک جہتی اور اتحاد دشوار تھا اور ان سب کے اوپر باہمی اختلافات کی پیدا کی ہوئی باہمی تلخی تھی۔ اکالی سنت فتح سنگھ اور ماسٹر تارا سنگھ کے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے یہاں تک کہ کمیونسٹ بھی، مارکسسٹ کمیونسٹوں کے نام سے اصل پارٹی سے الگ ہو گئے تھے۔ سنت فتح سنگھ کے گروہ کے اکالیوں نے الیکشن سے قبل صرف کمیونسٹوں کے ساتھ نشستوں کے سلسلے میں مفاہمت کی راہ نکال لی تھی۔ کانگریس نے اگرچہ انتخابات میں سب سے زیادہ یعنی ۳۷٫۶ فی صدی ووٹ حاصل کیے تھے مگر وہ ۱۰۴ نشستوں میں سے صرف ۴۸ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکی۔ سکھ اگرچہ آبادی کا ۵۶ فی صدی حصہ تھے مگر دونوں اکالی گروپوں نے بحیثیت مجموعی محض ۲۵ فی صدی ووٹ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ حسب معمول، اعتدال پسند اکالیوں کو اچھا خاصا حصہ ملا۔ ۲۰٫۴۶ فی صدی ووٹ اور ۲۴ نشستیں ماسٹر تارا سنگھ کے گروپ کو صرف دو نشستیں حاصل کرنے پر اکتفا کرنی پڑی۔ جن سنگھ نے جو ہندو انتہا پسندوں کی نمائندگی کررہی تھی صرف ۹٫۸۵ فی صدی ووٹ حاصل کیے۔ کمیونسٹوں کا حصہ محض ۹ فی صدی رہ گیا اور دونوں گروپوں نے مل کر آٹھ نشستیں جیتیں۔ پانچ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اور تین کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ) نے۔

منشوروں میں اختلافات کے باوجود، مخالف پارٹیوں نے ایک متحدہ محاذ بنالیا اور سنت اکالی دل کے گرنام سنگھ کو (ایک بیرسٹر جو ۱۹۵۹ء میں پنجاب ہائی کورٹ کے ایک جج کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے) وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے منتخب کیا اور ۸ مارچ ۱۹۶۷ء میں وزارت قائم کرلی۔

نفاست پسند لیڈر گرنام سنگھ ہندوستانی متحدہ محاذ کی سیاست کی ہنگامہ خیزی کو سمجھنے اور اس پر قابو پانے میں بالکل ناکام ثابت ہوئے۔ حرص و ہوس اور ذاتی مفادات نے بھی اپنا کام کیا۔ مثلاً اس بات پر ناراض ہو کر انھیں

منسٹر نہیں بنایا گیا اکالی دل کے نائب صدر ہرچرن سنگھ ہڑایارا نے پارٹی سے استعفا دے دیا۔ کانگریسی لیڈر گیان سنگھ راڑیوالا نے بھی نہایت آسانی کے ساتھ اس ساجھے کی ہانڈی کا ستیاناس کیا۔ انھوں نے ماسٹر تارا سنگھ گروپ کے کٹر لیڈروں کو جن کی قیادت لچھمن سنگھ گل کر رہے تھے اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اس متحدہ محاذ کو چھوڑ کر لیجس لیٹو اسمبلی میں کانگریس کی مدد سے ایک نئی حکومت کی تشکیل کریں۔ ماسٹر تارا سنگھ اپنے ایک شاگرد کی سربراہی میں چلنے والی پہلی حکومت کو دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے۔ وہ ۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء کو گل کے حلف لینے کے محض تین دن قبل انتقال کر گئے۔ گل حکومت نے پنجابی کو سرکاری زبان بنا دیا۔ وہ بڑے فخر سے کہتے تھے کہ یہ کام مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی نہیں کر سکے تھے۔ (سوال یہ ہے کہ کیا رنجیت سنگھ نے ایسا چاہا بھی تھا) مگر جلدی ہی کانگریس نے اس حکومت سے جس کے قیام میں اس نے مدد کی تھی حمایت کرنے کا عہد توڑ لیا۔ خندی لچھمن سنگھ گل نے مستعفی ہونے سے انکار کر دیا۔ اسمبلی میں تشدد ہوا اور دہلی نے ۱۳ اگست ۱۹۶۸ کو وسطی مدت کے انتخابات ہونے تک گورنر راج کا نفاذ کر دیا۔ اگر اس سب کو پڑھنے کے بعد قاری ایک دم پریشان ہو جائیں تو اس پر متعجب ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ یہی کیفیت لوگوں کی پنجاب میں تھی۔

۱۹۶۹ کے انتخابات کے لیے اکالیوں نے ایک مختلف حکمت عملی اختیار کی۔ وہ جن سنگھ کے شہری ہندوؤں کے ساتھ تو مصالحت کر سکتے تھے مگر ان کمیونسٹوں کے ساتھ وہ کوئی معاہدہ نہیں چاہتے تھے جو سکھ کسانوں کی حمایت کے معاملے میں ان کے حریف تھے۔ اکالی گٹھ جوڑوں کا ارتقا بہت دلچسپ ہے یہ پانچویں دہائی میں کانگریس سے شروع ہوا۔ کانگریس کے بعد ۱۹۶۷ء میں کمیونسٹ دوستی کے قابل سمجھے گئے اور اب اکالی اپنے سب سے زیادہ کٹر دشمن جن سنگھ سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ مگر موخرالذکر سے گٹھ جوڑ سب سے زیادہ منطقی گٹھ جوڑ تھا کیوں کہ ان کے حمایتی حلقوں کے سلسلے میں کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ اکالی ہندو ووٹ کبھی حاصل نہیں کر سکتے تھے اور اسی طرح جن سنگھ بھی سکھ کسانوں کی حمایت کی توقع کبھی نہیں کر سکتی تھی۔ دو فرقہ پرست جماعتیں اپنے اپنے فرقوں کی واحد نمائندہ بننے کے لیے کوشاں تھی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کانگریس کو، جسے ہندوؤں اور سکھوں دونوں کی حمایت حاصل رہتی تھی ختم کرنا ناگزیر تھا۔ یہ گرنام سنگھ تھے جو ۱۹۶۹ء میں ایک بار پھر وزیر اعلیٰ ہوئے۔

ہندوستانی سیاست میں یہ ایک ڈرامائی سال تھا۔ مسز گاندھی نے سرکاری کانگریس پارٹی سے اپنا ناطہ توڑا، صدر جمہوریہ کے بالواسطہ انتخاب میں خود اپنا امیدوار کھڑا کیا اور کچھ ایسی ہوشیاری سے کام کیا کہ ان کا امیدوار بہت کم اکثریت سے ہی سہی بہرحال کامیاب ہوا۔ مسز گاندھی کو گرنام سنگھ سے اہم اور انتہائی اہم مدد ملی۔ اس کے بدلے میں

اکالیوں کو چنڈی گڑھ سونپ دیا گیا۔

جب ۱۹۶۶ میں پنجاب تقسیم ہوا تھا، راج دھانی چنڈی گڑھ کے شہر (جس کے ڈیزائن کرنے والوں میں دوسرے لوگوں کے ساتھ LeCorbusier بھی ہیں) کی قسمت کا فیصلہ اس وقت تک ہریانہ کی نئی ریاست خود اپنی راجدھانی تعمیر نہ کرلے التوا میں رکھا گیا تھا۔ اکالی انتظار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۶۶ کو سنت فتح سنگھ نے دھمکی دی کہ اگر چنڈی گڑھ فوراً حوالے نہ کیا گیا تو وہ آگ میں جل کر اپنی جان دے دیں گے۔ بہرحال انھوں نے اپنی اس دھمکی پر عمل نہیں کیا لیکن ۱۹۶۹ء میں جنگِ آزادی کے ایک سکھ سپاہی درشن سنگھ پھیرو مل نے چنڈی گڑھ کے ٹرانسفر کے لیے ۷۴ دن کا برت رکھا اور ۲۷ اکتوبر کو مر گئے۔ ان کی اس موت نے ان تمام سنتوں کو نادم و شرمسار کر دیا جو اکثر شہادت کا نعرہ لگایا کرتے تھے۔ عوام کے موڈ اور ان کے جذبات کو بھانپتے ہوئے چنڈی گڑھ کو پنجاب کے حوالے کرنے کی خاطر دلی پر دباؤ ڈالنے کے لیے سنت فتح سنگھ نے یوم جمہوریہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۰ء کو ایک بار پھر مرن برت شروع کر دیا۔ برت شروع ہوئے ابھی تین ہی دن ہوئے تھے کہ مسز گاندھی نے ایک اوارڈ کا اعلان کر کے سنت کو بچالیا۔ اوارڈ تھا پنجاب کو چنڈی گڑھ ملے گا اور ہریانہ کو معاوضہ کے طور پر فاضلکا اور ابوہر کے اضلاع کے کچھ حصے اور خود نئی راج دھانی بنانے کے لیے دس کروڑ روپیہ۔ الوارڈ کا نفاذ جنوری ۱۹۷۵ء تک ہونا تھا۔ وزیراعلیٰ گُرنام سنگھ اور سنت فتح سنگھ دونوں نے دعویٰ کرنا شروع کیا کہ یہ ان کی ذاتی کوشش تھی جس سے یہ جیت حاصل ہوئی۔ گرنام سنگھ کا کہنا تھا کہ یہ سب کچھ اس حمایت کی وجہ سے ہوا جو انھوں نے صدارتی انتخاب میں مسز اندرا گاندھی کو اکالیوں سے دلوائی اور جس کے لیے ساری بھاگ دوڑ انھوں نے کی۔ دوسری طرف سنت فتح سنگھ کہتے تھے کہ مسز اندرا گاندھی نے ان کی مرجانے کی دھمکی سے خوف زدہ ہوکر یہ فیصلہ کیا ہے۔ (یہ فتح بہرحال کوئی نفع کا سودا نہیں ثابت ہوئی۔ ۱۹۷۵ء کا جنوری کا مہینہ آیا اور گذر گیا مگر چنڈی گڑھ پنجاب کو نہیں ملا) مذہبی لیڈروں سے جھگڑا کرانے کی گرنام سنگھ کو قیمت ادا کرنی پڑی۔ وہ پارٹی سے نکال دیے گئے۔ ۲۷ مارچ ۱۹۷۰ کو اکالی دل اور جن سنگھ کی ایک اور مخلوط وزارت نے حکومت سنبھالی، اس کے سربراہ سنت فتح سنگھ کے نامزد کیے ہوئے پرکاش سنگھ بادل تھے۔ بادل نے کاشت کاروں کو خوش کرنے کی کوششوں کو تیز کیا۔ اکالیوں نے پانچ ایکڑ تک زمین کی ملکیت کو لگان سے مستثنیٰ کر دیا۔ اناج کی خریداری کی نسبتاً زیادہ قیمت کی ضمانت کا رواج ڈالا۔ (جن سنگھ کے اپنے ساتھیوں کی سراسیمگی کے باوجود، جنھیں ساہوکاروں اور تاجروں کی اچھی خاصی حمایت حاصل تھی) غلے کی خرید و فروخت میں بچولیے کے وجود کو ختم کیے جانے کا مطالبہ کیا۔ اقتدار کے زمانے میں اکالیوں کا مزاج

یقیناً انتہائی معقول رہا۔ ان کی یہ خصوصیت ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۰ء کے درمیان جب تیسری بار وہ حکومت میں آئے اس وقت بھی نظر آتی تھی۔ جب ۱۹۷۸ء میں ایک سکھ لیڈر رہنمنت سیوا داس نے چنڈی گڑھ کے لیے برت رکھا تو اکالی لیڈروں نے یہ کہہ کر کشمکش کو دبا دیا کہ برت سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے خطرہ پیدا ہو جائے گا۔

بادل کی کسان دوست اقتصادی پالیسی کے باوجود ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۲ء کے انتخابات میں اکالی یکسر صاف ہو گئے مسز گاندھی کی کانگریس نے "غریبی ہٹاؤ" کے اپنے پرکشش نعرے کی مدد سے پنجاب میں لوک سبھا کی بارہ نشستوں میں سے گیارہ اور ریاستی اسمبلی کی ۱۰۴ سیٹوں میں ۶۶ سیٹیں جیت لیں۔ پھر آ گئے وہیں پر چلے تھے جہاں سے ہم، یعنی وہی پرانا مسئلہ پھر سامنے تھا۔ خالصہ رہنماؤں کو جب بھی کبھی حکومت میں وزارتیں نہیں ملتیں وہ سکھ وطن کے بارے میں، کہ جہاں ان کی وزارتوں کو انتخابی شکست سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا، بھیانک امکانات کی تبلیغ شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح اکتوبر ۱۹۷۳ء میں وہ مشہور اور متنازعہ فیہ ریزولیوشن آیا جو آنند پور صاحب ریزولیوشن کے نام سے جانا جاتا ہے۔

سکھوں کے نویں گرو تیغ بہادر کی جان کو سب سے پہلا خطرہ مغلوں سے یا ان کے بدنام ترین بادشاہ اورنگزیب عالمگیر کی طرف سے نہیں آیا بلکہ یہ خود سکھوں کی طرف سے پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں بڑا غلط مبحث تھا کہ آیا پچھلے گرو ہری کشن نے اپنے تایا ــــــــــ (یا بابا بکالے) کو اپنی موت کے وقت اپنا جانشین مقرر کیا تھا یا نہیں گرو ہری کشن کا انتقال چیچک کے مرض میں مبتلا ہو کر ہوا تھا وہ اس وقت اورنگ زیب کی فوج کے انتہائی اہم جنرل مرزا راجا جے سنگھ کی دلی میں قیام گاہ پر مقیم تھے (گرودوارہ بنگلا صاحب اسی جگہ پر تعمیر ہوا ہے) گرو کے اعزاز کے دعوے دار دو رشتے دار دھیر مل اور رام راج بھی تھے۔ اول الذکر نے گرو تیغ بہادر کو مارنے کی کوشش بھی کی۔ گرو اپنے قتل کے متمنی رشتہ داروں سے تو بچ گئے مگر اپنے باپ کے بنائے ہوئے شہر امرت سر یا کرتارپور میں اپنے حامی پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انھوں نے کرتار پور کے شمال میں تقریباً پانچ میل دور ایک پہاڑی خرید لی اور وہاں خود اپنی راج دھانی بنائی۔ اس کا نام انھوں نے آنند پور رکھا۔

مگر داخلی جھگڑوں نے گرو تیغ بہادر کو آنند پور چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے مشرق کی طرف آسام تک کا سفر کیا۔ اسی دوران اورنگ زیب کے اندر کا تعصب سرگرم ہو چکا تھا۔ تمام ان لوگوں نے اذیتیں اٹھائیں جنھوں نے اس کے خصوصی مسلک کو نہیں مانا (مثال کے طور پر مسلمانوں کا شیعہ فرقہ بھی نشانہ تھا۔) اورنگ زیب نے اپنی زندگی کے بارہ سال سے زیادہ کا عرصہ دکن کی مسلم سلطنتوں سے جنگ کرنے میں گزارا۔ ان سلطنتوں کے سربراہ شیعہ تھے) گرو تیغ بہادر پنجاب واپس آئے یہاں انھیں ایک مسلمان صوفی فقیر حافظ آدم میاں جو شیخ احمد سرہندی کے سلسلے کے تھے

کے بیٹے اپنا ایک رفیق نظر آیا دونوں نے مل کر مغل بادشاہ کے خلاف ایک عوامی بغاوت کو دبا دیا اور گرو تیغ بہادر کو آگرہ میں گرفتار کر لیا۔ انھیں موت کی سزا ہوئی۔ اور ۱۱ نومبر ۱۶۷۵ء کو دہلی میں اسی جگہ پر جہاں آج گرودوارہ سیس گنج ہے، ان کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ ان کے جسد خاکی کو دہلی میں اس جگہ نذر آتش کر دیا گیا جہاں آج پارلیمنٹ ہاؤس کے عقب میں گرودوارہ رکاب گنج بنا ہوا ہے ان کے کٹے ہوئے سر کو نذر آتش کرنے کے لیے ان کے بیٹے اور جانشیں گرو گوبند آنند پور صاحب لے گئے۔

آنند پور صاحب، دوسرے الفاظ میں، ایک شہر جس میں سکھوں کے لیے اشاریت اور علامتوں کی بھرمار ہے خصوصًا دہلی کے خلاف جنگ کا نعرہ بلند کرنے والے سکھوں کے لیے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں گرو گوبند نے قلعوں کا اپنا پہلا سلسلہ قائم کیا۔ یہ آنند پور ہی تھا جہاں انھوں نے خالصہ کے اپنے نئے فرقہ کی ابتدا کی اور پھر سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا دفاع کیا، پہلے ہم نوا ہندو راجپوت سرداروں کے حملوں سے جن کی قیادت بلاس پور کا راجہ کر رہا تھا۔ اس کے بعد وزیر خاں سرہندی کی زیر قیادت لڑنے والی مغل فوجوں سے۔ (سرہند مزید شمال میں ہے) یہ آنند پور ہی تھا، جہاں ۱۷۰۴ء میں گرو گوبند سنگھ کے شہر چھوڑنے پر مجبور ہونے سے قبل دا سم گرنتھ کا زیادہ حصہ مدون ہوا۔ آنند پور میں پانچ تختوں میں سے ایک تخت بھی ہے جہاں سے حکم نامے جاری کیے جا سکتے ہیں۔

۱۹۷۳ء میں اپنے نئے پروگرام کا اعلان کرنے کے لیے اکالیوں نے آنند پور صاحب کا انتخاب کیا تھا۔ باہمی طور پر مسلک سیاسی اور مذہبی عناصر کے تانے بانے کو ایک بار پھر بُنا گیا۔ مگر اس دفعہ بھی بنیاد اسی پرانے خوف پر رکھی گئی تھی جیسا کہ اکالی دل کے صدر سرہرچند سنگھ لونگووال نے ایک وضاحتی کتابچے ("ہمارے ساتھ انصاف کرنا آپ پر فرض ہے") میں جو بعد کو پارلیمنٹ کے ممبروں کو بھی بھیجا گیا تھا، لکھا تھا کہ اصل وجہ "یہ پیش اندیشگی تھی کہ بدھ ازم اور جین مت کی طرح، وہ (سکھ) بھی زبردست ہندو اکثریت کے وسیع سمندر میں اپنی شناخت کھو سکتے ہیں۔ نانک پنتھی کہہ رہے تھے کہ بغیر سیاسی قوت کے وہ بھی کبیر پنتھیوں کی طرح مصائب کا شکار ہوں گے۔

۱۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو اکالی دل کی ورکنگ کمیٹی نے "سکھ دانش وروں اور مفکروں" پر مشتمل ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی اور جس کے ذمے سکھ پنتھ کے مقاصد اور نصب العین کو از سر نو طے کرنا تھا تاکہ دل سکھوں کی توقعات پر پورا اتر سکے۔ "کمیٹی کے صدر تھے سرجیت سنگھ برنالا (مرارجی ڈیسائی کی حکومت کے زمانے میں یہ وزیر خوراک و زراعت ہوئے) کمیٹی کے دوسرے اراکین میں ایس جی پی سی کے صدر اور ممبر پارلیمنٹ گرچرن سنگھ توہرا جیون سنگھ امرانگل، گرمیت سنگھ، بلونت سنگھ، ڈاکٹر بھگت سنگھ، گیان سنگھ راڑیوالا، پریم سنگھ لال پُرا، جوندر

سنگھ برار، بھاگ سنگھ، میجر جنرل گربخش سنگھ بدھنی اور امیر سنگھ انبالوی تھے۔ اس کمیٹی کی پہلی نشست ۲۳ دسمبر کو ہوئی دس مزید میٹنگوں کے بعد (جو چنڈی گڑھ میں ۱۹۷۰ میں اکالی دل کے سکریٹری امیر سنگھ کے الفاظ میں وہاں کے پُرامن اور مانوس ماحول کی وجہ سے ہوئیں ایک مسودہ تیار ہوا جو ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۳ کو سری آنند پور صاحب (دسویں گرو کا مقدس اور تاریخی مقام) میں شرومنی اکالی دل کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا، ورکنگ کمیٹی نے دوسرے دن اسے منظور کر لیا۔

بنیادی مفروضے کی تعریف یوں کی گئی تھی "شرومنی اکالی دل، سکھ قوم کی امیدوں اور آرزوؤں کی حقیقی تجسیم ہے۔ اور اسی لیے یہ ان کی نمائندگی کی پوری حق دار ہے" تنازعہ یہیں سے شروع ہو جاتا ہے "اکالی قوم" سے اکالیوں کی کیا مراد ہے؟ پرانے خدشات کو ہوا دی گئی، جناح صاحب نے یہ اصرار کر کے کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اپنا پاکستان حاصل کر لیا۔ اکالی مجھوں نے سرکاری طور پر کبھی بھی نہ تو علیحدگی کی وکالت کی اور نہ تشدد کی، انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ نیشن کا لفظ، پنجابی زبان میں استعمال ہونے والے لفظ قوم کا قریب ترین متبادل ہے جس سے نیشن کے بجائے کمیونٹی زیادہ مراد ہوتی ہے مگر کیا یہ وضاحت سچائی پر مبنی تھی یا محض ایک پردہ۔ جو کچھ ہوا وہ اچھا خاصا صاف ہے، مسودہ تیار کرنے والی کمیٹی نے 'قوم' کا لفظ دانستہ استعمال کیا تھا اور ہر شخص کے یہ جاننے کے باوجود کیا تھا کہ اس لفظ کی مختلف تاویلیں کرنے کے کتنے امکانات ہیں۔ اس لفظ کا استعمال ایک پنہاں دھمکی تھی کہ اگر اکالیوں کے مطالبات نہ مانے گئے تو وہ اس لفظ کی وہ تاویل کرنا شروع کر دیں گے جو دہلی کے لیے کم ہی گوارہ ہوگی۔

آنند پور صاحب ریزولیوشن میں، قدرتی طور پر، خاصہ مذہبی عنصر شامل تھا مگر اس میں صرف دو ہی مذہبی مطالبات ایسے تھے جن کا ہندوستان کی حکومت سے ان کے تعلقات پر اثر پڑتا تھا۔ اکالی ایک آل انڈیا گردوارہ ایکٹ چاہتے تھے (انگریزوں نے ۱۹۲۰ء کی تحریک کے بعد صرف پنجاب کے گردواروں کے لیے قانون وضع کیا تھا) تاکہ سکھ ازم کے روایتی تبلیغی فرقوں کو انفرادی مٹھوں کی املاک کو غصب کیے بغیر پھر سے مربوط کیا جا سکے۔ دوسری بات جو سکھ چاہتے تھے وہ تھی تمام سکھ مقدس مقامات کی بشمول ننکانہ صاحب جن سے سکھ پنتھ دور ہو گیا تھا زیارت اور ان کی دیکھ بھال کے لیے رسائی چاہتے تھے دوسرے الفاظ میں ان کا مطالبہ پاکستان کے ساتھ دوستی کی پالیسی کا تھا (جہاں ان کے مذہبی مقامات تھے) جو دونوں ملکوں کے درمیان سفر کو آسان بنانے کی ضامن ہوتی، اور شاید پاکستان کی حکومت کی اجازت سے کوئی ایسا معاہدہ ہو جاتا جس کی بنا پر اکالی ان مقدس مقامات کی ذمہ داری اپنے ہاتھوں میں لے سکتے۔

دوسرے مذہبی دفعات میں الحاد وارتداد کی فوری پریشانی کا پرتو نظر آتا ہے۔ مبلغین اور مشنری، ہند اور بیرون ہند کے گاؤوں اور شہروں میں بھیجے جاتے۔ پیدائشِ نو کا بپتسمہ (امرت پرچار) ہوتا خصوصاً اسکولوں اور کالجوں وغیرہ میں۔ پنجاب کی خوش حالی کے ایک نسبتاً کم خوش گوار اثر کو تسلیم کرتے ہوئے شراب نوشی کے مسئلے اور خالصہ کی پاکیزگی پر پڑنے والے اثرات کے مسئلے کا بھی ذکر کیا گیا تھا، مگر آنند پور ریزولیوشن کے سیاسی مضمرات تھے جو دہلی کے لیے زیادہ پریشان کن تھے۔

ایک بار پھر تعارفی عبارت کو دانستہ مبہم چھوڑ دیا گیا۔ پنتھ کی سیاسی منزل بلاشبہہ دسویں گرو کے احکامات سکھ تاریخ کے صفحوں اور خالصہ پنتھ کے ایک ایک دل میں محفوظ ہے جس کا اصلی مقصد خالصہ کی فوقیت و برتری ہے۔ شرومنی اکالی دل کی بنیادی پالیسی ایک سازگار ماحول اور ایک سیاسی ڈھانچے کے ذریعہ خالصہ کے لیے اسی پیدائشی حق کا حصول ہے۔ دسویں گرو گوبند سنگھ کا کون سا حکم ؟ خالصہ راج کرے گا ؟ کیسا راج ؟ ایک الگ سکھ ملک۔ چوں کہ جمہوریت سکھوں کو مستقل حکومت کا موقع فراہم نہیں کر رہی تھی اس لیے کیا وہ اب پاکستان کی طرح ایک مذہبی طرزِ حکومت کو اپنائیں گے جہاں مذہب کے نام پر اقلیت کی حکومت کو جائز سمجھا جاتا ہے ؟ اسلام خطرے میں تھا چنانچہ ملاؤں نے اسے بچانے کے لیے اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، کیا اسی طرح سکھ ازم کو اس وقت تک ہمیشہ خطرہ لاحق رہے گا جب تک کہ اکالیوں کو ان کا سکھستان یا خالصتان نہ مل جائے ؟ کیا یہی اصلی مقصد تھا جس کا ذکر تو تھا مگر کوئی وضاحت نہیں کی گئی تھی وہ کون سا "پیدائشی حق" تھا اکالی جس کی بات کر رہے تھے ؟ ایک سازگار ماحول اور ایک سیاسی ڈھانچے سے ان کی کیا مراد تھی ؟

ریزولیوشن نے جدوجہد کے اگلے مرحلے کا خاکہ پیش کیا۔ سب سے پہلی بات جو اکالیوں نے کی وہ تھی ان تمام پنجابی بولنے والے ان علاقوں کو پنجاب میں شامل کرنا جنھیں جان بوجھ کر پنجاب سے باہر رکھا گیا تھا۔ مثلاً گورداس پور ضلع میں ڈلہوزی، چنڈی گڑھ، پنجور کالکا اور انبالا صور وغیرہ ضلع انبالہ میں نالاگڑھ کا "دیش کا علاقہ" کرنال ڈسٹرکٹ شاہ آباد اور گلہا بلاک، توہانہ، ذیلی تحصیل، رتیا بلاک اور حصار کی سرسا تحصیل اور راجستھان میں گنگا نگر ضلع کی چھ تحصیلوں کو ایک انتظامی اکائی بننے کے لیے پنجاب میں ملا دیا گیا جہاں سکھ اور سکھ ازم دونوں کو خصوصی طور پر محفوظ کیا گیا۔" جہاں خیال تھا کہ "ہندو شہریوں کے مفادات موخر کیے جا سکتے ہیں جہاں تک علاقائی مفادات کا تعلق ہے کون ہے جو دعووں پر روک لگا سکے ؟ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ مسلم لیگ کے شیخ جلی، موجودہ پاکستان سے دوگنے علاقے کے پاکستان کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ خالصتان کے خیال کی ہمت افزائی کرنے والے پاکستانی شاید یہ نہ

جانتے ہوں کہ مجوزہ اکالی سکھ ملک میں بہت سادہ علاقہ، بشمول لاہور، بھی شامل ہے جو اس وقت پاکستان میں ہے۔

سب سے اہم اور تشویش ناک سیاسی مسئلہ جو آنندپور صاحب ریزولیوشن نے اٹھایا وہ تھا مرکز میں تمام ریاستوں کی مساوی نمائندگی کے ساتھ حقیقی وفاقی اصولوں کو یقینی بنانے کے لیے آئین کی ازسرِنو تشکیل کا مطالبہ اس کی تجویز تھی کہ ۱۹۴۶ء کے کیبنیٹ مشن کی تجاویز کی تجدید کی جائے یعنی صرف دفاع اور خارجہ کرنسی اور ذرائع ترسیل و مواصلات کی ذمہ دار دہلی کی مرکزی حکومت ہو۔ جہاں تک مسز اندرا گاندھی کی خارجہ پالیسی کا تعلق ہے، ریزولیوشن کو یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں تھی کہ "کانگریس پارٹی کی بنائی ہوئی خارجہ پالیسی ..... بالکل ناکارہ اور بے کار ہے اور ملک و قوم بلکہ نوعِ انسانی کے مفادات کے لیے انتہائی نقصان دہ" اس حقیقت کے پیش نظر کہ مسز گاندھی کی خارجہ پالیسی ابھی دو سال قبل، بنگلہ دیش کے قیام کے ساتھ ہر فرد و بشر کی توقعات سے کہیں زیادہ کامیاب ثابت ہو چکی تھی، یہ موقف بہت دل چسپ تھا۔ "شرومنی اکالی دل ہندوستان کی صرف اس خارجہ پالیسی کی حمایت کرے گا جو امن اور قومی مفادات کے اصولوں پر مبنی ہوگی۔ یہ پڑوسی ملکوں کے ساتھ خصوصاً ان ملکوں کے ساتھ جن میں سکھ رہتے ہیں یا ان کے مقدس مقامات ہیں، امن کی پالیسی کی پرزور وکالت کرتا ہے۔" سیدھے سادے طور پر اگر یہ بات کہی جائے تو یوں کہی جائے گی کہ اکالی ایک ایسے وقت پر، جب کہ نوّے ہزار پاکستانی جنگی قیدیوں کو واپس ہوئے ابھی بہت مدت نہیں ہوئی تھی، ایک نرم اور کمزور سرحد کا مطالبہ کر رہے تھے۔ کیا اکالیوں کی خارجہ پالیسی برصغیر میں امن کی ایک حقیقی خواہش تھی؟ یا یہ کہ پاکستان سے مفاہمت کی طرف ایک قدم جس کے بدلے میں خالصتان کے لیے ان کی دہلی سے لڑائی میں پاکستان کی مدد حاصل کرنے کی سبیل کی تمنا۔ بہر حال شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ غداری کے الزام کے خطرے کو مول لے کر ہندوستان کی دوست رہ چکی تھی اور یہ سب، بنگلہ دیش کے قیام میں ہندوستانی فوجوں کی مدد کی ضرورت پڑنے سے کئی برس پہلے کی بات ہے۔

پہلے سے معلوم تھا کہ فوج میں سکھوں کی بھرتی کی بات اٹھے گی، چنانچہ وہ اٹھی۔ اکالیوں نے یہ بھی چاہا کہ کرپان، سکھ فوجیوں کے فوجی لباس کا ایک حصہ قرار دی جائے۔ انھوں نے سابق فوجیوں کو منظم کرنے کی بات کی (جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ان کی یہ خواہش بھی اتنی معصوم نہیں تھی جتنی کہ وہ بظاہر معلوم ہوتی تھی۔ انتہا پسندوں نے اپنے دستوں میں سابق فوجیوں کو استعمال کیا) اور ظاہر ہے کہ سکھوں کی عسکری روایات کے احترام اور اعزاز میں اکالیوں نے مطالبہ کیا کہ سوائے مستند مجرموں کے ہر شخص کو بغیر لائسنس صرف اندراج کی بنیاد پر ہر قسم کے چھوٹے ہتھیار جیسے ریوالور، بندوق، پستول، رائفل اور کاربائن وغیرہ رکھنے کی اجازت ہونا چاہیے۔ گرو گوبند سنگھ نے صرف کرپان پر اصرار کیا

تھا ۔ ۳، ۱۹ء کے سنتوں نے سکھوں کی "مدافعتی" صلاحیت کو جدید سطح تک اٹھانا چاہا مگر یہ دفاع کس سے ؟ اس مطالبے کے لیے کوئی وجہ یا جواز پیش نہیں کیا گیا تھا ۔ کیا اکالیوں کو یہ تجربہ ہوا تھا کہ دہلی کی فوجوں نے بڑی تعداد میں سکھوں کو قتل کیا تھا جس کی بنا پر ان کو ان ہتھیاروں کی ضرورت تھی ۔ یقیناً ایسا نہیں تھا ، پھر آخر کیوں ؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ایک بار پھر یہ اسی دن کے لیے خفیہ تیاری تھی جب مذہبی رہنما سکھ قوم سے بغاوت کرنے کے لیے کہیں گے ؟ مگر واقعات کے تسلسل میں دوسرے عناصر نے رخنہ ڈال دیا ۔ مثلاً ۱۹۷۵ء اور ایمرجنسی ۔

ایمرجنسی کے نفاذ کے تین دن کے اندر اندر اکالی دل کی ایکزیکیٹو کمیٹی نے مسز اندرا گاندھی کی انھیں منانے اور رام کرنے کی کوششوں کو مسترد کر دیا اور ایمرجنسی کو فاسسٹ ، جمہوریت کی بے حرمتی اور ڈکٹیٹرشپ کی طرف ایک بڑا قدم قرار دیا ۔ ۱۹۷۷ء کے انتخابات نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئے ۔ ایک لحاظ سے صورت حال ویسی تھی جیسی کہ پانچویں دہائی میں کانگریس اور اکالی اتحاد کے نتیجے میں تھی ۔ اس دفعہ فرق یہ تھا کہ اب کانگریس کی جگہ جنتا پارٹی نے لے لی تھی ۔ جنتا پارٹی کو اس شمالی ہندوستان میں بے مثال اور شاید دوبارہ نہ ملنے والی زبردست حمایت ملی جہاں کانگریس ایک نشست بھی جیتنے میں کامیاب نہ ہو سکی ۔ اکالی ۔ جنتا اتحاد نے پنجاب میں بھی کانگریس کو ختم کر دیا ۔ اکالیوں کو ۱۹۷۷ کے اسمبلی کے انتخابات میں اتنے ووٹ ملے جتنے کہ انھیں پہلے کبھی نہیں ملے تھے ۔ یعنی ۴۱٫۳۱ فی صدی اور انھوں نے ۵۸ نشستیں بھی جیتیں مگر اب بھی اکالی شہری سکھ ووٹوں میں کوئی بڑا رخنہ نہ ڈال پائے اور وہاں پست ہمت کانگریس ۳۴٫۰۷ فی صدی ووٹ حاصل کر کے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے والی پارٹی بنی رہی مگر کامیابی اسے صرف سترہ نشستوں پر ہی ملی ۔ کمیونسٹوں نے تمام سیاسی تغیر و تبدل کو پس پشت ڈالتے ہوئے ہمیشہ کی طرح دس فی صدی ووٹ حاصل کیے ۔ جنتا اور اکالی دل کی ملی جلی حکومت صرف پنجاب ہی میں نہیں دہلی میں بھی برسر اقتدار آئی ۔ یونین گورنمنٹ میں اکالیوں کو دو سیٹیں ملیں اور پنجاب میں پرکاش سنگھ بادل ان کے وزیر اعلیٰ ہوئے ۔ ان لوگوں کو ملنے والی حمایت کی نوعیت کا اندازہ ان کے وزیروں سے ہوتا ہے ۔ وہ چاہے چنڈی گڑھ ہو یا دہلی ، ایک بھی اکالی وزیر شہری سکھ نہیں تھا ۔

جنتا پارٹی کے اہم لیڈروں میں جن لوگوں کا شمار ہوتا تھا وہ اگر کچھ تھے تو مسز اندرا گاندھی کے مقابلے میں اکالیوں کے مطالبات کے سلسلے میں کہیں سخت تھے ۔ کانگریس کے تین میں سے جن دو وزیروں نے ۱۹۶۶ء میں پنجابی صوبے کے مطالبے کو ماننے کی مخالفت کی تھی وہ جنتا کی کابینہ میں تھے ۔ اڑیسہ کے ممتاز لیڈر بیجو پٹنائک اب اسٹیل اینڈ مائنز کے وزیر تھے ، اور مرارجی ڈیسائی وزیر اعظم ہو چکے تھے مزید یہ کہ نئے وزیر داخلہ چودھری چرن سنگھ تھے جو تبدیل مذہب کرانے والی جماعت آریہ سماج کے حامی ایک ہندو جاٹ تھے ۔ چرن سنگھ سکھوں اور مسلمانوں کے ساتھ ایک سیاسی اتحاد

کو سمجھ تو سکتے تھے مگر ضروری نہیں تھا کہ وہ اسے قبول بھی کریں۔ کیوں کہ ان کے پیش نظر یہ دونوں ہندوازم کے غدار تھے۔ چرن سنگھ کی حمایت کا اصلی ذریعہ ہریانہ کے ہندو جاٹ اور اتر پردیش کے پس ماندہ طبقات تھے اور اگرچہ ایک طرف ان کی سیاست عام طور پر اعتدال پسند تھی تو دوسری طرف ان کے ذاتی تعصبات ایسے نہیں تھے۔ کیبنیٹ میں اکالیوں کی موجودگی کو برداشت کر لینے کے رویئے کی توسیع چنڈی گڑھ کو ان کے حوالے کر دینے تک نہیں ہوئی۔

اب جب کہ اکالی خود حکومت میں تھے، طاقت ان کے ہاتھ میں تھی، اکالیوں کو خود اپنے خلاف تحریک شروع کرنا ذرا دشوار نظر آیا مگر وہ اکالیوں کی ایک آل انڈیا کانفرنس میں آنند پور صاحب ریزولیوشن کی توثیق کے عمل سے ضرور گزر گئے۔ ۲۸ اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۸ء لدھیانہ میں شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی کے صدر گرچرن سنگھ توہرا اور وزیر اعلیٰ پرکاش سنگھ بادل نے بارہ تجاویز پیش کیں جن میں اکالی مطالبات درج تھے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ آج کے حالات کا تقاضا اور اس وقت کی ضرورت اعتدال پسندی ہے یہاں تک کہ اکالی صدر جگدیو سنگھ تلونڈی نے بھی، جنھیں بعد کو سب سے الگ ہونا تھا اور بعد ازاں ایک نسبتاً کم اکالی دل قائم کرنا تھا اس جنگ جو گروہ کو متنبہ کیا جس نے دلی کے خلاف اگلی جنگ شروع کرنے کی ترغیب شروع کر دی تھی۔

اکالیوں کے ایک حلقے نے جو غالباً اس سلسلے میں پریشان تھا کہ یہ جنگ جو گروہ انھیں نہ جانے کہاں پہنچائے نہایت خاموشی کے ساتھ مذہبی لیڈروں کی گرفت کو ڈھیلا کرنے اور اکالی دل کو نہ صرف سکھوں کی پارٹی رکھ کر ڈی ایم کے کی طرح صحیح معنوں میں ایک علاقائی پارٹی میں تبدیل کرنے کی کوشش شروع کی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ صرف یہی طریقہ ہے جس کی مدد سے پنجاب میں اکالی، کانگریس کا قدرتی متبادل بن سکتے ہیں کیونکہ اکالی ووٹ، جیسا کہ ہر ایک جانتا تھا اتنی بڑی تعداد میں نہیں تھا کہ وہ تنہا اکالیوں کی فتح کا ضامن بن سکے۔ ان سیاست دانوں نے جنتا کے ساتھ اس اتحاد کو حزب اختلاف کی ان قومی پارٹیوں سے جو اس کوشش میں لگی ہوئی تھیں کہ کسی طرح ہندوستان کی سیاسی قوس قزح میں اپنی جگہ مستحکم بنا سکیں رابطے کا ایک وسیلہ بنا رہی تھیں۔ جنگ جو گروہ نے یہ بھانپ لیا کہ کیا ہو رہا ہے اور انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ پارٹی کے بنیادی کردار میں ذرا سی بھی ملاوٹ خود مختاری کے مقصد کو فوت کر دے گی۔ انھیں اعتدال پسندوں کو صف میں لانے کے لیے زبردستی کرنا پڑی۔ انتہا پسندوں نے دل خالصہ، اپنا پہلا پریشر گروپ قائم کیا ۱۹۷۸ میں چنڈی گڑھ میں، دل خالصہ کے تقریباً نصف درجن کارکنوں نے شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی کے دفتر کے سامنے اس وقت مظاہرہ کیا جب وہاں اکالی دل کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہو رہی تھی اور لیڈروں کو چوڑیاں پیش کیں (چوڑیاں نسوانیت کی نشانی ہیں۔ مردانگی اور اپنی عسکریت پر نازاں خالصہ دماغ میں اس سے زیادہ

کوئی بات قابلِ نفرت نہیں ہے کہ مرد عورتوں کی طرح برتاؤ کرے۔ عورت اور کمزوری کو مترادف سمجھا جاتا ہے۔) دل خالصہ نے اس حقیقت کو راز میں نہیں رکھا کہ وہ خالصتان چاہتے ہیں۔ اپریل ۱۹۷۹ میں دل خالصہ نے ایس جی پی سی کے انتخابات میں اکالیوں کا مقابلہ کیا، خود اپنے پندرہ امیدوار کھڑے کیے مگر بعض بڑے غیر معمولی حلقوں سے جن کا جائزہ ہم بعد میں لیں گے، امداد ملنے کے باوجود وہ بری طرح ہارے، جولائی ۱۹۷۹ میں جب دہلی میں جنتا حکومت نے خودکشی کی اس کے بعد پنجاب کی سیاست نے ایک بُری کروٹ لی۔ چرن سنگھ نے پارلیمنٹ کے ممبروں کا ایک حصہ ناقابلِ افسوس عارضی حکومت بنانے کے لیے اپنے ساتھ ملالیا۔ اکالی لیڈروں میں اس مسئلہ پر کہ جنتا کے کس بازو کی حمایت کی جائے اختلاف رائے پیدا ہوگیا۔ تلونڈی اپنا ایک اکالی دل بنانے کے لیے الگ ہو گئے، قومی دھارے سے دور ہونے والے تمام اکالی لیڈروں کی طرح انھوں نے بھی حمایت حاصل کرنے کے لیے غلط طریقہ اپنایا تھا یعنی زیادہ جنگجویانہ ہوکر، اور حسبِ معمول یہ طریقہ کامیاب نہیں ہوا۔ تلونڈی سکھوں کے لیے آزادی اور خودمختاری کے مطالبے کی حد تک تو نہیں گئے مگر انھوں نے کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر اپنے سے ایک بہت کم سن، زیادہ واضح، سادہ لوح اور ان کے ہر ایک کے مقابلے میں زیادہ بے رحم اور سنگ دل، جنگجو کی خدمت میں نذرہائے عقیدت پیش کرنا شروع کیں۔ اس شخص کا نام جو عنقریب، ہندوؤں اور سکھ غداروں کو قتل کرانے کے لیے قاتلوں کے گروہ بھیجے گا فضا میں گونجنے لگا، شروع شروع میں بے اعتنائی کے ساتھ، پھر مذاق میں اس کے بعد غصے کے ساتھ۔ بعدازاں ہیبت اور آخر میں خوف و ہراس کے ساتھ۔ اور یہ نام تھا جرنیل سنگھ بھنڈران والا۔



(۱۱)

جرنیل سِنگھ بھِنڈران والا

"میں خود حکومت نہیں کرنا چاہتا، میں تو چاہتا ہوں کہ سکھ حکومت کریں۔ دلی پر حکومت کریں، دنیا پر حکومت کریں۔ راج کرے گا خالصہ، باقی رہے نہ کوئے ...... اگلے دس برسوں میں سکھوں کو ان کی آزادی مل جائے گی۔ ایسا یقیناً ہو گا۔ میں نہیں جانتا کہ میں ایک نیا ملک دیکھنے کے لیے زندہ رہوں گا یا نہیں ...... میں نے کسی نئے ملک کی ابتدا نہیں کی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اس کے خلاف ہوں میں نہ تو خالصتان کے حق میں ہوں نہ اس کا مخالف۔ ہم ہندوستان میں مساوی حیثیت سے رہنا چاہتے ہیں۔ اب یہ دلی پر ہے کہ وہ ہمیں اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ ہم خالصتان لیں یا نہ لیں۔ وہ ہم کو باعزت طور پر رہنے دے گی یا نہیں ...... بہر حال پاکستان بھی آخر وجود میں آیا تھا......"

لوگ جو دوسرے لوگوں کی موت کے احکامات سناتے ہیں ضروری نہیں کہ انھیں احساس جرم ہو یا ان کی آنکھوں میں کوئی سوال ہو۔ بہت سے لوگ فخر کے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔ جج، جنرل یا انقلابی، یا پھر خود ساختہ پیغمبر۔ سنت جرنیل سنگھ بھنڈران والا کی آنکھوں میں ہنسی بھی ظاہر ہے کہ انھیں اس خیال کا سرور تھا کہ ایک اور صحافی اظہار عقیدت کے لیے اور ان کی اہمیت و عظمت کا پرچار کرنے کے لیے آیا ہے، اس کے حامی اس کے چرنوں میں بیٹھے تھے اور ایک مستعار نور سے ان کے چہرے چمک رہے تھے۔ ساری دنیا ان کے قائد کے پاس آرہی تھی۔ میری پشت پر، اخبار کے ایک صحافی سے زیادہ دل چسپ اور بدیسی چیز تھی۔ فلم بنانے والا ایک برطانوی ٹیلی وژن گروپ اس نوجوان سکھ لیڈر سے انٹرویو کا منتظر تھا۔ یہ ایک مسحور کن منظر تھا، ہم لوگ گولڈن ٹمپل کے اطراف میں بنی ہوئی ان عمارتوں میں سے ایک کی چھت پر تھے جنھوں نے وہاں پر تقریباً ایک بستی سی بسادی ہے اور جو ہندوستان کے آئین و قوانین کی دسترس سے اس وقت تک باہر تھی جب تک کہ ہندوستانی فوج وہاں داخل نہیں ہوئی تھی۔ سکھ اس کے اندر

کسی پولیس والے کو یا سیکورٹی فورس کے کسی آدمی کو داخل نہیں ہونے دیتے۔ ان عمارتوں میں صرف سکھوں کے عظیم ترین مذہبی پیشوا ہی نہیں رہتے بلکہ ان میں بہت سے معروف مجرموں نے بھی مذہب کی آڑ میں پناہ لے رکھی ہے۔ ہتھیار مذہبی مختار کل اکال تخت کی اجازت سے یا اس کے بغیر ہی تہ خانوں میں جمع تھے۔ ہم لوگ فروری کے مہینے کی ایک سہ پہر، موسم سرما کے سورج کی خوش گوار گرمی میں سری گرو رام داس صاحب کے لنگر میں بھنڈران والا کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ دن کی روشنی کے اکثر گھنٹے سنت عام طور پر یہیں گزارا کرتے تھے۔ عمارت کے سامنے ایک اجڑے اجڑے لان میں، ہندوستانی فوج کی ایک بیکار رفیلڈ گن رکھی ہوئی تھی۔ اور لان پر متعدد نہنگ ——————— پڑے ہوئے تھے وہاں تین بدمعاش آدمیوں کی ایک تصویر بھی تھی جس میں وہ بہادر اور دبے اور پسے ہوئے سکھوں کو اذیت دے رہے تھے ان آدمیوں میں پہلا ایک شمشیر بکف مسلمان تھا، اس کے نیچے سنہ ۱۵۲۶ء (یہ سن پانی پت میں بابر کی فتح کا سنہ ہے) سے ۱۸۴۹ (جب سکھ سلطنت ختم ہوئی) لکھا ہوا تھا۔ دوسرا بدمعاش بندوق لیے ہوئے ایک انگریز تھا، سنہ تھا ۱۸۴۹ء سے ۱۹۴۷ء۔ تیسرا لاٹھی تانے ہوئے ایک ہندو تھا۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا، ۱۹۴۷ء ——— تھوڑی خالی جگہ دوسری تاریخ لکھنے کے لیے چھوڑ دی گئی تھی (فوجی کارروائی کے بعد اگر تصویر بچی ہو گی تو خالی جگہ کو غالباً پُر کر دیا گیا ہو گا)

جس چھت پر بھنڈران والا بیٹھے تھے اس کے چاروں کونوں اور متعدد خاص خاص جگہوں پر بندوقیں لیے ہوئے اور جدید ترین نیم خودکار ہتھیاروں سے لیس محافظ تھے۔ یہ انتہا پسند وقتاً فوقتاً گولڈن ٹمپل سے باہر کی سڑکوں پر ہندوستانی پولیس والوں سے گولیوں کا تبادلہ کرتے رہتے تھے۔ ریت کی بوریاں محاصرے کی کیفیت میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ بھنڈران والا خود خول میں رکھے ہوئے ایک ریوالور سے لیس تھے اور پیٹی میں مزید کارتوس تھے۔ ان کے چاروں طرف ضعیف مرد اور عورتیں تھیں جو یا تو آہستہ آہستہ ان سے کچھ نصیحتیں لے رہی تھیں یا پھر ان کو تحیر، استعجاب اور احترام کے ملے جلے جذبات سے دیکھے جا رہی تھیں، یہ سب کے سب کسان تھے ان بوڑھوں میں سے کچھ تو وہ تھے جن کے بے صبر بیٹوں نے جائداد پر قبضے کے لیے ان کے مرنے کا انتظار نہ کرسکنے کی وجہ سے انھیں گھر سے نکال دیا تھا۔ یہ لوگ اب گردوارے کے ساکن ہو گئے تھے۔ بھنڈران والا کو ان لوگوں سے بات چیت میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ وہ بغیر وقفے کے مسلسل بولتے تھے، بولنے میں ان کا منہ مستقل ہی کھلا رہتا تھا ——————————— ۔ ان کے پاس ہر سوال کا فوری جواب موجود تھا۔ ہر دشواری کا فوری حل موجود تھا، یہ مسئلہ چاہے گھر کی خوشی کا ہو یا مذہبی فلسفے کا۔ گفتگو کا ایک سلسلہ تھا جو کبھی کبھی ان

قہقہوں سے ٹوٹتا تھا جو ان کی بذلہ سنجی یا لطائف الطیبی پر لگتے تھے۔ ان قہقہوں کا اشارہ وہ خود قہقہہ لگا کر دے دیتے تھے۔ ان کے چہرے پر عیاری بھی اور ان کے ہاتھ ہمیشہ ان کے لباس کے اندر چھپے رہتے تھے، سوائے اس وقت جب وہ روپے پیسوں کا کوئی تحفہ لینے اور اسے جیب میں رکھنے کے لیے انتہائی تیزی سے انھیں باہر نکالتے تھے۔ یہ رقم ایک، پانچ یا دس روپیے کے نوٹ کی شکل میں ہوتی تھی، جو کوئی نووارد معتقد نذر کرتا تھا۔ اور یہ ڈرامہ دنیا کی ایک انتہائی عجیب وغریب اسکائی لائن کے مقابل کھیلا جا رہا تھا۔ امرت سر شہر کی عمارتیں عام طور پر دو منزلہ ہیں اور حقیقتاً ایک دوسرے پر سوار ہیں۔ چھتوں پر، آنکھ کی سطح پر، لاتعداد ٹیلی ویژن کے انٹناؤں کا تاحدِ نظر ہجوم ہے۔ نیلے آسمان کے ساتھ یہ عجیب نظارہ تھا۔ مگر یہ بھی پنجاب کی خوش حالی کی ایک بصری تصدیق ہے۔ یہ شہر ایک نئے سکون واطمینان کا، نئی تعلیم کا اور شراب کی بڑھتی ہوئی فروخت کا شہر تھا۔ یہ خوش حالی ٹیلی ویژن اور تفریح کی نئی قسموں کے ساتھ ساتھ نئے خیالات ونظریات بھی لا رہی تھی۔ پاک خالصہ، مسلم شمشیر اور ہندو ساہوکار سے بچ نکلا تھا، کیا اب وہ پنجابی ٹیلی ویژن پروگراموں سے بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے گا؟ یہ بات اتنے مذاق کی نہیں ہے جتنی یہ سننے میں معلوم ہوتی ہے۔ سنت بھنڈرانوالا کو اس سلسلے میں کوئی شک وشبہہ نہیں تھا کہ وہ اپنی مذہبی ریاست میں اپنے اُس سکھ کے ساتھ کیا سلوک کریں گے جس نے پشیمانی کی بنا پر یا جدید علم سے پیدا ہوئے یقین کی بنا پر اپنی کرپان الماری میں رکھ دی تھی، اپنے بالوں کو حجام کی دکان پر ترشوایا تھا۔ انھوں نے مصنف سے کہا تھا کہ "ایک سکھ کو حقیقی معنوں میں سکھ ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک سب سے اہم چیز امرت پرچار ہے۔ اگر کوئی سچا سکھ شراب پیتا ہے تو اسے زندہ جلا دینا چاہیے۔ سنت جرنیل سنگھ بھنڈران والا، جناح صاحب سے زیادہ ایمان دار ہو رہے تھے۔ کیونکہ جناح صاحب نے مسلمانوں کو اس بات سے کبھی آگاہ نہیں کیا کہ ایک مذہبی ریاست میں عورت بدکاری کے شبہے میں سنگ سار کر کے ماری جائے گی جیسا کہ ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۴ء میں پاکستان میں ہوا۔ انھوں نے لوگوں کو اس سے بھی متنبہ نہیں کیا تھا کہ شراب پینے والے کو سرِ عام کوڑے لگائے جائیں گے۔ بھنڈران والا کو انصاف کے اپنے اصولوں کے اطلاق کے سلسلے میں کسی قسم کا کوئی شک یا کوئی احساسِ جرم نہیں تھا۔" وہ، جو برائی کرتے ہیں، انھیں انصاف کے دروازے تک لایا جانا چاہیے اور برائی وہ نہیں ہے جو کوئی فرد سوچتا ہے۔ برائی وہ ہے جو گرو گرنتھ صاحب میں لکھی ہوئی ہے۔" اور ظاہر ہے کہ اس کے واحد ترجمان تھے بھنڈران والا۔

سکھ کو کیا ہونا چاہیے اس سلسلے میں بھی بھنڈران والا اپنے ذہن میں بالکل واضح تھے۔ سکھ خالص (پاک) تھا پاکیزگی اس کا سب سے بڑا اثاثہ تھا اور اسے بہر حال ہر قیمت پر محفوظ رکھنا تھا۔ ایک سکھ، مسلمان یا ہندو سے کس طرح

زیادہ پاک تھا؟ سیدھی سی بات ہے۔ بنی نوع انسان میں سکھ وہ واحد لوگ ہیں جنھوں نے اپنی ہیئت کو بالکل ویسا ہی برقرار رکھا جیسا کہ خالق نے انھیں تخلیق کیا تھا۔ ہندو اپنے بال کاٹتے ہیں اور اس طرح وہ ایک ایسی چیز کو ہاتھ لگاتے ہیں جسے خدا نے چاہا تھا کہ اسے اس کی فطری نشو و نما نصیب ہو۔ مسلمان نے ختنہ کرا کے ایک چیز کو تھوڑا سا کاٹ دیا اس لیے سکھ ہی واحد ایسے لوگ ہیں جنھوں نے ہر چیز کو بالکل اسی طرح چھوڑ دیا جس طرح قدرت چاہتی تھی۔ اس موقع پر کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ اس دل چسپ نظریئے کے مطابق گوبند سنگھ سے پہلے کے نو گرو پاک نہیں تھے اور ظاہر ہے کہ انھوں نے کسی وقت اپنے بال کاٹے تھے۔ یہ صرف گرو گوبند تھے جنھوں نے، گرو نانک کے دو سو برس بعد اس "پاک" خالصہ شناخت کی تخلیق کی۔ بہر حال گولیوں کی آوازیں اور بھنڈران والا کے نظریات، ان کے غرور اور ان کے وجود کی حفاظت کرنے والے مذہبی جنونیوں کے ہاتھوں میں نیم خود کار بندوقیں دیکھ کر بحث اور تبادلۂ خیال کی ہر خواہش پر پانی پڑ گیا۔

اس بات کو سمجھنے میں بہت وقت نہیں لگا کہ بھنڈران والا کی دانش ورانہ صلاحیتیں محدود تھیں، جب وہ سادہ لوح نہیں لگتے تھے تو مضحک معلوم ہوتے تھے۔ بھنڈران والا کے مطابق ہندو اور مسلمان مسخ شدہ سکھ ہیں۔ ہر انفرادی آدمی، سکھ پیدا ہوا تھا، بعد کو وہ بال کٹا کر ہندو ہو سکتا تھا یا ختنہ کرا کے مسلمان۔ بھنڈران والا کے پاس مذاہب کی تاریخ کی اپنی ایک مخصوص شکل تھی۔ ان کے مطابق "تین سو کروڑ دیوتا، نو سے ملین دیویاں، ایک لاکھ چیس ہزار پیغمبر، چونسٹھ جوگنیں اور دس گرو یہ سب لمبے بال رکھتے تھے۔" دوسرے الفاظ میں وہ سب کے سب سچے سکھ تھے۔ بہر حال وہ بیسویں صدی کے دوسرے مذاہب کے ساتھ بقائے باہم پر راضی تھے مگر ایک شرط کے ساتھ، اور وہ یہ کہ ہر ایک کو تمباکو نوشی چھوڑنا ہوگی (سکھ روایت میں تمباکو ممنوع ہے) "میرا کام" بھنڈران والا نے کہا "گروبانی پڑھنے کا ہے، پاکیزگی کی تبلیغ کا ہے اور لوگوں کو منشیات سے بچانے کا ہے۔ گر میں بہر حال یہ جانتا ہوں کہ ایک ہندو کو سچا ہندو ہونا چاہیے۔ ایک سچے ہندو کی خصوصیات کیا ہیں؟ چوٹی، ٹوپی، دھوتی، بارہ تلک (ذاتوں کے نشان) پیشانی پر، ناک، ٹھوڑی، سینے، بغلیں، گال، گردن اور سر کے اوپر۔ ہندو کو نو دھاگے پہننے چاہئیں اور اسے شیولنگ کا پجاری ہونا چاہیے اور ہندو کو بھی تمباکو نہیں استعمال کرنا چاہیے۔ ہندو ہمارا بھائی ہے۔ مسلمان کو ایک سچا مسلمان ہونا چاہیے۔ اسے یہ ماننا چاہیے کہ اللہ سب سے بڑا ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ (متاثر کرنے کے لیے قرآن کی آیتیں پڑھنے کی کوشش میں بھنڈران والا نے عربی کے بجائے کچھ عجب سے الفاظ ادا کیے، یہاں تک کہ مصنف کو ایسا لگا کہ یہ کسی مزاحیہ ڈرامے کا کوئی حصہ تھا) اگر مسلمان قرآن کی آیتیں پڑھتا ہے، دن میں پانچ بار عبادت

کرتا ہے، محمد کو جانتا ہے، تمبا کو استعمال نہیں کرتا ہے تو میرا دوست ہے۔"

پینتیس سال کی عمر کا یہ آدمی، جب یہ گفتگو ہو رہی تھی پنجاب کی علیحدگی پسند تحریک کا آیت اللہ خمینی بھی تھا اور جناح بھی ...... وہ روڈے کے ایک جاٹ خاندان میں پیدا ہوا روڈا ایک اچھا خاصا بڑا گاؤں ہے جہاں کی آبادی تقریباً آٹھ ہزار ہے۔ جرنیل سنگھ، جوگندر سنگھ کے (دو بیویوں سے) سات بیٹوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ ایک بھائی فوج میں تھا، ایک گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر تھا۔ باقی لڑکے باپ کی چھوڑی ہوئی چالیس ایکڑ زمین پر کام کرتے تھے۔ گھر کے قریب ہی ایک گردوارہ تھا۔ جرنیل سنگھ کو بڑی کم عمری ہی سے مذہب سے دل چسپی تھی۔ چھٹی جماعت کے بعد بابا دیپ سنگھ کے شروع کیے ہوئے 'دمدمہ صاحب ٹکسال' میں مذہبی سلک کی خدمت کرنے کے لیے چلا گیا۔ اس سلک کے بارھویں سنت بھنڈران والا گاؤں کے سندر سنگھ تھے۔ جرنیل سنگھ کے نام کے ساتھ بھنڈران والا اسی تعلق سے لگا یا گیا ہے۔ اس سلسلے کے چودھویں سنت کرتار سنگھ تھے جنھوں نے اپنے شاگردوں کے ذہن میں ایک خود مختار سکھ ملک کے نظریہ کو بڑے مستحکم طور پر بٹھایا تھا۔ کرتار سنگھ کے بیٹے بھائی امریک سنگھ آل انڈیا سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر ہو گئے۔ یہ فیڈریشن علیحدگی پسند سرگرمیوں کی بنیاد پر ۱۹۸۴ء میں غیر قانونی قرار دے دی گئی۔ بھائی امریک سنگھ حقیقت تو یہ ہے کہ توقع کر رہے تھے کہ اپنے باپ کی موت کے بعد انھیں اس سلسلے کا سنت نامزد کر دیا جائے گا مگر یہ اہم حیثیت بیٹے کے بجائے ایک چہیتے شاگرد کو ملنی تھی۔ ۳۰۔ اگست ۱۹۷۷ء کو سنت کرتار سنگھ ایک حادثے کا شکار ہوئے اور ان کے سر میں بہت چوٹ آئی ضروری آپریشن کے لیے سر کے بالوں کو کاٹنے کی ضرورت پڑی مگر سنت کرتار سنگھ نے ڈاکٹروں کو اس کی اجازت نہیں دی اور اپنی خالصہ پاکیزگی کی حرمت کو موت پر ترجیح دی اور لدھیانہ کے براؤن اسپتال میں ۱۶ اگست ۱۹۷۷ کو جان دے دی۔ ان کا جانشین جو نامزد ہوا اس کا نام تھا جرنیل سنگھ۔ اس وقت ان کی عمر ۳۰ سال سے کم تھی۔ سنت جرنیل سنگھ نے امرت سر سے تقریباً چالیس کلومیٹر دور چوک مہتا کے مقام پر گردوارہ گرو درشن پرکاش میں قائم اس سلسلے کے ہیڈ کوارٹرز کو اپنی نگرانی میں لیا۔

اسی سال جولائی کے مہینے میں 'بیرونی ملکوں میں خالصتان کی تحریک شروع کرنے والے ڈاکٹر جگجیت سنگھ چوہان، ہندوستان واپس آئے۔ کسی نے بھی ان کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اکتوبر میں چوہان نے ہر سمرن سنگھ نام کے ایک شخص کی سربراہی میں دل خالصہ کی تنظیم میں مدد کی۔ اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں تھا کہ کوئی بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ ہر سمرن کون تھا۔ سارا خیال ابھی ایک 'پاگل پن' سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ دل خالصہ نے ایک دو نکاتی پروگرام کا اعلان کیا۔ ایک تو خالصتان کا قیام اور دوسرے سکھوں میں اپنے مذہب کا زیادہ شعور پیدا کرنا (دھی پرانا ور)۔

۱۹۷۹ء میں دل خالصہ نے بھنڈران والا کی مدد سے ایس جی پی سی کے مذہبی انتخابات میں اکالیوں کے خلاف مقابلہ کیا۔ بھائی امریک سنگھ بیاس کے حلقہ انتخاب سے کھڑے ہوئے اور اکالی امیدوار جیون سنگھ امرانگل سے زبردست شکست کھائی۔ کانگریس نے انتخابات میں اپنا کوئی امیدوار کھڑا نہیں کیا تھا مگر پنجاب میں اس کے لیڈر گیانی ذیل سنگھ نے اکالیوں کو سبک کرنے کے لیے مالی امداد کے ذریعے انتہا پسندوں کو بڑھاوا دیا جو خود بھی اکالیوں سے شاکی تھے۔ درحقیقت ابتدائی دنوں میں، یہ مسز اندرا گاندھی کی کانگریس تھی جس نے بھنڈران والا کو سرفراز کیا اس عمل کا بہت بڑا خمیازہ لیڈر اور ملک دونوں کو اٹھانا پڑا۔

۱۲ نومبر ۱۹۷۹ء کو جگ جیت سنگھ چوہان نے گولڈن ٹمپل میں ایک چھوٹا ٹرانزسٹر نصب کیا۔ ۲۰ مارچ ۱۹۸۰ سے اس پر گرو گرنتھ صاحب کا جاپ شروع کیا گیا۔ یہ رعایت بالآخر مذہبی گیتوں کی نشریات کے لیے ایک مستقل ریڈیو اسٹیشن کے مطالبے کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ ایک بار پھر، یہ ایک دو دھاری نظریہ ثابت ہوا۔ ایک دفعہ الیسا ریڈیو اسٹیشن قائم ہو جائے تو پھر ایسے ریڈیو کے ذریعے سے آزادی و خود مختاری کے مطالبے کو کون روک سکتا تھا۔ یہ بات یقینی ہے کہ گردوارے کے سنتوں اور مہنتوں کو محض مزید شور و شغب کے لیے ریڈیو اسٹیشن کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ آواز کو دور دور تک پہنچانے کے لیے وہاں یوں ہی بہت کافی لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے تھے۔ مارچ ۱۹۸۰ء میں چوہان نے آنند پور کے تاریخی شہر میں بنے ہوئے گردوارہ کیسر گڑھ صاحب میں خالصتان کا جھنڈا لہرایا اس وقت تک انھیں ایک اور خالصتانی مل گیا تھا، بلبیر سنگھ سندھو۔ ایک ناکام اسکول ماسٹر اور ایک ناکام صحافی، مالی طور پر پریشان، اس شخص کا چوہان سے تعارف جالندھر کے ایک کافی ہاؤس میں کرایا گیا اور اس نے خالصتان کی تحریک میں شرکت کرلی۔ حکام کی توجہ پہلی دفعہ اس پر اس وقت ہوئی جب اس نے گولڈن ٹمپل کے ریڈیو سے ایک پیغام نشر کیا۔ چوہان نے سندھو کو خالصتان کی نیشنل کانسل کا سکریٹری جنرل مقرر کیا۔ ۱۲ اپریل کو ایک گیارہ نفری کاؤنسل کا اعلان ہوا۔ دوسرے ہی روز سندھو نے خالصتان کے نام کے ڈاک ٹکٹ اور پاسپورٹ جاری کیے۔ ابھی تک یہ سب کھیل تھا۔ قومی سطح پر اس کہانی کو مشتہر کرنے والی، رسالہ "سنڈے" کی نامہ نگار مدھو جین تھیں جن کے پاس آج بھی خالصتان کا وہ پاسپورٹ یادگار کے طور پر موجود ہے۔ جو سندھو نے ان کے نام پر جاری کیا تھا۔ (پاسپورٹ کی طباعت کناڈا میں ہوئی ہے اور یہ دیکھنے میں بڑا دیدہ زیب ہے)

۸ جون ۱۹۸۰ء کو سندھو نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ جون کی ۱۶ تاریخ تک، اکال تخت، گولڈن ٹمپل سے خالصتان کی حکومت کا اعلان ہو جائے گا اور چوہان (جو موقع کو غنیمت جان کر اس وقت تک ملک چھوڑ چکے تھے)

ملک سے باہر جاکر حکومت کی کابینہ کا اعلان کریں گے۔ سندھو نے تمام آزادی پسند ملکوں سے خالصتان کی حکومت کو تسلیم کرنے کی اپیل کی اور ساتھ ہی ہندوستان کی حکومت کو خالصتان کے خلاف قوت کے استعمال سے پرہیز کرنے کا انتباہ کیا نہیں تو دوسری صورت میں نیا ملک دونوں بڑی طاقتوں سے امداد کا خواستگار ہوگا۔ ۱۶ جون کو ڈاکٹر چوہان نے برطانیہ میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے آپ کو خالصتان کا صدر بنایا۔ انھوں نے صحافیوں کو بتایا کہ وہ جلدی ہی لندن اور چند دوسرے یورپی ملکوں میں قونصل خانے کھول دیں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ وہ امریکا میں ایک جلا وطن حکومت قائم کرنے کے امکانات کے بارے میں واشنگٹن سے بات چیت کر رہے ہیں اور دس ہزار فوج کو تربیت دینے کے لیے امریکا سے درخواست کی تھی۔ ہندوستان میں ۱۵ اگست کو آزادی کے دن خالصتانیوں نے ایک جلوس نکالا مئی ۱۹۸۱ میں چوہان نے دعویٰ کیا کہ خالصتان کے مطالبے کو اکال تخت اور ایس جی پی سی اور اسی لیے اکالی دل کی خاموش حمایت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ دعویٰ صحیح لگا جب ۱۲ جولائی ۱۹۸۱ء کو ایس جی پی سی کے صدر گرچرن توہرا نے نیویارک میں ایک جلسے کی صدارت کی جس میں ایک یہ ریزولیوشن منظور کیا گیا کہ سکھ ایک الگ قوم ہیں اور یہ کہ فلسطین آزادی تنظیم کے نمونے پر، اقوام متحدہ کے ساتھ ایسوسی ایٹ حیثیت حاصل کرنے سے متعلق اقدامات کیے جانے چاہییں۔ مگر صحافیوں سے الگ الگ ملاقاتوں میں توہرا نے اپنے آپ کو خالصتان کے نظریئے سے بے تعلق بتایا اور تادم تحریر نہ تو اکالی دل، نہ ہی ایس جی پی سی اور نہ ہی اکال تخت نے باقاعدہ طور پر علیحدگی کی حمایت کی ہے۔

دوسری طرف دوسری بہت سی تنظیموں نے بشمول آل انڈیا سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے اس نظریئے کی حمایت کر دی۔ فیڈریشن کا دعویٰ ہے کہ وہ اکالی دل کا طالب علموں کا بازو ہے۔ جون ۱۹۷۸ میں یوتھ اکالی دل، سکھ ینگ ایسوسی ایشن سکھ نوجوان سبھا اور نوجوان اکالی دل وغیرہ جیسے گروپوں کو ملا کر دل خالصہ قائم کیا گیا۔ ۱۳ جون ۱۹۸۱ء کو چیف خالصہ دیوان کے زیر اہتمام ۵۴ ویں سکھ ایجوکیشن کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں ایک باقاعدہ تجویز پیش ہوئی اور جس کا پر جوش خیر مقدم ہوا اور اسے منظور کیا گیا۔ اس کانفرنس کی صدارت ایک دوسرے امریکی شہری گنگا سنگھ ڈھلوں نے کی۔ اسی کانفرنس میں خالصتان کے لیے اقوام متحدہ کی رکنیت کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ (اس مطالبے پر منتظمین کانفرنس تھوڑی الجھن میں بھی تھے)

خالصتان کے مطالبے کی طرف دل خالصہ نے قومی توجہ اس وقت مبذول کرائی جب انھوں نے ۱۰۷ مسافروں کے ساتھ انڈین ایرلائنز کے ایک جہاز بوئنگ ۷۳۷ کا جو دلی سے سری نگر جا رہا تھا اغوا کیا اور اسے پاکستان لے گئے۔ اغوا کرنے والے لاہور میں گرفتار ہوئے، مسافروں کو چھوڑ دیا گیا مگر اس کارروائی کے مقصد کی بہر حال تبلیغ ہوگئی۔ جوابی کارروائی کے طور پر پنجاب پولیس نے چنڈی گڑھ میں دل خالصہ کے دفتر پر چھاپہ مارا۔ کچھ علیحدگی پسندوں نے گرفتاری

سے بچنے کے لیے بھاگ کر گولڈن ٹمپل میں پناہ لی۔ سنت ہو گرو نانک نواس کے کمرہ نمبر ۲۵ میں قیام پذیر ہوئے اور سکھ مذہبی قائدین پولیس کو گولڈن ٹمپل میں داخلہ کی اجازت نہیں دے سکتے کیوں کہ یہ جگہ اتنی مقدس ہے کہ جسے نظم و ضبط قائم کرنے والوں کے ناپاک جوتوں سے بے حرمت نہیں کیا جاسکتا۔ اکالیوں کی نظر میں گولڈن ٹمپل کی حرمت پر اس وقت کوئی آنچ نہیں آئی جب قاتل اور مفرور مجرم وہاں پناہ لے رہے تھے۔

۱۹۸۱ء کی آخری چوتھائی میں، جب پنجاب کو غیر سکھوں سے خالی کرانے کے پروگرام پر عمل درآمد شروع ہوا تو انتہاپسندوں نے اپنی پُرتشدد توجہ کو عام شہریوں کی طرف مبذول کر دیا۔ اس وقت تک وہ پولیس کے محکمے میں بھی داخل ہو چکے تھے اور دوست پولیس والے منصوبہ بند قتل و غارت گری کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ ۲۰ ستمبر کو جالندھر میں، دوسرے دن ترن تارن میں اور ۱۶ نومبر کو کپور تھلا کے مقام پر چار آدمیوں کو گولی مار دی گئی۔ وزارت داخلہ کے ایک خفیہ دستاویز کے مطابق "اس سنسنی خیز جرم سے مجرموں کی شناخت کے اشارے بھی ملے"...... پتہ یہ چلا کہ گولیوں پر "REM-UMC-38" لکھا ہوا تھا۔ یہ گولا بارود ہندوستان میں دستیاب نہیں تھا جہاں 38، ریوالور، صرف پولیس یا ہوائی فوج والے استعمال کرتے ہیں۔ تحقیقات سے پتہ چلا کہ اس گولا بارود کو ہوائی فوج یا پولیس نے کبھی بھی درآمد نہیں کیا اس لیے پولیس اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ سارا سامان چوری چھپے لایا گیا ہے۔ چنانچہ ہتھیاروں اور گولا بارود کے اسمگلروں سے پوچھ تاچھ ہوئی۔ بالآخر نومبر ۱۹۸۱ء کے آخری ہفتے میں ایک بیان میں مجرموں کی شناخت ہوئی...... بدقسمتی سے انکشاف یہ ہوا کہ مجرموں کی مدد میں فرید کوٹ کے سیوا سنگھ، گرنام سنگھ اور امرجیت سنگھ تین پولیس کانسٹبل ملوث تھے۔ ہیڈ کانسٹبل گرنام سنگھ آل انڈیا سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر بھائی امریک سنگھ کا چچازاد بھائی تھا۔ سنت جرنیل سنگھ بھنڈران والا کا قریبی ساتھی۔

جال پھیل رہا تھا اور جس لیڈر کی حیثیت مستحکم ہوتی جارہی تھی وہ تھا جرنیل سنگھ بھنڈران والا۔ ہاتھ میں بندوق اور زبان پر وعظ کے ساتھ ہی سنت نے مذہبی احتساب کا بھی آغاز کر دیا تھا ان کے پہلے ہدف نہ تو ہندو تھے اور نہ حکومت ہند، ان کے بجائے "گمراہ اور غدار" سکھ تھے۔ سرفہرست (پاک کے مقابلے میں) ناپاک نرنکاری تھے۔

۱۹ویں صدی کے وسط میں دیال داس نے اس بات کی تبلیغ کی کہ خدا کی کوئی شکل نہیں ہے اور اسی لیے اس کا نہ تو کوئی بت ہو سکتا ہے اور نہ کوئی شبیہ۔ انھوں نے مزید کہا کہ سنتوں اور دیویوں کا ادب و احترام بھی اتنا ہی بے معنی ہے۔ دیال داس پشاور کے ایک تجارت پیشہ ہندو خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور اپنے آپ کو "حقیقی گرو" کہتے تھے۔ ان کا انتقال ۱۸۵۵ء میں ہوا۔ اور ان کا نرنکاریوں کا فرقہ ہندو اور سکھ کے درمیانی سلسلوں میں سب سے

ممتاز ہے۔ ۱۸۹۱ کی مردم شماری میں ۳۸۹۰۷ افراد نے کہا کہ وہ ہندو نرنکاری ہیں اور ۱۱۸۱۷ افراد نے اپنے کو سکھ نرنکاری لکھوایا۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ ان نرنکاریوں نے ہندو اور سکھ دونوں مذاہب کے قائدین کو ناراض کیا۔ اکالی بابا دیال کا احترام اس لیے کرتے ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ بابا ان مصلحین میں سے ایک تھے جنھوں نے سکھ ازم کو ہندوؤں سے بچانے میں مدد کی۔ اگرچہ بابا دیال نے دس گروؤں کے مقابلے میں گرو گرنتھ صاحب پر زیادہ زور دیا۔ "پنجابی سماچار" کے ایڈیٹر بھائی ہری سنگھ شیر گل کے لکھے ہوئے اور ایس جی پی سی کے شائع کیے ہوئے ایک کتابچے "جینیٹیکس آف دی سکھ ۔ نرکاری نسل" کے مطابق "بابا دیال نے برہمن رسوم ورواج کی مذمت کی اور انھیں ترک کیا...... (ان کی) تحریک کا مقصد سکھ عقائد کو اس کی اصلی اور قدیم شکل پر بحال کرنا تھا" اکالی ناراضگی کا رخ ایک گمراہ فرقے کی طرف تھا جس کی شروعات تقسیم ملک سے ذرا قبل، نرنکار دربار کے ایک ملازم بوٹا سنگھ نے کی تھی۔ جو خود کتابچے کے مطابق، شراب اور اس سے متعلق دوسرے سماجی عیوب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ متعلقہ سماجی عیوب بھی بتائے گئے۔ "وہ گوشت خور ہونے کے ساتھ ساتھ شراب کے عادی اور آزادانہ جنسی تعلقات رکھنے والے تھے۔" کتابچہ مبینہ آزادانہ جنسی تعلقات کی کچھ مثالیں بھی پیش کرتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ بوٹا سنگھ آتشک کے مرض میں مبتلا ہو کر مری کے مقام پر، جو اب پاکستان میں ہے، ۱۹۴۳ء میں مارے۔ ان کے جانشیں اوتار سنگھ نے بھی ایسا لگتا ہے کہ انھی متعلقہ سماجی عیوب، بشمول آزادانہ جنسی تعلقات میں خصوصی درک حاصل کیا تھا۔ ان دونوں نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اپنے آپ کو آدم، نوح، رام، موسیٰ، جان دی بیپٹسٹ، عیسیٰ، پال، محمدؐ، نانک، گوبند سنگھ اور بابا دیال سے گربچن سنگھ تک (اوتار سنگھ کا بیٹا اور جانشیں) کے انتہائی عالی سلسلے سے براہ راست منسلک بتایا۔ بعد کو گربچن سنگھ نے پیغمبریت کے کسی بھی ایسے دعوے کی تردید کی۔ بہر حال جو بھی ہو اکالیوں نے اس گمراہ فرقے کے پیچھے ایک ناپاک اور نامبارک سازش دیکھی۔ ایس جی پی سی کے کتابچے کے مطابق حکومت ہند کی طرف سے اس فرقے کی شعوری طور پر ہمت افزائی ہو رہی تھی جو شروع ہوئی تھی اس وقت جب سردار پٹیل وزیر داخلہ تھے اور یہ ہمت افزائی شروع کی گئی تھی۔ "گوشت خوری، شراب نوشی اور عیاشی کی عادتیں ڈال کر پاک خالصہ کو آلودہ کرنے کے لیے اور اسی ذریعہ سکھ پنتھ کے ترجمان شرومنی اکالی دل کے امیج کو اس کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے ایس جی پی سی کے کتابچے نے اکالی دل کے حقیقی رول کی وضاحت بھی کی۔ <u>۱۹۴۶-۴۷ میں موقع گنوا دینے کے بعد</u> (عبارت کے نیچے خط مصنف نے کھینچا ہے) دل نے، مذکورہ پہلوؤں میں کمیونٹی کی خود مختار حیثیت کی بحالی کی حق بجانب تاریخی جد وجہد کو جاری رکھا۔ اکالی، دلی میں حکومت پر اس نرنکاری فرقے

کی مدد کرنے کے لیے کروڑوں روپیہ خرچ کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ وہ نرنکاریوں کو بھی، سکھ ازم کے الگ تشخص کو تباہ کرنے اور اس طرح ایک حقیقی خالصہ راج کو روکنے کے لیے "ہندو سازش" کا ایک عنصر سمجھتے ہیں۔

ایس جی پی سی کے جاری کیے ہوئے ایک قرطاس ابیض میں سکھوں کے غم و غصّے کا اظہار ہوتا ہے۔"اس تحریک کا اصل زور اور اس کی اصل خصوصیت سکھ ازم کی مخالفت ہے، اس کی روشن خیال آزادی کی حیثیت ثانوی ہے، اس کا طریقہ، سکھ رسوم و رواج کا حقارت آمیز اور بھدّا مذاق ہے۔ یہ سکھ مذہبی جذبات اور سکھ مذہبی عقائد کی تحقیر و بے عزّتی ہے اس کی محرک سیاست ہے۔ اور یہ سیاست ہے اس سیاسی قوت کی جس کا مطمحِ نظر سکھ عوام کو مستقل طور پر ذلیل اور پست ہمت کرنے اور انھیں اپنی تاریخ اور اپنی روحانی صلاحیتوں سے محروم کر کے دوسرے درجے کے شہری اور طفیلی بنا کر بالآخر انھیں علیحدہ وجود سے محروم کرنا اور انھیں گھٹا کر تاریخ پر لکھا ہوا حاشیہ بنا دینا ہے۔

جرنیل سنگھ بھنڈران والا نے اتنی آسانی سے حاشیہ بننے سے انکار کیا ۱۳ اپریل ۱۹۷۸ء کو بیاکھی کے دن جو سکھوں کے لیے ایک متبرک دن ہے کیوں کہ اسی دن خالصہ کی بنیاد رکھی گئی تھی، انھوں نے امرت سر میں ہونے والی نرنکاریوں کی ایک کانفرنس کے خلاف ہونے والے ایک مظاہرے کی قیادت کی۔ نرنکاری بھی تیار تھے۔ جھگڑا ہوا اور جھگڑے میں بھنڈران والا کے تیرہ حمایتی، تین نرنکاری اور دو راہ چلتے مارے گئے۔ اس واقعہ نے بھنڈران والا کی حیثیت بنا دی اب انھوں نے نرنکاریوں اور ان کی پشت پناہی کرنیوالوں یعنی ہندوؤں کو سرعام برا بھلا کہنے کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ ۲۴ اپریل ۱۹۸۰ء کو دلی میں نرنکاریوں کے سربراہ بابا گربچن سنگھ مار دیئے گئے۔ سنٹرل بیورو آف انوسٹی گیشن نے قتل کی سازش کرنے کا الزام بھنڈران والا پر لگا کر پہلی رپورٹ میں ان کا نام رکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے تمام اخباروں میں شاہ سرخیوں میں بھنڈران والا کا نام آنے لگا مگر عجیب بات ہے کہ اگرچہ بھنڈران والا بغیر کسی روک ٹوک کے آزادانہ ہر طرف گھومتے پھرتے تھے مگر انھیں اس کیس میں کبھی گرفتار نہیں کیا گیا اسے اتفاق کہیے کہ اس وقت امور داخلہ کے وزیر گیانی ذیل سنگھ تھے قانون کی گرفت سے اپنی اس عملی آزادی سے فائدہ اٹھا کر بھنڈران والا نے اپنے حمایتی بڑھائے انھوں نے گاؤں کا دورہ کیا اور وہاں حمایتیوں کے چھوٹے چھوٹے گروپ قائم کیے۔ ۳۱ مئی ۱۹۸۱ء کو امرت سر میں انھوں نے سکھوں کے اس مقدس شہر" میں تمباکو اور سگریٹ کی فروخت پر پابندی لگانے کے مطالبے میں ایک جلوس کی قیادت کی۔ جلوس میں شریک ہونے والوں نے سگریٹ کی چند دکانوں کو نذر آتش کر کے اپنے خالصہ جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ ریل کی پٹریاں اکھاڑنے کا

سلسلہ بھی شروع ہوا۔ ستمبر ۱۹۸۱ میں اس طرح کے چار واقعات ہوئے، دوسری طرف سکھوں کی اس بڑھتی ہوئی عسکریت کے خلاف ہندو ردِ عمل بھی شروع ہوا۔ ایک بار پھر ہندوؤں نے مردم شماری کرنے والوں سے کہا کہ پنجابی نہیں ہندی ان کی مادری زبان ہے۔ ایک انتہائی اہم ہندو لیڈر اور آریہ سماجی سیاست داں، اخبار کے مالک اور ایڈیٹر تھے لالہ جگت نرائن۔ ۹ ستمبر ۱۹۸۱ کو جب لالہ اپنی ایمبیسڈر کار میں گرینڈ ٹرنک روڈ (جس کا نام اب شیر شاہ سوری مارگ ہے) پر جا رہے تھے، سکھ انتہا پسندوں نے گولی مار کر انھیں ہلاک کر دیا۔ اس جرم کا الزام جن لوگوں پر لگایا گیا ان میں ایک بار پھر بھنڈران والا کا نام تھا۔ پولیس اپنی ماضی کی نرمی کا اعادہ نہیں کر سکی۔ اور بھنڈران والا سے کہا گیا کہ وہ اپنے آپ کو حوالے کر دیں۔ انھوں نے اپنی اس سپردگی کو ایک بہت بڑا عوامی تماشا بنا دیا اور دو لاکھ سے زیادہ سکھوں کے ایک مجمع کے سامنے انھوں نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کیا۔ پولیس نے ایک بار پھر ان کے خلاف کوئی بھی شہادت نہ ملنے کا عذر کیا۔ بھنڈران والا جیل سے لوٹے تو وہ نسبتاً بڑے ہیرو تھے۔

پڑوسی صوبے ہریانہ میں کچھ ہندوؤں نے لالہ جگت نرائن کے قتل پر ناراضگی کے اظہار کے لیے گرنتھ صاحب کی بے حرمتی کی، بھنڈران والا کے گروہ نے علی الاعلان یہ دھمکی دی کہ اگر اب پھر کبھی ایسا ہوا تو وہ ہندوستانی دستور کو تباہ کر دیں گے اور اب آل انڈیا سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری امریندر سنگھ سندھو جیسے نوجوان لیڈر نے دھمکیاں دینا شروع کیں کہ اگر بھنڈران والا کے ساتھ کچھ ہوا تو وہ کشت و خون سے پرہیز نہیں کریں گے۔ بھائی امریک سنگھ کے بھائی منجیت سنگھ نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ دربارا سنگھ کے بچوں اور بی جے پی لیڈر راج بہاری باجپئی کو جو اتفاق سے غیر شادی شدہ ہیں، جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی اور پنجاب کے پولیس والوں کی یونین کے صدر کرنیل سنگھ نے بھنڈران والا کو پورا تعاون دینے کا وعدہ کیا۔ سنت کا جال پھیل رہا تھا۔

تشدد کی رفتار میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا آخر کار حکام نے ۱۸ جولائی ۱۹۸۲ کو بھنڈران والا گروہ کے دو لیڈروں، بھائی امریک سنگھ اور چوک مہتا میں بھنڈران والا کے ہیڈ کوارٹرز کے منیجر تھارا سنگھ کو گرفتار کر لیا۔ بھنڈران والا نے اب یہ فیصلہ کیا کہ دور اندیشی، شجاعت و بہادری سے بہتر ہے۔ چنانچہ وہ بھاگے اور جا کر گولڈن ٹمپل میں پولیس والوں کی دست رس سے محفوظ، چھپ گئے۔ جرنیل سنگھ بھنڈران والا نے یہ جائے امن پھر کبھی نہیں چھوڑی حتیٰ کہ فوج ان کی لاش کو وہاں سے باہر لائی۔

اس سارے ڈرامے میں، اکالیوں کی حیثیت تماشائیوں کی ہو گئی تھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو علیحدگی پسندی کے نعرے اور بھنڈران والا کے تشدد سے منسلک نہیں کرنا چاہا مگر پیچھے رہنے سے وہ خوف زدہ بھی

تھے کیوں کہ اگر کوئی دوسرا کبھی بھی کسی سکھ تحریک کی قیادت کرنے میں کامیاب ہوتا تو کمیونسٹ کے لیے ان کی افادیت ختم ہوتی تھی۔ مزید یہ کہ کانگریس (اندرا) کے لیڈروں کے دہرا کھیل کھیلنے کے امکانات کو بھی وہ مسترد نہیں کر سکتے تھے۔ فرض کیجیے کہ کانگریس حکومت بھنڈراں والا سے گفت وشنید کرتی ہے اور ان کی کچھ مانگیں مان لیتی ہے تو اکالی کہاں ہونگے؟ یہ، جیسا کہ حالات نے ثابت کر دیا کہ ایک افسوس ناک کیس تھا کمزور حکمرانی اور مفرد ردعمل کا جس نے ایک ایسی آگ سلگائی جو بہت جلدی ہی قابو سے باہر ہو گئی۔

اکالیوں کی اجازت یا ان کے تعاون کے بغیر انتہا پسندوں نے ایک احتجاج شروع کر کے ان پر سبقت حاصل کر لی۔ بہر حال اکالیوں نے علیحدگی کے مطالبے جیسے دلفریب نعروں سے متاثر ہونے سے انکار کر دیا۔ ۱۲ اور ۱۵۔ اگست ۱۹۸۱ کو جنرل سکریٹری اور اکالی دل کے ایم ایل اے سکھجندر سنگھ نے جب خالصتان کے مسئلے پر پنجاب میں استصواب رائے کا مطالبہ کیا تو پارٹی نے ان کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ اکالیوں کے سامنے تین صورتیں تھیں یعنی یہ کہ انتہا پسندوں کے ساتھ گہرا تعلق رکھ کر کام کیا جائے۔ اس خیال کی وکالت ایس جی پی سی کے صدر گرچرن سنگھ توہرا نے کی۔ دوسری طرف پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ پرکاش سنگھ بادل نے بھنڈراں والا اور ان کے حالی موالیوں کو یکسر رد کرتے ہوئے پارٹی کو جنگجو مذہبی افراد سے بتدریج دور کرنے کی اپنی خاموش کوششوں کو جاری رکھا۔ اکالی دل کے صدر سنت ہرچند سنگھ لونگووال نے مسئلے کی نوعیت اور اس سیاسی فضا کو جس میں کہ فیصلہ لیا جاتا تھا پیش نظر رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے ایک معتدل اور متوسط راہ نکالنے کی کوشش کی۔ بہر حال تمام لیڈر اس بات پر متفق تھے کہ اگر بالکل تنہا نہیں رہنا ہے تو پارٹی کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ انھوں نے آنند پور صاحب ریزولیوشن میں مذکورہ مطالبات کی تکمیل کے لیے ایک "مذہبی جنگ" کی بات کرنا شروع کی۔

یہ حقیقتاً کون سے مطالبات تھے؟ پہلا ہریانہ کو علاقائی معاوضہ دیے بغیر چنڈی گڑھ پنجاب کو ملنا چاہیے۔ دوسرا پنجابی بولنے والے علاقے (فاضلکا اور ابوہر ضلعوں کے کچھ حصے) جو پنجاب سے باہر رہ گئے ہیں انھیں پنجاب کے صوبے میں شامل کیا جانا چاہیے۔ تیسرا آب پاشی کا سارا انتظام اور بھاکرہ ننگل ڈیم کا اہتمام پنجاب گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ چوتھا پنجاب چوں کہ دریا کے کنارے بسنے والی ریاست ہے اس لیے اس کو ۲۴ فی صدی سے زیادہ پانی لینے کی اجازت ہونی چاہیے (بقیہ پانی غیر ساحلی ریاستوں، جیسے ہریانہ اور راجستھان کے لیے) پانچواں مطالبہ مرکزی فنڈ سے زیادہ بڑے پیمانے پر سرمایہ لگا کر پنجاب میں نسبتاً زیادہ صنعتیں لگائی جانا چاہئیں۔ چھٹا حقیقی وفاقیت کے اصول کو مانتے ہوئے مرکز کو کچھ ان اختیارات کو پھر سے ریاست کے حوالے کر دینا چاہیے

جو اس نے پہلے کبھی ہڑپ کر لیے تھے۔ ساتواں، فوج میں بھرتی لیاقت کی بنیاد پر ہونا چاہیے نہ کہ آبادی کے تناسب پر۔ آٹھواں اتر پردیش کے ترائی کے علاقوں کے سکھ کسانوں کو پریشان نہیں کیا جانا چاہیے۔ اس کے بعد کچھ مذہبی مطالبات تھے۔ گولڈن ٹمپل سے شبد اور مذہبی گیتوں کو نشر کرنے کے لیے ایک ریڈیو اسٹیشن کی تنصیب ہونا چاہیے گولڈن ٹمپل کے نواحی علاقے میں (امرتسر کا اندرون چہار دیواری علاقہ) تمباکو اور شراب کی فروخت پر پابندی ہونا چاہیے۔ یہ مطالبات ۱۹۸۱ میں پیش کیے گئے تھے۔

۱۹۸۲ء کے موسم خزاں میں حکومت ہند نے ناقابل برداشت مصارف سے ایشیائی کھیلوں کا انعقاد کیا۔ خوف زدہ دہلی پر کچھ ایسی ہیبت طاری تھی کہ سکھ انتہا پسندوں کی طرف سے ہونے والی کسی گڑبڑ کے تدارک کے لیے خصوصی حفاظتی اقدامات کیے گئے ان اقدامات میں سکھوں کی من مانی جامہ تلاشی بھی شامل تھی۔ اس سلسلے میں بڑے بڑے سابق فوجیوں کو (یہاں تک کہ جنرل بھی) مستثنیٰ نہیں کیے گئے۔ اس کارروائی کو اپنی انتہائی ذلت کہہ کر اکالیوں نے اپنے مطالبات کے حصول کے لیے ایک "مذہبی جنگ" کا آغاز کیا کافی عرصہ بعد بلکہ حقیقتاً ایک سال سے زیادہ مدت کے بعد، اکالیوں کے دماغ میں ایک لہر اٹھی اور انھوں نے اپنے مطالبات کی فہرست میں ایک مطالبے کا اضافہ کر دیا۔

ہندوستان کے دستور کی دفعہ ۲۵ ہر ہندوستانی کو مذہبی آزادی کے اس کے بنیادی حق کی ضمانت دیتی ہے۔ "امن عامہ اخلاقیات وصحت اور اس حصے کے دیگر مندرجات کے تقاضوں کی روشنی میں تمام لوگوں کو ضمیر کی آزادی، مذہب کو ماننے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کا مساوی استحقاق ہے۔" ایک دوسری کاشق میں کہا گیا ہے کہ اس دفعہ کی کوئی بات اس قانون کے نفاذ کو متاثر نہیں کرے گی یا کسی ایسے قانون کے وضع کرنے میں مملکت کی راہ میں حارج نہیں ہوگی جو (الف) کسی اقتصادی، مالی، سیاسی یا دیگر سیکولر سرگرمی کو (جو مذہبی طور طریقے سے متعلق ہو، منضبط کرنے یا پابند کرنے کے سلسلے میں وضع کیا جائے (ب) سماجی بہبود اور اصلاح کے لیے نیز عوامی کردار کے ہندو مذہبی اداروں کے دروازوں کو، ہندوؤں کے جملہ طبقات اور فرقوں کے لیے کھول دینے کے اہتمام سے متعلق کوئی قانون وضع کیا جائے گا۔" اس دفعہ کے ساتھ مزید دو توضیحات ہیں: "اول یہ کہ کرپانوں کا لگانا اور ساتھ رکھنا مذہب کی پیروی ہی شامل متصور ہوگا۔ دوم یہ کہ شق نمبر ۲ کی ذیلی شق (ب) میں جہاں ہندوؤں کا ذکر آیا ہے وہاں یہ سمجھا جائے گا کہ اس میں وہ تمام افراد بھی شامل ہیں جو سکھ، جین یا بدھ مذہب کے پیرو ہیں۔ اسی طرح ہندو مذہبی اداروں کے ذکر میں بھی ایسا ہی تصور کیا جائے گا۔

اشتعال انگیزی کے لیے یہ کافی تھا۔ اکالی دل جو ۱۹۲۰ء میں خاص طور پر سکھوں کے مذہب اور ان کے تشخص کے تحفظ کے لیے وجود میں لایا گیا تھا اس کے لیے سکھوں کو "ہندوؤں کے طبقات اور گروہوں" میں شامل کرنا مذہبی بے حرمتی سے کم نہیں تھا "مذہبی جنگ" کو مزید وسعت دی گئی اور بڑے بڑے اکالی لیڈروں نے دستور کی دفعہ ۲۵ کو سر بازار نذر آتش کیا اور مارچ ۱۹۸۴ء میں جیل گئے مگر تعجب کی بات یہ نہیں تھی کہ اکالی مطالبات کر رہے ہیں، تعجب اس پر ہے کہ ابھی تک دہلی اور اکالیوں کے مناقشے کا حل نہیں نکلا تھا۔ اعتدال پسند اکالی درحقیقت دہلی پر اپنی فوقیت یا فتح کے خواہش مند تھے تاکہ وہ میر میدان ہونے کے اپنے منصب کو بحال کر سکتے اور قیادت اور پہل کو انتہاپسندوں کے ہاتھوں سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لے سکتے۔ دہلی میں بینائی سے محروم حکومت بھی اس بات کو سمجھ لیتی اور کوئی راہ نکال لیتی، جیسا کہ پنڈت نہرو نے ماسٹر تارا سنگھ اور سنت فتح سنگھ کے ساتھ اکثر کیا تھا مگر زخم کو مندمل کرنے کی بجائے حکومت نے اسے زہر باد بننے دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مختلف اوقات میں اکالیوں کے مطالبات کا کوئی نہ کوئی حل نکالا جا رہا تھا اور اعتدال پسند اکالی، دہلی کے لیے مسائل کو آسان بنانے کے خواہش مند تھے اور ان مسائل کو جو طے نہیں ہو پائے تھے انھیں سپریم کورٹ یا کسی ثالث کے سپرد کرنے کے لیے کافی تیار تھے۔ اکالی اپنے شیر کی پیٹھ پر سے اترنے کے لیے اتنے ہی خواہش مند تھے جتنا کہ کوئی دوسرا ہو سکتا تھا۔ ان کے تضادات جو بھی رہے ہوں ان کی سیاسی سرگرمیوں کی جو بھی نوعیت ہو وہ یہ خوب اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اس وقت مقابلے میں ایک خطرناک عنصر بھی کارفرما ہو جائے گا اور جس کے اوپر ان کا کوئی قابو نہ تو ہے اور نہ ہی ہوگا اور یہ عنصر تھا، متشدد، مسلح اور مالی طور پر مطمئن علیحدگی پسندوں کا۔ جو نہ تو سکھوں کی اکثریت کی رائے کے پابند تھے اور نہ ہی کسی منطق اور دلیل کے، وہ بس اپنے خوابوں کی مثبت تعبیر دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔

حکومت نے اس بات کا اظہار بھی کیا کہ وہ مذہبی مطالبات کو ماننے کے لیے تیار تھی رہ جاتا تھا سیاسی پہلو، سب سے بڑا مسئلہ چنڈی گڑھ کا تھا مگر مسز اندرا گاندھی، نے ۱۹۷۰ کے اوائل میں بذات خود، بڑے واضح طور پر چنڈی گڑھ کو پنجاب کو دے دیا تھا جہاں تک فاضلکا اور ابوہر کا سوال تھا، اسے ہریانہ کے حوالے کرنے کے لیے دس میل لمبا اور چار میل چوڑا ایک راستہ فراہم کرنا ہوتا کیوں کہ یہ مذکورہ علاقے ہریانہ سے متصل نہیں تھے۔ انھیں بہت آسانی کے ساتھ پنجاب میں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اکالیوں نے، سرحدوں، ہیڈ ورکس اور پانی کی تقسیم کے مسائل کے حل کے لیے کسی تیسرے کی ثالثی کی تجویز کی تھی، جہاں تک مرکز اور ریاست کے مابین تعلقات کا سوال تھا حکومت نے اس مسئلے پر

غور و خوض کرنے کے لیے ایک کمیشن کی تشکیل کر دی تھی۔ فوج میں بھرتی اور ترقی کے علاقوں کا مسئلہ اتنا اہم نہیں تھا کہ وہ مصالحت کی راہ میں رکاوٹ بنتا۔ اسی طرح دستور کی دفعہ ۲۵ کے سلسلے میں حکومت اس بات پر راضی تھی کہ مجوزہ ترمیم کا فیصلہ ججوں کے کسی پینل کے حوالے کر دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ پھر کوئی مصالحت کیوں نہیں ہوئی؟ اس سوال کا جواب اس انتہا پسندی میں نہیں تھا جس کے وافر ثبوت موجود تھے، اس سوال کا جواب تھا ایک نئی اور غیر مثالی پالیسی میں جس نے ۱۹۸۰ کے بعد مسز اندرا گاندھی کے عہد حکومت میں کانگریس (اندرا) کے فیصلوں پر بہت اثر ڈالا تھا۔

ساتویں دہائی کے اواخر میں، ایک یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ آزادی کے بعد سے ہندو اکثریت کے حقوق مار کر اقلیتوں کے بڑے ناز اٹھائے جا رہے ہیں اور انھیں بگاڑا جا رہا ہے۔ انتخابی فائدوں کے لیے اقلیتوں کی بے جا خاطر داری کا الزام لگایا گیا۔ خصوصاً کانگریس پر جس نے ہمیشہ اقلیتوں کے ووٹ چاہے اور حاصل کیے۔ اس سازش میں سب سے اہم کردار یقیناً نہرو کا تھا مگر ان کی بیٹی بھی کچھ کم مجرم نہیں گردانی گئی۔ ۱۹۸۱ء میں تامل ناڈو کے ایک گاؤں میناکشی پورم میں چند سو اچھوتوں کے اسلام قبول کر لینے کی انتہائی اچھالی ہوئی خبر کو روایتی آخری تنکا کہا جانے لگا۔ ہندو احیا پرستوں نے کہنا شروع کیا کہ ہندو اکثریت والے ہندوستان میں اب اسلام نہیں ہندو دھرم خطرے میں ہے۔ وشو ہندو پریشد اور وراٹ ہندو سمیلن (جس کے سربراہ گلاب سنگھ ڈوگرا کے جانشیں کرن سنگھ تھے) جیسی تنظیموں نے ہندو دھرم کے تحفظ کے لیے اپنی کوششوں کو تیز تر کر دیا۔ اس سب کا اثر اتنا گہرا تھا کہ مسز اندرا گاندھی نے بھی یہ یقین کرنا شروع کر دیا کہ اقلیتوں کی مزید ذرا سی بھی خاطر داری پر "ہندو ردعمل" ہونا لازمی ہے۔ اس احیا پرستی کا مقابلہ کرنے کے بجائے مسز گاندھی نے اس کے ساتھ ساتھ جہاں تک چلا جا سکے چلنے کا فیصلہ کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۱ء میں مراد آباد میں آزادی کے بعد کا بدترین تشدد مسلمانوں کے ساتھ ہوا مگر مسز اندرا گاندھی نے زبانی تسلی اور دلاسے کے لیے بھی اس وقت ایک حرف زبان سے نہیں نکالا۔ ہندو احیا پرست ۱۹۸۲ میں اس وقت اپنے عروج پر پہنچ گئے جب انھوں نے "ہندو دھرم کو بچانے" کے لیے ملک بھر میں یاترائیں شروع کیں۔

مسز گاندھی نے اکثر اقلیت مخالف انداز کا مظاہرہ کیا۔ وہ وقتاً فوقتاً اس بات کا اعادہ کرتی رہیں کہ ہندستان میں مسلمانوں نے ابھی تک اپنے تخریبی کھیلوں کو ترک نہیں کیا ہے۔ مسلمانوں سے متعلق ہر مسئلہ کی پشت پر کسی "بیرونی سازش" کا تذکرہ ہمیشہ ہوا۔ اسی طرح کے شک و شبہات سکھوں کے بارے میں پیدا کیے گئے۔ موخرالذکر کے

لیے یہ بات کسی حد تک خود تسکینی کی پیش گوئی بن گئی۔ اس لیے مسز گاندھی کے پاس کوئی پنجاب پالیسی نہیں تھی بلکہ وہ اقلیتوں کے لیے ایک پالیسی رکھتی تھیں جس کی توسیع انھوں نے پنجاب اور جموں و کشمیر دو اقلیتی ریاستوں تک کی۔ خود ان کی تقریروں میں اور ان کے بیٹے راجیو گاندھی کی تقریروں میں سکھوں، خصوصاً اکالیوں کی تصویر کشی علیحدگی پسندوں کی طرح کی گئی۔ اور جموں و کشمیر کے مسلمانوں بہ مع ان کے لیڈر ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو غداری بلکہ اس سے بھی بدتر قسم کے جھوٹے الزامات سے نوازا گیا۔ یہ رویہ کانگریس کے روایتی رویوں سے بڑے اساسی قسم کا احتراز تھا۔ ماضی میں سکھوں یا مسلمانوں کا کوئی حلقہ اگر کبھی وطن دشمنی کی آواز اٹھاتا تھا تو مرکز شعوری طور پر اس سے صرف نظر کرنے کی کوشش کرتا تھا اور جو مسلمان یا سکھ لیڈر ہندوستان کے دستور کو مانتے اور اس کا احترام کرتے تھے ان کے ساتھ نمایاں طور پر امتیازی سلوک کیا جاتا تھا۔ آج ہمارے سامنے اس کے بالکل برعکس صورت حال تھی۔ اگر ایک طرف فاروق عبداللہ ہر لمحہ اس پر اصرار کرتے رہے کہ وہ اول ہندوستانی اور آخر ہندوستانی ہیں، اور یہ کہ کشمیر ہندوستان کا جزو لاینفک ہے، تو دوسری طرف اندرا اور راجیو گاندھی فاروق عبداللہ کی حب الوطنی کی کوالٹی کے بارے میں کبھی علی الاعلان اور کبھی دبے دبے لفظوں میں اظہار خیال کرتے رہے۔ یہ پالیسی مرکز گریز داخلی پالیسی پر عمل درآمد کی ایک تباہ کن مشق تھی۔ جو شمالی ہندوستان کے عام ہندو موڈ کی غلط تاویل کا نتیجہ تھی۔

اور اسی طرح پنجاب میں بجائے اس کے کہ انتہا پسندوں کو بے سہارا بنانے کے لیے اکالیوں سے تعاون کیا جاتا دہلی دانستہ یا نادانستہ ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی۔ متعصب ہندو تنظیموں کی "سکھوں کو سبق سکھانے کے لیے" ہمتیں بڑھ گئیں جب دہلی آخرکار امن و سکون کی خواہش مند ہوئی تباہ کار ہندو "تو" کی ہمتیں بلند ہو چکی تھیں۔ یون شرما کی قیادت میں ہندو سرکشا سمیتی ہندوؤں کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اس تباہ کار بھوت نے جو معاوضہ اور جو قیمت وصول کی وہ فروری ۱۹۸۴ میں اس وقت سامنے آگئی جب کامیاب خفیہ مذاکرات کے بعد حکومت ایک سہ رکنی میٹنگ میں، جس میں حزب اختلاف بھی شامل تھا اکالیوں کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے تیار ہو گئی تھی، عین میٹنگ کے دن سمیتی نے اس خطرے کے پیش نظر کہ اکالی اور کانگریس کا معاہدہ ان کے لیے نہ جانے کیسا ثابت ہو، امن و شانتی کے سارے امکانات کو اپنی شرارت انگیزی سے ختم کر دیا۔ مذاکرات جاری تھے کہ سرکشا سمیتی نے ہریانہ میں سکھوں کے خلاف تشدد شروع کر دیا۔ یہ تشدد دن بھر چلا، اس میں بے سہارا سکھوں کی تحقیر کی گئی، انھیں ڈرایا دھمکایا گیا اور بے گناہ سکھوں کو جان سے مارا گیا، مذاکرات ناکام ہو گئے اور گولڈن ٹیمپل کے پرسکون ماحول میں بیٹھے ہوئے بھنڈران والا، خصوصیت کے ساتھ مسرور تھے، صرف یہی نہیں کہ ہندوؤں نے مفاہمت کے امکانات ختم کر دیے بلکہ اب بھنڈرانوالا

کے پاس ہندو مخالف نفرت و تعصب کا سامان بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ مگر ۱۹۸۱ اور ۱۹۸۴ کے درمیان پنجاب میں دہشت و بربریت کی طویل کہانی کے بارے میں انتہائی انوکھی بات یہ تھی کہ اس تمام اشتعال انگیزی اور دانستہ پیدا کیے جانے والے کھنچاؤ اور شک و شبہات کے باوجود ۱۹۴۷ کی طرح عام قتل و غارت گری اور تباہی کی آگ نہیں بھڑکی۔ ہمارا یہ عہد تلوار کا نہیں نیم خود کار ہتھیاروں کا ہے اور ذرا سے بھی بڑے پیمانے کے فسادات قتل عام کی طرف لے جا سکتے تھے۔ سکھ عوام نے ہندو مخالف فسادات کے لیے بھنڈران والا کی کوششوں کی حمایت نہیں کی۔ اکالی ایک مخمصے میں گرفتار تھے اور ان کے ذہن اس سلسلے میں صاف نہیں تھے کہ وہ بھنڈران والا سے علی الاعلان کب الگ ہوں گے۔ مئی ۱۹۸۴ تک وہ اپنا رخ اس سمت میں کر چکے تھے۔ اکال تخت نے جو سکھوں کا سب سے بڑا اور معزز مذہبی ادارہ ہے، بھنڈران والا کے خلاف الزامات کی فہرست تیار کرنا شروع کر دی تھی۔ علیحدگی پسند سنت نے اس پر اپنے ردعمل کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ وہ اکال تخت کی باتوں پر کان نہیں دھریں گے۔ اکال تخت نے جواب میں یہ انتباہ دیا کہ سکھ ازم کی پوری تاریخ میں اس کی حکم عدولی نہیں ہوئی ہے اور وہ اس قسم کی نافرمانیوں کو کسی حالت میں برداشت نہیں کرے گا۔

بھنڈران والا کا مسئلہ صرف ایک غیر یقینی اکالی قیادت ہی نہیں تھی بلکہ یہ ایک حقیقت بھی تھی کہ سکھوں کی ایک بڑی اکثریت کو ہندوستان کے اتحاد اور اس کی یک جہتی کو ختم کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور یہ صرف شہری یا مذہبی سکھ ہی نہیں تھے جو اس طرح سوچتے تھے بلکہ خالصہ جاٹ بھی جن میں بھنڈران والا کے گاؤں رروڈے کے قرب و جوار میں رہنے والے بھی شامل تھے، یہی انداز فکر رکھتے تھے۔ جب فروری ۱۹۸۴ میں میں نے اس گاؤں کا دورہ کیا اور جس نوجوان سے میں نے بات کی اور اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ اب رروڈے کو خالصتان کا نیا روحانی دارالسلطنت بننے کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے، تو اس نوجوان کا ردعمل بڑا سخت تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا "تم رہتے کہاں ہو؟" میں نے جواب دیا "کلکتہ میں" اس نے کہا "کیا تم کلکتے میں مجھے ایک کمرہ کرایے پر دے سکتے ہو؟" میں نے کہا "کیوں؟ اگر خالصتان بن گیا تو وہاں رہنے کے لیے؟" جواب میں اس نے یہ سوال کیا "ایسے کسی ملک میں کوئی کیسے رہ سکتا ہے جہاں اس پاگل سنت کی حکومت ہو؟" تین ماہ بعد گولڈن ٹمپل میں ہونے والی فوجی کارروائی کے بعد کتنے لوگوں نے اپنے ایسے خیالات بدل لیے ہوں گے۔ زندہ بھنڈران والا کو مسترد کرنے والوں میں سے کتنے ہوں گے جو مرے ہوئے علیحدگی پسند کے پیرو بن گئے ہوں گے؟ اس سوال کا جواب کوئی نہیں دیتا۔

ایک چھت پر بیٹھا ہوا ایک چالاک آدمی، جو مبلغ، سپاہی اور بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہا ہے، اس وقت بھی گفتگو یوں کرتا ہے جیسے کوئی سربراہ مملکت ہو اور کہتا ہے کہ اگر ہندوستان کی حکومت یا اس کی وزیراعظم

مسز گاندھی اس سے بات کرنا چاہتی ہیں تو وہ گولڈن ٹمپل میں آسکتی ہیں۔ وہ خود دہلی نہیں جاسکتا۔ ایسے ایک شخص کی موت کیا ایک جیت تھی؟

مَیں نے پوچھا تھا "وہ کس چیز سے خوف زدہ ہے؟ کوئی بھی چیز۔ مثلاً موت۔ اس نے جواب دیا تھا "مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا۔ ایک سکھ موت سے نہیں ڈر سکتا اور اگر وہ ڈرتا ہے تو وہ سکھ نہیں ہے۔" چاروں طرف بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں پر خوشامد اور چاپلوسی کی چمک تھی اور خود سنت اپنے فی البدیہہ فقروں سے انتہائی مسرور نظر آتے تھے۔

عقیدہ، جذبات، عزت، شناخت، خوف، نشوونما، خوش حالی، دارومدار، موقع پرستی، حیلے، حرص، شرافت، بے بسی، تعصب، دلولے، یہ سب عناصر ہیں جو اس وقت اور الجھیں گے اور تکلیف دہ ثابت ہوں گے جب پنجاب ایک بار پھر شورش سے گزرتا ہے۔



(۱۲)

پنجاب : ایک جنرل کی موت

سکھ والدین، دوسرے ہندوستانی والدین کی طرح اپنے بچوں کے نام اپنی خواہشوں اور اپنے ولولوں کے مطابق رکھتے ہیں۔ جرنیل سنگھ کے ماں باپ نے بھی چاہا تھا کہ ان کا لڑکا بڑا ہو کر کسی فوج کی قیادت کرے۔ جرنیل پنجابی زبان میں انگریزی کے لفظ جنرل کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جرنیل سنگھ کا رجحان عسکری تھا مگر اس نے اسے مذہب کی خدمت میں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کا بھائی ہندوستانی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوا اور ۱۹۸۴ تک ترقی کر کے ایک صوبے دار (نان کمیشنڈ افیسر) بن گیا۔ جون کے پہلے ہفتے میں دونوں بھائی ایک اہم لڑائی میں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ گولڈن ٹمپل کے اندر انتہاپسندوں کے ساتھ ایک خونخوار جنگ کے بعد جب ہندوستانی فوج نے وہاں سے چتاؤں پر جلانے کے لیے انتہاپسندوں کی لاشیں نکالیں تو اس میں جرنیل سنگھ کی لاش کو اس کے بھائی نے ہی پہچانا تھا۔

اس سال اپریل، مئی اور جون کے مہینوں میں پنجاب میں تشدد میں اضافہ ہی ہوتا رہا تھا، رات کی ڈیوٹی پر کام کرنے والے صحافی دیت نام کی باتیں کرتے تھے۔ کیفیت یہ تھی کہ آپ کچھ اموات پر بھروسہ کر کے ایک بے کیف دن کی کہانی تیار کر سکتے تھے۔ سارے ملک میں ایک بے بسی کا ماحول پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ کیوں کہ اقلیت کا فاشزم نہ صرف یہ کہ بڑھ گیا تھا بلکہ وہ کامیاب بھی ہو رہا تھا۔ علیحدگی پسندوں نے بھی یہ تصور کرنا شروع کر دیا تھا کہ ان کے خواب پورے ہو رہے ہیں۔ لندن سے خالصتان کے خود ساختہ صدر ڈاکٹر جگجیت سنگھ چوہان نے بھنڈراں والا کو پیغام بھیجا کہ اب خالصتان کی ہنگامی (وقتی) حکومت کے قیام کے اعلان کا وقت آ گیا ہے۔ یہاں سے ردِ عمل مثبت ہوا۔ یہ بات خود ڈاکٹر چوہان نے سیما مصطفیٰ کو بتائی تھی اور جو ۱۹ جون کے ڈیلی ٹیلی گراف میں شائع ہوئی تھی اسکیم یہ تھی کہ ایک پارلیمنٹ نامزد کی جائے گی جس کا اجلاس گولڈن ٹمپل میں ہوگا۔ ایک حکومت کی تشکیل ہوگی جو سکھوں

سے کہے گی وہ اس حکومت کو اپنی وفاداری بھی دیں اور اپنے ٹیکس بھی۔ اسی دوران لندن میں ایک "خالصتان ہاؤس" قائم کر دیا جائے گا اور دنیا کے دوسرے ملکوں سے خالصتان کو تسلیم کرنے کی اپیل کی جائے گی۔ (نئی دہلی میں سرکاری حلقوں کا خیال تھا کہ درحقیقت چند ممالک ایسا کرنے پر تیار تھے)

اکالی حسب دستور کسی بھی ایسے لیڈر کے پیچھے چلنے کے لیے بے چین تھے جس نے ان کی مذہبی جنگ کو ایک قدم بھی آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا ہو۔ ایک سال سے زیادہ ہو گیا تھا کہ وہ مسز گاندھی کی حکومت سے مصالحت کی کوشش میں خفیہ طور پر ملاقاتیں کر رہے تھے مگر کسی اور چیز نے نہیں، بدگمانی نے کامیابی کے امکانات کو ختم کر دیا۔ طرفین نے ایک دوسرے پر بے ایمانی اور تذبذب کے الزامات لگائے۔ بات چیت کے ذریعے کسی معاہدے کی توقع ایسا لگتا تھا کہ ختم ہو گئی ہے۔ اکالیوں نے اعلان کیا کہ وہ ۳ جون کو گرو ارجن کے یوم پیدائش سے ہندوستان کے کسی بھی حصے میں پنجاب سے ہونے والی اناج کی برآمد کو روکیں گے اور سکھوں سے کہیں گے کہ وہ کوئی بھی ٹیکس ادا نہ کریں۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ڈرامے کا کوئی انجام سامنے آ رہا ہے۔ یکم جون کو شعلہ بھڑک اٹھا جب گولڈن ٹمپل کے علاقے میں بنی ہوئی عمارتوں کی محفوظ چھتوں پر مقیم بھنڈراں والا کے مسلح آدمیوں اور باہر تعینات فوج کے درمیان گولیاں چلیں اور اس میں گیارہ آدمی مارے گئے۔ تشدد میں دوسرے دن بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ پنجاب کے مختلف شہروں میں بارہ آدمی دہشت پسندی کا شکار ہوئے۔ ہوشیار پور میں انچاس سالہ سابق ایم ایل اے ادم پرکاش بگا کو اسکوٹر پر سوار تین دہشت پسندوں نے اپنی گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ اسی شام اچانک ایک اعلان ہوا کہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی ریڈیو پر قوم کے نام ایک خصوصی پیغام نشر کریں گی اور یہ وہ لمحہ تھا جب پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ وہ بھی ہو سکتا ہے جو سوچا نہیں جا سکتا یعنی فوج سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ گولڈن ٹمپل کے علاقے میں داخل ہو جائے۔ اس سے پہلے آخری دفعہ سکھوں کے اس مقدس مقام میں فوج اس وقت داخل ہوئی تھی جب احمد شاہ ابدالی نے اپنے مالِ غنیمت لے کر افغانستان واپس ہونے والے قافلوں پر کیے جانے والے مسلسل حملوں سے تنگ آکر، اپنے سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ وہ، انتقامی طور پر گولڈن ٹمپل کو اڑا دیں مگر اس واقعے کو دو سو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ گولڈن ٹمپل اور اس سے متصل بنی ہوئی عمارتیں سکھوں کے لیے مقدس ترین تھیں۔ گولڈن ٹمپل جیسے مقامات کو، جس کی بنیاد گرو ارجن نے رکھی تھی یا اکال تخت جسے گرو ہری کشن نے تعمیر کیا تھا، پہنچنے والا ذرا سا بھی نقصان ہر سکھ کو جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھیں انتہا پسندوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے خفا کرنے کے لیے کافی تھا۔ دوسری طرف، علیحدگی پسند عناصر، دوسروں کی شرافت کا پورا فائدہ اٹھا رہے

تھے۔ بھنڈران والا اور اس کے ساتھیوں نے انجام سے بے نیاز ہو کر ان مقامات مقدسہ کو قلعوں میں تبدیل کر دیا تھا جہاں ہندوستان کے دستور کی عملداری نہیں تھی۔ ہر روز گولڈن ٹمپل سے چند مزید ہندوؤں کو مارنے کے احکامات اور ضروری ہتھیار انتہا پسندوں کو بھیجے جاتے تھے۔ اور توہرا، لونگوال اور بادل جیسے اعتدال پسند اکالی لیڈر خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ کیا ہو رہا ہے مگر انھوں نے اسے چیلنج نہیں کیا، ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ صورت حال اس حد تک بگڑ چکی ہے کہ صرف فوج ہی انتہا پسندوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ بھنڈران والا کو اس بات کا پورا یقین اور بھروسہ تھا کہ مسز اندرا گاندھی فوج کو بھیجنے کی ہمت کبھی نہیں کریں گی مگر مسز اندرا گاندھی نے ہمت کی جیسا کہ وہ اپنی زندگی میں اکثر کرتی رہی تھیں۔

دو جون سنیچر کی شام کو، مسز اندرا گاندھی قومی ٹیلی ویژن پر آئیں اور پنجاب کے بارے میں باتیں کیں۔ ان کی تقریر سے پہلے ٹیلی ویژن پر دو گیت ہوئے۔ پہلی اثر انگیز نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" تھی جو سر محمد اقبال کی تھی۔ انھوں نے یہ نظم اس صدی کی دوسری دہائی میں لکھی تھی جب وہ ایک متحدہ ہندوستان پر ایمان رکھتے تھے دوسرا گیت سرسوتی وندنا تھا۔ مسز گاندھی نے قوم کو بتایا کہ حکومت نے اکالیوں کے اکثر مطالبات مان لیے ہیں مگر کوئی معاہدہ صرف اس لیے نہیں ہو پایا ہے کہ سکھ ہر دفعہ کچھ اور نئے مطالبات سامنے رکھ دیتے ہیں انھوں نے الزام لگایا کہ ایسا لگتا ہے کہ تمام اکالی فیصلے اب انتہا پسند کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے اس عدم تعاون کی تحریک کا ذکر کیا جو اگلے دن سے شروع ہونے والی تھی۔ مسز گاندھی نے یہ نہیں کہا کہ انھوں نے فوج کو گولڈن ٹمپل میں داخل ہونے کا حکم دے دیا تھا مگر اب یہ بات ظاہر تھی۔ فوج کے اس اقدام کا سربراہ خود بھی ایک سکھ تھا۔ ویسٹرن کمانڈ کے چیف آف اسٹاف لفٹیننٹ جنرل رنجیت سنگھ دیال کو اسی دن پنجاب کے گورنر بی۔ ڈی۔ پانڈے کا سکیورٹی ایڈوائزر بھی مقرر کیا گیا۔

فوج اس قسم کے امکان کے لیے تیاری کر رہی تھی پنجاب کے حساس علاقوں میں فوجی دستے تعینات کیے جا چکے تھے اور بہانہ یہ تھا کہ سرحدی حفاظتی فوج چوں کہ سکھ انتہا پسندوں سے نبٹنے میں مصروف ہے، فوج، اسمگلنگ کے تدارک اور عام حفاظتی انتظامات کے وہ کام کرے گی جو عام حالات میں سرحدی حفاظتی فوج کرتی ہے۔ میرٹھ اور سکندرآباد سے پیدل فوج کے دو ڈویژن امرت سر بھیجے گئے۔ مسز گاندھی نے جب اپنی تقریر ختم کی ہے اس وقت یہ ڈویژن گولڈن ٹمپل کے اطراف میں مورچے سنبھال رہے تھے۔ اتوار کی صبح ہوئی اس وقت تک ہر شخص جان چکا تھا کہ اصل جنگ شروع ہو چکی تھی۔ بھنڈران والا جو عام طور پر بڑے جوش و خروش میں رہتا تھا اس دن افسردہ اور مغموم تھا۔ صحافی جو اکالی عدم تعاون تحریک کی خبروں کے لیے امرت سر میں موجود تھے حسب معمول

بھنڈران والا سے ملنے گئے۔ اخبار ٹیلی گراف کے فوٹوگرافر سندیپ شنکر جو بھنڈران والا سے ملنے والے باہر کے آخری آدمی تھے ان کا کہنا ہے کہ "وہ (بھنڈران والا) خود رائفلوں میں گولیاں بھر بھر کر اپنے ساتھیوں کو دے رہے تھے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ اگر فوج اندر آئی تو وہ اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔" اس رات نو بجے سے سارے پنجاب میں چھتیس گھنٹے کا کرفیو نافذ کر دیا گیا یہ وہ مدت تھی جو خالصتان چاہنے والوں کو ختم کرنے کے لیے فوج کو دی گئی تھی۔

ترسیل کے بری اور ہوائی تمام ذرائع مسدود تھے اور باقی ملک سے پنجاب کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ دیسی اور بدیسی صحافیوں سے بڑی نرمی کے ساتھ یہ کہا گیا کہ وہ اپنے ٹائپ رائٹروں کو کچھ آرام دے لیں۔ ان سب کو بحفاظت پنجاب سے باہر پہنچا دیا گیا۔ جنرل دیال اور جنرل کے سندرجی نے اپنے ڈویژنوں اور بریگیڈ کمانڈروں کے ساتھ گولڈن ٹیمپل کے صدر دروازے سے تقریباً پچاس میٹر کے فاصلے پر اپنی کارروائی کے ہیڈ کوارٹرز قائم کیے۔ انتہاپسندوں نے اپنے دفاع کے لیے تین دائروں میں یا تین صفوں میں انتظام کیا تھا۔ بیرونی سمت میں انھوں نے سترہ شہری گھروں پر قبضہ کر لیا تھا جہاں سے فوج کو آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کرنا تھی۔ دفاع کی دوسری صف گولڈن ٹیمپل کی چہار دیواری پر بنی ہوئی عمارتوں پر تھی۔ چھتیں، گھنٹہ گھر، پہرے کے مینار اور وہ تمام عمارتیں جن پر سے رائفلوں اور بندوقوں کے ذریعے اس مرکزی صحن پر قابو رکھا جا سکے جہاں سے علیحدگی پسندوں کے کنٹرول روم پر قبضہ کرنے کے لیے فوج کو بہرحال گزرنا تھا۔ تیسری دفاعی لائن اکال تخت میں قائم خود کنٹرول روم تھا، اکال تخت کی مقدس عمارت جہاں بڑے بڑے لیڈر اور خاص خاص لوگ جمع تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں بھنڈران والا، بھائی امریک سنگھ، ماہر فن حرب شاہ بیگ تھے۔ شاہ بیگ سنگھ لفٹیننٹ جنرل دیال کی طرح ایک جنگی ہیرو تھے۔ وہ میجر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے اور ۱۹۷۱ میں بنگلہ دیش کی جنگ میں گوریلا جنگی کارروائیوں کے پیچھے ان ہی کا دماغ تھا مگر بدعنوانیوں کے الزامات کے پیش نظر انھیں فوج سے "چھٹی" دے دی گئی تھی اب وہ ایک کٹر خالصتانی ہیں (انھوں نے ایک صحافی خاتون تولین سنگھ کو اپنی موت سے کچھ قبل بتایا تھا کہ آخری واقعہ جس نے ہندوستان پر سے ان کا اعتماد بالکل ختم کر دیا وہ تھا ۱۹۸۲ کے ایشیائی کھیلوں میں جاتے ہوئے دہلی کے راستے میں ان کی تحقیر کا واقعہ)

۴ جون کی صبح کو چار بج کر ۴۵ منٹ پر لڑائی کا آغاز ہوا۔ پہلے مقابلے میں پانچ گھنٹوں تک گولیاں چلتی رہیں اس کے بعد سناٹا ہوا۔ ۵ جون کو انتہاپسندوں نے گولیاں چلانے میں پہل کی۔ فوج کو اب کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ انتہاپسند کتنی اچھی طرح مسلح تھے۔ ان کے پاس ہتھیاروں اور گولہ بارود کی کمی نہیں تھی۔ دونوں فریق

گولیاں چلاتے رہے۔ سات بجے شام کو فوج نے فیصلہ کیا کہ اب بڑی بندوقوں کو لاکر اس تعطل کو ختم کرنا چاہیے۔ ایک ۳۰۷/ انچ والی توپ کی مدد سے اس مینار اور پانی کے حوض کو تباہ کیا گیا جہاں سے انتہا پسند ابھی تک بڑی کامیابی سے فوج کو آگے بڑھنے سے روکے ہوئے تھے۔ جوں ہی خالصتانی، افراتفری کے عالم میں پیچھے ہٹے، فوجیوں نے فوراً ہی گولڈن ٹمپل کے اندر اپنے قدم جمالیے۔ اب کام یہ رہ گیا تھا کہ مرکزی صحن کو پار کرکے اکال تخت پر قبضہ کیا جائے۔ دو مسئلے تھے جنھوں نے اس کارروائی کو بڑا خطرناک بنا دیا تھا۔ پہلا مسئلہ ہر طرف سے ہونے والی لگاتار چلتی ہوئی جان لیوا گولیوں کا تھا جن کے سامنے فوجی کے جانے کا مطلب یقینی ہوئی بلکہ کی موت مرنا تھا اور دوسرا مسئلہ یہ حقیقت تھی کہ فوج کو بڑی سختی سے یہ ہدایت دی گئی تھی کہ کسی بھی صورت میں گولڈن ٹمپل پر آنچ نہیں آنا چاہیے جو صحن میں بنے ہوئے ایک حوض کے بالکل بیچوں بیچ واقع تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ فوج نہ تو گولیوں کا جواب گولیوں سے آزادانہ دے سکتی تھی اور نہ ہی بڑی توپوں کو استعمال کرکے اپنے لیے راستہ بنا سکتی تھی۔ ہندوستانی فوج نے جاں بازی اور بہادری کا ایک اور ثبوت دیتے ہوئے کسی طرح کی بھی حکم عدولی نہیں کی اگرچہ اس احتیاط میں انھیں دو سو سے زیادہ جوانوں کی جانیں گنوانا پڑیں۔

اس کارروائی میں جرنیلوں پر یہ انکشاف ہوا کہ انتہا پسندوں کے پاس اندازے سے کہیں زیادہ ہلکی اور اوسط درجے کی مشین گنیں تھیں اور انھیں نہایت ماہرانہ اور جان لیوا طریقے پر استعمال کیا جارہا تھا۔ اس رات ساڑھے دس بجے، بجلی کی سپلائی بند کرکے فوج کا اصل حملہ شروع ہوا۔ انتہا پسندوں نے دو بڑے الاؤ جلائے تاکہ اس کی روشنی میں وہ فوج کی نقل وحرکت پر نظر رکھ سکیں۔ اس صورت حال سے نبٹنے کے لیے جنرل برار مدد و جینتا ٹینک لائے جن میں آنکھیں خیرہ کر دینے والی روشنیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان ہی روشنیوں میں فوجیوں اور کمانڈوز نے پیش قدمی شروع کی۔ فوجیوں کی بہت جانوں کا اتلاف ہوا وہ توپوں کی مدد کا مطالبہ کرتے رہے مگر وہ انھیں نہیں ملی کیوں کہ جنرل کسی حالت میں بھی گولڈن ٹمپل کو زک نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ فوج کے ایک یونٹ نے چار دیواری پر بنی ہوئی عمارتوں میں سے ایک پر قبضہ کرلیا۔ وہاں پھنسے ہوئے تقریباً چار افراد نے جن میں دو بڑے اکالی لیڈر، سنت ہرچند سنگھ لونگوال، گرچرن سنگھ توہرا اور ہر خالصہ کی انچارج خاتون بی بی امرجیت کور بھی تھیں، اپنے آپ کو فوج کے حوالے کردیا۔ اس میں ایک حیرت انگیز سپردگی آل انڈیا سکھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نوجوان سکریٹری ہرچندر سنگھ سندھو کی تھی۔

مسلسل جنگ کے بعد، دوسری صبح تک بھی فوج اکالی تخت تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ اب بکتر بند گاڑیاں لائی

گیئں، انتہاپسندوں نے اس کا جواب اینٹی ٹینک راکٹوں سے دیا۔ کسی نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ بھنڈران والا کے لوگوں کے پاس اس اعلیٰ معیار کے ہتھیار ہوں گے۔ آخر میں فوج ٹینکوں کو اندر لانے پر مجبور ہوگئی۔ صبح طلوع ہو رہی تھی جب فوج اکال تخت میں داخل ہوئی۔ دوپہر تک وہاں کے کمرے کمرے کے لیے لڑائی ہوتی رہی۔ کمین گاہوں سے وقتاً فوقتاً گولیاں چلنے کا سلسلہ دوپہر تک جاری رہا۔ ۷ جون کی صبح کو، فوج بالآخر اکال تخت کے تہ خانے میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئی۔ وہاں ۳۵ لاشوں (بشمول شاہ بیگ سنگھ اور امریک سنگھ) میں جرنیل سنگھ بھنڈران والا کی لاش بھی تھی۔

پنجاب پر اچانک ایک سکوت طاری ہوگیا۔ دلی کے شاندار بنگلوں میں بیٹھے قیمتی اسکاچ پیتے ہوئے متمول شہریوں سے لے کر کھیتوں پر کام کرنے والے کسانوں تک، سکھ رائے عامہ کے حلقے، جو کچھ ہوا تھا اس پر ہیبت زدہ تھے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جنھوں نے علیحدگی کی مانگ کو کبھی بھی معاف نہیں کیا وہ بھی اس فوجی کارروائی کا جواز ڈھونڈنے سے قاصر تھے۔ ساری دنیا کے سکھوں نے سوگ منایا۔ بھنڈران والا ایک رات میں ایسا ہیرو بن گیا جیسا وہ زندگی میں کبھی نہیں بن پایا تھا۔ ہندو ردعمل اگر خوشی کا نہیں تو اطمینان کا تھا ایک دو ہفتے تک تو ایسا لگا کہ مسز گاندھی نے اپنی وہ مقبولیت بحال کرلی جو انھیں بنگلہ دیش کی جنگ کے بعد ملی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ دونوں طرف مزاج کچھ ٹھنڈے ہونے شروع ہوئے۔ حکومت نے اپنے تمام وسائل مجتمع کر کے اکال تخت کی تعمیر نو کی۔ اس سلسلے میں ایس جی پی سی کو نظر انداز کرنے کی ایک احمقانہ کوشش کی گئی اور گولڈن ٹمپل کی تعمیر نو کی ذمہ داری ایک خاصے مقبول مگر کم سمجھ نہنگ لیڈر بابا سنتا سنگھ کے حوالے کردی گئی مگر شکر ہے کہ جلد ہی عقل آگئی اور آخرکار فوج نے گولڈن ٹمپل کو بڑے مذہبی لوگوں کے حوالے کردیا۔ صدر ذیل سنگھ نے اس وقت اس حکومت کے جس نے گولڈن ٹمپل پر اس حملے کا حکم دیا تھا، رسمی سربراہ ہونے کی وجہ سے سکھوں کی زبردست ناراضگی مول لی تھی۔ انھوں نے بڑے مذہبی رہنماؤں کے سامنے اپنی مبینہ غلطیوں کی معافی مانگ کر اپنے آپ کو سکھ دھرم سے باہر کیے جانے سے بچالیا۔

پنجاب میں تشدد پسندوں کا تشدد پورے طور پر ختم نہیں ہوا مگر بہرحال اب یہ پہلے جیسے بڑے پیمانے پر نہیں تھا۔ اکتوبر کے آخر تک ہندوستان کو دوسرے مسائل کی پریشانی لاحق ہوچکی تھی۔ مسز اندرا گاندھی کی حیثیت اور ان کے وقار میں آندھرا پردیش کی مضحکہ خیز ناکامی کے بعد، جہاں مرکزی حکومت کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ایک جانب دار گورنر نے ایک جائز حکومت کو برطرف کردیا تھا، بہت کمی ہوگئی تھی حکومت کے اس اقدام پر

ملک نے اپنی ناراضگی کا خاصے موثر طور پر اظہار کیا۔ جمہوریت ظاہر ہے محفوظ رہتی ہے اگر عوام سڑکوں پر نکل کر نئے پولیس کی گولیوں کا سامنا کرنے اور ایک عوامی حکومت کی بحالی کی خاطر جان دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

انتخابات کا جوش و خروش ملک کی فضا میں محسوس ہونے لگا تھا۔ جنوری ۱۹۸۵ کے پہلے ہفتے میں ان کا ہونا طے ہوا تھا۔ حرص و ہوس کی شکار حزب اختلاف کی پارٹیوں نے الیکشن سے پہلے کی روایتی نوچ کھسوٹ شروع کی اور پھر اس نتیجے پر پہنچیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہیں کہ ایک ملی جلی سرکار کی پیش کش کریں اور اس کے امکان کے لیے ملک کو تیار کریں۔

اگر پنجاب کا ذکر کبھی ہوتا تھا تو صرف یہ کہ آیا وہاں انتخابات کرانا ممکن تھا یا نہیں۔ اکتوبر کے آخری ہفتہ تک وزیر داخلہ نرسمہا راؤ نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ انھیں کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ پنجاب میں باقی ملک کے ساتھ انتخابات کیوں نہیں ہونے چاہئیں۔ مسز اندرا گاندھی بہر حال کچھ بہت زیادہ پُر امید نہیں تھیں۔ ۳۰ اکتوبر کو اڑیسہ کے اپنے دورے کے اختتام پر جو بالکل واضح طور پر ان کی انتخابی مہم کا ایک حصہ تھا ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے مسز گاندھی نے کہا کہ انھیں ابھی بھی یقین نہیں ہے کہ سکھ انتہا پسندوں کے تشدد پر آزادانہ اور محفوظ رائے شماری کرانے کے لیے کافی قابو حاصل کیا جا چکا ہے۔

دوسرے دن سکھ انتہا پسندوں نے وہاں گزند پہنچائی، جو نازک مقام تھے دل کے جہاں چوٹ لگنے سے ملک بھر کو انتہائی تکلیف ہوئی۔ یہ بات عام طور پر لوگ جانتے ہیں کہ مسز گاندھی جب عوامی مجمعوں میں جاتی تھیں تو ایک مخصوص بلٹ پروف جیکٹ پہنا کرتی تھیں۔ دہلی میں ان کے دن کی شروعات عموماً کچھ وقت اُن عام لوگوں کے ساتھ گزار کر ہوتی تھی جنھیں ان کے دفتر اور گھر کے ملے جلے احاطے میں داخل ہونے کی اجازت ہوتی تھی۔ یہ جگہ اکبر روڈ اور صفدر جنگ روڈ کے کنارے پر واقع ہے، ظاہر ہے کہ تمام آنے والوں کی پورے طور پر تلاشی ہوتی تھی۔ آپریشن بلواسٹار کے بعد حفاظتی انتظامات مزید سخت کر دیئے گئے تھے۔

۳۱ اکتوبر بدھ کی صبح یہ روزانہ کا درشن ملتوی کر دیا گیا تھا، پچھلے رات ان کا پوتا اور ان کی پوتی ایک معمولی سے حادثے کا شکار ہو گئے تھے اور پریشان مسز گاندھی ہنسنے اور خوش طبعی کے موڈ میں بالکل نہیں تھیں۔ روزانہ درشن کے اس پروگرام کے لیے جو مزید حفاظتی انتظام ہوتا تھا اسے ترک کر دیا گیا تھا۔ مسز گاندھی نے کچھ وقت رہائش گاہ کے اپنے آفس میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور اسی لیے انھوں نے بلٹ پروف جیکٹ پہننا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ وہ اپنی رہائش گاہ سے احاطے سے ہوتی ہوئی دفتر کی طرف چلیں جب ہی ان کے دو حفاظتی گارڈوں

نے، جو اُن کے گھر میں ان کی حفاظت کرنے کے لیے تعینات کیے گئے تھے، اُس اعتماد کو ٹھوکر مار کر جواُن پر کیا گیا تھا، ایک اسٹین گن اور ایک ریوالور استعمال کرتے ہوئے اس سے پہلے کہ دوسرا حفاظتی عملہ انھیں گولی مارے، سات گولیاں ان کے جسم میں پیوست کر دیں۔

سب انسپکٹر بینت سنگھ اور کانسٹبل ستونت سنگھ نے انتقام لے لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ سازش کی اس کامیابی کا مطلب انٹلی جنس سروسز کی کھلی ناکامی تھا۔ قتل کی منصوبہ بندی میں یقیناً دونوں سکھ اکیلے نہیں تھے۔ وزیر اعظم کے حفاظتی گارڈوں میں دونوں کا بغیر کسی شک وشبہہ رہنا ان کی ذاتی صلاحیتوں کا مظہر تو ہے ہی، ساتھ ہی یہ حکومت کی لاپرواہی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ مگر جس وقت یہ خبر ملک بھر میں پھیلی اس وقت لوگوں کے ذہن میں پہلا سوال یہ نہیں تھا۔ معتبر رپورٹوں کے مطابق، مسز گاندھی بہت دیر زندہ نہیں رہیں اگرچہ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں ان کا آپریشن بھی ہوا — سب سے اہم سوال ظاہر ہے کہ یہ تھا کہ اب وزیر اعظم کون ہو؟ کانگریس (اندرا) کے اہم لیڈر اس مسئلے پر تبادلۂ خیال کے لیے بیٹھے۔ مسز گاندھی کے بیٹے، اور بظاہر وارث، راجیو گاندھی صریحی دعوے دار تھے، اس دن وہ دہلی میں نہیں تھے بلکہ مغربی بنگال کے مارکسسٹوں کے گڑھ میں الیکشن کی مہم میں مصروف تھے اور اچھے خاصے بڑے بڑے مجمعوں کو خطاب کر رہے تھے۔ وائرلیس پر یہ خبر سن کر ایک پولیس والا کاغذ کے ایک پرچے پر لکھا ہوا پیغام راجیو گاندھی کے پاس لے گیا جو اس وقت دیہی بنگال کے کولاگھاٹ کے مقام پر تھے۔ پرچے پر لکھا تھا مسز گاندھی کے ساتھ ایک حادثہ پیش آگیا ہے۔ راجیو گاندھی کو فوراً دہلی واپس آنا چاہیے۔

ان کے بیٹے کو یقیناً بدترین شبہات ہوئے ہوں گے مگر انھوں نے خبر وں کو بڑے سکون اور ضبط کے ساتھ سُنا۔ وہ ایک خصوصی ہوائی جہاز کے ذریعہ واپس آئے۔ ان کے نام پر اگر کوئی اختلاف یا اعتراض ہو سکتا تھا تو وہ تھا تو صرف ان کے ناتجربہ کار ہونے کا۔ ۱۹۸۰ میں جب ان کے چھوٹے بھائی سنجے ایک ہوائی حادثہ میں ہلاک ہوئے تھے اس وقت تک راجیو گاندھی نے سیاسی قوت کی موہنی آواز سے اپنی دلچسپی کا کم ہی اظہار کیا تھا وہ ایک ائر لائن پائلٹ کی حیثیت سے اتنا کمانے پر قانع تھے جس سے ایک نسبتاً آرام دہ زندگی گزر جائے۔ یہ صرف ۱۹۸۰ کے بعد ہوا کہ اس سلسلے کی ان کی تربیت شروع ہوئی وہ صرف چالیس برس کے تھے۔ کیا ستر کروڑ آبادی والے اس ملک کے وزیر اعظم کی ذمہ داریاں ان کو دی جا سکتی تھیں؟

یہ بحث چل رہی تھی اور حکومت ہند کے سرکاری ذرائع ترسیل یہ افسانہ سنائے جا رہے تھے کہ مسز گاندھی ابھی زندہ ہیں اور اسپتال میں موت اور زیست کا مقابلہ جاری ہے، خبر رساں ایجنسیوں نے یہ خبر دے دی تھی کہ ان کا انتقال

ہو چکا ہے اخباروں نے خصوصی ایڈیشن نکالے۔ امریکہ کے رونالڈ ریگن نے، وزیر اعظم کے انتقال کے سرکاری اعتراف سے پورے چار گھنٹے قبل اپنا تعزیتی پیغام بھیج دیا تھا۔ ہندوستان اس دن، پڑوسی ملک پاکستان میں ایک دن کا کرکٹ میچ کھیل رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے وقفے کے کچھ دیر بعد ہندوستانی ٹیم کے منیجر ڈنگر پور کے راج سنگھ نے آبدیدہ ہوتے ہوئے اعلان کیا کہ ان کی ٹیم اپنا کھیل جاری نہیں رکھ سکتی کیونکہ ان کی وزیر اعظم کا انتقال ہو گیا ہے مگر جہاں تک آل انڈیا ریڈیو کا تعلق ہے اس کے لیے مسز گاندھی اب بھی زندہ تھیں، بہر حال شام تک یہ فیصلہ لے لیا گیا کہ مسز اندرا گاندھی کا انتقال ہو گیا ہے اور راجیو گاندھی اب وزیر اعظم ہوں گے۔

غالباً اہم لیڈروں کے سامنے انتخاب کا کوئی موقع نہیں تھا اس افسوس ناک خبر سے لگنے والے دھکے کے اثرات ذرا کم ہوئے تو سارے ملک نے غم و غصے اور شکست و ریخت کا وہ مظاہرہ کیا کہ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے روزنامہ ٹیلی گراف کی شاہ سرخی غالباً صورت حال کو بڑے جامع انداز میں پیش کرتی ہے۔ "مسز گاندھی کو گولی مار دی گئی۔ ملک زخمی۔" ایک عورت کی موت کے غم میں غصے سے بھرے ہوئے عوام کی شہروں کو بند کرانے کی خبریں ملک کے ہر حصے سے آ رہی تھیں۔ یہ موت ایک ایسی عورت کی تھی جو بلا شبہہ ایک شہید کا مرتبہ حاصل کر چکی تھی۔ اور امکان تھا کہ اسے دیوی کا مرتبہ بھی مل جائے گا۔ عوام کے اس غم و غصے نے بتدریج ایک خطرناک شکل اختیار کرنا شروع کر دی اور سکھوں کے خلاف تشدد میں تبدیل ہو گیا۔

جس دن مسز گاندھی کا انتقال ہوا اس دن تشدد نسبتاً دبا دبا سا تھا۔ مگر دوسرے دن، مسز گاندھی کے مرنے پر دنیا بھر میں سکھوں کی خوشیاں منانے کی خبریں آنے لگیں۔ برطانیہ اور امریکہ میں ٹیلی ویژن کے کیمروں کے سامنے شمپین کی بوتلوں کے کاگ اڑائے گئے۔ خود امرت سر میں، لوگوں نے سکھوں کو مٹھائی بانٹتے ہوئے دیکھا (جس طرح گولڈن ٹمپل میں فوجی کارروائی پر کچھ ہندوؤں نے مٹھائی تقسیم کی تھی) سکھوں کے اعلیٰ مذہبی رہنماؤں نے بھی ہندوؤں کی تحقیر میں اس طرح اعانت کی کہ انھوں نے پہلے تو قاتلوں کی مذمت کی اور بعد میں اس مذمت کو واپس لے لیا۔

سکھ جنھوں نے مسز گاندھی کی موت کی توصیف کی وہ اپنے وجود سے متعلق ایک سیدھی سادی اور پرانی حقیقت کو بھول گئے تھے۔

ان کی تعداد کافی نہیں تھی اور اس میں بھی ان کی ایک چھوٹی سی تعداد، تقریباً پانچواں حصہ پنجاب سے باہر رہتا تھا۔ یہ بیس فی صدی سکھ شمالی ہندوستان کے شہروں میں بکھرے ہوئے تھے، دہلی میں خصوصاً اس کے

علاوہ پٹنہ، کلکتہ، بھوپال، کان پور، دہرادون اور نہ جانے کتنے دوسرے مقامات پر۔

اس پر مزید یہ کہ وہ خوش حال تھے ان کی دوکانیں تھیں ان کے پاس کاریں تھیں جو چیز سکھوں سے عام دشمنی کی شکل میں شروع ہوئی وہ آخر میں کسی اور چیز میں تبدیل ہو گئی۔ شہری علاقوں کے مفلس اور غریب لوگوں پر اچانک یہ انکشاف ہوا کہ حملہ کرنے اور لوٹنے کی ان کو اجازت مل گئی ہے۔

لوٹ کا ذائقہ منہ کو لگا تو انھوں نے خون کی تلاش شروع کی ساری دلی پر ایک ہوا بیٹھ گیا۔ تقسیم کے بعد پہلی دفعہ سکھ اس ہیبت ناک اور ناقابل یقین فرقہ وارانہ تشدد کا نشانہ بنے جو اس ملک نے ۱۹۴۷ء میں دیکھا تھا سکھوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نذر آتش کیا گیا۔ بچے مارے گئے، دوکانیں لوٹی گئیں، کاروں کو آگ لگائی گئی۔ بازار تباہ کیے گئے۔ مکانات جلا کر راکھ کیے گئے۔ ٹرینیں روکی گئیں۔ اس میں سفر کرنے والے سکھ مسافر نیچے اتار لیے گئے اور تالیاں بجاتے ہوئے نعرے لگاتے ہوئے پاگل بلوائیوں نے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔

عوام الناس نے حالات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ پولیس تماشائی تھی، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس سارے پاگل پن میں ملوث۔ مشرقی دلی میں قتل عام ہوا۔ دلی ریلوے اسٹیشن پر ٹرینیں آتی رہیں مگر یہ مسافر نہیں، ہیبت ناک کہانیاں لا رہی تھیں۔ یہاں ایک بار ۱۹۴۷ء دہرایا جا رہا تھا۔ وہی سلسلہ وہی ترتیب۔ ایک اقلیتی فرقے کے مذہبی رہنماؤں کی برسہا برس کی اشتعال انگیزی، ابتدا میں خود اپنوں کا تعاون عنقا، بحران میں بتدریج اضافہ، ایک سہمی ہوئی پریشان اکثریت، صبر و ضبط کی آزمائش اور پھر اچانک ایک دن ایک واقعہ جس نے اکثریتی فاشزم کو بھڑکا دیا۔ ۱۹۸۴ء اور ۱۹۴۷ء میں ایک فرق اگر تھا تو وہ یہ تھا کہ اس دفعہ ہندوستان انگریزوں کے ماتحت نہیں تھا۔ یہاں کوئی تیسرا فریق نہیں تھا جو داد دیتا۔

خالصتان، پاکستان کی طرح آسانی سے حاصل ہونے والا نہیں ہے مگر ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو ہندستان نے، خالصتان کے لیے کی جانے والی دوسری جنگ کا پہلا موڑ دیکھا۔ پہلا موڑ جرنیل سنگھ بھنڈران والا اور مسز اندرا گاندھی کے درمیان ہوا تھا۔ ۳۱ اکتوبر کو یہ تنازعہ اگلی نسل کے سپرد کر دیا گیا۔

پنجاب کی تاریخ کا ایک اور باب اپنے اختتام کو پہنچا۔ مگر سوال یہ تھا کہ کہانی اب کیا رُخ اختیار کرے گی؟ ہندوؤں اور سکھوں کے باہمی تعلقات بنیادی طور پر تبدیل ہو چکے تھے۔ اخوت اور بھائی چارہ، قصۂ پارینہ ہو چکا تھا سکھ اب ہر لحاظ سے اور خصوصاً نفسیاتی طور پر، ہندوستان میں ایک اقلیت ہو چکے تھے۔ ملک کے صدر گیانی ذیل سنگھ، ایک سکھ تھے مگر اس لگاؤ اور اس محبت کے لیے، جس نے ۱۹۶۲ء، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی

جنگوں میں، سکھوں کو ہندوستان کے جاں باز محافظوں کا درجہ دے دیا تھا۔ ایسی علامتی مہربانیوں سے زیادہ کسی اور چیز کی ضرورت ہوگی۔ کیا ایک مرا ہوا بھنڈران والا، زندہ بھنڈران والا کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور اور موثر ہوگا؟ اکالیوں کے اغلب حلقوں نے ابھی تک ہمیشہ علیحدگی پسندی کو مسترد کرنے میں عقل مندی سمجھی، کیا اب وہ بدل جائیں گے؟ یا سکھوں کی بڑی اکثریت جنرل دیال کی طرح اس بات کو قبول کرے گی کہ ان مذہبی طاقتوں کے ساتھ، جو تشدد اور علیحدگی کی ہمت افزائی کرتی ہیں، اسی طرح کا سلوک ہونا چاہیے؟ کیا سکھ عوام کے لیے جمہوریت اور سیکولرزم کی توانا دل فریبی بدستور رہے گی؟ کیا وہ اقدار، جنھوں نے اس انوکھے ملک کو جنم دیا ہے، انسانی المیے کے بوجھ کو انگیز کرنے کے لیے کافی توانا ثابت ہوں گی؟ سوالات مختصر ہیں مگر جوابات طویل۔



تیسرا حِصّہ

کشمیر

(۱)

جنّت میں جمہُوریّت

اس دنیا میں، سیاحوں کے لیے شائع ہونے والے کتابچوں میں جنت جیسی خوبصورتی کیلئے بہت سے اشتہارات ہوتے ہیں۔ اس دعوے کی تکمیل کرنے والی ایک ممتاز جگہ، عظیم ہمالیہ کے مغرب میں خوب صورت جھیلوں سے مزین ایک وادی ہے۔ وادیٔ کشمیر۔ سطح سمندر سے پانچ ہزار فیٹ بلند ہندستان کے سر پر تاج کی طرح کشمیر کی گھاٹی ہے جس کے چار طرف پہاڑوں کے سلسلے ہیں، ہمالیہ، شمالی کشمیر کے پہاڑی سلسلے اور جنوب میں پیر پنجال۔ اگرچہ کشمیر کا کُل علاقہ بہت بڑا ہے مگر آبادی زیادہ تر وادی میں مرکوز ہے۔ اور آبادی کا تقریباً نوّے فی صد حصّہ مسلمانوں پر مشتمل ہے اس حسین پرستان کے بارے میں نہ جانے کتنا شعر و ادب ہے اگرچہ اس میں اچھا خاصہ حصّہ لفّاظی اور عبارت آرائی کا بھی ملتا ہے۔ اس ادبی سرمایے میں، ممتاز کشمیری جواہر لال نہرو کی ایک انتہائی اثرانگیز تحریر بھی ہے جو انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے۔ "ایک اُس انتہائی حسین و جمیل صورت کی طرح، جس کا حسن بڑا غیر شخصی اور انسانی خواہشات سے ماورا ہو، کچھ ایسا نسوانی حسن تھا۔ کشمیر کے دریاؤں، اس کی وادیوں، اس کی جھیلوں اور اس کے درختوں کا۔ اور پھر اسکی ساحرانہ خوب صورتی کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے، مردانہ حُسن کا ایک پہلو، سخت پہاڑوں اور سنگین چٹانوں کا پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں اور گلیشیروں کا اور پہاڑوں کی بلندیوں سے وادی میں گرنے والے جھرنوں کا، جو حسین بھی ہیں اور ہیبت ناک بھی۔ اس اکثر کے سینکڑوں چہرے ہیں اور لاتعداد پہلو۔ ہر آن بدلتے ہوئے کبھی مسکراتے ہوئے، کبھی افسردہ، کبھی غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے ...... یہ اس محبوب کے چہرے کی طرح تھا جو خواب میں نظر آتا ہے اور آنکھ کھلتے ہی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔"

ایک زمانے میں، دشوار گزار پہاڑی درّے واحد راستے تھے اس وادی میں آنے اور یہاں سے

جانے کے۔ اس کی اس تنہائی اور یکسوئی نے بہرحال اسے نواح کی عظیم سلطنتوں کی دست رس سے باہر نہیں رکھا۔ جنوب میں دہلی، شمال میں وسط ایشیائی حکومتیں، مغرب میں افغان اور مشرق میں تبتی اور چینی۔ مگر پہاڑ اچھے دوست تھے اور وفادار محافظ۔ جب تاتاریوں کے سلسلے کے ایک ہیبت ناک شخص زلفی خاں جو دلچو کے نام سے بھی جانا جاتا تھا، چوتھی صدی کے اوائل میں اپنے گھوڑسواروں کی معیت میں آیا تو اس نے سری نگر کو نذرِ آتش کیا، بے حساب مالِ غنیمت اور پانچ ہزار غلام (کہانی یہی ہے) اپنے ساتھ لے گیا۔ مگر یہ سب کس کے لیے، محض واپسی میں درۂ دیواسار کے مقام پر ایک برفانی طوفان میں اپنی پیدل فوج کے ساتھ تلف ہو جانے کے لیے۔

۱۸۴۶ء میں کشمیر کا مقدر، پیر پنچال کے جنوبی سلسلے کے پار کے صوبے جموں کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ جموں کے ڈوگرا راجہ نے پچھتر لاکھ روپیوں میں، کشمیر کو انگریزوں سے خرید لیا یہ کوئی سودا نہیں بلکہ پنجاب کے سکھوں کے خلاف انگریزوں کی لڑائی میں ڈوگروں کی خدمات کا صلہ زیادہ تھا۔ جموں و کشمیر کی سلطنت سو برسوں (اکتوبر، ۱۹۴۷ء) تک ڈوگروں کے ہاتھوں میں رہی۔ سری نگر کشمیر کی موسم گرما کی راجدھانی، اور جموں شہر موسم سرما کا دارالخلافہ بنا۔ ڈوگروں نے بانہال کارٹ روڈ اور جہلم دہلی روڈ بنا کر وادی کے دروازے کھول دیئے۔

جموں میں، جنوب کی طرف ہندوؤں کی اکثریت تھی مگر بحیثیت مجموعی، سلطنت کے مسلمان، تعداد کے لحاظ سے ہندوؤں کے مقابلے میں تین اور ایک کی نسبت سے زیادہ تھے۔ اسی لیے تقسیم کی منطق کے ہر پہلو کے پیش نظر کشمیر کو پاکستان میں، جو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے وجود میں آیا تھا، جانا چاہیے تھا۔ مگر کشمیر پاکستان میں نہیں گیا۔ جناح صاحب نے اپنے بس بھر جتن کر لیے۔ پہلے تو انھوں نے ہندو مہاراجہ اور مسلمانوں کے عوامی لیڈروں کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی، اس میں وہ ناکام رہے، تب انھوں نے، آزادی ملنے کے تین ہفتوں کے اندر اندر حملہ آور اور اس کے بعد پاکستانی فوجی دستے بھیجے کہ وہ طاقت کے بل پر کشمیر پر قبضہ کر لیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان لوگوں نے سری نگر پر تقریباً قبضہ کر لیا تھا مگر پھر انھیں پیچھے دھکیل دیا گیا۔ یہاں تک کہ ان کے تصرف میں مغرب میں وادی کا ایک چھوٹا سا حصہ اور شمال میں، افغانستان اور چین کی سرحدوں پر ایک وسیع پہاڑی بنجر علاقہ رہ گیا۔ اس وقت کشمیر منقسم ہے اور حدِ فاصل وہ لائن ہے جس پر ۱۹۴۸ء کے آخری دن پہلی ہند پاک جنگ میں، جنگ بندی کے وقت فوجیں کھڑی تھیں۔ کشمیریوں کی بہت بڑی تعداد ہندوستان میں رہتی ہے۔ سری نگر ان کا دارالخلافہ ہے۔ پاکستان کے مقبوضہ کشمیر پر، مظفر آباد کے شہر سے ایک حکومت، حکمرانی کرتی ہے اور جو اپنے علاقے کو آزاد کشمیر کا نام دیتی ہے۔

دو آدمیوں نے کشمیر کو ہندوستان میں رکھا۔ دو کشمیری برہمن خاندانوں کے اخلاف۔ ان میں سے ایک ظاہر ہے کہ جواہر لال نہرو تھے جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے اپنی آخری سانس تک یعنی ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء تک ہندوستان کے وزیراعظم رہے تھے۔ دوسرے فرد تھے شیخ عبداللہ جن کے خاندان نے اٹھارہویں صدی کے اواخر میں برہمن ازم کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ شیخ عبداللہ نے جنھیں پیار سے لوگ "بابائے قوم" یا "شیرِ کشمیر" کہتے تھے اپنے عوام کو ایسی خود اعتمادی اور ایک نظریہ دیا جس نے انھیں ایک غلام ماضی کے بوجھ سے نجات دلائی اور صدیوں بعد پہلی دفعہ اس سرزمین کو آس دلائی۔ وہ اپنے مشن کو بیان کرنے کے لیے اپنے پسندیدہ شاعر علامہ اقبال کا یہ مصرعہ اکثر پڑھا کرتے تھے:۔ "اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے" ایک کامیابی، جسے سمجھنے میں ایک ہی چشمے سے دیکھنے کی وجہ سے دنیا کو آج بھی دشواری ہوتی ہے یہ تھی کہ شیخ عبداللہ اور کشمیری، ۱۹۴۷ء میں پاکستان جانے کے بجائے ہندوستان میں ٹھہرے۔ جیسا کہ شیخ عبداللہ بار بار کہا کرتے تھے کہ جناح صاحب کے ساتھ وہ ایک مشترکہ مذہب رکھتے ہیں، اور نہرو کے ساتھ ایک مشترکہ خواب۔

یہ دو خاندان، نہرو کا خاندان اور شیخ عبداللہ کا خاندان جس طرح، ہندوستان اور کشمیر کی سیاست پر حاوی رہے ہیں اس کی شاید نظیر نہیں مل سکتی۔ دونوں خاندان بہترین ذاتی دوست تھے اور بدترین سیاسی دشمن۔ جب انھوں نے ایک دوسرے سے تعاون کیا، امن تھا۔ جب دونوں لڑے تو سری نگر پھٹ پڑا، دونوں نے ہندوستانی قومیت سیکولرزم اور جمہوریت سے زبردست تعلق اور وفاداری کا مظاہرہ کیا اور دونوں جب، ان تعصبات اور کمزوریوں کا شکار ہوئے جنھیں اگر تعدیل قوت کی منطق کی روشنی میں دیکھیے تو انھوں نے سارے ملک کو متزلزل کر کے رکھ دیا۔ ۱۹۴۷ء میں شیخ عبداللہ اور جواہر لال نہرو دونوں نے ایک آواز ہو کر کہا کہ کشمیر کو ہندوستان میں رہنا ہے کیوں کہ یہی وہ محل ہے جہاں انسانیت، جمہوریت اور اخوت کے نظریات کی، انتہائی مشکل حالات میں آزمایش کی جا سکے گی۔ اگر مسلم کشمیر، ایک سیکولر اور سوشلسٹ ہندوستان میں پل بڑھ سکتا ہے تو اس سے بہتر جواز اس نظریئے کے خلاف نہیں پیش کیا جا سکتا جس نے ملک کو تقسیم کرایا اور پاکستان بنوایا۔

جناح صاحب نے، تقسیم سے پہلے شیخ عبداللہ کی طرف سے بارہا دھتکارے جانے کے باوجود، کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ کشمیر کے پاکستان سے الحاق میں کوئی دشواری بھی ہو سکتی ہے کیونکہ بہر حال انگریز ہندوستان کی تقسیم کی ضمانت کلی طور پر مذہب کی بنیاد پر لے رہا تھا۔ کشمیر میں چوں کہ مسلمانوں کی زبردست اکثریت تھی لہٰذا وہ پاکستان کا حصہ تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ کو پاکستان سے الحاق کرنے پر مجبور کرنے کی

اپنے بس بھر کوشش کی۔ ہندوستان کے پہلے وزیرِ داخلہ، مستحکم عزم وارادے کے مالک، سردار پٹیل بھی کشمیر پاکستان کو دینے پر پورے طور پر راضی تھے۔ اس معاملے میں کسی جغرافیائی خلط ملط کا بھی کوئی سوال نہیں تھا۔ کشمیر صرف یہی نہیں کہ نئے ملک کے ساتھ مشترکہ سرحد رکھتا تھا بلکہ اس کی بہت سی ضروری سپلائی اور خدمات کا انحصار ان علاقوں پر تھا جو پاکستان میں جانے والے تھے۔ اس بظاہر منطقی منظر نامے میں صرف ایک رکاوٹ تھی۔

کشمیری پاکستان نہیں جانا چاہتے تھے، انھوں نے دو قومی نظریے پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ یہاں تک کہ اس وقت بھی، جس بیسویں صدی کی غیر معمولی چوتھی دہائی میں، کشمیر کی سرحدوں پر، پنجاب میں اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں ہندو اور مُسلمان ایک دوسرے کو ذبح کر رہے تھے۔ کشمیر کی وادی میں متعصبانہ قتل کا ایک بھی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اس کے برعکس، کشمیری مسلمانوں نے ان پاکستانیوں کے خلاف لڑ کر اپنی جانیں دیں جو کشمیر میں اپنے مسلمان بھائیوں کو غلامی سے نجات دلانے والے "جہاد" میں اپنے فوجیوں اور اپنے لیڈروں کو وادیٔ کشمیر میں بھیج رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ عبداللہ نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ کو جب پناہ گزینوں کے کیمپس بھرے ہوئے تھے اور دل خالی تھے، دہلی میں مسلمانوں کے ایک مجمعے کو خطاب کرتے ہوئے کسی حد تک فخر کے ساتھ کہا تھا:

"میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری یا مولانا آزاد کی پیروی کریں، مگر میں آپ سے یہ ضرور کہتا ہوں کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایتوں کی ضرور پیروی کریں جو تیرہ سو سال قبل انھوں نے دی تھیں۔ رسولِ مقبول صرف مسلمانوں کے نہیں تمام نوعِ انسانی کے محسن تھے...... آپ دو قومی نظریے اور اپنے بعض لیڈروں کی پھیلائی ہوئی نفرت کے شکار ہو گئے ہیں۔ ہم کشمیر کے لوگوں نے اس کا اثر نہیں لیا اور اس سے مدافعت کی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم امن سکون کی فضا میں رہ رہے ہیں اور آپ اور آپ کے ہزاروں بھائی ناقابلِ بیان مصائب سے گزر رہے ہیں۔

آپ کو میری نصیحت ہے امن وشانتی کے ساتھ رہیے اور پروپگنڈے سے گمراہ نہ ہوجیے۔"

شیخ عبداللہ ایک مشترکہ بصیرت کی بنا پر نہرو اور گاندھی کے ساتھ رہے مگر اس وقت کیا ہوگا اگر دہلی میں یہ مشترکہ بصیرت بدل جائے؟ اس وقت کیا ہوگا جب قوم پرستی اور جمہوریت کمزور ہونا شروع ہوجائے اور رجعت پسند مذہبی قوتیں اپنا زور دکھانے لگیں، اور اس وقت کیا ہوگا جب ملک کا دستور خود اس کے محافظوں کے ہاتھوں پامال ہونے لگے۔ انڈین یونین کی اساس ایک مخصوص نظریے پر رکھی گئی تھی جو فرد کو اس کی آزادی بھی ودیعت کرتی ہے اور مہاتما گاندھی کے ساجی فلسفے سے ایک مشترکہ وفاداری کا مطالبہ بھی کرتی ہے۔ اسی لیے یونین کی بقا ان ہی اقدار کے تحفظ اور استحکام پر منحصر ہے۔ دوسرے الفاظ میں، ہندوستان کے اتحاد اور اس کی یک جہتی کو خطرات جتنے

بیرونی ہیں اتنے ہی داخلی بھی ہیں۔ دہلی میں برسر اقتدار لوگ اگر کسی بہانے کا سہارا لے کر کبھی اس بنیادی نقطے سے ہٹ گئے، تو یہ اتنا ہی خطرناک ہو سکتا ہے جتنا کہ پاکستانی فوج تھوڑی سی زمین پر قبضہ کر کے اسے دہلی کے اثر سے آزاد قرار دے دے۔

شیخ عبداللہ نے آزادی کے بعد صرف چھ سال کشمیر میں حکومت کی۔ ۱۹۵۳ء میں انھیں جیل بھیج دیا گیا جب کہ دہلی میں ان کا بہترین دوست وزیر اعظم تھا۔ شیخ عبداللہ جو اب بھی اس مقصد کے وفادار تھے، پھر واپس آئے، اور اپنی زندگی کے آخری سات برسوں میں کشمیر کی عنان حکومت ان کے ہاتھوں میں رہی۔ ۱۹۸۲ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے جسدِ خاکی پر ہندوستان کا پرچم لپیٹا گیا تھا۔

ان کے بعد ان کے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے ان کی جگہ لی ــــ اور ۱۹۸۳ء کے انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ انھیں ورثے میں صرف عقیدہ ہی نہیں ووٹ بھی ملے ہیں۔ جولائی ۱۹۸۴ء میں وہ متعدد ایسے فیصلوں کی بنا پر حکومت سے ہٹائے گئے جنھوں نے اگرچہ جمہوریت کی روح کو پامال کر دیا مگر انھیں نہرو کی بیٹی مسز اندرا گاندھی کی منظوری حاصل رہی۔ ۱۹۵۳ء کی طرح اس دفعہ بھی کشمیری عوام احتجاج کے لیے سڑکوں پر نکل آئے اور پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ کیا کچھ تبدیل نہیں ہوا تھا؟ یا انسانی اطوار کی کجروی کے باوجود، یہ توقع باقی تھی کہ وہ خواب جو ۱۹۴۷ء میں دیکھا گیا تھا کسی دن صحیح ثابت ہو گا؟



(۲)

راجہ اور کِسان

ہندو عقیدہ، حسب توقع کشمیر کے وجود میں آنے کے عمل کی بڑی نفیس اور خوب صورت تصویر فراہم کرتا ہے۔ وادی ایک خوب صورت جھیل تھی۔ بستی سر، جس میں ناگا، جنھیں سانپ والا کہا جاتا تھا، بستے تھے۔ ان پر جالا دیو کی ہیبت کا سایہ تھا۔ اس ہیبت سے جب ناگا تنگ آ گئے تو مجبور ہو کر اپنے سرپرست نیلا ناگا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نیلا ناگا نے اپنے باپ برگزیدہ کشیپ (جو دُنیا کے خالق، برھما کے دماغ سے پیدا ہوئے تھے) کے حضور میں درخواست کی۔ کشیپ ناگاؤں کی نجات کے لیے طویل مراقبے میں گئے۔ دیوتاؤں کو رحم آیا۔ لارڈ شیوا، بدن پر خاکستر ملے، لنگوٹ باندھے، کیلاش کی چوٹی پر اپنے استھان سے نیچے آئے اور اپنے زبردست ترشول کو پہاڑ کے ایک طرف پھینک دیا۔ پہاڑ میں ایک سوراخ بن گیا اور جھیل کا پانی باہر نکلنے لگا یہاں تک کہ زمین سوکھ گئی۔ شیوا کی ساتھی لکشمی نے ایک مینا کا روپ دھارا اور بڑی بلندی سے دیو کے اوپر ایک کنکر گرا دی، دیو اپنے گوشت پوست میں جم کر رہ گیا۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ ایک پہاڑی کے برابر ہو گیا۔ یہ پہاڑی آج ہری پربت کے نام سے جانی جاتی ہے۔ ہری پربت کی چوٹی پر شہنشاہ اکبر کا بنوایا ہوا ایک قلعہ ہے اور ڈھال پر ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے متبرک مقامات بکھرے ہوئے ہیں۔

اس برگزیدہ ہستی سے عقیدت اور احسان مندی کے اظہار کے طور پر یہ جگہ کشیپ امر (کیشپامار) کہی جاتی تھی۔ یہی نام ہے جو بگڑتے بگڑتے کشمیر ہو گیا۔ کشیپ نے جنوب کے میدانوں سے اس وادی میں بسنے کے لیے لوگوں کو مدعو کیا۔ سائنس اس ساری کہانی کی وضاحت شاید زیادہ آسانی سے کر سکتی ہے۔ ایک برفیلے عہد کی جھیل، ایک زلزلہ جس سے پہاڑوں میں شگاف پڑا اور ارضیاتی دھماکا ہوا جس نے زمین سے ایک پہاڑی اگل دی وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال دیومالا نہ صرف خوب صورت ہے بلکہ لوگ اس پر یقین بھی رکھتے ہیں۔ کشمیر ابتدائی ہندوازم

کا ایک بہت بڑا مرکز تھا، اس کا جو محل وقوع ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مختلف نظریات و خیالات کی راہ گذر بنے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر آج کشمیر ایک آزاد ملک ہوتا تو جنوب میں ہندوستان، مشرق میں چین، شمال مغرب میں افغانستان اور جنوب مغرب میں پاکستان کے ساتھ اس کی مشترک سرحدیں ہوتیں۔ روس بھی بہت تھوڑے فاصلے پر ہوتا بہر حال کشمیر جو بھی اس کا مہتمم ہوتا، اپنے جغرافیائی و سیاسی اقبال سے اس کا پشت پناہ ہوتا۔ پہلا بادشاہ جس نے ایسا کیا وہ کوئی دوسرا نہیں اشوک اعظم تھا۔ یہ شخص جس نے بدھ ازم کو ایک بین الاقوامی مذہب میں تبدیل کیا اسی نے دارالخلافہ سری نگر کی تعمیر کی۔

کشمیری ہمیشہ مفلس رہے ہیں۔ زراعت میں کچھ بہت دولت ہوتی بھی نہیں ہے۔ کشمیر کی سب سے زیادہ حیات آفریں اور روزی فراہم کرنے والی صنعت اس کے ان صناعوں اور دستکاروں کی روایتی مہارتوں کی مرہون منت ہے جو اپنے ہاتھوں سے بنائی اور کشیدہ کاری کے نفیس نمونے تخلیق کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہاں بھی زیادہ نفع دستکار کی نہیں، حاکم اور تاجر کی جیبوں میں جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ نپولین نے جوزفین کے لیے ایک کشمیری شال بھیجی تھی۔ شال پیرس میں کچھ اس طرح مقبول ہوئی کہ اعلیٰ فیشن ایبل حلقوں میں اس کی مانگ کہیں سے کہیں پہنچ گئی اور تاجروں کے منافع بھی۔ ایسے بازاروں اور ایسی منڈیوں کے باوجود کشمیری غریب رہا۔ اس صدی کے اوائل میں، مفلسی غیر معمولی سطح تک پہنچ گئی۔ نہرو نے اپنی خود نوشت سوانح عمری (۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی) میں لکھا ہے "باقی ہندوستان کے مقابلے میں کشمیر زیادہ تضادات کی سرزمین ہے۔ اس سرزمین میں جو قدرتی حسن اور فطرت کے دیئے ہوئے حسین ترین تحائف سے بھری پڑی ہے، انتہائی غریب افلاس کا دور دورہ رہا ہے اور معمولی گزر بسر کے لیے بھی انسانیت کو مسلسل جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ کشمیر کی عورتیں اور مرد، دیکھنے میں خوب صورت اور بات کرنے میں اچھے لگتے ہیں، وہ ذہین ہیں اور چابک دست۔ ان کے پاس رہنے کے لیے ایک حسین و جمیل ملک ہے۔ پھر وہ آخر اتنے مفلس کیوں ہیں؟ اس سوال کا جواب جاگیردارانہ نظام میں ہے، اور اس ظلم و ستم میں ہے جو عام کشمیریوں کا مقدر رہا ہے۔

اس سرزمین کا، جس کے مناظر جتنے ہی سکون بخش تھے اس کی سیاست اتنی ہی ہنگامہ خیز۔ سب سے پہلا مورخ کلہانا ہے جس نے اپنی کتاب راج ترنگی بارھویں صدی عیسوی میں لکھی۔ کلہانا نے اپنے عوام کا تذکرہ یوں کیا ہے۔ "کشمیر کو روحانی قوتوں سے تو جیتا جا سکتا ہے مگر سپاہیوں کی طاقت کے بل پر اسے شکست نہیں دی جا سکتی۔" اپنے بارے میں یہی خیال ہے جس پر کشمیریوں کا ایمان ہے۔ یہ بدھ ازم تھا جس نے سب سے پہلے

کشمیریوں کو مفتوح بنایا۔ اس کے زوال پذیر ہونے کے بعد ہی ہندو عقاید پھر پنپے۔

بارھویں صدی عیسوی میں، یہ محمود غزنوی کی فوجیں تھیں جنھوں نے کشمیر کو اسلام کی پہلی جھلک دکھائی۔ مگر اسلام خود صوفی بزرگ بلبل شاہ کے ساتھ آیا جن کا سب سے ممتاز نومسلم پیرو ایک تبتی شہزادہ رنچنا تھا جو کہ ہندو راجہ سہادیوا (۱۳۰۱-۲۰ء) کے دربار میں پناہ کے لیے آیا تھا۔ ۱۳۲۰ء میں چنگیز خاں کے اسلاف میں سے ایک زلفی خاں نے (جو دُلچو کہلاتا تھا) مشہور و معروف تاتاری انداز میں کشمیر کو لوٹا۔ سہادیوا بجائے دفاع کرنے کے بھاگا۔ جب دُلچو کی لائی ہوئی تباہی کا غبار کچھ بیٹھا تو رنچنا نے پھر تخت پر قبضہ کر لیا۔ وہ اب مسلمان ہو گیا تھا اور اس نے صدرالدین نام اختیار کیا تھا۔ اس کے سریرِ حکومت پر بیٹھنے کے کچھ ہی عرصے کے بعد ——— مسلمان بادشاہوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس کی ابتدا ۱۳۴۳ء میں شاہ میر سے ہوئی۔ ان لوگوں نے تقریباً دو سو سال تک حکومت کی۔ ان میں عظیم ترین تھا زین العابدین۔ آج بھی ان کے نام سے کشمیر میں لاتعداد مقامات ہیں۔ زیناکدل، زیناپور، زیناگیر اور زیناڈب وغیرہ۔ ۱۵۸۵ء میں کشمیر مغل شہنشاہ اکبر کے قبضے میں آیا۔ اکبر کے بیٹے جہانگیر کو اگر کہیں اور نہیں تو کم از کم کشمیر میں آج بھی شالیمار اور چشمہ شاہی نسیم باغ اور ویری ناگ کے خوبصورت باغات تعمیر کرانے کے سلسلے میں یاد کیا جاتا ہے۔ جہانگیر بستر مرگ پر تھا جب اس سے پوچھا گیا کہ اس کی آخری خواہش کیا ہے تو اس نے کہا تھا کہ وہ کشمیر میں مرنا چاہتا ہے۔ اورنگ زیب کے عہد کو چھوڑ کر مغل عہد کو خوش آمدید کہنے کا ہندوؤں کے پاس سبب تھا کیوں کہ ان لوگوں نے جزیے جیسے تعزیری ٹیکس ترک کر دیے تھے۔ ۱۷۵۲ء میں، احمد شاہ دُرانی کی زیر قیادت ازسرِ نو بیدار ہونے والے افغان آئے اور مقامی کمانڈروں کی غیر یقینی وفاداری کے پیش نظر کشمیر کی سرزمین کو مصیبت زدہ کر دیا۔ مگر عہد جدید کا آغاز، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بڑھتی ہوئی سلطنت میں کشمیر کے ادغام اور میکیاولی کے ذہین وطباع چیلے گلاب سنگھ کے عروج سے ہوتا ہے۔ اس وقت تک کشمیر کی نوّے فی صد آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ صرف کشمیری پنڈت اپنے صبر، مکر و فریب، انتظامی صلاحیت اور اپنے غرور کے ساتھ وادیٔ کشمیر میں رہتے تھے۔ سلطنت کے دوسرے ہندو جمو کے میدانوں میں تھے جس پر بارھویں صدی میں ان پر محمود غزنوی کی لائی ہوئی آفت سے پہلے راجپوتوں کا تسلط تھا، انھوں نے دوبارہ اپنے آپ کو صرف مغلوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد بحال کیا۔

لفظ راج پوت کے لفظی معنی ہیں "راجہ کا بیٹا"، سیتھین اور آریاؤں کے ملے جلے خون والا یہ فرقہ اپنے آپ کو سورج اور چاند کے خاندانی سلسلے کے اجداد کے خلف ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ عقیدہ یہ کہتا

ہے کہ نوعِ انسانی کا سب سے پہلا راجہ مانو سوائمبھو تھا، جو دُنیا کو پیدا کرنے والے دیوتا، برہما کا بیٹا تھا۔ مانو مرد بھی تھا اور عورت بھی۔ مانو کے نو لڑکوں میں سب سے بڑا بھی ایک مخنث تھا اور اسی لیے دو ناموں سے ایک مردانے نام اور ایک زنانے نام سے جانا جاتا تھا۔ اسی سے دو حکمران فرقے وجود میں آئے۔ ایک سوریہ ونشی اور ایک چندر ونشی۔ گلاب سنگھ کے خاندان کے ڈوگرہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سوریہ ونشی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں اگرچہ ان کی حکمرانی کا قصہ بہت پُرانا ہو چکا ہے۔

گلاب سنگھ ڈوگرا نے ۱۸۰۹ء میں، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سکھ فوج میں تین روپے ماہانہ کے معاوضے پر ایک ٹروپر کی حیثیت سے شرکت کی۔ گلاب سنگھ کی پیدائش ۱۷۹۲ء میں ہوئی تھی۔ وہ پڑھا لکھا بالکل نہیں تھا مگر شہسواری اور فنِ حرب سے خوب واقف تھا۔ ۱۸۱۹ء کے ملتان کے محاصرے میں اس کی بہادری نے اسے بہت سے انعام و اکرام دلوائے۔ دوسرے سال، رنجیت سنگھ نے جموں اسے جاگیر کے طور پر دے دیا اور ۱۸۲۲ء میں راجہ کے روایتی لقب سے بھی نوازا۔ شرط یہ تھی کہ "راجہ پہلے کی طرح اب بھی ریاست کے وفادار رہیں گے، اور ہماری اولادوں کا بھی عزت اور اطاعت گزاری کے ساتھ سواگت کریں گے....." گلاب سنگھ بہرحال اولادوں کے ساتھ کسی احترام اور کسی اطاعت گزاری دکھانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ ۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو رنجیت سنگھ کا انتقال ہو گیا۔ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے گفت و شنید شروع کی جو اس سلطنت میں جس سے انھیں حسد تھا اور جس پر وہ قبضہ کرنا چاہتے تھے، ایک ایجنٹ کی تلاش میں تھے۔

گلاب سنگھ نے انگریزوں کے ساتھ پہلی اہم رعایت یہ کی کہ ۱۸۴۱ء میں پہلی افغان جنگ کے لیے ان کی فوجوں کو جموں سے گزرنے کی اجازت دے دی (جب کہ سکھوں نے انگریزوں کو محفوظ راستے کی ضمانت نہیں دی تھی) انگریزوں نے ۱۸۴۲ء میں درّہ خیبر میں شکست کھائی مگر وہ گلاب سنگھ کی امداد کے لیے اس کے احسانمند تھے چنانچہ انھوں نے اسے شکریے کا ایک خط بھیجا۔ ۱۰ فروری ۱۸۴۶ء کو، انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ہونے والی پہلی جنگ میں، جسے انگریز "ہندوستان کی واٹرلو" کہتے تھے، سب سے اہم لمحہ سوبراؤن کی فیصلہ کن لڑائی میں آیا۔ لاہور دربار کے ایک رکن ہونے کی حیثیت سے گلاب سنگھ کو سکھوں کے شانہ بشانہ لڑنا چاہیے تھا اس کے برعکس وہ ایک ایسی لڑائی میں الگ رہا جس میں سکھ فتح حاصل کرتے کرتے رہ گئے۔ ۶ مارچ ۱۸۴۶ء کے ایک خط میں، گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ نے لارڈ ایلین برو کو بتایا کہ اس غداری کا باقاعدہ منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ "اس بات کا ہمیشہ قوی امکان سمجھا گیا تھا کہ گلاب سنگھ جس کے فوجی دستوں نے ایک گولی بھی نہیں چلائی اس کے

کیس اور اس کی حیثیت پر پوری طرح غور ہوگا اس کا یہ رویہ ایک طے شدہ پالیسی کے مطابق تھا۔"

یہ کھیل ۱۸۴۵ء میں اس وقت شروع ہوا تھا جب گلاب سنگھ کے ایجنٹ شیودت نے لاہور میں انگریزوں کے نمائندے میجر براڈ فوٹ کو بتایا تھا کہ وہ پہاڑوں پر سے "چالیس ہزار سپاہی جمع کر کے سکھوں پر حملہ کر سکتا ہے۔" جنوری ۱۸۴۶ء میں، ایک بنگالی فرنیشین نے گلاب سنگھ کا ایک خط لفٹیننٹ ای۔ ایک (گورنر جنرل کے اسسٹنٹ ایجنٹ) کو دیا تھا جس میں کہا گیا تھا "وہ جو فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے کی آرزو دل میں رکھتا ہے اسے علی الصباح سفر شروع کر دینا چاہیے۔ اگر وہ دیر کر دیتا ہے تو اس سے پہلے کہ اس کے دل کی مراد پوری ہو رات آجاتی ہے۔" گلاب سنگھ نے یقیناً اپنا سفر علی الصباح شروع کیا تھا اور اس کے دل کی مراد ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو اس وقت برآئی جب انگریزوں نے معاہدہ امرت سر کے تحت تیس نوئی سکے ادا کر دیئے۔ پچھتر لاکھ روپوں (جو نانک شاہی کہلاتے تھے) کی حقیر رقم کے بدلے انگریزوں نے جموں اور کشمیر گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا۔ بہر حال اس کے ساتھ گلاب سنگھ کو تنبیہ بھی کر دی گئی کہ وہ یہ کبھی نہ بھولے کہ کشمیر اسے کس نے دیا ہے۔ معاہدہ امرتسر کی دفعہ (۱۰) میں کہا گیا تھا "مہاراجہ گلاب سنگھ برطانوی حکومت کی عظمت و برتری کو تسلیم کرتا ہے اس برتری کے اقرار کی ایک علامت کے طور پر وہ ہر سال برطانوی حکومت کی خدمت میں ایک گھوڑا، بارہ بکریاں (چھ نر اور چھ مادہ) اور کشمیری شالوں کے تین جوڑے نذر کیا کرے گا۔"

سو سال بعد اگست ۱۹۴۷ء میں جب گاندھی جی کشمیر گئے تو اس وقت بھی انھوں نے پچھتر لاکھ روپیوں میں کشمیر کے اس سودے کی مذمت میں لگائے جانے والے نعرے سنے تھے۔ کشمیریوں کو اتنا ناراض کسی اور بات نے نہیں کیا۔ اس طرح بیچے جانے اور خریدے جانے کے خیال ہی سے ان کو اپنی تذلیل کا احساس ہوتا تھا اور وہاں کے جاگیر دارانہ نظام کی مخالفت کے اُن جذبات کی زیادہ ذمہ داری اسی خیال پر ہے جنھوں نے تقسیم ملک کے دوران کشمیر کے معاملے میں اتنی اُلجھنیں پیدا کیں۔

انگریزوں کے لیے یہ ایک اچھا سودا تھا۔ وہ اب کشمیر جیسی ریاست میں اپنا ایک وفادار ایجنٹ رکھتے تھے۔ (انھوں نے ۹ نومبر ۱۸۴۶ء میں کشمیر پر قبضہ کرنے میں گلاب سنگھ کی مدد کی) اور ڈوگروں نے ہمیشہ انگریزوں کی توقعات پوری کیں۔ ان سے اپنی وفاداری کو برقرار رکھا اور سلطنت کو جب بھی ضرورت پڑی آدمیوں اور روپے پیسے سے مدد کی۔ ۱۸۴۸ء میں گلاب سنگھ نے افغانستان کے دوست محمد خاں اور مہاراجہ دلیپ سنگھ کی ماتحتی میں سکھوں کے ساتھ اس معاہدے میں شرکت کرنے سے انکار کیا جسے انگریزوں کے خلاف آخری اہم موقف قرار دیا جاتا

چاہیے۔ ۱۸۵۷ کے غدر (جنگ آزادی) میں گلاب سنگھ نے دہلی کے معرکے میں انگریزوں کی مدد کے لیے اپنے بیٹے رنبیر سنگھ کے ساتھ دو ہزار پیدل سپاہی، دو سو سوار اور چھ بڑی توپیں بھیجی تھیں۔ ۱۸۵۸ میں گلاب سنگھ کا انتقال ہو گیا مگر اس کے جانشینوں نے اپنی وفاداریوں میں کمی نہ آنے دی۔ ۱۸۷۸-۸۰ء کی اینگلو افغان جنگ میں کشمیر پھر اپنی فوجوں اور توپ خانے کے ساتھ انگریزوں کے مفاد کے پیش نظر شامل ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ میں سکنڈ کشمیر رائفلز کا بارہ سو سپاہیوں کا ایک دستہ اور اس کے بعد ایک ہزار ستر فوجیوں پر مشتمل ایک دوسرا جتھا ۱۹۱۷ء میں برطانیہ کی امداد کے لیے گیا۔ اسی نوعیت کی مدد دوسری عالمی جنگ میں بھی دی گئی۔ برطانیہ نے اس کے صلے میں تمغے عطا کیے اور اکیس توپوں کی سلامی (دوسری ریاستیں جن کی اس طرح عزت افزائی کی گئی ان میں، حیدرآباد، گوالیار، میسور اور بڑودہ تھیں) جموں اور کشمیر کے اس تمغے کو قبول کرتے ہوئے گلاب سنگھ نے اپنے آپ کو "زرخرید" کہا تھا اور یہ بات کتنی صحیح کہی تھی۔

گلاب سنگھ کی موت استسقا کے مرض میں ہوئی۔ اگر پہلے ڈوگرا شہزادے نے کوئی بہت زیادہ خوشگوار شہرت نہیں حاصل کی تو چوتھے اور آخری راجہ ہری سنگھ نے ایک دوسری نوعیت کی شہرت پائی۔ جب ۱۹۲۵ء اپنے الحاق کے سال، وہ افشائے راز کی دھمکی دے کر رقم اینٹھنے والے ایک گروہ کے چکر میں پھنس گیا۔ ان لوگوں نے اسے لندن کے سیوائے ہوٹل میں . . . . پکڑ لیا۔ پولیس کے ہاتھوں پکڑے جانے سے پہلے ان لوگوں نے راجہ سے جو رقم وصول کی اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تیس لاکھ پونڈ تھی۔ لندن کے چھوٹے اخباروں کو مسٹر "اے" سے متعلق خبروں کی اشاعت میں بڑا لطف آیا۔ احتیاط کی خاطر مہاراجہ کا ذکر اسی نام سے ہوتا تھا۔ افسوس یہ ہے کہ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کی شخصی عادتوں سے متعلق صحیح تفصیلات اس وقت ضائع ہو گئیں جب ان سے متعلق برطانوی حکومت کی فائلوں کو ۱۹۴۷ء میں انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے سے قبل مسٹر کونارڈ کورفیلڈ نے تلف کرا دیا۔ شاہی خاندانوں کے تحفظ کا سر کورفیلڈ کو کچھ زیادہ ہی احساس تھا۔ کمزور اور خود اپنی خواہشات میں گھل جانے والے ہری سنگھ دراصل علامت تھے جاگیرداری کی تمام ناقابلِ قبول اور ناپسندیدہ خصوصیات کے۔ اگر ایک طرف مہاراجہ نے ریاستی خزانے کو اپنی عیاشیوں کی خاطر (یا افشائے راز کو روکنے کے لیے رقمیں دے دے کر) خالی کر دیا تھا تو دوسری طرف عوام انتہائی مایوسی میں ڈوب گئے تھے۔ انتظامیہ کے مسلم مخالف تعصبات کی دھار بھی بہت تیز ہو گئی تھی۔ صحافی گواشا ناتھ کول جنھوں نے اپنی کتاب "کشمیر دین اینڈ ناؤ" پہلی بار سری نگر کے الحاق سے قبل ۱۹۲۴ء میں شائع کی تھی۔ کتاب کے آٹھویں ایڈیشن میں (جو ۱۹۶۷ء

میں شائع ہوا) لکھتے ہیں کہ سری نگر کا شہر، دوسری دہائی کے اوائل میں بڑی تشویش ناک تصویر پیش کرتا ہے ۔ زینا کدل اور گنوو کدل میں طوائفوں کے دو اڈے، صبح و شام چوریاں اور بھیک مانگنا اتنا عام کہ ایک ایک دمڑی پر لوگوں کے ہجوم ٹوٹ پڑتے ۔ مزدور اتنے سستے کہ ایک کھیر دار (تقریباً ۸۰ پاؤنڈ یا ایک من) شالی محض چار آنے کی اجرت دے کر صاف کرائی جا سکتی تھی ۔ گھروں میں کام کرنے والی عورتیں تقریباً مفت ۔ ناخواندگی ایسی کہ خدا کے چند محبوب بندوں کے علاوہ کوئی پڑھا لکھا ملنا مشکل ۔ بے روزگاری کی وہ شدت کہ دس بارہ افراد پر مشتمل خاندان میں ایک کمانے والے کا ملنا دشوار ۔ شرح پیدائش کم، شرح اموات بیماریوں کی وجہ سے جن کے علاج کا انتظام بھی نہیں، زیادہ ۔ تفریح اور دلچسپی کے سامان عنقا ۔ چکٹ کپڑے ایک عام بات تھی، صابن قیمتی اور کمیاب ۔ سکھوں کی حالت بھی اتنی ہی زار تھی ۔ پنڈت بحیثیت ایک طبقے کے نسبتاً بہتر نظر آتے تھے ۔ ۔ ۔ سری نگر میں نوے فیصد مسلمانوں کے گھر ہندو ساہوکاروں کے پاس رہن تھے ۔"

کشمیری مسلمانوں کو غم و غصے کے اظہار کے لیے بہر حال راہ ڈھونڈنا تھی ۔ یہ لاوا پہلے کیوں نہیں پھوٹا، اس کی وجہ، فرقے کی انتہائی پس ماندگی تھی اور اس کے ساتھ ہی تشدد سے جبلی کراہت تھی ۔ سول سرونٹ والٹر لارنس نے صدی کے آخری زمانے میں لکھا تھا کہ (مختصراً) "کشمیری کسان کے ساتھ ابھی تک ایک غلام جیسا سلوک ہوتا رہا ہے اور درحقیقت جوتنے بونے کا کام اس سے جبراً کرایا جاتا ہے ۔ انھیں اپنی زمین سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ۔ انھیں یہ خطرہ بھی ہر لمحہ گھیرے رہتا ہے کہ کب انھیں حکام یا بارسوخ لوگوں کے یہاں بیگار کرنے کے لیے بلوا لیا جائے ...... (لیکن) گاؤوں میں جرائم کا نام نہیں ہے ۔ جائداد اور ملکیت بالکل محفوظ ہے اور میں نے فصلوں کی چوری جیسی بات کبھی نہیں سنی ۔ جسمانی لڑائی شاذ و نادر ہی ہوتی ہوگی ۔ کشمیری جب لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں ۔ اگر کبھی بات بہت بڑھ گئی تو صاف نوچ لیتے ہیں یا پھر چنگے کو گھسوٹتے ہیں ۔ خون دیکھ کر انھیں گھن آتی ہے ۔"

دبے اور کچلے ہوئے لوگوں کی اولین بغاوت ۱۹۲۴ء کے موسم گرما میں ہوئی جب سری نگر سلک فیکٹری کے مزدوروں نے بغاوت کی تھی ۔ دوسرے دن انھوں نے زمین کے ایک پلاٹ پر قبضہ کر لیا ۔ جو حکومت کی ملکیت تھا ۔ فوج بلائی گئی اور مہاراجہ نے تحریک کے لیڈروں کے خلاف کارروائی کی ۔ سعدالدین شال کو نکال دیا گیا اور ایک دوسرے لیڈر نور شاہ نقشبند کی جاگیر ضبط کر لی گئی ۔ مگر یہ سب محض تمہید تھی ۔ بھوکے کسان اس زمین پر اپنی ملکیت چاہتے تھے جس پر وہ صدیوں سے غلام تھے ۔ عوام اپنی عبرت ناک مفلسی سے چھٹکارا چاہتے تھے اور مہاراجہ کا اختتام چاہتے تھے، جس نے ان کو اتنے دنوں سے بھوکا رکھا تھا ۔ عوام تیار تھے، وقت آ گیا تھا کہ کوئی اٹھتا اور ان کی راہ نمائی کرتا ۔

●●

۳

شیرِ کشمیر

اساطیری ہری پربت کے شمال میں انچھر جھیل کے کنارے سردہ نام کا ایک گاؤں ہے یہاں ایک برہمن خاندان رہتا تھا جس کی گزر بسر شال اور دوشالے تیار کرنے پر تھی۔ خاندان کی روایت کے مطابق انھیں ایک صوفی میر رشید بیہاقی نے ۱۷۶۶ء میں مشرف بہ اسلام کیا۔ یہ لوگ متمول کبھی نہیں تھے۔ شال بنانے والوں پر ڈوگروں کے عائد کیے ہوئے ٹیکسوں کی وجہ سے ان کی حالت اور تقیم ہوگئی۔ اس خاندان میں ۱۹۰۵ء میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام شیخ محمد عبداللہ رکھا گیا۔ عبداللہ یتیم پیدا ہوئے تھے۔ وہ شیخ محمد ابراہیم کی تیسری بیوی خیر النساء کے بطن سے باپ کے انتقال کے پندرہ دنوں بعد پیدا ہوئے۔ شیخ محمد ابراہیم کی دوسری دونوں بیویوں کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور سارے خاندان کی نگہداشت کی ذمہ داری خیر النساء پر تھی اس میں ان کی مدد ان کے سوتیلے بیٹے بھی کرتے تھے۔ خیر النساء کی صرف ایک خواہش تھی اور وہ یہ کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے ذریعے افلاس کے اس چکر سے آزاد دیکھنا چاہتی تھیں انھوں نے شیخ عبداللہ کو سب سے پہلے صوفی اخون مبارک شاہ کی خدمت میں بھیجا۔ ان بزرگ سے بچے نے نہ صرف فارسی اور عربی کے لکھنے پڑھنے کے فوائد سمجھے بلکہ تصوف کے جوہر، ضبط و برداشت کو بھی حاصل کیا۔ اپنے بچپن ہی میں عبداللہ نے قرأتِ قرآن پاک سیکھی۔ ان کی قرات اتنی دل نشیں ہوتی تھی کہ لوگ اسے سن کر جھومنے لگتے تھے (اور ملا جھنجھلاتے تھے کہ ان ہی کے مکتب میں ان کی سبکی ہوتی تھی۔)

عبداللہ خود دراصل ڈاکٹر بننا چاہتے تھے وہ ڈاکٹر نہیں بن سکے (اگرچہ بعد کو ان کے دو بیٹے ضرور ڈاکٹر ہوئے) مگر کسی کی مدد سے ان کو مشہور و معروف علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ وہاں سے انھوں نے سائنس میں ایم ایس سی کیا۔ اس عہد میں اتنی کم یاب قابلیت حاصل کرنے کے باوجود سری نگر کے اسٹیٹ ہائی اسکول میں سائنس کے استاد سے زیادہ کی نوکری انھیں نہیں مل سکی۔ عبداللہ کی واپسی ایک ایسے وقت میں ہوئی تھی جب کشمیر غم و غصہ کی آگ میں

تپ رہا تھا۔ وہ حالات کو بدلنے کے لیے عزم مصمم کے ساتھ کمربستہ تھے چنانچہ انھوں نے سیاسی کام شروع کیے۔ شیخ عبداللہ کے ایک تقریباً ہم عصر ڈی۔ این۔ کول نے جو آخری عمر میں شیخ عبداللہ کے وزیر اعلیٰ ہونے کے زمانے میں ترقی کرکے پولیس کے انسپکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچ گئے تھے، ان دنوں کو یوں بیان کیا ہے: "میرے بڑے بھائی جن کو انھوں (شیخ عبداللہ) نے سائنس پڑھائی تھی یاد کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ کتنے طویل القامت اور دُبلے پتلے تھے۔ ترکی ٹوپی پہننے والے سائنس کے استاد سائنس کی بہت سی اصطلاحوں کو کشمیری روزمرہ میں بتایا کرتے تھے تاکہ ان کے لیکچر کو سننے میں غرق نوجوان طالب علم انھیں اچھی طرح سمجھ لیں۔ طالب علموں میں ان کا رعب بھی تھا اور احترام بھی۔ طالب علموں کا یہ ردِّ عمل صرف اسی وجہ سے نہیں تھا کہ وہ نظم وضبط کے معاملے میں بڑے سخت تھے بلکہ عظیم مرتبے کی وجہ سے بھی تھا۔ ان کا یہ مرتبہ جسمانی بھی تھا اور تعلیمی بھی، اور وہ بھی صرف طالب علموں کے مقابلے میں نہیں بلکہ دوسرے استادوں کے مقابلے میں بھی۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد، مَیں نے انھیں سری نگر کی پتلی پتلی گلیوں میں، ہاتھ اٹھا اٹھا کر نعرے لگاتے ہوئے پُرجوش جلوسوں کی قیادت کرتے دیکھا۔ عام جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے ان کی بہترین اور پُرشکوہ آواز میرے کانوں میں آج بھی گونجتی ہے۔ ان کی عوامی تقریریں عموماً قرآن کریم کی تلاوت یا علامہ اقبال کے شعروں سے شروع ہوا کرتی تھیں۔ یکسر مُسلمان سامعین اور یونی ورسٹی کے اثرات کے غلبے کی وجہ سے شیخ عبداللہ نے اپنے فرقے کے مسائل کے حل کے لیے مسلم کانفرنس تنظیم دی۔ مگر مستقبل کے رُجحانات اسی زمانے سے نظر آنے لگے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ حقیقی جنگ، جاگیرداری کے خلاف اور سیلف رول اور اصلاحات اراضی کے لیے ہے۔

پہلی چنگاری جولائی ۱۹۳۱ء میں بھڑکی۔ مُسلمان غصّے سے بھڑک اٹھے جب انھوں نے سُنا کہ جموّں کے ایک جیل میں ایک کانسٹبل نے قرآن کریم کی بے حرمتی کی ہے۔ مہاراجہ کے خلاف جو غم وغصہ ابھی تک قابو میں تھا وہ اس واقعے سے بے قابو ہو گیا۔ شیخ عبداللہ نے اس تحریک کی قیادت سنبھال لی اور کسانوں، مزدوروں اور دستکاروں کے مسائل کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے مطالبات میں سیاسی حقوق اور سماجی اصلاحات مزید شامل کرلیں۔ انھوں نے شہری عدم تعاون کی ایک تحریک کا آغاز کیا اور رضاکاروں کے پہلے جتھے کی قیادت کی، جو گرفتار ہوا اور ہری پربت کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ ۱۳ جولائی کو تشدد پر آمادہ ایک مجمعے نے سری نگر میں سنٹرل جیل پر حملہ کیا۔ اس موقع پر پولیس فائرنگ میں نو افراد مارے گئے۔ شیخ عبداللہ نے کشمیریوں کو یہ دن بھولنے نہیں دیا۔ انھوں نے اس دن کا نام "یوم شہیداں" رکھا۔ ہر سال، انھیں جب بھی موقع ملتا وہ اس قیمت کو یاد دلاتے رہتے جو مرنے والوں نے اپنی جانیں دے کر ادا کی تھی۔ مہاراجہ کی حکومت کو مجبور ہو کر ایک انگریز سر برٹرینڈ گلاسی کی سربراہی میں ایک تحقیقاتی

کمیشن بٹھانا پڑا۔ ایک عوامی تحریک کے عواقب کے طور پر پہلی دفعہ کشمیر نے کچھ اصلاحات دیکھیں۔

شیخ عبداللہ نے اب اپنے آپ کو پہچاننا شروع کر دیا تھا۔ ان پر یہ انکشاف ہوا کہ ان کا ذوق کسی ایسے نظریے کا ساتھ نہیں دے سکتا جو کسی ایک مذہب تک محدود ہو۔ ۱۹۳۲ء میں ہی انھوں نے مسلم کانفرنس کے ایک سیشن میں کہا تھا کہ "ہم تمام فرقوں کے حقوق کے لیے لڑتے ہیں۔ ہمارے ملک کی ترقی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ ہم مختلف فرقوں کے درمیان خوش گوار تعلقات استوار نہیں کرتے ہیں۔" مگر "مسلم کانفرنس" کا نام اور یہ پیغام ظاہر ہے کہ دو متضاد چیزیں تھیں۔ ان میں سے کسی ایک کو تبدیل ہونا تھا۔ نام بدل گیا۔ بعد کو شیخ عبداللہ نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنے اقتصادی پروگرام کے لیے کتنے دقت ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں جب انھیں حکومت ملی تو انھوں نے پہلا کام جو کیا وہ تھا جاگیرداری نظام کی عطا کی ہوئی زمین کی بڑی بڑی ملکیتوں کا خاتمہ۔ ۱۹۶۹ء میں "یوم شہیداں" کے موقع پر انھوں نے کسانوں (آبادی کے ۸۳ فی صدی حصہ) کو اس قطعۂ اراضی کی ملکیت دے دی جسے وہ جوت رہے تھے۔ شیخ عبداللہ کا "بگ لینڈیڈ اسٹیٹس ابالیشن ایکٹ" سارے ملک میں مشہور ہو گیا اور اس نے ان سوشلسٹوں کو بھی شرمندہ کر دیا تھا جنھوں نے ایسا کرنے کے وعدے تو بہت کیے مگر ایفا نہ کر سکے۔ کشمیری کاشت کار کے لیے یہ حقیقی آزادی تھی۔

۱۹۳۳ء میں شیخ عبداللہ نے بیگم اکبر جہاں سے شادی کی (بیگم اکبر جہاں کے باپ، اسلام قبول کرنے سے پہلے عیسائی تھے) ان کا سب سے بڑی لڑکی کا نام خالدہ رکھا گیا (خالدہ نے بعد کو غلام محمد شاہ سے شادی کی) خالدہ کے بعد فاروق پیدا ہوئے۔ پھر طارق ایک اور لڑکی ثریا اور مصطفیٰ کمال۔ بیگم عبداللہ پردے میں نہیں بیٹھیں بلکہ انھوں نے اپنے شوہر کی ہنگامی سیاسی زندگی میں پوری طرح شرکت کی۔ تیسری دہائی میں شیخ عبداللہ کی شہرت سارے ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔ شیخ عبداللہ کی دوسری برسی کے موقع پر کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہونے والی یادگاری جلد میں مسز اندرا گاندھی نے لکھا ہے "میں نے شیخ صاحب کو پہلی بار ۱۹۳۰ میں دیکھا وہ ایک جلوس کی قیادت کر رہے تھے اس کے بعد کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ وہ ہماری تحریک آزادی کی ایک ممتاز شخصیت کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ پرانی شاہی ریاست کے دوسرے مقبول لیڈروں کی طرح انھوں نے بھی جاگیرداری اور نو آبادیاتی نظام دونوں کے جبر و ظلم کے خلاف لڑائی لڑی۔ انھوں نے مسلم لیگ کی سیاست کی بڑی سختی سے مخالفت کی۔ وہ ہمارے ملک کے سیکولر آئیڈیل کے بہترین نمونہ تھے۔"

اور وہ یہ بہترین نمونہ تیسری اور چوتھی دہائی کے بدترین زمانے میں بھی رہے جب جناح صاحب نے

مذہب کے نام پر خطرناک قسم کا تہلکہ مچانا شروع کر دیا تھا۔

۱۹۳۹ میں انھوں نے مسلم کانفرنس کو باقاعدہ طور پر "نیشنل کانفرنس" میں تبدیل کر دیا۔ اس نئے نام کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا تاکہ یہ مسلم لیگ اور نیشنلسٹ تحریک کے نظریاتی فرق کو واضح کر سکے۔ شیخ عبداللہ نے اپنے شمالی پڑوسی سوویت یونین کے تجربات کے سلسلے میں اپنی پسندیدگی کا اعلان بھی شروع کر دیا۔ نیشنل کانفرنس کے جھنڈے کا رنگ دانستہ طور پر لال رکھا گیا۔ جو انگریزوں کے لیے مزید تشویش کا باعث بنا۔ جھنڈے کے درمیان میں ایک ہل کی تصویر بھی اور کسانوں کو جو نعرہ دیا گیا تھا وہ تھا "الیاں ہال ہلا کاری، دشمناں چلا کاری" کشمیری زبان کے اس نعرے کا مطلب ہے کہ جب ہل چلتا ہے، دشمن کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔

مولانا آزاد کے ساتھ شیخ عبداللہ قوم پرست مسلمانوں کے عظیم نمائندے بن گئے۔ ظاہر ہے کہ کشمیر مسلم لیگ کا خاص ہدف تھا۔ شیخ عبداللہ نے انتہائی فعال طریقے پر لیگ کی خلاسفی اور اس کی سیاست کو یہ کہتے ہوئے للکارا کہ دو قومی نظریہ ایک زہر ہے جو جب پھیلے گا تباہ کر دے گا اگر ہم اس منظر کو ذہن میں رکھیں جس میں شیخ عبداللہ نے اتحاد و یک جہتی کی وکالت کی تو ان کے کارنامے اور بھی زیادہ قابلِ قدر ہو جاتے ہیں۔ آزادی سے پہلے کشمیریوں کے پاس اگر کچھ تھا تو وہ بھی ان کی تعداد۔ سیاسی اور اقتصادی دونوں اختیارات ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے۔ مسلمان اپنے غم و غصے اور ہندوؤں سے انتقام کی خواہش رکھنے میں پورے طور پر حق بجانب تھے۔ ۱۹۴۷ میں کشمیر میں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اتحاد و شانتی کا برقرار رہنا جو بڑی حد تک شیخ عبداللہ کی قیادت کی وجہ سے تھا، اسے ایک قابلِ ذکر زندگی کا ایک غیر معمولی کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں، جیسا شخص بھی کشمیر سے متصل شمالی مغربی سرحدی صوبے کے پٹھانوں کو فرقہ پرستی کے جال سے بچانے میں ناکام رہا تھا، لیگ نے اپنے بس بھر کوشش کی۔ جناح صاحب نے شیخ عبداللہ کو پاکستان میں اقتدار اور وقار دونوں کی پیش کش کی اور جب یہ حربہ کامیاب نہ ہوا تو مسلم لیگ نے اپنے قدیم حلیفوں یعنی ملّا اور جماعت اسلامی کی مدد سے گڑبڑ پھیلانے کی کوشش کی۔ (جماعتِ اسلامی کے کشمیری یونٹ نے تادمِ تحریر ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو نہیں مانا ہے۔ اس کی وفاداریاں پاکستان کی جماعتِ اسلامی کے ساتھ ہیں) شیخ عبداللہ نے کشمیر کو ان سے محفوظ رکھا کسانوں کے لیے ان کا پیغام سیدھا سادا تھا۔ "اچھے ہندو اور اچھے مسلمان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بُرے ہندو اور بُرے مسلمان نہ صرف یہ کہ جھگڑے پیدا کرتے ہیں بلکہ یہ ان لوگوں کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیتے ہیں جو کوئی اچھی بات کرنا چاہتے ہیں۔

۱۹۴۴ء میں شیخ عبداللہ نے کشمیر کے مستقبل کے اپنے ایک خاکے کا اعلان کیا۔ شیخ عبداللہ کے بیٹے فاروق عبداللہ کی وزارت میں وزیر قانون پیارے لال ہانڈو کے مطابق "سیاسی آزادی کے لیے لڑی جانے والی لڑائی کا مطلب اقتصادی نجات کی لڑائی سے تھا...... جب ایک دفعہ انھوں نے ہماری ریاست کی سیاسی اور اقتصادی نجات کے اس پروگرام کو ایک منشور کی حیثیت سے منظور کرالیا تو پھر تبدیلی کی ایک ہوا چل گئی جس کا نتیجہ ۱۹۴۶ء میں تاریخی نعرے "کشمیر چھوڑ دو" کی شکل میں سامنے آیا۔ یہی زمانہ تھا جس میں شیخ صاحب کے خوابوں کے جمہوری کشمیر کی بنیاد ایک ایک اینٹ کر کے پڑنے لگی۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، جاگیردارانہ نظام کی مخالفت شیخ صاحب کے پروگرام کا ایک اہم حصہ تھی، وہ مہاراجہ ہری سنگھ کی حیثیت کو کبھی بھی تسلیم نہیں کر سکتے تھے اور مہاراجہ کو وہ اس کا حق بھی نہیں دے سکتے تھے کہ وہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ مستقبل کا کشمیر کیسا ہونا چاہیے۔ استصواب رائے عامہ کے نزاعی سوال کی بھی عموماً غلط تاویل کی جاتی ہے، کیونکہ یہ سمجھایا جاتا ہے کہ یہ خیال کشمیریوں کے پاکستان سے الحاق کرنے کی خواہش کی بنیاد پر پیدا ہوا تھا۔ اور جس کے بارے میں بعد کو یہ بھی سمجھا جانے لگا کہ اس معاملے میں ہندوستان نے گڑبڑ کر دی۔ اس سے زیادہ حقیقت سے دور اور کوئی بات نہیں ہو سکتی چوں کہ ۱۹۴۷ء میں کشمیر کی کسی نمائندہ حکومت کے پاس ہندوستان سے الحاق کرنے کے لیے کوئی آئینی طریقہ نہیں تھا اس لیے شیخ عبداللہ نے یہ تجویز کیا (اور نہرو نے خوشی سے مان لیا) کہ مہاراجہ (جو شیخ عبداللہ کی نظر میں کشمیر کے ناجائز نمائندے تھے) فی الوقت الحاق کے کاغذ پر دستخط کر سکتے ہیں، مگر الحاق کی اس کارروائی کے اخلاقی جواز کی خاطر اسے عوام کے سامنے بھی پیش کر دیا جانا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ عبداللہ نے بھی اس مسئلے پر خصوصی استصواب کی تجویز نہیں رکھی تھی۔ مثلاً ایک عوامی آئین کے تحت، بالغ رائے دہندگی کے ذریعہ منتخب کی ہوئی حکومت کو اس بات کا حق ہوگا کہ وہ ہندوستان سے الحاق کی توثیق کر دے۔ کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے سلسلے میں کسی کے دماغ میں کوئی شبہہ نہیں تھا۔ سوال صرف یہ تھا کہ اس کارروائی کے لیے طریقہ کون سا اپنایا جائے۔ جاگیردارانہ نظام کے پرانے دشمن شیخ عبداللہ اس سلسلہ میں مہاراجہ کو کشمیریوں کے مقدر پر مُہرِ تصدیق ثبت کرنے کے لیے کوئی ٹیکنیکی بہانہ بھی نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس لیے استصواب رائے عامہ کے خیال کی ابتدا، جناح صاحب کے جنھیں شیخ نے ہمیشہ حقارت سے دیکھا، نظریات سے کوئی محبت یا کسی قسم کی دل چسپی میں نہیں، شیخ عبداللہ کی راجوں مہاراجوں کے خلاف نبرد آزمائی میں دیکھی جا سکتی ہے۔

۱۹۴۶ء میں سر اسٹیفورڈ کرپس کی سربراہی میں ہندوستان آنے والے کیبنٹ مشن کو نیشنل کانفرنس نے جو

میمورنڈم پیش کیا تھا اس میں کانفرنس کے مقاصد اور اس کا مطمح نظر بالکل واضح تھا "کشمیری عوام کا قومی مطالبہ صرف ایک ذمہ دار حکومت کا قیام نہیں ہے بلکہ وہ ڈوگرہ خاندان کے تاناشاہی اقتدار سے اپنی مکمل نجات اور آزادی کا حق بھی طلب کرتے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں شیخ عبداللہ نے "کشمیر چھوڑ دو" کی جو تحریک شروع کی تھی وہ اسی خاندان کی حکومت کے خلاف تھی اور گاندھی اور نہرو کی مکمل حمایت کے ساتھ تھی۔ کانگریس نے جو صرف ایک تحریک آزادی تھی، اپنے وجود کو برطانوی ہند تک محدود رکھا۔ دیسی ریاستوں، (رجواڑوں) میں، کانگریس کی ہم پلہ جماعت آل انڈیا اسٹیٹس پیپلس کانفرنس تھی اور مختلف ریاستوں میں چلنے والی آزادی کی تحریکیں اس کے تحت چلتی تھیں۔ ۱۹۴۶ میں نہرو اس کانفرنس کے صدر تھے، اور شیخ عبداللہ نائب صدر۔ اسی سال، مئی کے مہینے تک شیخ عبداللہ نے ڈوگروں کے خلاف اپنے عوامی احتجاج کی لے کو خاصا بلند کر دیا تھا۔ ۱۵۔ مئی کو سری نگر میں، انھوں نے ایک تقریر کی جس نے جاگیردارانہ حکومت کو ہلا دیا۔ تقریر کے کچھ اقتباسات سے اس کے تاثر اور لطف کا اندازہ کیا جاسکتا ہے

"یہ مطالبہ کہ راجہ کے خاندان کو ریاست چھوڑ دینا چاہیے دراصل "ہندوستان چھوڑ دو" کی اس پالیسی ہی کی توسیع ہے (جسے انگریزوں کے خلاف ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی نے اپنایا تھا۔ ہندوستانی راجے ایک معاہدے کی رو سے انگریزوں کے اتحادی تھے اور ان کی ریاستوں کی حیثیت "علاقہ زیر حمایت" کی تھی) جب تحریک آزادی، انگریزی حکومت کی مکمل واپسی کا مطالبہ کرتی ہے، تو منطق یہی کہتی ہے کہ برطانوی استعمار کے پٹھوؤں کو بھی جانا چاہیے اور اقتدار اعلیٰ کو اس کے اصلی حق دار یعنی عوام کے حوالے ہونا چاہیے...... دیسی ریاستوں کے حکمرانوں نے ہندوستان کی آزادی کے مقصد سے ہمیشہ غداری کی ہے۔ ایک انقلاب نے زار روس کی حکومت کا تختہ پلٹا اور انقلاب فرانس نے فرانس کے حکمراں طبقے کا خاتمہ کر دیا۔ امرت سر عہد نامے کے پرخچے اڑانے کا وقت آگیا ہے اور کشمیر چھوڑنے کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ اقتدار اعلیٰ مہاراجہ ہری سنگھ کا پیدائشی حق نہیں ہے۔ "کشمیر چھوڑ دو" بغاوت یا سرکشی کا سوال نہیں ہے۔ یہ حق کا سوال ہے۔"

پنڈت نہرو اگرچہ کرپس مشن سے متعلق کاموں میں بری طرح الجھے ہوئے تھے مگر کشمیر کے واقعات پر اپنے جوش و خروش کو دبا نہ سکے۔ انھوں نے اپنے نائب صدر کو وہاں کے حالات بتانے کے لیے دہلی آنے کو کہا۔ شیخ عبداللہ کو جوں ہی پیغام ملا انھوں نے فوراً ہی سری نگر سے راولپنڈی کے لیے رخت سفر باندھا جہاں سے انھیں دہلی کے لیے ہوائی جہاز مل سکتا تھا ابھی وہ سری نگر سے کوئی سو میل دور گھاری کے مقام تک ہی پہنچے تھے کہ ہری سنگھ حکومت نے انھیں وطن دشمنی کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ ثبوت میں ان کی ۱۵ مئی والی تقریر پیش کی گئی۔ نہرو کو اپنے

دوست کی گرفتاری کا پتہ ایک ٹیلی گرام سے چلا۔ انھوں نے ایک "اذیت رسان" بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ کیا جاگیردارانہ ہندوستان کے راجے مہاراجے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ "چھوٹی چھوٹی ظاہری تبدیلیوں" کی بنیاد پر بچ نکلیں گے۔ بیان میں انھوں نے ایک تنبیہ بھی شامل کر دی، شیخ انگریزوں کے بھڑکانے پر گرفتار کیے گئے تھے۔ "ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسے معاملات میں مہاراجاؤں کے درباروں (انگریز) ریزیڈنٹ ہی ہے جو ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔"

نہرو کے اس کہنے کے پیچھے کہ روسیوں کی توسیع پسندی سے تشویش کی وجہ سے انگریز ہری سنگھ کو بچانے کے لیے بے قرار تھے، معقول سبب تھا۔ بغیر ریاست کشمیر کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے ہری سنگھ اس پالیسی کی تشکیل میں اہم رول ادا کرتے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ چرچل کی وار کیبنیٹ کے ایک رکن بنائے گئے تھے، یہ ایک بڑا فریب تھا جس میں برطانوی سامراجیوں کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ ہری سنگھ کے بیٹے کرن سنگھ کے مطابق اس کیبنیٹ کے بنانے کا مقصد برطانوی سامراج کے ممبروں کو ملکی معاملات میں فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی کوئی حقیقی طاقت دیئے بغیر ایک علامتی حق رائے دینا تھا۔ جنگ کے بعد کی سیال دنیا میں بڑی طاقتیں اپنے اپنے علاقہ ہائے اثر تسلط کے لیے نسبتاً محترم لفظ کو وسیع کرنے کی متمنی تھیں اور ظاہر ہے کہ ماسکو اپنی جنوبی سرحدوں، ایران، افغانستان، برطانوی ہند اور کشمیر کی طرف بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا ماسکو کے مفادات کے فروغ کے لیے استعمال کیے جانے والے ہتھیاروں میں سے ایک تھی۔ کمیونسٹ پارٹی نے اس وقت جب کہ کانگریس نے تعاون سے انکار کر دیا تھا نہ صرف برطانیہ کی جنگی کوششوں کی حمایت کی بلکہ جب مسلم لیگ انگریزوں سے مل گئی تھی تو اس نے پاکستان کے خیال کی پرزور تائید کی۔ بہت سے کمیونسٹوں نے (کچھ بنیاد پرستوں کو جو دہریے کمیونسٹوں سے زیادہ کسی کو بھی نامحترم نہیں سمجھتے ناخوش کر کے) مسلم لیگ میں شرکت کر لی۔ کمیونسٹوں کے اس فعل سے ہندوستان میں لوگ واقف تھے اور ۲۱ مئی ۱۹۴۶ء کے روزنامہ ہندوستان اسٹینڈرڈ میں لاہور کی ایک رپورٹ میں کہا گیا تھا "بعض سیاسی حلقوں میں اس بات کا انکشاف کیا گیا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے ہندوستان میں اپنے اثر ورسوخ کو بڑھانے میں روس کی مدد کرنے کے لیے کشمیر میں کسی جگہ بہت مضبوط اور فعال "خفیہ" دفتر قائم کیا ہے۔ یہ بات سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ روس ایران کے ذریعے اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام ہو چکا ہے اور بہت سے جائز اسباب تھے جن کی بنا پر روس، افغانستان کے ذریعے اس قسم کے جوڑ توڑ نہیں کر سکتا تھا۔ پنجاب کے مسلمان جو کمیونزم اور روس کے اثرات کے فروغ کے خطرے کو محسوس کر چکے ہیں۔ مسلم لیگ کو کمیونسٹ دوست عناصر سے پاک کرنے کے سوال پر بڑی سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔" ہری سنگھ کی حکومت کے رویے اور پولیس

فائرنگ نے پٹرول چھڑک کر لاشوں کو جلا کر، زخمیوں کو اسپتال میں داخل کرنے کے بجائے جیلوں میں ٹھونس کر جو خوف دہراس — پھیلا رکھا تھا اس پر نہرو کو سخت غصہ۔" انھوں نے سری نگر کو "شہر خموشاں" کہا اور کہا کہ وہاں کے حالات جنرل ڈائر کے پنجاب کی یاد دلاتے ہیں جہاں لوگوں کو سڑکوں پر پیٹ کے بل چلایا جاتا تھا یا سنگینوں کی نوک پر ڈانٹا، پھٹکارا جاتا تھا۔" مہاراج زندہ باد۔" شیخ عبداللہ کی تعریف کے ان کے پاس بہت سے جواز تھے۔ "ہر وہ شخص جو کشمیر کو جانتا ہے وہ وہاں شیخ عبداللہ کی حیثیت کو بھی جانتا ہے۔ وہ وہاں شیر کشمیر ہیں، دور افتادہ وادیوں تک کے لوگوں کے وہ چہیتے ہیں۔ نہ جانے کتنے عوامی گیت اور کتنی کہانیاں ان کی شخصیت کی گرد بن گئی ہیں۔ ریاستوں کی تحریک آزادی میں وہ میرے ایسے قابل قدر ساتھی رہے ہیں اور آج بھی ہیں جن سے تمام اہم مسائل میں مشورہ لیا جاتا ہے۔ کیا کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ہم ان کو چھوڑ دیں گے"۔ نیشنل کانفرنس کی پبلسٹی کمیٹی کے سکریٹری شیام لال نے صحافیوں کو بتایا کہ "کشمیر کی تمام کی تمام پولیس نے اپنے بھائیوں اور اپنی بہنوں پر لاٹھی چلانے سے انکار کر دیا، اس حکم عدولی کے نتیجے میں ان کشمیری پولیس والوں میں سے چالیس کو ڈوگرا فوجوں نے حراست میں لے لیا اور کشمیر کی پولیس کو غیر مسلح کر دیا گیا۔ ایک تلخ و ترش نہرو نے کہا" دنیا کے اکثر ملکوں میں مردودوں کی حکومتیں ختم ہو چکی ہیں یہاں آج بھی مردودوں کی حکومت کا ہونا کشمیریوں کی بدنصیبی ہے۔" انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ شیخ عبداللہ کے دفاع کے لیے بذاتِ خود وکیلوں کی ایک جماعت کی سربراہی کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ کشمیر میں اس وقت تک امن نہیں ہو سکتا جب تک کہ شیخ عبداللہ کو رہا نہ کیا جائے۔

لارڈ ویول نے زور ڈال کر سمجھا کر، بہت کوشش کی کہ نہرو کشمیر نہ جائیں مگر وہ نہرو کو روک نہیں سکے۔ کانگریسی لیڈروں نے بھی کہا کہ کیبنیٹ مشن کے مذاکرات میں ان کی ضرورت ہے مگر نہرو اس سب کے باوجود کشمیر گئے۔ ۱۵ جون کو نہرو نے ہری سنگھ کی حکومت کو ایک تار بھیجا جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ وہ کشمیر آرہے ہیں۔ سری نگر سے نہایت سرد مہری کا جواب آیا کہ انھیں ریاست میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ۱۹ جون کو سہ پہر میں ایک بجے نہرو، آصف علی، دیوان چمن لال تلک راج اور چند دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کار کے ذریعے کوہالا پل کے پاس پہنچے۔ یہ جگہ سری نگر سے تقریباً ایک سو چالیس میل دور، سری نگر اور راولپنڈی روڈ پر واقع ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ان لوگوں نے پل کی طرف چلنا شروع کیا۔ ضلع مجسٹریٹ نے ایک سرکاری حکم نامہ پیش کیا جس میں نہرو کو ریاست میں داخل ہونے سے روکنے کی ہدایت تھی وہ اور ان کے ساتھیوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ نہرو نے ضلع مجسٹریٹ سے کہا کہ انھوں نے پچھلے بیس برسوں میں، برطانوی حکومت کے کسی حکم کو نہیں مانا ہے اور ہری سنگھ اور ان کے مطعون و بدنام

وزیراعظم پنڈت رام چندر کاک کے احکامات کو ماننے کی بھی ان سے توقع نہیں کرنا چاہیے۔

نہرو کے راستے میں فوجیوں نے گھیرا ڈال دیا۔ نہرو نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ "شاید کشمیر کے ریاستی حکام یہ نہیں جانتے کہ ان کا مقابلہ اس وقت انڈین نیشنل کانگریس کے منتخب صدر سے ہے میں نہیں جانتا کہ کسے پیچھے ہٹنا پڑے گا اور یہ کہہ کر وہ گھیرا بنانے والے حیران و پریشان فوجیوں کے بیچ سے نکل گئے۔ اگلے تین ساڑھے تین میل تک ان کی راہ میں کوئی مزاحمت نہیں ہوئی یہاں تک کہ شام کے ساڑھے سات بجے پولیس ان کے سامنے پھر آئی۔ اس وقت وہ کار بھی آ چکی تھی جو انھیں کو ہالا تک لائی تھی۔ پوری پارٹی کو رات بسر کرنے کے لیے "ڈومل" لایا گیا۔ دوسرے دن نہرو کو حراست میں لے کر سری نگر سے تقریباً چھیانوے میل دور اُڑی کے مقام پر ایک ڈاک بنگلے میں پہنچا دیا گیا۔

نہرو کی گرفتاری کی خبر جب پھیلی تو ملک بھر میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ کانگریس کارکنوں نے کشمیر جا کر اپنے آپ کو گرفتار کرانے کی تیاری کی۔ ہری سنگھ کی حکومت نے پنڈت نہرو کے مقرر کیے ہوئے شیخ عبداللہ کے وکیل، بہار کے سابق ایڈوکیٹ جنرل بلدیو سہائے اور اُدیش نرائن کو تو اجازت دے دی مگر آزادانہ نقل و حرکت کے لیے نہرو کو اجازت نہیں ملی۔ لیکن نہرو بھی شیخ عبداللہ سے ملاقات کیے بغیر واپس نہیں جا سکتے تھے۔ دہلی میں، کانگریس ورکنگ کمیٹی ایک اضطراب کے عالم میں تھی۔ کیبینیٹ مشن سے متعلق انتہائی اہم مسائل، قطعی اور آخری فیصلوں کے منتظر تھے اور نہرو جنھیں مکمل آزادی اور نوآبادیاتی حکومت کے درمیان عبوری عارضی حکومت کا سربراہ ہونا تھا کشمیر کی ایک جیل میں بیٹھے تھے۔ بالآخر، کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد نے نظم و ضبط کے پابند کانگریسی کو دہلی واپس آنے کا حکم دیا۔ پہلے تو نہرو نے انکار کر دیا اور ورکنگ کمیٹی سے درخواست کی کہ "وہ میرے بغیر کارروائی کو آگے بڑھائے" آزاد نے جواب دیا۔ "یاد رکھو، تم ایک تنظیم کے ماتحت ہو اور جسے تم نے برسوں سے چاہا اور پسند کیا ہے۔ ...... اس کی ضرورتیں، تمھارے لیے اور میرے لیے سب سے افضل ہونا چاہییں......" نہرو نے پیچھے جواب بھیجا "آپ کا پیغام، دوپہر کے کھانے کے بعد ایک بجے ملا۔ میں اس توقع اور یقین کے ساتھ فوراً واپس آنے پر تیار ہوں کہ میں بعد کو کشمیر واپس آؤں گا۔" نہرو کشمیر سے چل دیئے مگر غالباً اپنے اس عمل سے نہرو نے کشمیریوں کے دل جیت لیے۔ کشمیری جو انتہائی جذباتی لوگ ہیں کبھی نہیں بھول سکتے کہ پنڈت نہرو نے ایک تاریک گھڑی میں آپ ان کے لیے کیا کیا انھوں نے کس طرح ان کے مقدمے کو لیا اور ہری سنگھ کی حکومت کو اپنی زیادتیوں پر لگام لگانے پر مجبور کر دیا۔ مشترکہ وفاداریوں کے ایسے ہی مظاہر تھے جن سے کشمیر اور جمہوری ہندوستان کے باہمی رشتے استوار ہوئے تھے۔

شیخ عبداللہ کا مقدمہ ۲۲ جولائی ۱۹۴۶ کو شروع ہوا۔ پنڈت نہرو مقدمے کی کارروائی دیکھنے کے لیے ۲۵ جولائی کو آئے۔ چار دن تک ٹھہرے رہے اور چار ہی دفعہ اپنے دوست سے ملے۔ شیخ عبداللہ کے صفائی کے وکیل شانتی سروپ دھون اور آصف علی تھے اور استغاثہ کی طرف سے لاہور کے جے گوپال سیٹھ مقرر ہوئے تھے غالباً مسئلے کو خود شیخ عبداللہ نے اس وقت ہی طے کر دیا جب انھوں نے اپنے آپ کو مجرم نہ قرار دیتے ہوئے تین ہزار الفاظ پر مشتمل ایک بیان دیا۔ اس بیان میں انھوں نے کہا "میں آج بھی ان تمام باتوں کو صحیح سمجھتا ہوں جو میں نے جموں اور کشمیر کے عوام کے حقوق سے متعلق کہی یا لکھی ہیں۔ سرکشی اور بغاوت کا میرا مقدمہ، میرے خلاف صرف شخصی الزام ہی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ چیز ہے۔ حقیقت میں یہ مقدمہ جموں اور کشمیر کی ساری آبادی کا مقدمہ ہے" بادام باغ کنٹونمنٹ کے سیشن جج نے شیخ عبداللہ کو بغاوت کے الزام میں تین سال کی قید محض اور ڈیڑھ ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا سنائی۔

جیل سے شیخ عبداللہ نے چوری چھپے کسی طرح اپنے ساتھیوں کو ایک خط بھجوایا جو ان کے انداز فکر کا آئینہ دار ہے۔ "جدوجہد کے عزیز ساتھیو۔ یہ لڑائی وہ ہے جسے انجام تک لڑنا ہے۔ یا ہم اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں یا پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے ہیں۔ میں نے کہا ہے اور میں اب بھی کہتا ہوں کہ مہاراجہ ہری سنگھ کو ہم پر حکومت کرنے کا کوئی اخلاقی حق نہیں ہے اور جہاں تک ان کے آئینی استحقاق کا سوال ہے جب اور جہاں بھی ممکن ہوا ہم اس کی مخالفت کریں گے۔ ہندوستان سے برطانوی استعمار کے معدوم ہو جانے کے بعد اقتدار اعلیٰ خود بخود عوام کے ہاتھ میں آجاتا ہے اور اب یہ مہاراجہ کا کام ہے کہ وہ عوام کے ساتھ اپنا نیا رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرے اور اس نئے رشتے کا امکان عوام کے مطالبات کو مہاراجہ کے ماننے کی بنیاد پر ہے اور بس۔ اسے اس نوشتۂ دیوار کو پڑھ لینا چاہیے یا پھر عوام سے لڑائی انجام تک لڑنا چاہیے اسے عوام اور موجودہ وزیر اعظم رام چندر کاک میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ہوگا۔ موخرالذکر جب تک وزارت عظمیٰ کی گدی پر متمکن ہیں، کشمیر میں امن و سکون نہیں ہو سکتا اس لیے ساتھیو! کمربستہ ہو جاؤ، رجعت پسندی اور بربریت کی اس آخری پناہ گاہ پر آخری اور بھرپور حملہ کرنے کے لیے اور اس بات کا یقین کرو کہ آخر میں فتح ہماری ہی ہوگی۔ حق کے اس معرکہ میں شخصی مصائب اور پریشانیاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ یہ ہمارے مہتم بالشان مقاصد ہیں جو ہمارے دلوں میں سب سے پہلے ہونے چاہییں۔ انقلاب زندہ باد، بیعنامۂ امرت سر کو توڑ دو۔"

دلی میں حالات میں بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور جون ۱۹۴۷ تک پاکستان قبول کیا جا چکا کانفرنس کا ہیڈ کوارٹر ہے) گئے تو وہاں قابو سے باہر جوش و خروش تھا۔ "گاندھی جی کی جے" کے نعرے فضا

تھا۔ نہرو نے گاندھی جی سے اپنا یہ شکوہ جاری رکھا کہ ایک طرف ہندوستان آزادی کی منزل کے قریب پہنچ رہا ہے، دوسری طرف شیخ عبداللہ ابھی تک جیل میں ہیں اور کانگریس ان کی رہائی کے لیے کچھ نہیں کر رہی ہے۔ وہ کشمیر کا دورہ کرنا چاہتے تھے۔ گاندھی جی نے اس کی تائید نہیں کی اور یہ کہا کہ وہ خود وہاں جائیں گے۔ وہ غیر معمولی زمانہ تھا۔ مذہبی تعصب اپنے عروج پر تھا۔ ہر شہر میں خون خرابہ ہو رہا تھا۔ پنجاب میں بھی گھبراہٹ اور ہراس پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ سارے ملک میں کشیدگی تھی، تناؤ تھا۔ ہر جگہ یہ قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں کہ کون سا صوبہ کس ملک کے ساتھ جائے گا اور یہ کہ اس پر عمل درآمد کیوں کر ہوگا۔ گاندھی جی جانتے تھے کہ اس صورت حالات میں ان کے کشمیر جانے کی غلط تاویلیں ہو سکتی ہیں۔ انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ وضاحت کی کہ وہ کشمیر اس لیے نہیں جا رہے ہیں کہ کشمیریوں کو ہندوستان کے ساتھ رہنے پر آمادہ کریں۔ یہ بات تو پورے طور پر کشمیریوں پر منحصر ہے کہ وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان میں جانا چاہتے ہیں۔ گاندھی جی تو اپنا ایک وعدہ پورا کرنے جا رہے تھے جس کے ایفا میں غیر معمولی مصروفیتوں کی وجہ سے ایک سال کی تاخیر ہو گئی تھی۔ وہ صرف بیگم عبداللہ سے ملنے اور یہ کہنے جا رہے تھے کہ کانگریس ان کے مقاصد اور ان کے مفاد کو بھولی نہیں ہے۔ اگر نہرو اس وقت کشمیر گئے تو اس کا یہ غلط مطلب نکالا جائے گا کہ ہندوستان کا ہونے والا وزیر اعظم کشمیریوں پر دباؤ ڈالنے گیا تھا۔ گاندھی جی ۳۰ جولائی ۱۹۴۷ کو روانہ ہوئے۔

وہاں پہنچتے ہی گاندھی جی کو وہاں کے جذبات کا ذائقہ مل گیا۔ اس کا پہلا اشارہ ان کا بے مثال استقبال تھا۔ سڑکوں پر دور دور تک ہجوم تھے۔ نعرے لگ رہے تھے "باغی عبداللہ کی جے" بیگم عبداللہ نے گاندھی جی کو ہار پہنائے۔ گاندھی جی نے لوگوں کو بتایا کہ وہ مہاراجہ سے ملنے نہیں بیگم عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کے کارکنوں سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔ ہری سنگھ کی حکومت کو توقع تھی کہ گاندھی جی مہاراجہ سے ملاقات کی درخواست کریں گے۔ گاندھی جی نے حکومت کو یکسر نظر انداز کیا۔ ہری سنگھ نے اپنے محل میں گاندھی جی کی میزبانی کی پیش کش کی، انھوں نے انکار کر دیا اور نیشنل کانفرنس کے مہمان بن کر رہے (جس نے انھیں سیٹھ کشوری لال کے مکان پر ٹھہرایا) بالآخر وزیر اعظم کاک گاندھی جی سے ملنے گئے۔ انھوں نے ہری سنگھ سے ملنے پر رضامندی ظاہر کی مگر انھیں صرف یہ بتانے کے لیے کہ "آپ کے عوام آپ سے خفا ہیں، میں آپ کی طرف سے کوئی چیز بھی قبول نہیں کر سکتا جب تک آپ کے عوام آپ کو قبول نہیں کرتے ہیں اپنے عوام کو خوش کیجیے اور میں آؤں گا اور آپ کے محل میں دس دن ٹھہروں گا۔"

جب گاندھی جی پارٹی کے کارکنوں سے خطاب کرنے کے لیے مجاہد منزل (جو پہلے کی طرح آج بھی نیشنل کانفرنس کا ہیڈ کوارٹر ہے۔) گئے تو وہاں قابو سے باہر جوش و خروش تھا: "گاندھی جی کی جے" کے نعرے فضا میں گونج رہے تھے۔ خوشی سے پٹاخے چھوڑے جا رہے تھے۔ بیس ہزار سے زیادہ آدمیوں کا مجمع تھا۔

گاندھی جی کو پاکستان کے جنم سے محض دو ہفتے قبل، مسلم اکثریت والے کشمیر نے ناقابل یقین طور پر خوش آمدید کہا تھا ان کا استقبال کیا تھا۔

شیخ عبداللہ کو بالآخر ایک نسبتاً آرام دہ مقام پر رکھا گیا اور ان کے دوست جواہر لال نہرو کی زیر قیادت آزاد ہندوستان کی حکومت کے دباؤ کی وجہ سے بالآخر انھیں ستمبر ۱۹۴۷ء میں چھوڑ دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ کشمیر سرمستی و سرخوشی میں ڈوب گیا۔ کہتے ہیں کہ ان کی پہلی عام تقریر کے موقع پر مجمع میں ایک لاکھ سے زیادہ لوگ شریک ہوئے تھے۔ اس پہاڑی ریاست کی مختصر آبادی کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد غیر معمولی تھی۔ ۴ اکتوبر کو، حضوری باغ کے مقام پر، شیخ عبداللہ نے عوام کو ایک بار پھر وہ سب کچھ بتایا جس پر ہمیشہ سے ان کا ایمان رہا تھا۔ ان کی سولہ مہینوں کی حراست کے زمانے میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔ پاکستان معرض وجود میں آچکا تھا۔ کشمیر کے سامنے انتخاب کا مسئلہ آگیا تھا۔ ہری سنگھ نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ کس ملک سے الحاق کریں گے۔ شیخ نے یہ بات صاف کر دی کہ ہری سنگھ کو کشمیریوں کی نمائندگی یا ترجمانی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ فیصلے کا حق عوام کو دیا جانا چاہیے نہ کہ ان کے جاگیردار آقا کو۔ یہ وہی اصول تھا جس پر ہندوستان کے وزیر داخلہ سردار پٹیل نے جوناگڑھ اور حیدر آباد کے مسلمان راجاؤں کو چیلنج کیا تھا، جو اپنی ریاستوں میں بہت بڑی ہندو اکثریت کے باوجود خودمختاری یا مذہبی ملک پاکستان سے الحاق کے اعلان کی دھمکی دے رہے تھے۔ شیخ عبداللہ نے کہا کہ کشمیر میں بھی اسی اصول کا نفاذ ہونا چاہیے۔

اس وقت یہ سوال سامنے آیا کہ عوام کے حق میں کیا بہتر ہوگا، ایک مسلمان ملک پاکستان سے مل جانا چاہیے یا ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہیے جو ایک سیکولر ملک ہے۔ اس سوال کا جواب شیخ عبداللہ نے اپنی تقریر میں دیا۔

"پنڈت جواہر لال نہرو میرے دوست ہیں اور گاندھی جی کے لیے میرے دل میں انتہائی احترام ہے ..... ہم دو قومی نظریے پر جس نے اتنا زہر پھیلایا ہے یقین نہیں رکھیں گے۔ اس موقع پر کشمیر نے روشنی دکھائی جب سارے ہندوستان میں بھائی بھائی کو مار رہا ہے۔ کشمیر نے ہندو مسلم اتحاد کی اپنی آواز اٹھائی۔ میں ہندوؤں اور سکھ اقلیتوں کو یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں اس وقت تک ان کی زندگیاں اور ان کی عزت بالکل محفوظ ہے۔" ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ خود اس وقت جس وقت شیخ عبداللہ یہ تقریر کر رہے تھے، ہندوستان اور پاکستان میں کیا ہو رہا تھا اس مہینے اور عین اس دن، ہندو مسلم فسادات، انتہائی ہولناک اور بھیانک شکل میں ہوئے تھے اور وادی کشمیر میں نیشنل کانفرنس اپنے نعرے "ہندو مسلم اتحاد کی جے" سے مسلم لیگ کی ہر کوشش کا مقابلہ کر رہی تھی۔

اس زمانے میں ملک کی صورتِ حال کے بارے میں کچھ اندازہ ان تقریروں سے کیا جا سکتا ہے جو کہیں اور ہو رہی تھیں۔ ۴۔ اکتوبر کو اپنی روزانہ کی پرارتھنا سبھا میں ایک مایوس اور نا اُمید گاندھی جی کہہ رہے تھے کہ وہ بھگوان سے ایک سو پچیس سال کی اپنی زندگی کی دُعا مانگا کرتے تھے تاکہ وہ آزاد ہندوستان میں رام راج دیکھ سکیں مگر اب زندگی اس لائق لگتی نہیں ہے۔ جس شخص نے اپنی ساری زندگی اس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا دوست رکھنے میں صَرف کر دی اس نے کہا "ہندو اور مسلمان آج ایسا لگتا ہے کہ ظلم اور زیادتی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں مقابلہ کر رہے ہیں۔ مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے غرض کوئی بھی چھوڑا نہیں جاتا۔" نہرو کو غصّہ تھا اس ہندوستان پر جو انھیں دیا گیا تھا۔ دلّی میں کانگریس کے کارکنوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے وہ بپھر گئے۔ محض چار دن قبل انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ جب تک وہ زندہ ہیں ہندوستان ایک ہندو ریاست نہیں بن سکتا۔ کانگریسی کارکنوں کا یہ جلسہ دلّی کے سبزی منڈی کے محلّے میں ہوا تھا۔ انھوں نے کہا کہ فاشزم ہندوستان کو اپنی گرفت میں لے رہا ہے۔ ایک ہندو ریاست کے مطالبے ہو رہے تھے مگر وہ بنیا وزیرِ اعظم، ایسی رجعت پرستانہ نقطۂ نظر کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہ کانگریس کی قدروں پر ایمان رکھتے تھے اور اگر یہ اقدار اب عوام کو قبول نہیں ہیں تو انھیں اپنا کوئی دوسرا وزیرِ اعظم منتخب کر لینا چاہیے وہ اپنے اعتقادات کو ووٹوں کے لیے تبدیل نہیں کریں گے۔

اپنی ۴۔ اکتوبر کی تقریر میں شیخ عبداللہ نے بہت بڑی تعداد میں سامعین کو یہ سمجھایا کہ مسلم لیگ نے اپنا پاکستان کس طرح حاصل کیا۔ کوئی دوسرا اتنے تیقّن اور اعتماد کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ "میں نے پاکستان کے نعرے پر کبھی بھی ایمان نہیں رکھا۔ یہ میرا محکم ایمان رہا ہے کہ یہ نعرہ سب ہی کے لیے پریشانیاں اور مصائب لائے گا۔ مَیں نے دو قومی نظریے کو بھی نہیں مانا مگر اس کے باوجود پاکستان ایک حقیقت ہے..... ہندوستان کے لیے ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کو اس سے کیا ملا؟ ان کی پریشانیوں سے میں ہمدردی رکھتا ہوں۔ پاکستان دوست عناصر نے اپنا 'راست عمل' ۱۶۔ اگست سے نواکھالی سے شروع کیا تھا اور وہاں غیر مسلموں پر ناقابلِ بیان مصائب توڑے تھے۔ اس کے بعد بہار میں اس کا بدلہ لیا گیا۔ بعد کو صوبہ سرحد اور مغربی پنجاب میں ہندو اور سکھ مارے گئے۔ اس کے ردِّ عمل کے طور پر مشرقی پنجاب اور دلّی میں مسلمانوں کا کشت و خون ہوا...... یہ نتیجہ نکلا تھا دو قومی نظریے کا...... ہم کشمیر میں عوامی راج چاہتے ہیں۔ یہ کسی ایک فرقے کی حکومت نہیں ہوگی، بلکہ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں سب کی ہوگی۔" یہ تھے شیخ عبداللہ تاریخ کی اس گھڑی میں جب ان کی زبان سے

نکلا ہوا ایک بھی حرف نہایت آسانی کے ساتھ کشمیر کو پاکستان میں پہنچا سکتا تھا اور سردار پٹیل بھی، کشمیر کو پاکستان میں جانے کی بخوشی اجازت دے دیتے اگر اس سے حیدر آباد اور جونا گڑھ کو ہندوستان میں رکھا جانا آسان ہو جاتا۔

۱۹۴۶ء میں شیخ عبداللہ، جواہر لال سے ملنے کے لیے دہلی آرہے تھے ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ ہری سنگھ کے سپاہیوں نے انھیں گرفتار کر لیا۔ اب شیخ صاحب کشمیر کے غیر متنازعہ ہیرو تھے اور پنڈت نہرو ہندوستان کے وزیر اعظم۔ نہرو نے انھیں آرام کرنے کی غرض سے دہلی آنے کی دعوت دی تھی۔ ظاہر ہے کہ دہلی میں صرف ایک جگہ تھی جہاں یہ مہمان ٹھہر سکتا تھا اور وہ جگہ تھی ۱۶ یارک پیلیس، ہندوستان کے نئے وزیر اعظم کی عارضی رہائش گاہ۔ شیخ کے قیام کے سلسلے میں نہرو کو جو مسئلہ پریشان کیے ہوئے تھا وہ تھا شیخ صاحب کے اچھے کھانے کا شوق (کھانے کے معاملے میں شیخ صاحب کی خوش مذاقی اور خوش خوراکی دونوں بہت مشہور ہیں)۔ نہرو کی بیٹی اندرا اسی زمانے میں الٰہ آباد سے آئیں تو اس سلسلے کے انتظامات انھوں نے اپنے ہاتھ میں لیے۔ ایک وقت پھر آئے گا ان گنت طوفانوں کے گزرنے کے بعد، یہ عمل پھر دہرایا جائے گا اور شیخ صاحب ایک طویل مدت کی حراست سے رہا ہونے کے بعد پہلا کام تو یہ کریں گے کہ جلدی سے کشمیر کا ایک چکر لگائیں گے اور پھر اپنے "عزیز ترین دوست" کے گھر ٹھہرنے کے لیے دہلی آجائیں گے۔ یہ سب کچھ ۱۹۶۴ء میں ہوگا اور شیخ عبداللہ ہری سنگھ کے حکم سے ملی ہوئی نہیں بلکہ نہرو حکومت کی دی ہوئی حراست سے رہا ہو رہے ہوں گے۔ مگر یہ دوستی سیاست کے بے رحم اثرات سے غیر متاثر ایک غیر معمولی دوستی تھی جو صرف اس نسل میں ممکن تھی جسے کبھی نہ نفرت کرنے اور کبھی نہ خوف کھانے کا سبق پڑھایا گیا تھا۔ یادگاری جلد میں بی کے نہرو اس رشتے کی گرمجوشی کو یاد کرتے ہیں: "۱۹۴۷ء میں ایک بار جواہر لال نہرو اور شیخ عبداللہ نے میری رہائش گاہ (۱۔ صفدر جنگ روڈ) پر میرے اور میری بیوی کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس وقت تک ہم نے کھانے کے لباس اور طور طریقوں کو جمہوریت کے منافی سمجھنا شروع نہیں کیا تھا۔ حفاظتی اقدامات نے بھی اس زمانے میں حکمرانوں کی زندگیوں کو آج کل کی طرح ناممکن نہیں بنا دیا تھا۔ کھانے کے بعد کناٹ پیلیس کے ریگل سنیما میں ہم چاروں سامرسٹ مام کے ناول پر مبنی ہوئی ایک فلم "دی ریزرس ایج" دیکھنے گئے۔ ہم لوگ بالکنی میں بالکل دوسرے عام لوگوں کی طرح بیٹھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ آخری موقع تھا جب جواہر لال نہرو نے نجی طور پر ایک عوامی جگہ پر فلم دیکھی۔"

طوفان آرہے تھے اب نہرو اور شیخ عبداللہ کی دوستی کی ایک ایسے بحران میں کڑی آزمائش ہو گی جس نے برصغیر کے نوزائیدہ اور نوجوان ملکوں کو نہ صرف ہلا کر رکھ دیا بلکہ وہ قیمت طلب کی جو آج بھی وہ پیڑھیاں ادا کر رہی ہیں جن کا اس گناہ سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔



(۴)

"فردوسِ گم شدہ" - بازیافت کی سعیِ ناکام

۲۲ اکتوبر کی تاریخ تھی اور ۱۹۴۷ کا سن - پاکستان کے شمالی مغربی سرحدی صوبے پشاور میں ایک بہت بڑا جلسہ عام ہوا اس جلسے سے خطاب کرنے والے شخص کو اپنے حق کے طور پر ہندوستان میں رہنا چاہیے تھا - اس نے اپنی ساری زندگی ، ایک سیکولر ملک بنانے کے لیے لڑائی میں صرف کر دی تھی اور عدم تشدد پر ایمان رکھتا تھا - اسے لوگ سرحدی گاندھی کے نام سے جانتے تھے ۔ وہ بادشاہ خان بھی کہلاتا تھا - تشدد اور بربریت کے حالیہ ننگے ناچ میں اس نے دیکھا کہ اس کی ساری زندگی کا کیا دھرا ختم ہو رہا ہے مگر اس نے اب بھی طوفان کا رُخ بدلنے کی کوشش کی - جلسے میں موجود پٹھانوں سے اس نے کہا "اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک ضبط و برداشت کا جذبہ ہے - اسلام کا لفظ ہی محبت اور غیر سگالی کو ظاہر کرتا ہے جو پٹھانوں کے قوانین کی بھی خصوصیت ہے اس لیے اگر کوئی کسی کمزور ، غیر محفوظ اور بے یار و مددگار شخص کو اذیت دیتا ہے تو وہ صرف اسلام ہی کے پاکیزہ نام پر دھبا نہیں لگاتا بلکہ وہ ایک بالکل غیر پٹھانی عمل کا بھی مجرم ہوتا ہے ۔" یہ الفاظ اس دن خصوصاً بڑے دھاردار تھے جموں ، سرحد اور کشمیر کی سرحدوں پر اسلام کی ایک بالکل مختلف تاویل پیش کی جا رہی تھی -

جناح صاحب نے کشمیر کے پاکستان سے الحاق کے لیے اپنا بس بھر زور لگا لیا تھا - شیخ عبداللہ نے اس بات کو ہمیشہ ہی خودکشی کے مترادف سمجھا تھا - تقسیم کے بعد جب ایسا محسوس ہوا کہ نہ تو نیشنل کانفرنس اور نہ ہی مہاراجہ کی حکومت کشمیر کو پاکستان میں لے جانے کے لیے تیار ہے تو جناح صاحب نے طاقت کے استعمال کا فیصلہ کیا اس وقت مہاراجہ ہری سنگھ ہوائی قلعوں کی تباہ کن تعمیر میں اُلجھ چکے تھے اور ان کے ذہن میں خود مختار سلطنت کے عجیب عجیب نقشے گھومنے لگے تھے ان کے درباریوں کی خوشامدانہ تجاویز تو یہاں تک تھیں کہ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عظیم سلطنت کی بازیافت کر سکتے ہیں - جولائی میں ، کشمیر کے ایک دورے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اس اشارے

کے باوجود کہ سب سے اچھی بات یہ ہو گی کہ پاکستان سے الحاق کیا جائے، مہاراجہ نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک کسی کاغذ پر دستخط نہیں کیے تھے اس کی جگہ پر کشمیر نے ہندوستان اور پاکستان دونوں کے ساتھ توقف کا ایک معاہدہ کر لیا۔ ہندوستان مذہبی فسادات کے علاوہ حیدرآباد، جوناگڑھ اور ریفیوجیوں کے مسائل کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان نے کشمیر پر قبضہ کرنے کا ایک منصوبہ تیار کر لیا۔

۲۴ اگست کو جناح صاحب نے اپنے ملٹری سکریٹری کو حکم دیا کہ وہ وسط ستمبر میں کشمیر میں دو ہفتے کی چھٹیاں گزارنے کے انتظامات کر دے مگر یہ سن کر انھیں بہت زبردست دھکا لگا کہ ہری سنگھ انھیں وادی میں قدم بھی نہیں رکھنے دیں گے۔ معاصرین کا خیال ہے کہ اس تحقیر نے جناح صاحب میں کشمیر میں چھٹیاں منانے کا عزم اور محکم کر دیا۔ ستمبر کے وسط تک کشمیر پر قبضہ کرنے کے لیے صوبۂ سرحد کے قبائلیوں کو کشمیر بھیجنے کے منصوبے پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ پاکستان کے لیے یہ عمل اس وار کی حیثیت رکھتا تھا جس سے بیک وقت تین شکار ہوتے تھے۔ اول یہ کہ اس کارروائی سے پٹھانوں کی توجہ کو کابل کی طرف سے ہٹایا جاسکتا تھا (جب ۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان کو اقوام متحدہ میں داخل کیا گیا تھا، افغانستان واحد ملک تھا جس نے اس کی مخالفت کی تھی)۔ دوم یہ کارروائی اس پاکستانی فوج کا استعمال کیے بغیر ہی کشمیر کو پاکستان میں شامل کرا دے گی جس کی سرزمین کشمیر میں موجودگی آئینی طور پر کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتی اور سوم یہ کہ یہ کارروائی قبائلیوں کو ان کے پسندیدہ شغلے یعنی لوٹ مار کا بھی موقع فراہم کر دے گی جو بہت دنوں سے ان کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ قبائلی لیڈروں کو یہ سمجھایا گیا کہ یہ لڑائی صرف یہی نہیں کہ ایک ہندو راجہ کے چنگل سے اپنے مسلمان بھائیوں کو آزاد کرانے کے لیے جہاد ہو گی بلکہ منزل پر مال غنیمت حاصل کرنے کے بھی بے پناہ مواقع فراہم کرے گی۔ یہ قبائلی ۲۲-۲۳ اکتوبر کی رات میں جہلم کے پار کشمیر میں داخل ہوئے۔ سرحدی مورچے پر نہایت آسانی سے قبضہ ہو گیا۔ سری نگر تقریباً ایک سو چالیس میل دور تھا جہاں پہنچنے کے لیے موٹر کے لائق ایک سڑک تھی۔ جموں و کشمیر کی موسم گرما کی راجدھانی پر تکنیکی طور پر چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر قبضہ ہو سکتا تھا مگر جب لٹیروں کے سربراہوں نے سیدھے سری نگر جانے کا فیصلہ کیا تو اس انکشاف سے انھیں ایک بہت بڑا دھکا لگا کہ ان کے پیروان کے ساتھ ہیں ہی نہیں۔ پٹھان رات کی تاریکی میں غائب ہو گئے تھے وہ لوگ قریب کے قصبے مظفر آباد میں لوٹ مار کے لیے چلے گئے۔ دراصل وہ جانتے تھے کہ مقدم کیا چیز ہے۔ اس حرص و ہوس کی وجہ سے سری نگر پر دھاوے میں چند انتہائی اہم دنوں کے لیے خلل پڑ گیا اور ان ہی دنوں میں برصغیر کی تاریخ ایک بار پھر سے لکھی گئی۔

راکشش مہیش اسوار پر دیوی درگا کی فتح کشمیر کا محل میں ہر سال بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ درگا ایک ایسی دیوی ہے ڈوگرے جس کی بہت پرستش کرتے ہیں تقریبات کے سلسلے میں وہاں ایک روایت یہ تھا کہ وہاں کے امرا ریشمی کپڑے کے ایک ٹکڑے میں لپیٹ کر سونے کا ایک ٹکڑا ہری سنگھ کی خدمت میں پیش کرتے تھے اور ان کا یہ عمل ان کی وفاداری کا ایک ثبوت تصور ہوتا تھا۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ کی شام کو امرا اپنی وفاداریوں کا اظہار کر ہی رہے تھے کہ تمام روشنیاں گل ہو گئیں۔ جشن میں شریک لوگوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ ہوا کیوں؟ مگر حقیقت یہ تھی کہ مہورا کے پاور ہاؤس میں جو ساری وادی کو بجلی سپلائی کرتا تھا، حملہ آوروں نے قبضہ کر کے اسے نذر آتش کر دیا تھا۔ قبائلی اب سری نگر سے پچاس میل سے کچھ کم ہی فاصلے پر تھے۔ جموں اور کشمیر کے عظیم حکمراں نے پہلا کام وہ کیا جو ان کا ذہن سوچ سکتا تھا اور یہ کام تھا کہ انھوں نے اپنے لاتعداد تھیلے جمع کرنے شروع کیے اور چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر اپنے عوام کو لٹیروں حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

نہرو کو اس بحران کی اطلاع ۲۴ اکتوبر کی رات میں ملی۔ ان کے ہوش اُڑ گئے۔ شیخ عبداللہ اس وقت ان ہی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے، دونوں نے مختلف امکانات اور مختلف کارروائیوں پر غور کیا۔ شیخ عبداللہ نے کشمیر کو بچانے کے لیے ہندوستانی فوج کو وہاں بھیجنے کے فیصلے کی پوری قوت کے ساتھ تائید کی مگر نہرو اس عمل کے آئینی پہلو کی توثیق پہلے چاہتے تھے۔ اگلی صبح، ۲۵ اکتوبر کو کابینہ کی ایک ہنگامی میٹنگ ہوئی اسی سہ پہر رائل انڈین ایر فورس کا ایک جہاز ڈی سی ۔ تھری سری نگر کے ہوائی اڈے پر اترا اس جہاز میں ریاستوں کی وزارت کے سکریٹری وی پی مینن تھے۔ ان کے اوپر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ وہ کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے کاغذات پر دستخط لے لیں۔ ہندوستانی فوجیں کشمیر میں اس وقت تک داخل نہیں ہوں گی جب تک کہ انھیں آئینی طور پر یہ اختیار نہ مل جائے۔ ابتدائی مذاکرات ختم ہوئے، مینن واپس دہلی آگئے۔ دوسرے دن وہ ایک دوسرے جہاز کے ذریعے جموں روانہ ہوئے۔ (رات میں مہاراجہ اپنا روپیہ اور قیمتی خزانہ لے کر ٹرکوں اور کاروں کے ایک قافلے کے ساتھ جموں کے محفوظ شہر کی طرف بھاگ گئے تھے) مہاراجہ نے بخوشی کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ کشمیر ہندوستان کا ایک حصہ بن گیا۔

مگر ایک الجھن تھی۔ یہ الحاق عارضی تھا، ایک اصول تھا جس پر شیخ عبداللہ کوئی مفاہمت نہیں کر سکتے تھے ان کا خیال تھا کہ وہ خاندان جس نے کشمیر انگریزوں سے پچھتر لاکھ روپے میں خریدا تھا اسے کشمیر کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں دیا جا سکتا تھا۔ ایسا فیصلہ کرنے کا حق صرف کشمیری عوام کو تھا، اور بعد کو کسی وقت ان عوام کو اس فیصلے کی توثیق کا حق دیا جانا چاہیے۔ اس توثیق کا طریقہ کیا ہو گا اس کے بارے میں ابھی تک کسی کے ذہن میں کوئی صاف بات

نہیں تھی۔ نہرو کے سوانح نگار ایس گوپال کے مطابق یہ ماؤنٹ بیٹن تھے جنھوں نے استصواب رائے عامہ تجویز کیا تھا اس وقت نہ تو الحاق کے عارضی ہونے کا پہلو اور نہ ہی توثیق کا خیال کوئی مسئلہ سمجھا گیا۔ ہندوستان کے لیے شیخ عبداللہ کی وفاداری کسی قسم کے شک وشبہہ سے بالاتر تھی۔ یہ جناح صاحب نہیں پنڈت نہرو تھے جنھوں نے یہ بات رکھی اور علی الاعلان کہہ دی تھی کہ الحاق کے فیصلے میں یہ شرط شعوری طور پر رکھی گئی تھی۔

۲ نومبر کو آل انڈیا ریڈیو پر ایک نشریئے میں جس کے الفاظ جب بھی کشمیر پر بحث ہوتی ہے، دہرائے جاتے ہیں۔ نہرو نے کہا "آج کی رات میں آپ لوگوں سے کشمیر کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں، مشہور و معروف وادی کے حسن کے بارے میں نہیں بلکہ اس دہشت کے بارے میں جس کا اس نے ابھی حال ہی میں مقابلہ کیا ہے ....
۲۴ اکتوبر کی رات تھی جب ریاست کشمیر کی جانب سے ، ہم سے الحاق اور فوجی امداد کی درخواست کی گئی تھی ......
سری نگر بلکہ پورے کشمیر کا مقدر تذبذب کا شکار تھا۔ ہم کو ہنگامی پیغامات بھیجے گئے، صرف مہاراجہ کی حکومت کی طرف سے ہی نہیں بلکہ عوام کے نمائندوں خصوصًا کشمیر کے عظیم لیڈر شیخ محمد عبداللہ، جو اس وقت نیشنل کانفرنس کے صدر بھی ہیں، کی طرف سے بھی۔ کشمیر کی حکومت اور نیشنل کانفرنس دونوں نے ہم پر انڈین یونین سے کشمیر کے الحاق کو منظور کرنے کے لیے زور ڈالا۔ ہم نے اس الحاق کو منظور کرنے کا فیصلہ کیا اور ہوائی جہاز کے ذریعہ اپنے سپاہی بھیج دیئے مگر ہم نے ایک شرط بھی لگا دی کہ اس الحاق کی، جب نظم وضبط اور امن وشانتی قائم ہو جائے گی تو عوام سے بھی توثیق کرانا ہوگی۔ ہم اس بات کے لیے مضطرب تھے کہ بحران کی اس گھڑی میں عوام کو اپنی بات کہنے کا موقع دیئے بغیر کوئی آخری فیصلہ نہیں ہونا چاہیے یہ طے کرنا بہر حال ان کا کام ہے اور مجھے یہ بات بھی صاف کرنے کی اجازت دیجیے کہ اس پورے عرصے میں ہمارا یہ موقف رہا ہے کہ دونوں ملکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کے بارے میں ایک تنازعہ ہے اور فیصلہ ریاست کے عوام کو کرنا چاہیے۔ یہ ہماری اس پالیسی کے مطابق تھا کہ ہم نے کشمیر کے الحاق کے معاہدے میں یہ شرط بھی بڑھا دی۔"

دراصل یہ جناح صاحب تھے جنھوں نے استصواب رائے عامہ کے خیال کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ جب تک ہندوستان کی فوجیں ریاست میں ہیں وہاں ایمان داری کے ساتھ رائے شماری ہو ہی نہیں سکتی۔ جناح صاحب کو یقین تھا کہ جب تک شیخ عبداللہ کی قیادت ہے کشمیری ہندوستان کے حق میں ہی رائے دیں گے۔

اسی تقریر میں جس میں پنڈت نہرو نے الحاق کی توثیق کے لیے "اقوام متحدہ جیسی بین الاقوامی تنظیم کے تحت، عام رائے معلوم کرنے" کا وعدہ کیا تھا اسی میں انھوں نے دنیا کو یہ بھی بتایا تھا کہ کشمیر کیوں نظریاتی طور پر ہندوستان

کا حصّہ ہے۔ سری نگر پر تباہی آئی ہوئی تھی اور حملہ آور تقریباً دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔ انتظامیہ کا کوئی وجود باقی نہیں رہ گیا تھا۔ فوج نہیں تھی، پولیس نہیں تھی، روشنی اور بجلی خراب ہو چکی تھی، اور پناہ گزینوں کی ایک بڑی تعداد وہاں تھی اور پھر بھی سری نگر کسی ظاہری سراسیمگی کے بغیر حسب معمول تھا۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور لوگ سڑکوں پر چل پھر رہے تھے۔ اس معجزے کا سبب کیا تھا؟ شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس کے ان کے رفیقوں، ان کے غیر مسلح مسلمان، ہندو اور سکھ رضا کاروں نے حالات کو اپنے ہاتھ میں لیا، نظم و ضبط کو قائم رکھا اور پریشانی اور سراسیمگی کو روکا۔ یہ ایک حیرت ناک کام تھا جو انھوں نے کیا اور ایک ایسے وقت میں کیا جس میں اکثر لوگوں کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں انھوں نے ایسا اپنی تنظیم مضبوط ہونے کی وجہ سے بھی کیا مگر اس سے بھی زیادہ اس لیے کیا کہ وہ ان بے رحم اور ظالم و جابر حملہ آوروں سے اپنے ملک کو محفوظ رکھنے کا مصمم تہیہ کر چکے تھے جو ان کے ملک کو تباہ کر رہے تھے اور تشدد کے بل بوتے پر انھیں پاکستان میں شامل ہونے پر مجبور کر رہے تھے۔

ایک ایسے لمحے میں جب ہر آن مقدرات بدل رہے تھے۔ شیخ عبداللہ کے کارنامے بیان کرنے میں پنڈت نہرو کسی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لے رہے تھے۔ ۲۶ اکتوبر اتوار کے دن، اس وقت بھی جب ایک سہما ہوا مہاراجہ جموں میں بیٹھا الحاق پر دستخط کر رہا تھا۔ شیخ عبداللہ نے اعلان کیا کہ کشمیر میں دس ہزار افراد پر مشتمل ایک امن بریگیڈ بنائی گئی ہے جو حملہ آوروں سے عوام کی حفاظت کرے گی۔ نیشنل کانگریس کے چند وہ رضا کار جو پاکستانی قبائلیوں سے لڑے اساطیری بن گئے۔ جیسے بارہ مولا کے مقبول شیروانی، جب بالآخر ہندوستانی فوج بارہ مولا میں داخل ہوئی انھوں نے دیکھا کہ مقبول شیروانی کو ایک بتی پر کیلوں سے ٹھوک کر گولی مار دی گئی ہے اور اصل قصبے میں زندگی کی علامت محض ایک روتے ہوئے کتے کی آواز تھی جو مشن ہاسپٹل میں راہباؤں اور مدر سپیریر کی لاشوں پر رو رہا تھا۔ دو اکتوبر کو جب تباہ کاریاں اپنے عروج پر تھیں، کشمیر کے لیے روانہ ہوتے ہوئے (اپنے جاگیردار حریف روہری سنگھ کے برعکس، جو مخالف سمت میں بھاگ گئے تھے) شیخ عبداللہ نے کہا "میں واپس جا رہا ہوں حملہ آوروں کے خلاف عوام کی مدافعتی جدوجہد کی قیادت کے لیے۔"

الحاق کی شرائط کے مطابق اب جب کہ ہری سنگھ اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو گئے تھے۔ شیخ عبداللہ کو نئی حکومت کی سربراہی کرنا تھی۔ ۳۱ اکتوبر کو انھوں نے اپنے قریبی ساتھیوں مرزا افضل بیگ، بخشی غلام محمد، شام لال سراف اور جی ایم صادق کے ساتھ حلف لیا۔ اسی دن مہاتما گاندھی نے اپنی پرارتھنا سبھا میں کہا کہ میں نے جب بھی فوجیوں اور سامان کو کشمیر لے جانے والے جہازوں کی آوازیں سنی، میرا دل شیخ عبداللہ میں لگا رہا۔ (ملک کا ہر فاضل جہاز اس کام

میں لگا دیا گیا تھا) ان جہازوں نے کشمیر کو بچا لیا۔ ۳۱ اکتوبر کو نہرو نے دو ٹیلی گرام پاکستان بھیجے جس میں امن و شانتی قائم کرنے کے لیے کہا گیا تھا، تاروں کا کوئی جواب نہیں ملا۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کو ابھی بھی یہ خیال تھا کہ وہ اس لڑائی میں جیتنے والا ہے، مگر جلد ہی لڑائی کا رُخ بدلنے لگا اور حملہ آور گھیرے جو اچھی طرح مسلح بھی تھے اور تعداد میں بھی بہت تھے، پیچھے دھکیلے جانے لگے۔ چودہ مہینہ بعد جب تک جنگ بندی ہوگی تو اس وقت ان کے پاس مغرب میں زمین کا محض ایک چھوٹا سا ٹکڑا اور شمال میں دور افتادہ بنجر اراضی ہوگی۔ ہندوستانی فوج کے کمانڈروں کا آج بھی یہ خیال ہے کہ انھیں روک دیا گیا نہیں تو انھوں نے اپنے ملک کے لیے "کشمیر کے مسئلے" کو تقریباً حل کر دیا تھا۔ سری نگر کے کنارے سے انھوں نے پاکستانی فوج کو پونچھ کے مغرب میں اس جگہ تک دھکیل دیا تھا جہاں سے پاکستان نظر آنے لگا تھا اور وہ شمال میں گلگت پر حملہ کرنے کے لیے تیار تھے مگر پنڈت نہرو نے اقوام متحدہ کے اہتمام میں جنگ بندی کو قبول کر لیا۔ بہر حال کشمیر کا اصل مسئلہ نہ تو پاکستان کے رویّے کا تھا کہ یہ تو اس سے مختلف ہو ہی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی اقوام متحدہ کی ثالثی کی کوتاہی کا تھا کہ یہ بھی اس سے زیادہ موثر نہیں ہو سکتی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ دو افراد، جو ۱۹۴۷ء کے ہندوستان میں، اُن اقدار کی علامت تھے جو ملک کو متحد رکھ سکتی تھیں، شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے لگے۔

۱۹۴۷ء کے رشتۂ یگانگت کو جن جذبات اور جس اعتماد نے جنم دیا تھا وہ شاید ۱۱ نومبر کو سری نگر سے زیادہ کہیں اور ظاہر نہیں تھا۔ ۱۱ نومبر کو پنڈت نہرو دہلی سے کشمیر کے دورے پر آئے۔ اس وقت تک سری نگر کے نواحی علاقے خالی کرائے جا چکے تھے اور بریگیڈیر ایل۔ پی۔ سین کے فوجیوں نے بارہ مولا پر قبضہ کر لیا تھا۔ شیخ عبداللہ نے اس وقت کی کیفیت اور موڈ کی تصویر کشی کی تھی جب انھوں نے ۵ نومبر کو شائع ہونے والے روزنامے ہندوستان ٹائمز کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ "پاکستان کی قبر وادیٔ کشمیر میں کھودی جائے گی" ۱۱ نومبر کو رفیع احمد قدوائی، اچوت پٹوردھن اور اپنی بیٹی اندرا گاندھی کے ساتھ پنڈت نہرو سری نگر پہنچے۔ ایک بار پھر پُرجوش استقبال ہوا۔ ہوائی اڈّے سے شہر تک سڑک کے دونوں طرف لوگوں کے ہجوم تھے۔ اسی دن جلسہ عام میں تالیاں بجاتے ہوئے مجمع کو پنڈت نہرو نے بتایا کہ "ماضی کی طرح مستقبل میں بھی ہم ساتھ کھڑے ہوں گے اور دشمن کا مل کر مقابلہ کریں گے۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئے، پھر مڑے اور انتہائی جذبات میں اپنا ہاتھ شیخ کی طرف بڑھا دیا جو پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ متحیّر شیخ نے فوراً پنڈت جی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دو دوست محبت اور وفاداری کی عالمی علامت کے طور پر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کھڑے تھے اور مجمع خوشی سے چلائے جا رہا تھا۔

پنڈت نہرو، جنھیں ہندوستانی موقف کے آئینی طور پر جائز ہونے کا یقین تھا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۷ کو یہ مسئلہ

انجمن اقوام متحدہ کے سامنے لے گئے جس پر بعد کو انھیں خود بھی بہت افسوس رہا۔ پنڈت نہرو چاہتے تھے کہ پاکستان پر بین الاقوامی دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اپنے حملہ آوروں کو واپس بلائے۔ سیکورٹی کاؤنسل نے حسب توقع فریقین سے امن کی اپیل کی۔ حملہ آوروں نے کہ جنھوں نے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کی تھی وہ انداز اختیار کیا کہ جیسے سیکورٹی کاؤنسل کا وجود ہی نہیں ہے۔ اقوام متحدہ کی کوششوں کے سلسلے میں پاکستان کا ردعمل یہ تھا کہ موسم گرما میں جب ہندوستان نے اپنا کامیاب حملہ شروع کیا انھوں نے حملہ آوروں کے ساتھ ساتھ اپنی باقاعدہ فوج کے سپاہی بھی محاذ پر بھیجنے شروع کر دیے۔

پاکستان نے اب یہ کہنا شروع کیا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کو اقوام متحدہ کی نگرانی میں بیک وقت اپنی فوجیں ہٹانا چاہئیں تاکہ ایک ایماندارانہ استصواب ہو سکے۔ یہ کہتے ہوئے پاکستان نے اس سیدھی سادی حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ وہ کشمیر میں کوئی آئینی حیثیت نہیں رکھتا ہے جب کہ ہندوستان کی حیثیت آئینی تھی۔ اس دلیل میں ایک سے زیادہ چالیں تھیں۔ پاکستان کو جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے فوقیت حاصل تھی۔ پاکستان بر وقت ہی، اپنے نائبین یعنی قبائلیوں کو واپس بھیج سکتا تھا اور یہ ظاہر کر سکتا تھا کہ کشمیر پر حملہ سوائے ایک "داخلی معاملے" کے اور کچھ نہیں ہے۔ ———— پاکستان نے ۱۹۴۷ء میں بھی یہی کیا تھا اور ۱۹۶۵ء میں بھی اسے یہی کرنا تھا۔ دوسرے یہ کہ پاکستانی فوجی اڈے کشمیر پر حملہ کرنے کے لیے بہت قریبی فاصلے پر تھے۔ ایبٹ آباد کی دوری صرف سولہ میل تھی، راولپنڈی اکتیس، مری پندرہ، سیال کوٹ چھ اور جہلم محض چار میل کے فاصلے پر تھا۔ دوسری طرف، کسی بحران میں، اچھی تعداد میں ہندوستانی فوج کو لانا پہلی ہی دفعہ مشکل کام تھا جو ظاہر ہے کہ بار بار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

شیخ عبداللہ جو اب کشمیر کے وزیر اعظم تھے وہ بھی ہندوستانی فوج کی واپسی نہیں چاہتے تھے۔ وہ نیویارک گئے اور وہاں کہا کہ "وہ پاکستان کو انھیں غلام بنانے کی کبھی اجازت نہیں دیں گے۔ کشمیر میں ہندو مسلمان کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" جنوری ۱۹۴۸ء میں شیخ عبداللہ نے نیویارک میں دوپہر کے ایک کھانے کے موقع پر کہا کہ "ہم کشمیر میں یہ زبان استعمال نہیں کرتے ہیں...... پچھلے سترہ برسوں میں نیشنل کانفرنس کے سامنے سیکولر جمہوریت کے حصول کا مقصد رہا ہے۔"

کشمیر سے متعلق، اقوام متحدہ کی طول طویل کارروائیوں کا ذکر ایک بے مصرف عمل ہوگا کیوں کہ اس کا ردعمل، آخری تجزیے کے بعد بھی نظر آتا ہے کہ محض رسمی اہمیت کا تھا جو لڑائیاں اہمیت رکھتی ہیں وہ وہ تھیں جو میدان جنگ

میں لڑی گئیں یا پھر ہندوستان اور پاکستان کے باہمی مذاکرات میں۔ شیخ عبداللہ نے چاہا کہ پنڈت نہرو ۴۸-۱۹۴۷ء میں پاکستان کو الٹی میٹم دیں اور اس ملک کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیں مگر پنڈت نہرو نے ان کے اس خیال کو رد کر دیا۔ اقوام متحدہ میں، برطانیہ اور امریکہ نے بڑی بے شرمی کے ساتھ کشمیر کے سلسلے میں پاکستان کی دلیلوں کی تائید کی۔ برطانیہ نے جناح صاحب کا یہ نظریہ کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں، مان لیا تھا۔ وہ یہ نہیں مان سکتے تھے کہ وہ غلطی پر تھے اور ان کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آسکتی تھی کہ کشمیر جیسا بڑی مسلم اکثریت والا علاقہ ہندوستان کے ساتھ اپنے الحاق کو ترجیح دے سکتا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے تو یہاں تک کیا کہ وہ جولائی ۱۹۴۷ میں بنفس نفیس کشمیر گئے، تاکہ مہاراجہ کو پاکستان کے ساتھ الحاق پر تیار کر سکیں۔ مگر شیخ عبداللہ نے بار بار اس بات پر اصرار کیا کہ وہ ہندوستان کی طرف ہیں۔ مسئلے کے اقوام متحدہ میں جانے کے پورے ایک سال گزرنے پر جنگ بندی کے بعد پاکستان نے "آزاد کشمیر" کی حکومت کے قیام کا اعلان کیا اور اس کی راجدھانی اپنے مقبوضہ علاقہ مظفر آباد (پہلا شہر جسے حملہ آوروں نے لوٹا تھا) میں بنائی۔ جنگ بندی نے درحقیقت لڑائی کو ختم کرایا اور لیڈروں کو اس بات کا موقع دیا کہ اُن وعدوں کی طرف توجہ مبذول کر سکیں جن کا انھیں پاس رکھنا ہے۔

ہندوستان کے آئین نے مسئلے کی، جو بین الاقوامیت اختیار کر چکا تھا، خصوصی نوعیت کو تسلیم کرتے ہوئے، کشمیر کو آئین کی دفعہ ۳۷۰ کے ذریعے ایک خصوصی حیثیت عطا کی۔ اب شیخ عبداللہ نے الحاق کے لیے عوامی جواز کے حصول کا عمل شروع کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں نیشنل کانفرنس کی جنرل کاؤنسل نے، ایک آئین ساز اسمبلی کے قیام کے لیے انتخابات کا باقاعدہ مطالبہ کیا۔ ستمبر اکتوبر ۱۹۵۱ء میں انتخابات ہوئے۔ نیشنل کانفرنس نے ہر کامیابی حاصل کرلی۔ وادیٔ کشمیر اور لداخ کی پینتالیس نشستوں میں سے صرف دو پر، پارٹی کے امیدواروں کے خلاف امیدوار کھڑے ہوئے اس زبردست کامیابی پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا مسعودی نے کہا کہ یہ کامیابی، پاکستان کے ان دعووں کا کہ کشمیری پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں، کشمیری مسلمانوں کی طرف سے مسکت جواب تھا۔ اپنے دوست کی کامیابی کا جشن منانے کے لیے پنڈت نہرو سری نگر گئے، وہاں یکم ستمبر کو ان کا استقبال "نہرو اور ہندوستان ہمیشہ" "کشمیر جنگ بازوں کے ساتھ نہیں نہرو کے ساتھ جائے گا" جیسے نعروں سے ہوا۔ پاکستان نے جب دیکھا کہ پاکستان دوست امیدواروں کی جیت کے کوئی امکانات نہیں ہیں تو اس نے ان انتخابات کے معتبر ہونے میں شکوک پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ہدایتیں بھجوائی گئیں کہ امیدواروں کو اپنے نامزدگی پرچے داخل کرنے چاہییں اور پھر کوشش کرنا چاہیے کہ ان کو گرفتار کر لیا جائے تاکہ پاکستان یہ دعویٰ کر سکے کہ انتخابات میں بے ایمانی ہوئی ہے۔ مگر شیخ عبداللہ کی حکومت نے کہ اسے اپنی

کامیابی پر کامل یقین تھا کسی کو بھی گرفتار نہیں کیا۔ جس دن اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا سارے کشمیر میں خوشی وانبساط کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہر طرف اس احساس کی ایک مسرت تھی کہ بالآخر صدیوں بعد کشمیر کے عوام اپنی قسمت کا خود فیصلہ کر رہے تھے۔ اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے مولانا مسعودی نے کہا "ہمارا مستقبل اب ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ آج ہم نے اپنے مقدر کو اپنی آرزوؤں اور اپنے خوابوں کے مطابق بنانے کا حق حاصل کر لیا ہے۔" اسی دن ایک جلسۂ عام میں شیخ عبداللہؒ نے ہندوستان کے عوام اور ان کے لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو کا، کشمیر کی تاریک ترین گھڑی میں پاکستانی حملے کے وقت امداد دینے پر شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم نے اب پہل اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور اب اپنے ملک کی تقدیر بنانے کے اقدامات ہم کریں گے۔ ۵۔ نومبر ۱۹۵۱ کو اسمبلی کو پہلی دفعہ خطاب کرتے ہوئے شیخ عبداللہ نے وہ چار اہم کام گنوائے جو کرنے تھے۔ "مستقبل کی کشمیر کی حکومت کے لیے ایک دستور کی تیاری، شاہی خاندان کے مستقبل کا فیصلہ، ان سابق زمینداروں کے مسئلے پر غور کرو جو اس زمین کے معاوضے طلب کر رہے تھے جو ان سے لے لی گئی تھی اور ہندوستان کے الحاق پر فیصلہ لینا۔" انھوں نے یہ بات بالکل صاف کر دی کہ وہ ہندوستان کے الحاق کو ترجیح دینا اسمبلی کے لیے بہترین کارگزاری سمجھتے ہیں۔

بہر حال، جلدی ہی ان کے دماغ میں کچھ شکوک پیدا ہونے لگے۔ ہندوستان سے کشمیر کے تعلقات سے متعلق سارے مسئلے کو بالآخر قانون ساز اسمبلی ہی کو طے کرنا ہوگا۔ کیا یہ دہلی کے تمام اثرات اور تعلق کو ختم کرنے کا فیصلہ کرے گی؟ یہ بات بالکل صاف ہے کہ اب شیخ عبداللہؒ نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ کیا یہ بات مناسب ہوگی کہ کشمیر اگرچہ محدود مگر کسی حد تک خود مختاری حاصل کرے جس سے اس بات کی ضمانت ہوگی کہ کشمیر ابھی ابھی پاکستان کے پنجوں سے نکل آنے کے بعد ہندوستان کا غلام نہ ہو جائے۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے مگر کیا یہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا؟ وہاں ایسے ہندوؤں کی خاصی تعداد بھی تھی جو ذرا سا موقع ملنے پر اپنے زہریلے دانت دکھانے کے لیے تیار تھے۔ شیخ کی پریشانی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہندوستان پر ہمیشہ نہرو کی حکومت نہیں رہ سکتی۔ حکومت میں ہندو تعصب کی علامتیں ابھی سے نظر آنے لگی تھیں۔ شیخ کی پریشانی کا ایک جزوی سبب خود مختار رہنے کا پرانا ولولہ بھی تھا اور ایسے خیالات کو امریکا اور برطانیہ کی طرف سے شہ بھی ملتی تھی۔ جو پانچ حریص قوتوں کے درمیان کشمیر کے غیر معمولی جغرافیائی محل وقوع کی فوجی اہمیت کو سمجھ سکتے تھے۔ دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر نظر رکھنے کے لیے کشمیر میں ایک اچھا اڈا قائم کیا جا سکتا تھا۔ شیخ نے اب بات کرنا شروع کی پاکستانی فوجوں کی واپسی کی۔ ہندوستان کی فوجی سرگرمیوں میں کمی کی اور اس کے بعد اقوامِ متحدہ کے زیر اہتمام

اُس استصواب رائے عامہ کی جس کا کہ وعدہ کیا گیا تھا۔ بعد کو جب انھوں نے دیکھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں سے کوئی بھی کشمیر کے ان حصوں کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں جہاں ان کی فوجیں ہیں تو انھوں نے ایک مختلف مستقبل کی وکالت شروع کی۔ پاکستان، ہندوستان اور کشمیر کا ایک وفاق۔ یہ وفاق کچھ اس قسم کا تھا جو ۱۹۴۶ میں کیبنیٹ مشن نے سارے برصغیر کے لیے تجویز کیا تھا جس میں مرکز کو محدود اختیارات حاصل تھے۔ اور ریاستوں کو مکمل خودمختاری نہرو اور کانگریس نے اس خیال کو مسترد کر دیا تھا اور ان کا مطالبہ ملک کی کھری اور خالص سالمیت کا تھا۔

بھڑکانے والوں کی کمی نہیں تھی، جو کشمیر کے موڈ کی تبدیلیوں کی کہانی دلی کو، جو انھیں بڑے اشتیاق سے سنتا تھا، سناتے رہتے تھے۔ شیخ کو اپنے رویے کی طرف سے ہر وقت محتاط رہنا تھا۔ مبادا ان کے دشمن یہ کہتے ہوئے کہ وہ خفیہ طور پر غدار ہیں ان پر جھپٹ پڑیں۔ جاگیردارانہ عناصر کی حکومت ختم ہوئی ہوگی مگر ان کا اثر و رسوخ ابھی قائم تھا خصوصاً بڑے لوگوں میں۔

چوں کہ تقسیم کی جانے والی زمینیں عام طور پر ہندوؤں کی تھیں اور ان کے حاصل کرنے والے مسلمان کاشت کار اور زمین جوتنے والے تھے اس لیے ان زمینداروں نے جن کی زمین بے زمین افراد کو دی گئی تھی اس بات کا پرچار شروع کر دیا کہ شیخ عبداللہ کی اصلاحات سوائے چھپی ڈھکی ہندو مخالفت کے اور کچھ نہیں۔

وائی ڈی گندیویا، جنھوں نے اپنا کیریر انڈین سول سروس میں شروع کیا تھا اور چھتیس سال ملازمت کرنے کے بعد جس میں نہرو کے آخری فارن سکریٹری کی خدمات بھی شامل ہیں، ریٹائر ہوئے تھے، اپنی زبردست کتاب "آوٹ سائڈ دی آرکائیوز" میں اپنی ایک گفتگو کو لکھا ہے جو انھوں نے ۱۹۴۹ء میں شیخ عبداللہ سے کی تھی۔ گندیویا ایک ایسے آزاد کشمیر کے امکان کی بات کر رہے تھے جس کے دفاع کے ضامن ہندوستان اور پاکستان دونوں ہوں۔ شیخ کا جواب تھا "نہیں، نہیں" "یہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پاکستان ہمیں ایک سبق پڑھا چکا ہے۔ کشمیر بہت چھوٹا ہے اور بہت غریب۔ پاکستان کشمیر کو ایک ہی نوالے میں ہڑپ کر جائے گا۔ وہ ایک دفعہ اس کی کوشش کر چکے ہیں، وہ ایک دفعہ پھر یہی کریں گے" گندیویا لکھتے ہیں کہ "حیرت ناک بات ہے کہ یہ ریکارڈ کسی برطانوی یا امریکی معزز شخص اور شیخ عبداللہ کے مابین ہونے والی گفتگو کا نہیں ہے ...... میں ان سے سوال پوچھ رہا تھا اور شیخ اس کا منفی جواب دے رہے تھے۔"

اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ایک طرف نہرو اور شیخ عبداللہ اور دوسری طرف جناح صاحب کے لیے کشمیر کی لڑائی ایک نظریاتی جنگ تھی۔ کشمیر کے بغیر ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قوموں کے ہونے

کا نظریہ بے بنیاد ہو جاتا تھا۔ اگر کشمیر کے مسلمان ایک اسلامی ریاست کا حصہ نہ ہوتے تو جناح صاحب کی ساری مہم کی قلعی کھل جاتی۔ اسی طرح نہرو کے لیے یہ حقیقت کہ ایک مسلم اکثریت والی ریاست ایک مذہبی ملک کے بجائے ایک سیکولر جمہوریت سے رشتہ جوڑنا چاہتی ہے۔ اس قوم پرستی کی بین فتح تھی جس کی کانگریس نے ہمیشہ تبلیغ کی تھی۔ نہرو اور شیخ عبداللہ دونوں اس نکتے پر برابر زور دیتے رہے۔ ایک انٹرویو جو جرنل آف انڈو جاپان ایسوسی ایشن (جولائی - نومبر ۱۹۵۷ء) میں شائع ہوا تھا، اس میں جب ہزاروں بار یہ سوال نہرو سے پوچھا گیا تھا، تو انھوں نے کہا تھا۔ "پاکستان نے یہ جواز رکھا ہے کہ کشمیر کے عوام کی اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ یہ ایک بڑی عجیب و غریب دلیل ہے۔ ایک دفعہ جب ہم یہ مان لیں کہ ملک مذہب کی بنیاد پر بنتے ہیں تو ہم درحقیقت یورپ کے یا دوسری جگہوں کے قرون وسطی میں چلے جاتے ہیں۔ یہ ایک ناممکن جواز ہے۔ اگر ہم اسے قبول کرلیں تو جو صورت حال آج تقسیم کے بعد ہے وہ یہ ہے کہ چار کروڑ مسلمان ہندوستان میں ہیں۔ کیا یہ سب کے سب پاکستان کے شہری ہیں؟ اور ان کی وفاداریاں پاکستان کے ساتھ ہیں؟۔ ہندوستان کے ہر گاؤں میں مسلمان ہیں، عیسائی ہیں۔ بتائیے کہ وہاں عیسائی قوم ہے یا مسلمان، بدھ قوم ہے یا ہندو، یہ ایک ناممکن منطق ہے..... کشمیر بلاشبہہ آئینی طور پر، تاریخی طور پر قانونی طور پر ہندوستان کا ایک حصہ ہے۔ یونین آف انڈیا کا ایک حصہ۔"

اپنی انتہائی مایوسی کے دنوں میں بھی شیخ عبداللہ نے اس نظریے کو کبھی ترک نہیں کیا۔ کئی برس ہندوستانی جیلوں میں گزارنے کے بعد شیخ عبداللہ مئی ۱۹۶۴ء میں پہلی بار پاکستان گئے تو پاکستانیوں نے یہ سوچا کہ کم از کم اب شیخ عبداللہ سیکولر ہندوستان سے مایوس ہو چکے ہوں گے اور یہ مانیں گے کہ مسلمان ایک ہندو اکثریت والے ہندوستان میں امن، حفاظت اور عزت کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ شیخ عبداللہ نے یہ کہہ کر اپنے میزبانوں کو مایوس کر دیا کہ وہ اب بھی سیکولرزم پر ایمان رکھتے ہیں اور اب بھی وہ دو قومی نظریہ کو مسترد کرتے ہیں۔ کراچی کے اخبار "ڈان" نے اپنی جھینپ کو چھپانے کی تھوڑی کوشش کی اپنے اداریے میں یہ لکھ کر کی کہ "شیخ عبداللہ کا بیان اور ہندوستان کے نام نہاد سیکولرزم کے حوالے نے عوام میں عام طور پر اور دانش وروں میں خصوصاً کچھ مایوسی پیدا کی ہے۔" دوسرے لوگوں کے ردعمل نسبتاً زیادہ تلخ تھے کہ شیخ عبداللہ نے اپنے بیان میں نہ تو بلیک میلر نہرو کو کچھ کہا اور نہ ہی جنگجو بھارت کو۔" دوسری طرف ہندوستان میں بھی متعصب لوگوں نے نہرو اور شیخ عبداللہ کے تعلقات کو تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور ۱۹۵۳ء تک یہ لوگ بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔

۱۹۵۲ء میں نہرو اور شیخ عبداللہ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جو "دلی معاہدے" کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ٹنڈلویا لکھتے ہیں "میں پرانی دہلی میں کسی جگہ جہاں شیخ صاحب زیرِ حراست (چھٹی دہائی میں) تھے گفتگو کر رہا تھا۔ میری یہ ملاقات، خواہ مخواہ خفیہ رکھی جانے والی اور رات کے اندھیرے میں ہونے والی ملاقاتوں میں سے ایک تھی۔ میں وہاں شاستری جی کی موت کے ایک سال بعد پولیس کی جیپ میں گیا تھا۔ دورانِ گفتگو جب میں نے 'دہلی معاہدے' کا ذکر کیا تو شیخ صاحب نے کچھ جذباتی ہوتے ہوئے مجھے بتایا کہ جواہر لال نے بہت سی باتوں کو طے کرنے کا کام کشمیر قانون ساز اسمبلی پر چھوڑنے پر رضامندی ظاہر کی تھی اور نہرو کے آخری الفاظ تھے کہ "ارے پریشان نہ ہوئیے ہم آپ کو سونے کی زنجیروں سے باندھیں گے ......" سونے کی زنجیر محض ایک سال بعد ان میں سے ایک کے ہاتھ کی ہتھکڑیوں میں کیوں کر تبدیل ہوگئی؟ شیخ نے اس گفتگو کے دوران مجھ سے اس کی وضاحت یوں کی کہ یہ دراصل دائیں بازو والوں، رجعت پرستوں اور گھٹیا لوگوں کی بتدریج فتح تھی"۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ "ان کے خیال میں، رجعت پرست عناصر کی دہلی میں بہت دست رس ہے۔" نہرو کے دربار میں نہیں مگر دوسری جگہوں پر یقیناً۔ شیخ نے مزید کہا کہ سردار پٹیل اور بہت سے دیگر لوگوں کو مجھ پر بالکل بھروسہ نہیں تھا۔ نہرو نے شروع شروع میں مجھے بدنام کرنے کی کوششوں کا مقابلہ کیا مگر بالآخر انھوں نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔

۱۹۵۱ء کے انتخابات میں شرم ناک ہزیمت اٹھانے کے بعد ہندوستانی مذہبی متعصبین نے نہرو پر حملے کا ایک مختلف طریقہ اختیار کیا۔ ایک نکتہ جس پر وہ سمجھتے تھے کہ نہرو کو آسانی کے ساتھ زک پہنچائی جا سکتی ہے وہ ہے شیخ عبداللہ پر ان کا بھروسہ۔ چوں کہ وہ نہرو کو اپنا ہدف نہیں بنا پائے اس لیے انھوں نے اپنا نشانہ شیخ کو بنایا۔ اس سلسلے میں انھیں اچھی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس میں، پاکستان کی ہٹ دھرمی اور مسلسل پروپگنڈے نے بھی بہت مدد کی۔ پاکستان ہر محاذ پر شکست کھا چکا تھا۔ پہلے حملہ آوروں کی ناکامی اور پھر پاکستانی فوج کی شکست کی وجہ سے میدانِ کارزار میں وہ جنگ ہار گئے۔ ہری سنگھ کے ہندوستان سے الحاق کے بعد وہ آئینی اور قانونی لحاظ سے بھی اپنی جدوجہد میں ناکام ہو گئے، اور شیخ عبداللہ کی طرف سے انتہائی غیر مبہم الفاظ میں پاکستان کو رد کیے جانے کے بعد تو اخلاقی جنگ میں بھی ان کو شکست ہوگئی۔

یہ بات ان لوگوں کو بڑی عجیب معلوم ہوگی جو ہندوستان کے مسائل کو ہندو مسلم روایتی دشمنی کی صورت میں دیکھنے کے عادی ہیں، مگر یہ شیخ عبداللہ تھے جو ۱۹۴۸ میں اس بات کے لیے پریشان تھے کہ دہلی میں کچھ خاص ہندو لیڈر کشمیر کو پاکستان کے حوالے کر دینے کی کوششوں میں دانستہ لگے ہوئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ شیخ کی اس بات پر سردار پٹیل نے احتجاج بھی کیا اور شیخ عبداللہ ظاہر ہے کہ بین السطور یہ کہہ رہے تھے کہ یہ سردار پٹیل تھے جو اس قسم کے

مادوں کے مجرم تھے۔ مگر ۱۹۵۲ء تک اسی متعصب ہندو لابی نے کشمیر کی حیثیت سے متعلق شیخ عبداللہ کے مبینہ تذبذب کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ ان اختلافات کو جو کشمیر دستور ساز اسمبلی میں ہونے والی بحثوں کے درمیان سامنے آئے اور جو بہترین حالات میں بھی ناگزیر تھے، موت اور زیست کا مسئلہ بنا دیا گیا۔ ۱۹۵۲ء کے اواخر میں ان تنظیموں کے ایک گروپ نے جن کے مقاصد کے سلسلے میں کسی شبہے کی گنجائش تھی ہی نہیں، مل کر مشترکہ طور پر، جموں میں شیخ مخالف احتجاج شروع کیا۔ ان میں شیاما پرشاد مکرجی کی قیادت میں نئی نئی قائم ہوئی جن سنگھ پارٹی کے علاوہ ہندو مہاسبھا، راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ اور جموں پرجا پریشد شامل تھیں۔ سب کی سب ہندو جماعتیں۔ ان کے ساتھ سکھوں کی جماعت اکالی دل بھی تھی جس کی قیادت ماسٹر تارا سنگھ کر رہے تھے۔ نہرو جیسا شخص، جس نے اس سے کہیں زیادہ سنجیدہ اور پریشان کن حالات میں ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس بحران میں حیرت انگیز طور پر بے اثر تھا۔ کیا ان کی جرأت و توانائی جواب دے چکی تھی یا کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اپنے دوست پر سے ان کا بھی اعتماد اٹھ رہا تھا۔ نہرو کے سب سے زیادہ معتقد اور ہمدرد سوانح نگار ایس گوپال اپنی تین جلدوں پر مشتمل تصنیف کی دوسری جلد میں لکھتے ہیں کہ یہ مخصوص احتجاج ملک کو تقسیم کے وقت کے تشدد اور غارت گری کی تباہی کی طرف لے جا سکتا تھا ایسی خطرناک صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے مختلف سطحوں پر سخت اور فوری کارروائی کی ضرورت تھی۔ مگر نہرو کسی سطح پر بھی پورے طور پر کامیاب نہیں ہوئے اور نتیجے کے طور پر یہ بحران قابو سے باہر ہو گیا۔ ان کے احکامات پر کہ ہندوستان میں جہاں بھی گڑبڑ ہو وہاں اسے فوراً دبا دیا جائے، بڑی بے دلی سے عمل کیا گیا۔ وزارتِ امورِ داخلہ اس وقت کیلاش ناتھ کاٹجو کے پاس تھی۔ کاٹجو نہرو کے وفادار پیروؤں میں تھے مگر اب ان کی عمر بہت ہو چکی تھی اور ان کی رعشہ زدہ نا اہلی، ان افسروں کی سستی اور کاہلی کی وجہ سے اور بڑھ گئی تھی جن کی متعصبانہ ہمدردیاں چھپی ہوئی نہیں تھیں۔ اس تحریک کے شخصی اور فرقہ وارانہ کردار کو آشکار کرنے کے لیے احتجاج کو دوسرے ہنگاموں سے الگ کرنے کی نہرو کی کوششیں کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ ثابت کرنے کے لیے کہ شیخ عبداللہ کا ایڈمنسٹریشن سیکولر، کھلے دماغ والا اور قوم پرست ایڈمنسٹریشن تھا، پنڈت نہرو، اس تحریک کے فرقہ وارانہ اور متعصب مرکز کو تنہا اور بے یار و مددگار کرنے کی اپنی اصل کوششوں میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔

شیاما پرشاد مکرجی کے اس احتجاج نے صرف یہ کام کیا کہ نیشنل کانفرنس والوں کے دل و دماغ میں ہندو تعصب اور کٹرپن کے بارے میں مزید شک اور خوف بٹھا دیا۔ شک و شبہات پیدا کرنے کا یہ وقت بہت خطرناک تھا کیوں کہ قانون ساز اسمبلی اپنے فیصلوں کو آخری شکل دینے میں مصروف تھی۔ کشمیر، کشمیریوں کے ہاتھ میں رکھنے کی

ترغیب او ان کے خیالی لطف نے الگ اثر ڈالا۔ شیخ عبداللہ نے خودمختاری اور آزادی کی خواہش کبھی نہیں کی۔ (انھوں نے اس خیال کو "بکواس" سے تعبیر کیا تھا) ان کے اس رویّے کی اگر کوئی دوسری وجہ نہیں تھی تو صرف یہ بھی کہ وہ اس خیال کو قابل عمل اور چلنے والا نہیں سمجھتے تھے۔ آزادی دخود مختاری کے لیے کشش بہت کمزور تھا مگر انھوں نے انڈین یونین کے اندر رہتے ہوئے خود اختیاری کی بات شروع کی۔ نہرو کو اس بات کا یقین تھا کہ امریکی ان مطالبوں کی حمایت کر رہے ہیں۔ مسٹر ایس گوپال کے مطابق نہرو نے ہندو فرقہ پرستوں کی سرگرمیوں کا سر کچلنے کی کوشش کی جو ملک دشمنی سے کچھ ہی کم ہوں گی اور شیخ عبداللہ کو مزید وقت فراہم کر دیا کہ وہ اپنے اعصاب کو ٹھیک کر لیں.... مگر نہرو کے ہاتھ وزارتِ داخلہ کی مسلسل نااہلیت اور ناکارکردگی کی وجہ سے کمزور ہو چکے تھے۔ کیلاش ناتھ کاٹجو اپنے وزیراعظم کی تجویز (جن سنگھ پر پابندی لگانے اور احتجاجیوں کو گرفتار کرنے) پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہندوستان کے وزیر داخلہ بالکل واضح طور پر ان لوگوں کے زیر اثر تھے جو شیخ عبداللہ کو برطرف دیکھنا چاہتے تھے۔ اوران لوگوں میں مہاراجہ ہری سنگھ کے بیٹے ڈاکٹر کرن سنگھ بھی تھے (ابھی ابھی وہ اپنی سلطنت سے محروم ہوئے تھے اس کے لیے ان کا یہ رویّہ سمجھ میں آتا ہے) جو کشمیر کی تاریخ میں اس خاندان کی حیثیت کے پیش نظر ریاست کے آئینی سربراہ (یہ ایک رسمی عہدہ تھا) بنا دیئے گئے تھے۔ کرن سنگھ نے کہا کہ شیخ عبداللہ پر دباؤ ڈالا جانا چاہیے کہ وہ احتجاجیوں سے بات چیت کریں۔ نہرو نے اس خیال کو فوراً مسترد کیا اور کرن سنگھ کو لکھا "میرے نقطۂ نظر سے ان لوگوں نے (احتجاجیوں نے) جو کچھ کیا ہے وہ وطن دشمنی سے کم نہیں ہے اور عوام کو اس بات کو سمجھنا چاہیے" (کرن سنگھ کی خود نوشت سوانح عمری "ہیئر اپارنٹ" آکسفورڈ یونیورسٹی پریس) شیخ عبداللہ کو ہٹانے کی سازش ۱۹۵۳ء میں شروع کی گئی۔ بروٹس کا کردار ادا کرنے کے لیے جس شخص کا انتخاب کیا گیا وہ تھے نائب وزیراعظم، بخشی غلام محمد۔ جنھیں کرن سنگھ ایک موقع پرست اور کاروباری آدمی کہتے ہیں۔ جون میں شیاما پرشاد مکرجی نے بغیر ضروری اجازت نامے کے جموّں میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ ایسے نازک وقت میں انھیں جموّں جانے سے روکنے کے بجائے حکومتِ پنجاب کے حکام درحقیقت سرحد تک ان کے ساتھ گئے اور اسے پار کرنے میں ان کی مدد کی۔ اس طرح کی مدد انتظامیہ کی طرف سے اس شخص کو دی جا رہی تھی جس پر نہرو نے وطن دشمن احتجاج کی قیادت کرنے کا الزام لگایا تھا۔ نہرو نے پنجاب کے وزیراعلیٰ بھیم سین سچر اور خود اپنے وزیر داخلہ کیلاش ناتھ کاٹجو سے مکرجی کو جموّں میں داخل ہونے کی اجازت دیئے جانے پر زبردست احتجاج کیا۔ لیکن انتہائی حیرت ناک طور پر نہرو کو نظرانداز کر دیا گیا۔ شیخ عبداللہ کی حکومت نے مکرجی کو گرفتار کر لیا اسے مقدّر ہی کہیے کہ وہ قلب کے ایک حملے میں

جیل ہی میں مر گئے ۔ شیخ عبداللہ کو بدنام کرنے اور بد معاش ثابت کرنے کے لیے دشمنوں کو کسی ایسے ہی ہتھیار کی ضرورت تھی۔

۱۰ جولائی کو شیخ عبداللہ نے ایک تقریر کی جسے یہ ثابت کرنے کے لیے خوب خوب استعمال کیا گیا کہ وہ ہندوستان کے ایک غدار ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ نیشنل کانفرنس کے ہیڈ کوارٹرز مجاہد منزل میں شیخ عبداللہ نے کہا کہ جب ہندوستان میں فرقہ پرست عناصر کو نہرو بھی قابو میں نہیں رکھ سکے تو ایک ایسا وقت آسکتا ہے جب کشمیر کو سیکولر ہندوستان سے خدا حافظ کہنا پڑے ۔ پارٹی کی ورکنگ کمیٹی میں شیخ عبداللہ کے قریب ترین ساتھی مرزا افضل بیگ نے تجویز رکھی کہ ہندوستان کے الحاق کو ان شرائط سے آگے نہیں جانا چاہیے جنھیں ہری سنگھ نے منظور کیا تھا یعنی صرف دفاع ، امور خارجہ اور مواصلات دہلی کے تحت ہونے چاہییں ۔ بخشی غلام محمد نے نسبتاً وسیع تعاون کی بات کی ۔ شکست و فتح کے فیصلے کا وقت آرہا تھا اور ایک مایوس اور افسردہ نہرو صرف یہ دیکھ سکتا تھا کہ حالات کیا رُخ اختیار کرتے ہیں ۔ شیخ عبداللہ میں بھی جھنجھلاہٹ کے آثار پیدا ہونے لگے تھے اور خصوصاً اس وقت سے جب سے ان پر یہ انکشاف ہوا کہ ان کے وہ ساتھی جن پر انھوں نے بھروسہ کیا تھا ان کے خلاف ہوتے جا رہے ہیں اور یہ کہ ان کی نظریاتی ایمان داری پر بھی شکوک و شبہات کیے جانے لگے ہیں ۔ گندیویا کا کہنا ہے کہ " پروپگنڈے کا جو سیلاب پریس میں امڈا اس میں کہا گیا کہ شیخ عبداللہ نمک حرام اور غدار ہیں ۔ وہ پاکستان دوست ہیں ، وہ عن قریب کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کی تردید کرنے والے ہیں وہ ایک آزاد کشمیر چاہتے ہیں .....

۷ اگست کو شیخ عبداللہ نے کابینہ میں اپنے مخالفین کے خلاف کارروائی کا فیصلہ کیا اور اپنے وزیر صحت پنڈت شیام لال صراف سے استعفا طلب کیا ۔ ۸ اگست کو بخشی غلام محمد ، وزیر مالیات جی ایم ڈوگرا اور شیام لال صراف کے دستخطوں سے شیخ عبداللہ کے خلاف کرن سنگھ کے پاس ایک میمورنڈم بھیجا گیا جس میں شیخ عبداللہ پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ ریاست کے تعلقات میں ناچاقی پیدا کرنا چاہتے ہیں ۔ میمورنڈم میں وزیر اعظم کو یہ اطلاع بھی دی گئی تھی کہ دستخط کنندگان کے خیال میں کابینہ "عوام کا اعتماد کھو چکی ہے " اسی دن شیخ عبداللہ ، اپنی بیوی اور اپنے خاندان کے ساتھ ایک آدھ دن خاموشی اور سکون کے ساتھ گزارنے کے لیے گلمرگ چلے گئے ۔

ایس گوپال کے مطابق ، نہرو نے ۲۴ اگست ۱۹۵۳ کو گرجا شنکر باجپئی کو لکھا کہ " میں پچھلے تین مہینے سے اس صورت حال کو آتا ہوا دیکھ رہا تھا ایک غیر مرئی تباہی کی طرف رینگتا ہوا ۔ مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ قطعی شکل کیا اختیار کرے گی ۔ " ہوا یہ کہ کرن سنگھ نے ۸ اگست کی سہ پہر ، برطرفی کا مسودہ تیار کرنے میں صرف کی ۔ " اور چوں کہ ایک ایسی منزل آگئی ہے جس میں ایک ایمان دار اور کارگزار انتظامیہ ناقابل عمل ہو کر رہ گئی ہے اور چوں کہ

آخر کار مشترکہ ذمہ داری کی بنیاد پر موجودہ کیبینٹ کا کام کرنا ناممکن ہو گیا ہے اور اس سب کے نتیجے کے طور پر پیدا ہونے والے تنازعات نے ریاست کی یک جہتی، خوش حالی اور استحکام کو بری طرح مجروح کر دیا ہے ...... (میں) شیخ محمد عبداللہ کو جموں کشمیر کی ریاست کی وزارت عظمیٰ سے سبکدوش کرتا ہوں اور نتیجتاً ان کی سربراہی والی کاؤنسل آف منسٹرز بھی اس کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔"

۸ اگست کی شام کا موسم، شیکسپیر کے ڈرامے میکبیتھ کا سین تھا جب کرن سنگھ کے اے۔ڈی۔سی میجر بی ایس باجوا نے اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ ٹنگ مرگ کی طرف سے گلمرگ جانے والا دشوار گزار راستہ اختیار کیا۔ رات کے گیارہ بجے جب میجر باجوا نے دروازے پر دستک دی تو اس وقت شیخ اور ان کی بیگم سو رہے تھے۔ پولیس نے گھر کو گھیر لیا تھا۔ انھیں ٹھیک دو گھنٹے کی مہلت دی گئی جس میں سامان باندھ لیں اور نماز ادا کر لیں۔ علی الصباح انھیں لے جایا گیا۔ یہی وہ گھڑی تھی جس کے بعد سے جیلوں کی وہ دس سالہ آمد و رفت اور بے سمتی کے تقریباً بیس سال گزرنے تھے جنھیں شیر کشمیر کے ایمان اور ہمت کی آزمائش کرنا تھی۔ مرزا افضل بیگ جیسے ان کے ساتھی اور ہمدرد بھی گرفتار کر لیے گئے۔ اسی رات کی تاریکی میں، صبح طلوع ہونے سے قبل ہی غلام محمد کی قیادت میں ایک نئی حکومت نے حلف لے لیا تھا۔ سر پر حکومت پر آنے سے پہلے بخشی غلام محمد نے صرف ایک شرط رکھی تھی اور وہ یہ کہ شیخ عبداللہ کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ کیوں کہ اگر شیخ آزاد رہے تو وہ کشمیر کو قابو میں نہ رکھ سکیں گے۔ اخباروں میں یہ پروپگنڈہ کرایا گیا کہ ہندوستان کو بچا لیا گیا ہے اور شیخ عبداللہ کو اس طوفانی رات میں عین اس وقت گرفتار کر لیا گیا ہے جب وہ سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہونے والے تھے۔

پنڈت نہرو کو یہ کبھی نہیں بتایا گیا کہ ان کے دوست کو جیل میں بند کر دیا جائے گا۔ ہندوستان بھر میں، سیاست داں حتیٰ کہ حزب اختلاف والے بھی بڑے حیرت ناک طور پر مہر بہ لب تھے۔ ملک بھر میں اعتماد کی ایک کمی سی بڑے واضح طور پر نظر آرہی تھی اور ایک خوف کو شاید بقا اور یک جہتی کے لیے یہ قیمت دینا ضروری تھی۔ سوشلسٹ لیڈر رام منوہر لوہیا بھی جو کسی بھی بات پر نہرو پر تنقید کر سکتے تھے اپنے تاثرات کے اظہار میں بڑے نرم نرم سے تھے، البتہ کو جے پرکاش نراین اور اشوک مہتا جیسے کچھ لیڈر تھے جنھوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ شیخ کی گرفتاری تباہ کن حماقت تھی اور درحقیقت وہ علیحدگی پسند نہیں تھے (مگر شاید ۱۹۵۳ء کی خاموشی کا جرم ۱۹۸۴ء میں اس وقت دھو دیا گیا جب فاروق عبداللہ کی حکومت کو بالکل اسی طرح اور بالکل ویسے ہی بہانوں پر برطرف کیا گیا تھا، ملک بھر کے، حزب اختلاف کے لیڈر، شیخ عبداللہ کے بیٹے کی حمایت میں جمع ہو گئے) شیخ عبداللہ کی گرفتاری کا حال بیان کرتے ہوئے گنڈیویا

کا کہنا ہے کہ "یہ ایک دو طرفہ چوٹ تھی صرف شیخ ہی کی شکست نہیں ہوئی تھی، نہرو نے بھی شکست کھائی تھی"۔

بہت عرصے بعد ۱۹۷۸ء میں، مصنف سے بات کرتے ہوئے شیخ عبداللہ نے کہا تھا کہ انھوں نے اپنی زندگی میں تین بڑے بحرانوں کا سامنا کیا ہے۔ پہلی دفعہ اسی وقت جب میں نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا تھا اور کشمیر کے مُلّا میری تباہی کے درپے ہو گئے تھے۔ میں نے سوال کیا کہ آپ نے ان کا مقابلہ کیسے کیا؟ "خود ایک مُلّا بن کر" شیخ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ دوسرا بحران ۱۹۴۷ء میں اس وقت آیا تھا جب سارا ملک ظلمت کا شکار ہو گیا تھا۔ ہمارے چاروں طرف فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے۔ پنجاب میں، راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کی طرف سے قتل و غارت گری اور دوسری طرف مسلم لیگ کا تمام غیر مسلموں کو مارنا۔ ہم دو سمتوں سے گھرے ہوئے تھے۔ شمال سے مسلم فرقہ پرستی کی آگ لے کر حملہ آور آئے اور جنوب سے راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ ہندو فرقہ پرستی کا زہر لے کر۔ مگر کشمیر کو بچا لیا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں قید کا تجربہ تیسرا بحران تھا۔ جب سیکولرزم، جمہوریت اور سوشلزم پر ہمارے ایمان و یقین پر سخت آزمائش کا وقت پڑا تھا۔ اس وقت جیل میں میرے ساتھیوں نے مجھ سے کہا "اب باقی کیا بچا ہے؟ اگر یہی نتیجہ ہے تو ہم آخر ہندوستان کے ساتھ کیوں جائیں؟ ہمیں پاکستان چلے جانا چاہیے۔" مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ نظریات جنھیں لے کر ہم کھڑے ہوئے تھے، زیادہ اہم تھے۔ پاکستان سے بھی زیادہ ہندوستان سے بھی زیادہ۔ ہم ہندوستان کے ساتھ ملے تو اس کے سیکولرزم اور سوشلزم کے نظریات کی وجہ سے۔ ہندوستان نے ایک ایسا ملک تعمیر کرنا چاہا تھا جہاں انسانیت کا دور دورہ ہوگا۔ جب تک ہندوستان ان نظریات کا پیرو رہتا ہے، اس وقت تک ہمارے عوام کے لیے کوئی دوسری جگہ نہیں ہے سوائے ہندوستان کے"۔



(۵)

کچھ بھی ثابت نہ ہوا

شیخ عبداللہ کی سیاسی زندگی، نصف صدی سے زیادہ کا قصہ ہے۔ اس مدت میں وہ نو مرتبہ جیل گئے۔ بحیثیت مجموعی پندرہ سال سات مہینے اور پانچ دن حراست میں گذارے۔ ہری سنگھ کے جیلوں میں زندگی بہت سخت تھی۔ ایک دفعہ تو شیخ عبداللہ نے جیل کے کھانے اور وہاں کی ابتر حالت کے خلاف احتجاج کرنے کی خاطر بھوک ہڑتال کی۔ ہری سنگھ کی حکومت میں زیر حراست رہنا وہ منظور کر سکتے تھے مگر ان کے لیے یہ سمجھنا بہت دشوار تھا کہ پنڈت نہرو جیسا ایک دوست ان پر سے اپنا اعتماد کیوں ختم کر دے اور پھر آزادی اور حرّیت سے مشترکہ طور پر باندھے ہوئے پیمان وفا کو ایک ڈیموکریٹ کیسے نظر انداز کر دے؟ ان کے اور ان کے خاندان کے خلاف پروپگنڈے کا جو طوفان اٹھایا گیا وہ زخم پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے ہو سکتا تھا اس بات کو کہ شیخ عبداللہ کشمیر کو پاکستان میں لے جانے کی کوشش کر رہے تھے، بار بار دہرانے کے علاوہ اور بھی زیادہ شرارت آمیز الزامات تھے مثلاً یہ کہ بیگم عبداللہ کو پاکستان سے بڑی بڑی رقوم مل رہی ہیں۔ بخشی غلام محمد کی موجودگی میں جو یہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ قومی مفاد کے پیش نظر کیا۔ محکمہ خفیہ کی ایجنسیاں اور دہلی میں وزارت داخلہ میں جس میں ایسے لوگوں کا ہجوم تھا جو شیخ عبداللہ کو تباہ کرنے کے درپے تھے، وطن دشمنی کی شہادتیں جمع کرنے کی ایک زبردست کوشش کی گئی۔ چار سال تک انٹیلی جنس بیورو یہ دعوی کرتا رہا کہ وہ ایک پاکستان دوست سازش میں شیخ کے ملوث ہونے کے ثبوت فراہم کرنے کے قریب قریب پہنچ چکا ہے۔ مگر کبھی کچھ بھی نہ ڈھونڈا جا سکا۔ الزام بھی طے نہ کیا جا سکا۔ مگر شیخ عبداللہ جیل میں رہے۔

شیخ عبداللہ کی بیوی، بیگم اکبر جہاں عبداللہ نے ایک ملاقات میں اُدین شرما (سنڈے ۵ جون ۱۹۸۳ء) کو یہ بتاتے ہوئے کہ انھوں نے اپنے شوہر کو پہلی بار کب دیکھا، ایک بہت دل چسپ کہانی سنائی۔ بیگم عبداللہ کا

تعلق ایک متمول اور روشن خیال خاندان سے ہے۔ سری نگر کا مشہور ہوٹل نیڈوز، ان ہی کے خاندان کا تھا۔ اس زمانے میں لڑکیاں کشمیر میں پڑھ نہیں سکتی تھیں اس لیے یہ کشمیر سے باہر رہتی تھیں۔ اس وقت ان کی عمر محض سولہ سترہ سال کی تھی اور ۱۹۳۲ء میں وہ سری نگر اپنی تعطیلات گزارنے آئی تھیں۔ ایک دن ایک دبلا پتلا اور لمبا نوجوان ہوٹل میں ان کے والد سے، اپنی سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں چندہ مانگنے آیا۔ جب مستقبل میں ہونے والی بیگم عبداللہ نے اس نوجوان کو دیکھا۔ انھوں نے اپنی ماں سے پوچھا کہ یہ شخص کون تھا؟ تو ان کی ماں کا جواب تھا کہ یہ کشمیریوں کے لیے ایک فرشتہ ہے، فرشتہ جو مہاراجہ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کی لڑائی میں ان کی مدد کر رہا ہے۔ یہ لڑکی نوجوان سے متاثر ہو چکی تھی اور نوجوان کو اور اچھی طرح دیکھنا چاہتی تھی مگر شرم و حیا کے، اصولوں نے اسے وہاں نہ جانے دیا جہاں وہ اس کے والد کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ بہرحال جلد ہی دونوں کی شادی کی بات چیت شروع ہو گئی جب لڑکی کے باپ مسٹر نیڈو کو یہ خبر پہنچی تو وہ چلا پڑے "یا خدا، یہ آدمی تو اپنی ساری زندگی جیل میں گزارنے والا ہے میری بچی کا کیا ہوگا؟" بہرحال ایک شفیق باپ نے اپنی بیٹی کی خواہش کے سامنے ہتھیار ڈال دیے مگر لڑکی کے باپ نے جو کچھ کہا تھا وہ ایک پیغمبرانہ پیشین گوئی ثابت ہوئی۔ شیخ عبداللہ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۸۵ء کے درمیان اس وقت بھی جیل میں رہے جب کوئی الزام بھی ان کے سر نہیں منڈھا جا سکا۔

بالآخر ۱۹۵۷ء میں حزب اختلاف کی کچھ پارٹیوں نے شیخ کی رہائی کا مطالبہ کرتے ہوئے ایک تحریک کا آغاز کیا۔ ایک تھکے اور تنگ آئے ہوئے نہرو نے حکم دیا کہ شیخ کو چھوڑ دیا جائے۔ تقریباً ساڑھے چار سال بعد ۸ جنوری ۱۹۵۸ء کو پانچ بجے شام کو رہائی کے احکامات اس بنگلے تک پہنچے جہاں شیخ عبداللہ بانیہال رینج کی جموں کی جانب واقع کُد کی پہاڑی آرام گاہ میں رکھے گئے تھے۔ حکومت کی طرف سے انھیں بتایا گیا کہ ایک ہزار روپے کا وظیفہ اور جو یومیہ الاؤنس انھیں ملا کرتا تھا اب موقوف ہو گیا ہے اور ایک کار انھیں سری نگر ان کے گھر لے جانے کی منتظر کھڑی ہے۔ شیخ عبداللہ نے کار واپس کر دی اور مزید ایک دن خود اپنے خرچ پر جیل ہی میں رُکنے کا فیصلہ کیا، وہ سرکاری کار کا استعمال نہیں کریں گے۔ دوستوں نے فوراً گاڑی کا انتظام کر دیا اور انھوں نے اس انتظام کو پہلے کے مقابلے میں نسبتاً بہتر سمجھا۔

اس وقت تک حالات بہت بدل چکے تھے۔ کشمیر کی قانون ساز اسمبلی نے ہندوستان سے الحاق کی توثیق کر دی تھی اور اس دستور کو مان لیا تھا جس کا نفاذ ۲۶ جنوری ۱۹۵۷ء کو ہوا تھا۔ بخشی غلام محمد جنھوں نے نیشنل کانفرنس اور حکومت دونوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، اب بھی وزیر اعلیٰ تھے۔ مگر ان کے کچھ ساتھی، ان پر بدعنوان اور نااہل

ہونے کا الزام لگا کر ان سے الگ ہو چکے تھے۔ بخشی غلام محمد کی ماتحتی میں، آزادی کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے جی ایم صادق اور ڈی پی دھر نے ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ شیخ کے حامی نئے نئے بنے ہوئے استصواب محاذ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ فرنٹ کی قیادت مرزا افضل بیگ کر رہے تھے۔ اس پارٹی کے سامنے صرف ایک مقصد تھا۔ ۹۔ اگست ۱۹۵۳ کو شیخ عبداللہ کی گرفتاری سے جمہوریت کو قتل کر دیا گیا تھا، قانون ساز اسمبلی عوام کی نمائندہ نہیں رہ گئی تھی اور اس لیے اس کے لیے ہوئے تمام فیصلے کالعدم ہو گئے تھے۔ نتیجتاً یہ بات لازمی تھی کہ عوام کی خواہشات معلوم کرنے کے لیے ایک نیا استصواب رائے ہونا چاہیے حتیٰ کہ الحاق سے متعلق بھی۔

شیخ عبداللہ کے لیے تو کشمیر کی گھڑی ۸۔ اگست ۱۹۵۳ کی نصف شب سے ایک گھنٹہ قبل ہی رک چکی تھی اور وہ اب دہلی کے ساتھ کسی ایسے معاہدے کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے جو "اسٹیٹس کو" کو بحال نہ کرتا ہو۔ شیخ عبداللہ کے حقیقی نظریات کا کیا ہوا؟ کیا چار سال کی بے وجہ اور من مانی سزائے قید نے انھیں تبدیل کر دیا تھا۔؟

۱۰ جنوری ۱۹۵۸ کو انھوں نے پریس والوں سے ملاقات کی۔ کالی شیروانی اور سفید پاجامے میں ملبوس، وہ خوش و خرم نظر آ رہے تھے۔ پہلے سوال کا ان کا جواب یہ تھا کہ ان چار برسوں میں، مہاتما گاندھی پر ان کا عقیدہ اور پختہ ہو گیا ہے۔ گاندھی جی کی زندگی اور ان کے تجربات، مشکل دنوں میں "روشنی کی کرن" رہے تھے، انھوں نے اعادہ کیا کہ میں آج بھی ۱۹۴۷ء ہی جیسا عبداللہ ہوں۔ جب لوگ کہیں اور مارے جا رہے تھے۔ میں نے گاندھی جی کے آئیڈیل کو بچائے رکھنے کی کوشش کی۔ میں آج بھی بدستور یہی کر رہا ہوں۔ میں تبدیل نہیں ہوا ہوں۔ میرے خیالات پختہ ہیں۔ میں اس قسم کا سیاست داں نہیں ہوں جو حقائق کو دوسروں سے چھپائے۔ میرے خیالات سب ہی لوگ جانتے ہیں...... قدرتی طور پر، عوام ہی آخری فیصلہ کرنے والے ہیں۔ میں آخری ثالث نہیں ہوں...... میرے پاس لوگوں کو زیر کرنے کے لیے بندوقیں نہیں ہیں انھیں دینے کے لیے روپیہ بھی نہیں ہے میرا طریقہ تو صرف سمجھانے کا، قائل کرنے کا ہے۔"

شیخ عبداللہ میں اگر تلخی تھی تو صرف ان لوگوں کی طرف سے جن کے بارے میں وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ان لوگوں نے ۱۹۵۳ء میں حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے ان کے ساتھ غداری کی تھی "میں نے دوستوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنا نہیں سیکھا ہے۔ دوستوں میں بہت سے وہ ہیں جنھیں میں نے پروان چڑھایا اور انھیں اپنے ہی خاندان کا فرد سمجھا۔ میں نے سازش کرنا یا دوستوں کے ساتھ غداری کرنا نہیں سیکھا ہے۔"

شیخ کی ناراضگی اور ان لوگوں کی دلیلیں جنھوں نے انھیں چھوڑ دیا تھا، دونوں کا بہت اچھا تذکرہ اس خط و کتابت میں ملتا ہے جو اگست ۱۹۵۶ کے بعد شیخ عبداللہ اور جی ایم صادق کے مابین اس وقت ہوئی تھی جب شیخ کو یہ معلوم ہوا تھا کہ قانون ساز اسمبلی عن قریب ایک دستور کی توثیق کرنے والی ہے (یہ خط و کتابت مصنف کو صادق صاحب کے خاندان والوں سے ملی تھی) صادق صاحب اس وقت قانون ساز اسمبلی کے صدر تھے اور شیخ صاحب نے "ان کے مجوزہ اقدامات کے امکانی سنگین اثرات" سے انھیں متنبہ کیا تھا۔ شیخ عبداللہ نے کشمیر کی حالت کو جو اُن کے خیال میں اب ہوگئی تھی، بیان کیا ان کی رائے میں کشمیر "حقیقی معنوں میں ایک جہنم بن چکا تھا اور حقائق کو دبانے اور چھپانے کے لیے ایک آہنی پردہ ڈال دیا گیا تھا" ۹۔اگست ۱۹۵۳ کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی کارروائی "فرقہ پرست، رجعت پسند عناصر اور خود غرض افراد کے مابین ایک گہری سازش کا نتیجہ تھی۔ آخر میں شیخ نے کہا، مجھے یقین کامل ہے کہ اگر آپ نے اپنے عوام دشمن راستے کو ترک نہ کیا اور کشمیر کے عوام پر ایک دستور تھوپنے کی کوشش کی ...... تو وہ آپ کے ناپاک ارادوں کا تلخ ترین انجام تک مقابلہ کریں گے۔"

۱۱ستمبر ۱۹۵۶ء کے اپنے جواب میں صادق صاحب نے شیخ عبداللہ کو یاد دلایا کہ اسمبلی کے سامنے اپنی پہلی تقریر میں خود شیخ صاحب نے مشورہ دیا تھا کہ "اپنی خود مختاری کا پورے طور پر تحفظ کرتے ہوئے تاکہ ہمیں اپنے ملک کو اس کی سابقہ روایات، اور عوام کے مزاج کے مطابق بنانے کی آزادی رہے، ہم (انڈین) یونین کے ساتھ مناسب دستوری انتظامات کے ذریعے اس عظیم کام میں وفاقی تعاون و امداد پانے کے اپنے حق کو منوا سکتے ہیں اور ساتھ ہی یونین کو اپنے پورے تعاون اور امداد کی پیش کش کر سکتے ہیں۔ صادق صاحب کا کہنا ہے کہ یہ شیخ عبداللہ تھے جن کی ہندوستان سے وفاداری اگست ۱۹۵۲ کے دہلی معاہدے کے بعد سے متزلزل ہونا شروع ہوگئی تھی ساتھوں نے شیخ پر "ہندوستان کے ساتھ ہمارے الحاق کے متبادل کی اذیت ناک تلاش شروع کرنے" کا الزام لگایا "مہربانی کرکے یاد کیجیے کہ اس پورے زمانے میں آپ نے ایک ایسی ٹوٹی پھوٹی ریاست کی خود مختاری کے خیال سے اپنی دلچسپی کا اعلان فرمایا تھا جس میں کم و بیش صرف وادی کشمیر شامل ہوگی۔ ہماری پُرخلوص التجاؤں اور درخواستوں کے باوجود آپ اپنے اس خیال سے چپٹے رہے اور خود ان وزنی دلیلوں کے باوجود جو اس سے پہلے آپ خود اس کے خلاف دیا کرتے تھے!"

۲۶ستمبر کو شیخ نے اس خط کا جواب بھیجا پہلے تو انھوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ صادق صاحب نے اس الزام کو کہ قانون ساز اسمبلی نے اپنا نمائندہ کردار "جمہوریت کے قتل" کے بعد کھو دیا تھا، نظر انداز کر دیا تھا اس کے بعد شیخ نے سازش کے الزام کا تذکرہ کیا اور کہا "میری گرفتاری کے فوراً بعد آپ پہلے شخص تھے جس نے ۹ اگست

کی کارروائی کو "صحیح اور بروقت" قرار دیا تھا۔ آپ اس کے فوراً بعد ہی دوڑے دوڑے دہلی اور بمبئی گئے اور کشمیر کو ایک دوسرے کوریا میں تبدیل کرنے کے لیے کچھ بدیشی قوتوں کے ساتھ سازش کرنے کا مجھ پر الزام رکھا۔ آپ نے یہ دھمکی بھی دی کہ الزام کو ثابت کرنے کے لیے حکومت کے قبضے میں ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہے۔ اگرچہ تین سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے مگر ان غیر ذمہ دارانہ الزامات کے نام نہاد ثبوت ابھی تک سامنے نہیں آئے ہیں۔" شیخ صاحب نے مزید لکھا کہ اگر بخشی گروپ یہ سمجھتا تھا کہ وہ اکثریت میں ہے تو جائز طریقہ یہ ہوتا کہ وہ شیخ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک لاتے اور ایوان میں رائے شماری کے ذریعہ شیخ کو حکومت سے نکال باہر کرتے۔ "اگر تجویز منظور ہو جاتی" شیخ نے لکھا "میں نے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا ہوتا" مگر یہ موقع کبھی نہیں دیا گیا یہاں تک کہ جواہر لال نہرو نے بھی جمہوریت کے ساتھ اپنے جذباتی اور ذہنی وفاداری کے باوجود اس ضابطہ شکنی کو ہو جانے دیا۔ اور عوام پسند بہانہ تھا قومی مفاد کا۔ مگر شیخ نے اس بات کے لیے اپنے دوست پر برسرِ عام کبھی الزام نہ رکھا اگرچہ نجی گفتگو میں ہو سکتا ہے کہ انھوں نے یہ مسئلہ اٹھایا ہو۔

درحقیقت، اگر سیاست کو نہیں تو جواہر لال نہرو کی شخصیت کو اس سے بہتر خراج عقیدت پیش ہی نہیں کیا جا سکتا جو انھیں ایک ایسے شخص نے پیش کیا جو ابھی ابھی چار سال سے زیادہ عرصہ جیل میں گزار کر آیا تھا:" میں اس محبت اور اس خلوص کو کیوں کر بھول سکتا ہوں جو انھوں نے اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھ کر میرے ساتھ برتا؟ میں سمجھ سکتا ہوں، بہت سی قوتیں برسرِعمل ہوتی ہیں جب کوئی کسی جد وجہد کی منجدھار میں ہوتا ہے۔ اس پر چہار سمت سے کھینچا تانی ہوتی ہے۔ خود غرض مفاد پرستوں کی طرف سے قومی اور بین الاقوامی مطالبات کی طرف سے اگر کوئی شخص ان مطالبات کا مقابلہ کر سکتا ہے تو وہ ہیں، صرف پنڈت جی، غالباً صورت حال میں کارفرما قوتیں کچھ ایسی تھیں کہ مسائل کو جلدی حل کرنے کی غرض سے انھوں نے مجھے جیل میں بند کر دیا۔"

۱۲ جنوری ۱۹۵۸ء کو شیخ عبداللہ سری نگر پہنچے، سارا شہر "شیر کشمیر زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھا انھیں دیکھنے کے لیے سارا شہر ٹوٹ پڑا۔ ۱۳ جنوری کو انھوں نے ایک جلسہ عام کو خطاب کیا۔ ان کی شعلہ بیانی اپنے عروج پر تھی۔ ایک جذباتی تقریر میں انھوں نے ان لوگوں پر حملے کیے جو کہتے تھے کہ اب جب کہ دستور ساز اسمبلی نے توثیق کر دی ہے۔ الحاق کو قطعی سمجھ کر اس پر بحث ختم ہو جانا چاہیے۔ شیخ کا کہنا تھا کہ اسمبلی اپنا جمہوری کردار کھو چکی ہے اس لیے لوگوں کو رائے دینے کا ایک اور موقع دیا جانا چاہیے۔ "مسٹر نہرو نے سری نگر کے اسی لال چوک پر کشمیریوں کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا تھا۔ (نومبر ۱۹۴۷ء کے اسی انتہائی جذباتی دن پر) اور عوام کو یقین دلایا تھا کہ

کشمیر کے الحاق کے بارے میں آخری اور قطعی فیصلہ عوام پر چھوڑ دیا جائے گا۔ اس یقین دہانی کی توثیق بعد میں سکورٹی کاؤنسل میں بھی کی گئی۔ میں مسٹر نہرو سے پوچھتا ہوں وہ اب اس پہلو پر خاموش کیوں ہیں؟ کیا وہ اب کشمیریوں کو گائے اور بکریاں سمجھتے ہیں؟ ہندوستان کو اپنے اس رویئے کے بعد جو اس نے ۱۹۵۳ء میں اختیار کیا کشمیریوں کی محبت کو جیتنے کی توقع نہیں کرنا چاہیے (کشمیر کے مستقبل کے) مسئلے کو جو لوگ طے کر سکتے ہیں وہ صرف کشمیر کے عوام ہیں، چالیس لاکھ، مرد، عورتیں اور بچے۔ یہاں کے مسلمان ہیں اور ہندو ہیں جو اس سرزمین پر رہتے بستے ہیں۔

دہلی میں وزیر دفاع وی کے کرشنا مینن ایسی تقریروں کو وطن دشمن قرار دے رہے تھے اور ظاہر ہے کہ بخشی غلام محمد کا ہر لمحہ اصرار تھا کہ ہندوستان سے الحاق اب کسی تنازعے سے مبرا ہے۔ محکمہ خفیہ ایک بار پھر سرگرم عمل ہوگیا (اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دستور کی دفعہ (۱۹) کی تحت علیحدگی کا پروپگنڈا کرنے کا حق بدستور حاصل تھا۔ مثال کے طور پر جنوبی ہندوستان میں علیحدگی، ڈی ایم کے کے مشن کا بنیادی نکتہ تھا۔ یہ آزادی تو اسی وقت ختم ہوئی جب ۱۹۶۳ء میں پارلیامنٹ نے دستور میں سولھویں ترمیم منظور کی)

جس دن شیخ عبداللہ کی رہائی ہوئی تھی اسی دن پاکستان کے وزیراعظم، ملک فیروز خاں نون نے یہ بات بڑی صفائی سے کہا تھا کہ شیخ کی گرفتاری پاکستانی پروپگنڈے کے لیے ایک بہت موثر ہتھیار ثابت ہوئی تھی "مجھے افسوس ہے کہ وہ ہتھیار ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا۔ حالات جس طرح وقوع پذیر ہوئے اس میں ملک فیروز خاں نون کچھ اور تو نہ کر سکے سوائے اس کے کہ انھیں مزید چار ماہ انتظار کرنا پڑا۔

۳۰ اپریل ۱۹۵۸ء کو رات کے سوا گیارہ بجے شیخ کو دوبارہ گرفتار کرلیا گیا۔ اس مرتبہ ان کی گرفتاری پریونٹیو ڈیٹنشن ایکٹ کے تحت ہوئی تھی۔ پولیس کے انسپکٹر جنرل ڈی ڈبلو مہرا ئے نے کہا کہ "ان کا آزاد رہنا ریاست کی سلامتی کے لیے نقصان دہ تھا" کہانی (ہر طرف سے مصرعہ اٹھالیا گیا) یہ مشہور کی گئی کہ شیخ عبداللہ نے، ان مجرموں کو پناہ دی ہے جن کی، استصواب محاذ کی بھڑکائی ہوئی قتل و غارت گری، آتش زنی اور لوٹ مار میں ملوث ہونے کے جرم میں تلاش تھی۔ حسب معمول مخالف پروپگنڈے کے بند ٹوٹ گئے۔ بخشی غلام محمد نے لندن کے اخبار ڈیلی ٹیلی گراف کو انٹرویو میں جو ۲ مئی کو شائع ہوا تھا، بتایا "انھوں نے (شیخ عبداللہ نے) مسلم تشدد اور تعصب کی تبلیغ کی...... اس سلسلے میں بھی کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ شیخ عبداللہ پاکستان کے ساتھ سازباز کر رہے تھے اور یہ پاکستان ہی تھا جہاں سے اُن کو اپنی نجی فوج بنانے کے لیے روپیہ مل رہا تھا" خود نہرو کا بھی یہی خیال تھا کہ شیخ عبداللہ اب "جس پالیسی کو اپنا رہے ہیں وہ تنگ دماغ، فرقہ پرست اور نہایت خطرناک ہے"

شیخ عبداللہ نے نہرو کے اس خیال کو درست کرنے کی کوشش کی۔ دی نیویارک ٹائمز کے دلی میں نامہ نگار اے۔ ایم روز سنیتھال نے شیخ کے اس خط کا حوالہ دیا جو انھوں نے نہرو کو جیل سے لکھا تھا "میں اس سب کو خاموشی کے ساتھ دیکھ رہا ہوں تاکہ میں خود یہ معلوم کر سکوں کہ ریاست کے مسلم اکثریت والے حصے میں ہندوستانی جمہوریت کس ڈھنگ سے چل رہی ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں اس پالیسی سے بالکل اتفاق نہیں کرتا ہوں جس پر حکومتِ ہند عمل پیرا ہے...... دس سالہ یہ تنازعہ کشمیر کے عوام کو وہ حق خود اختیاری دے کر (ہی حل ہو سکتا ہے) جس کی خود آپ نے پُرزور حمایت کی تھی...... میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ مسئلے کے حل کی کنجی آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ ایک ایسی پالیسی پر عمل پیرا ہو کر، جو بہرحال ہم سب کے لیے تباہ کن ثابت ہوگی، بخشی اور ان کے حامیوں سے دھوکہ نہ کھایئے۔ امید ہے کہ آپ کی صحت ٹھیک ہوگی۔"

پچھلے واقعات پر غور کرتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو شیخ عبداللہ کی بار گرفتاری پہلی گرفتاری کے مقابلے میں زیادہ منطقی اور زیادہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔ شیخ عبداللہ کی دوسری گرفتاری کے لیے بخشی غلام محمد جو دلیلیں دیتے ہیں انھیں غیر ذمہ دارانہ کہہ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے مگر شیخ عبداللہ کو فرقہ پرست کہنے پر نہرو کا دفاع نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان نے ان پچیس برسوں میں کتنی تمنا اس بات کی کی ہوگی کہ کاش شیخ عبداللہ درحقیقت وہ سب کچھ ہوتے جو ان کے ناقد کہتے تھے کہ وہ ہیں۔ ابھی تک شیخ عبداللہ کا ایک بیان بھی کوئی ایسا نہیں ڈھونڈا پایا جس میں شیخ نے کشمیر کے پاکستان سے مل جانے کی وکالت کی ہو یا کہا ہو کہ کشمیریوں کی استصواب میں پاکستان کے حق میں ووٹ دینا چاہیے۔ مگر آزادی اور عزت کے ساتھ اپنا مستقبل طے کرنے کے کشمیریوں کے حق کے سلسلہ میں وہ ذہنی طور پر کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ یہ سوچ رہے تھے کہ اپنے عوام کو سب سے بڑی چیز جو وہ دے سکتے ہیں وہ خود اعتمادی اور افتخار ہے جو مغل، یا سکھ یا ڈوگرہ حکمرانوں نے یکے بعد دیگرے تباہ کر دیا تھا اور خود اپنی بے وجہ برطرفی کو انھوں نے نو آبادکاری نظام اور نیم جاگیردارانہ قوتوں کی واپسی اور عوام کی خواہشوں کی تحقیر تصور کیا جسے قبول کرنے کے لیے انھیں وہ سب کچھ تج دینا پڑتا جس کے لیے وہ زندگی بھر لڑے تھے، جدوجہد کی تھی۔ اس میں کسی شک کی گنجایش نہیں ہے کہ اگر ۱۹۵۸ء میں انھیں آزاد چھوڑ دیا جاتا تو عوام کی خفگی کا مقابلہ کرنا حکومتِ ہند کے لیے مشکل ہو جاتا۔ ۱۹۵۳ء میں لیا جانے والا فیصلہ برا تھا مگر جب وہ ایک دفعہ لے لیا گیا تو پھر نہرو کو ایک برے فیصلے کی منطق کے مطابق عمل کرنا ہی تھا۔ غلطی پر مزید غلطیوں ہی سے قابو پایا جا سکتا ہے۔

شیخ عبداللہ جس قسم کا استصواب چاہتے تھے اس کا مسئلہ بہت سیدھا سادا تھا۔ دہلی کا حکمراں حلقہ یہ سمجھتا تھا کہ کشمیر کے مسلمان ہندوستان سے الحاق کے لیے اب، اور خصوصاً شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد ووٹ نہیں دیں گے۔ اگر نہرو ابھی تک استصواب کے بارے میں سرگرمی دکھاتے رہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں شیخ عبداللہ کی طرح اس بات کا یقین تھا کہ عوام کی بہت بڑی اکثریت کا جواب ہندوستان کے حق میں اثبات میں ہوگا۔ اس بات کا ثبوت بھی ۱۹۵۱ء کے دستور ساز اسمبلی کے انتخابات میں مل چکا تھا جب پاکستان دوست عناصر نے شرم ناک شکست کھائی تھی۔ پاکستان کے بھیجے ہوئے لیڈروں کے خلاف غصہ اپنے عروج پر تھا۔ پاکستانی "جنگ بازوں" کے خلاف نعرے عام تھے۔ مگر ۱۹۵۳ء تک، سیکولرازم کے عقیدے سے کشمیر کی وفاداری پر دہلی کا اعتماد بڑی حد تک کم ہو چکا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح جمہوریت پر دہلی کے ایمان کے سلسلے میں کشمیر بے یقینی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ۱۹۵۸ء تک حکومت ہند نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ اب استصواب رائے عامہ کا کوئی سوال نہیں رہا ہے۔ سرکاری وضاحت یہ تھی کہ استصواب کا وعدہ صرف اس حالت میں تھا کہ پاکستانی فوجیں کشمیر چھوڑ دیں گی۔ وہ چوں کہ اب بھی بدستور موجود ہیں اس لیے کوئی استصواب نہیں ہو سکتا اور یقیناً پاکستانی فوجی اب بھی وہاں ہیں اور وہ اس وقت تک نہیں جائیں گے جب تک ہندوستانی فوج اس قابل نہیں ہوتی ہے کہ انھیں نکال باہر کرے چوں کہ تادم تحریر، ایسا لگتا ہے کہ ہندوستانی اور پاکستانی فوج کم از کم اس وقت تو ایسی نہیں کہ ایک دوسرے کو نکال سکے۔ کشمیر اس دن تک منقسم رہے گا جب تک، اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ پرانا ملک پھر سے متحد ہو جائے اور ایک حقیقی وفاق وجود میں آجائے۔ وفاق کا خیال آخری دفعہ ۱۹۶۴ء میں سامنے آیا تھا اور یہ آخری چیز تھی جس کے لیے دو دوست جواہر لال نہرو اور شیخ عبداللہ، اس ہنگامی موسم گرما میں کوشش کرنے والے تھے۔

گرم ۱۹۶۴ء سے چھ موسم گرما قبل شیخ عبداللہ پر "مجرمانہ قوت کے بل پر" جموں و کشمیر کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی سازش کے الزام میں مقدمہ چل رہا تھا۔ ۲۱ مئی ۱۹۵۸ء کو جموں کے ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں، پچیس مجرموں کے خلاف بدنام زمانہ "کشمیر کانسپریسی کیس" نام کے مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ ۲۳۔ اکتوبر کو استغاثہ کے سینیر وکیل جے۔ پی مترا نے، سازش کرنے والوں کی فہرست میں دو اہم ناموں کو شامل کرنے کی درخواست گزاری۔ یہ نام تھے شیخ محمد عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کے۔ ۲۴۔ اکتوبر کو عدالت لوگوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ کتھئی رنگ کے کرتے پاجامے اور صدری میں ملبوس شیخ عبداللہ نے وہاں کے مجمع کو مسکرا کر تہنیت پیش کی۔ دوسرے دن انھوں نے عدالت کو بتایا کہ انھوں نے شکایت نامے کو پڑھ لیا ہے۔ "اور اچھے خاصے لطف کے ساتھ" پھر انھوں نے اپنا نقطۂ نظر بتایا کہ

یہ مقدمہ ہے کس سلسلے کا۔ انھوں نے کہا کہ یہ بات صاف ہے کہ اس استغاثہ کے پیچھے ایک سیاسی چال ہے۔ مقدمہ سوائے سیاست کے اور کچھ نہیں ہے"۔ شیخ نے مزید کہا کہ "ایک سازشی کہنے کے بجائے زیادہ صحیح یہ ہوتا کہ انھیں "ایک سازش کا شکار کہا جاتا۔ حکومت ہند چھ سال اس بات کو ماننے میں لے گی کہ شیخ عبداللہ صحیح تھے۔ حکومت کی ساری قوت کی پشت پناہی اور دلوں میں انھیں بدنام کرنے کے عزم مصمم کے ساتھ بھی شیخ عبداللہ کے مخالفین ایک بار پھر کچھ ثابت کرنے میں ناکام تھے۔ شیخ عبداللہ ایک بار پھر جیل سے نکلیں گے اور سر اٹھائے ہوئے نکلیں گے۔

شیخ کی حراست کے زمانے میں جموں اور کشمیر کی حکومت نے جمہوری ہونے کی اداکاری تک چھوڑ دی تھی الیکشن تو قانون کی رو سے ہونے ہی تھے۔ مگر کھلم کھلا اس بات کی کوشش ہوئی کہ عبداللہ دوست امیدوار جیتنے نہ پائیں ایک خط جس نے خاص شہرت پائی، اس میں ۱۹۶۲ء کے انتخابات کے بعد جس میں تقریباً تمام نشستیں نیشنل کانفرنس نے جیتی تھیں، خود نہرو نے بخشی غلام محمد کو لکھا تھا۔ "حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کچھ نشستوں پر اپنے اچھے مخالف امیدواروں سے ہار جاتے" ایس۔ گوپال کے مطابق، پنڈت نہرو نے اپریل ۱۹۶۲ء میں ایک کوشش کی کہ شیخ رہا ہو جائیں مگر وزارت داخلہ اور سری نگر کی حکومت نے مزاحمت کی۔

۱۹۶۲ء کی چین ہندوستان جنگ نے کشمیر کے مسئلے پر اچھا خاصہ اثر ڈالا تھا۔ امریکہ اور برطانیہ نے ایوب خاں کو کشمیر محاذ اس وقت کھولنے سے روکنے میں مدد کی جب ہندوستانی فوج پر ہمالیہ پہاڑوں میں مار پڑ رہی تھی مگر جنگ بندی اور چینیوں کی غیر متوقع واپسی کے بعد نہرو پر پاکستان سے کشمیر کے معاملے میں کوئی تصفیہ کرنے کے لیے اینگلو امریکی دباؤ ڈالا جانے لگا۔ چینیوں کی فتح پر پاکستان خوش تھا اور ایوب خاں نے دو عالمی جنگوں میں بہترین مظاہرہ کرنے والی "عظیم ہندوستانی فوج" کی اچانک شکست کے بارے میں کسی موزوں ہندوستانی پر طنز کرنے کا کوئی موقع کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے مابین مذاکرات کا ایک طویل سلسلہ دسمبر ۶۲ء میں شروع ہوا۔ یہ مذاکرات راولپنڈی، دلی، کراچی اور کلکتہ میں ہوئے اور اگلے سال مارچ تک چلتے رہے۔ ہندوستان، پاکستان کو مزید پندرہ ہزار مربع میل علاقہ اس شرط پر دینے کو تیار تھا کہ پاکستان نئی سرحد کو بین الاقوامی سرحد مان لے۔ مگر ایوب خاں اور نام نہاد کے شوقین ان کے چیلے ذوالفقار علی بھٹو کے ذہن میں تو کچھ اور ہی تھا۔ پاکستان نے اپنی نیت کا اظہار واضح طور پر اس وقت کر دیا جب ہندوستان سے مذاکرات شروع ہونے سے ایک ہی دن قبل پاکستان نے، پاکستان اور چین کے درمیان ایک سرحدی مصالحت کا اعلان کر دیا اور یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ مصالحت کشمیر کے مسئلے کے طے ہونے کے بعد ایک باقاعدہ معاہدے میں تبدیل کر دی

جائے گی (یہ شرط ضروری تھی اس لیے کہ درحقیقت پاکستان وسیع و عریض بنجر مگر فوجی نقطۂ نظر سے اہم کشمیر کا علاقہ چین کے حوالے کر رہا تھا) ہندوستان کے ساتھ یہ عمل بہرحال ان مذاکرات سے ایک دن پہلے ظاہر ہے کہ کوئی مناسب بات نہیں تھی جن مذاکرات کے بارے میں خیال تھا کہ وہ ایک "تاریخی" امن کے قیام کی طرف لے جائیں گے۔ پُراعتماد بھٹو نے یہ سمجھتے ہوئے کہ بالادستی ان کی ہے، کہا کہ پاکستان ہماچل پردیش سے ملحق تھوڑے سے حصے کو چھوڑ کر ساری وادیٔ کشمیر سے کم پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ بھٹو نے ہندوستانی وفد سے کہا تھا (گنڈیویا کے حوالے سے جو خود شریک وفد تھے) "دیکھیے نا آپ ایک ہاری ہوئی قوم ہیں"۔ مگر ہندوستان کی تاریخ میں وہ ایک ایسا وقت تھا جب ۳۷ سال کا ایک نوآموز پاکستانی سیاست داں ایسے بیانات دے اور اسے کوئی جواب دینے والا نہ ملے پاکستان اور چین نئے نئے دوست ہو گئے اور بھٹو شیخی بھی بگھار سکتے تھے اور دھمکی بھی دے سکتے تھے کہ ہندوستان سے مستقبل کی کسی بھی جنگ میں اس کا مقابلہ ایشیا کے سب سے طاقت ور ملک پاکستان کے ساتھ ہوگا اور ظاہر ہے کہ مزید یہ حقیقت کہ پاکستان کا اسلحہ بارود دنیا کے سب سے طاقت ور ملک سے پہلے ہی آچکا تھا (۱۹۶۲ء کی جنگ کے بعد ہندوستان نے امریکہ اور برطانیہ سے پانچ سو ملین ڈالر کے ہتھیاروں کی درخواست کی تھی اور اسے صرف سات ملین ڈالر کے ہتھیار ملے تھے، جب کہ پاکستان کو اس وقت تک مغربی ملکوں سے آٹھ سو ملین ڈالر کی قیمت کے ہتھیار فراہم کیے جا چکے تھے) یہی پاکستانی گھمنڈ تھا جس نے ملک کو ۱۹۶۵ء کی اس جنگ میں دھکیل دیا جس کے بارے میں ایوب خاں اور بھٹو دونوں کو یقین تھا کہ اس میں جیت ادھر سے ٹہلتے ہوئے ادھر جانے کے مترادف ہے۔ اور یہ خود اعتمادی کی زیادتی تھی جس نے ایوب خاں سے ۱۹۶۴ء کی نہرو عبداللہ تجویز کو حقارت آمیز طریقے پر رد کرایا۔ کشمیر میں اپنی فوجی فتح کے خواب میں گم پاکستانی اس آگ کو بھول گئے جو خود ان کے پچھلے صحن میں لگ چکی تھی۔ اگرچہ نہرو نے انھیں اس کے بارے میں آگاہ کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔

پاکستان کے ساتھ ۱۹۶۲ء کے مذاکرات سے پہلے پنڈت نہرو کو اس خیال کی خوبیاں نظر آنے لگی تھیں کہ ہندوستان اور پاکستان کی الجھن کا حل ایک وفاق ہی میں تھا۔ پنڈت نہرو کا خیال تھا کہ اسے ایک چوکھنٹی یونین ہونا چاہیے۔ ہندوستان، مغربی پاکستان، کشمیر اور مشرقی بنگال، دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات کی ایک مشترکہ پالیسی کا ایک وفاق۔ اس وفاق سے نہ صرف یہ کہ کشمیر کے لیے ہونے والی جد و جہد میں کمی آئے گی بلکہ یہ پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان فاصلے کے مسئلے کو بھی حل کر دے گا اور زیادہ خود مختاری دے کر مشرقی بنگال کے بڑھتے ہوئے غم و غصہ کو بھی قابو میں رکھا جا سکے گا جیسا کہ پنڈت نہرو نے واشنگٹن پوسٹ کے دلی میں مقیم نامہ نگار کو بتایا تھا۔ (یہ

بیان ۱۹ دسمبر ۱۹۶۲ کو شائع ہوا اور ایس گوپال نے حوالہ دیا" وفاق ہماری قطعی اور آخری منزل ہے۔ یورپ کو دیکھیے کامن مارکٹ پر نظر ڈالیے، ہر جگہ یہی خواہش ہے۔ کہیں بھی دو قومیں اتنے قریب نہیں ہیں جتنی کہ ہندوستان اور پاکستان کی۔ حالانکہ اگر ہم یہ کہیں تو وہ گھبرا جاتے ہیں وہ سوچتے ہیں کہ ہم ان کو نگل لینا چاہتے ہیں۔"

شیخ عبداللہ کے سلسلے میں بھی نہرو کو احساس جرم ہونے لگا تھا انھوں نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عبداللہ کو چھوڑنے کی ہمت ملک میں نہیں تھی، پھر سری نگر میں ایک واقعہ ہوا جس نے یہ ظاہر کر دیا کہ شیخ عبداللہ اور ان کے وفاداروں کے تعاون کے بغیر آتش فشاں کتنی آسانی سے پھٹ سکتا ہے۔ حضرت بل کی خوب صورت مسجد میں جہاں جمعہ کی نماز کے بعد شیخ عبداللہ نے اکثر خطاب کیا تھا، وہاں ساتویں صدی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بال تبرک کے طور پر رکھا گیا تھا۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۶۳ کو یہ مقدس یادگار معلوم ہوا کہ غائب ہے۔ سری نگر پھٹ پڑا، ایک ہفتہ تک لوگ سڑکوں پر رہے اور اس احتجاج کے آگے آگے عبداللہ دوست قوتیں تھیں۔ ایک ہفتہ میں موئے مبارک یکایک پردہ خفا سے نکل آیا۔ سنکیوں نے سوال کرنا شروع کیا کہ آیا یہ بال حقیقتاً موئے مبارک ہے یا لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس کی جگہ کوئی اور بال رکھ دیا گیا ہے۔ بال کو دیکھ کر اس کی اصلیت کا تعین کرنے کی معتبر شاہدوں کو اس کی اجازت نہ دے کر ریاستی حکومت نے جذبات کی آگ پر اور تیل چھڑکا۔ پنڈت نہرو نے مداخلت کی اور لال بہادر شاستری سے جو اس وقت ایک وزیر بے قلمدان تھے فوراً سری نگر جانے کے لیے کہا۔ موئے مبارک کی جانچ کرنے کے لیے شاستری جی نے جن مذہبی افراد سے درخواست کی ان میں شیخ عبداللہ کے پرانے اور بزرگ ساتھی مولانا مسعودی بھی تھے۔ سب نے سکون و اطمینان کی سانس لی جب ان لوگوں نے موئے مبارک کے حقیقی اور اصلی ہونے کا اعلان کیا۔

اس واقعے کے بعد شاستری جی اس گروہ میں شامل ہو گئے جو شیخ عبداللہ کی رہائی کے لیے پنڈت نہرو پر زور ڈال رہا تھا۔ پنڈت جی نے شاستری سے کہا کہ وہ جیل میں شیخ عبداللہ سے ملیں۔ شاستری جی ملے، مگر شیخ عبداللہ اپنی رہائی کے سلسلے میں کسی شرط کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، اگر وہ ایسا کرنے پر راضی ہو گئے ہوتے تو بہت پہلے ہی وہ ایک آزاد فرد ہو جاتے۔ وزارتِ داخلہ کے لیے شیخ صاحب ابھی بھی ملک کے لیے ایک بڑا خطرہ تھے۔ گنڈیویا (جو اس واقعے میں موجود تھے) نے لکھا ہے کہ "ایک دن نہرو ایک بیوروکریٹ پر جو اس قسم کے شبہات ظاہر کر رہا تھا بھڑ پڑے اور انتہائی غصے میں کہا " اگر کمبخت چار سال اور چھ سال میں کوئی چیز ثابت نہیں کی جا سکتی تو ظاہر ہے کہ وہاں ثابت کرنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں۔"

۵ اپریل ۱۹۶۴ء کو پنڈت نہرو کی براہ راست ہدایت پر وزارتِ داخلہ کو نظرانداز کرتے ہوئے کشمیر کے وزیراعلیٰ جی ایم صادق نے اعلان کر دیا کہ شیخ عبداللہ کے خلاف دائر کیے جانے والے مقدمات فوراً واپس لیے جا رہے ہیں۔ شیخ صاحب ۸ اپریل کو رہا کر دیئے گئے اور ایک بار پھر جموں سے کشمیر تک یہ ایک فاتحانہ سفر تھا۔ شیخ عبداللہ میں اگر کوئی تبدیلی محسوس ہوتی تھی تو وہ صرف یہ تھی کہ وہ پچھلی بار کے مقابلے میں اپنی حراست کے سلسلے میں کچھ فلسفی نظر آتے تھے ان میں تلخی نہیں تھی۔ "یہ سب کھیل کا حصہ ہے اور میں نے اسے اسی جذبہ سے لیا ہے۔۔"

۱۰ اپریل کو پنڈت نہرو نے اپنے پرانے دوست کو ایک ذاتی خط لکھا اور اس میں انھیں رہائی کے بعد دہلی آنے اور اپنے ساتھ قیام کرنے کی دعوت دی۔ یہ خط شیخ کو ۱۷ اپریل کو ملا۔ اس وقت سڑک کے ذریعہ انھیں سری نگر لے جانے کا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ شیخ پنڈت نہرو کے گھر پر ان کے مہمان کی حیثیت سے قیام کرنے کے لیے ۲۹ اپریل کو دہلی آ سکے۔ اب بڑے طول طویل اور سنجیدہ مشورے شروع ہوئے۔ صرف پنڈت نہرو اور شیخ کے درمیان ہی نہیں بلکہ دوسرے متعدد بڑے اور اہم لیڈروں کے ساتھ بھی جن میں جے پرکاش نرائن، سی راج گوپال اچاریہ اور اچاریہ کرپلانی جیسے وہ لوگ بھی شامل تھے جو کانگریس چھوڑ چکے تھے۔ شیخ عبداللہ، حالات پر تبادلۂ خیال کے لیے محترم اچاریہ ونوبا بھاوے کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے جو اب تارکِ دنیا ہو چکے تھے اور وار دھا میں اپنے آشرم میں رہتے تھے ("اگر آپ روحانیت اور عملی سیاست کو ملانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں" شیخ نے ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا "تو پھر آپ کو کسی چیز کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔")

شیخ کی شرائط دہی تھیں۔ جو بھی فیصلہ ہو اسے کشمیریوں کے لیے قابلِ احترام ہونا چاہیے اور ہندوستانی سیکولرزم پر اس کے کسی قسم کے منفی اثرات نہیں پڑنے چاہییں مگر ہند چین جنگ کے بعد کے زمانے میں توجہ کا مرکز بدل گیا تھا۔ خود جنگ کے دوران شیخ نے پنڈت نہرو کو لکھا تھا کہ آزادی کو مشترکہ کوشش کے لیے کشمیر کے مسئلے کو حل کرنا ایک اہم قدم ہوگا۔ اب انھوں نے یہ بھی کہنا شروع کیا کہ مقبوضہ کشمیر کا ایک بڑا حصہ ہندوستان اور پاکستان کی باہمی رنجشوں کی وجہ سے چین کے حوالے کر دیا گیا۔ اہم کام صرف یہی نہیں تھا کہ کشمیر کے الحاق کے آئینی یا غیر آئینی ہونے کی توثیق ہو جائے، بلکہ اصل کام یہ ہے کہ مسئلے کا ایک ایسا حل تلاش کیا جائے جو برِ صغیر کے امن اور دوستانہ ماحول کو پھر سے بحال کر دے جو کشمیر کے متنازعہ ہونے کی وجہ سے برباد ہوا ہے۔ شیخ عبداللہ کے خیال

کا منطقی جواب صرف ہندوستان، پاکستان اور کشمیر کا ایک وفاق تھا۔ شیخ عبداللہ اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ غالباً طویل حراست کے بعد اعلیٰ ترین سطحوں پر ملک کی سیاست میں شرکت ممکن ثابت ہو رہی تھی۔

۶ مئی کو ایک اور ٹھوکا لگا۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اس ساری چپقلش میں پاکستان پیچھے چھٹا جا رہا ہے، ایوب خاں نے شیخ عبداللہ کو ایک خط بھیجا "آپ ظاہر ہے، ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ کشمیر کے مستقبل کے بارے میں تبادلۂ خیال کر رہے ہیں اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کشمیر کے عوام سے ایک وعدہ کیا ہے کہ ریاست کا مستقبل ان کی خواہشات اور اقوام متحدہ کی تجاویز کے مطابق ہوگا اور پھر یہ حقیقت کہ کشمیر میں ہمارے بھی اہم مفادات مضمر ہیں اس سلسلے میں ہمارے مشورے اور ہماری رضامندی کے بغیر کوئی فیصلہ نہ ہو جائے۔ آپ ہماری تشویش کا اندازہ کر سکتے ہیں اس لیے اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ایسے مشوروں کے لیے اب وقت آگیا ہے تو ہمیں آپ کا یہاں استقبال کرنے اور آپ کے ساتھ مسئلے پر غور کرنے میں بڑی مسرت ہوگی۔"

دعوت قبول کر لی گئی۔ شیخ عبداللہ یہ آزمائش کرنے کے مشتاق تھے کہ وفاق کے خیال کا پاکستانیوں پر کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔ غالباً پنڈت نہرو نے ان سب میں کچھ ضرورت سے زیادہ مضمرات پڑھ لیے اور جھنجھلا گئے۔ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ پاکستان اس خیال پر راضی نہ ہوگا اور یہ خیال محض ایک سعی لاحاصل ہو کر رہ جائے گا۔ ایوب خاں یہ کہیں گے کہ یہ پاکستانیوں کو ایک بار پھر ہندوستان میں مدغم کر لینے کی ایک چھپی ڈھکی کوشش ہے شیخ عبداللہ اس کی کامیابی کے لیے زیادہ پرامید تھے۔ انھوں نے ایوب خاں کو جواب دیا وہ اس "محبت آمیز دعوت" پر "جوں ہی یہ تجویز کوئی قطعی شکل اختیار کر لیتی ہے" وہاں آنے میں انتہائی مسرت محسوس کریں گے۔ شیخ نے تو یہاں تک تجویز کر دیا کہ وہ کشمیر کی جنگ بندی لائن کو پار کر کے پیدل اسی طرح پاکستان جائیں گے جس طرح مہاتما گاندھی نے ہندوستان اور پاکستان کی سرحد کو، انھیں تسلیم نہ کر کے ختم کرنا چاہا تھا۔ نہرو نے جب یہ سنا تو وہ خود دہشت زدہ ہو گئے کہ اگر شیخ نے ایسی کوئی حماقت کی حرکت کی تو کہیں ان پر بھی ویسی ہی نہ گذرے۔ ان کی سلامتی کی ذمہ داری کون لے سکتا ہے؟ شیخ عبداللہ نے جب یہ سنا کہ سرحد پیدل چل کر پار کرنے کے ان کے منصوبے کی مخالفت ہو رہی ہے تو ان کو شدید غصہ آیا۔ انھوں نے اس کا الزام بیورو کریٹس پر رکھا انھیں اپنی رائے بدلنے پر مجبور کرنے میں کافی دشواری پیش آئی مگر وہ جب ۲۴ مئی کو پاکستان پہنچے تو پاکستان بین الاقوامی ائرلائنز کے ایک خصوصی جہاز سے پہنچے ـــ پاکستان جو ان کی آمد کو ایک بہت بڑا اور اہم واقعہ بنانے کا عزم کیے ہوئے تھا اس نے ان کا بڑے عظیم پیمانے پر استقبال کیا۔ ہوائی اڈے پر انھیں

خوش آمدید کہنے کے لیے ایوب خاں کے اس وقت وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو، اور وزیرِ داخلہ و امورِ کشمیر حبیب اللہ خاں موجود تھے۔ شیخ کے ساتھ مرزا افضل بیگ اور مولانا مسعودی کے علاوہ ان کے بیٹے فاروق عبداللہ بھی تھے جنھیں وہ اپنی جانشینی کے لیے تیار کر رہے تھے۔ ہوائی اڈے پر موجود دس ہزار کے مجمع نے شیخ کے استقبال کے جوش میں پولیس کے حلقے توڑ دیے۔ مگر دو دن کے اندر اندر شیخ عبداللہ نے اپنے پاکستانی میزبانوں کو مایوس کر دیا تھا۔ انھوں نے ہندوستان پر نکتہ چینی کرنے سے انکار کر دیا۔ ایسا کرنے کے بجائے وہ ہندوستان کے سیکولر نظریے کی تعریف کرتے رہے۔ ایوب خاں نے شیخ کے وہاں پہنچنے کے چند ہی گھنٹے بعد ان سے ملاقات کی۔ حسبِ توقع انھوں نے وفاق کے خیال کو مسترد کر دیا۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اسے نہرو کے ایما پر لائی جانے والی ایک "بے ہودہ تجویز" قرار دیا ہے (شیخ عبداللہ نے بعد کو ایوب خاں کو لکھا تھا اور اس بات کی تردید کی تھی کہ انھیں نہرو نے بھیجا تھا) اور پاکستانی اخبارات و رسائل نے جو شیخ عبداللہ کی توصیف کے گن گانے کے لیے تیار تھے یہ محسوس کیا کہ انھیں اب ان کی برائی کرنا چاہیے۔ شیخ کو یہ آگاہی دی گئی کہ وہ ایک ایجنٹ نہ بن جائیں جو یہاں ہندوستانی مسلمانوں کے تحفظ کے لیے ہندوستان کے ہاتھ کشمیر کا سودا کرنے آئے ہیں۔ یہ ایک انتہائی غیر معمولی منطق تھی جس نے پاکستان بنایا۔ اس سفر میں شیخ عبداللہ، ایوب خاں سے صرف اس ایک رعایت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے کہ انھوں نے ہندوستان آنے کا وعدہ کر لیا۔ شیخ عبداللہ نے پنڈت نہرو سے ایوب خاں کو ایک دعوت نامہ بھیجنے کے لیے کہا۔ ایک بیمار اور تھکا ہوا نہرو جس دن آرام کرنے کی خاطر جس کی شدید ضرورت تھی، دہرہ دون روانہ ہو گیا تھا مگر دعوت نامہ فوراً لکھا گیا اور ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو ایوب خاں کو دینے کے لیے پاکستان میں انڈین ہائی کمیشن پہنچا دیا گیا۔ اسی دن یعنی ۲۷ مئی ۱۹۶۴ کو جواہر لال نہرو، وہ عظیم ترین فرد جسے اپنا سپوت کہنے کا فخر اس برصغیر کو حاصل تھا، مر گیا — ۲۷ مئی کو شیخ عبداللہ "آزاد کشمیر کے صدر ایچ خورشید کے ساتھ کشمیر کے اس حصے میں تھے جہاں وہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے نہیں گئے تھے وہ یہیں تھے جب انھیں نہرو کے انتقال کی خبر ملی۔ چند منٹ تک شیخ عبداللہ پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے۔ اس حادثے پر ان سے کچھ کہنے کے لیے درخواست کی گئی مگر وہ کچھ نہ کہہ پائے بہ مشکل تمام انھوں نے کہا "وہ مر گئے۔۔۔۔ میں ان سے پھر نہ مل سکوں گا۔۔۔۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا" یہ کہہ کر وہ پھر زار و قطار رونے لگے۔ انھوں نے اپنا باقی دورہ ملتوی کر دیا اور دوسرے دن اپنے گھر ہندوستان واپس آ گئے۔

اور یہ جیل میں گزرنے والی ایک اور دہائی کا آغاز تھا۔



۶

مرنا — ایک ہندوستانی کی حیثیت سے

"ادھر کچھ عرصے سے ہم شدت کے ساتھ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ وہ وقت آگیا ہے جب ہمیں اس سلسلے میں عوام کو اعتماد میں لینا چاہیے کہ ہم کشمیر کے ہندوستان سے تعلقات کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں اور ایسا کرتے وقت ہمیں اس حقیقی صورت حال کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو ریاست اور ریاست سے باہر اس وقت ہے۔ برصغیر کے تمام لوگ اور خصوصاً ریاست کے باشندے اچھی طرح واقف ہیں کہ پچھلے گیارہ برسوں میں ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کو جو ۱۹۴۷ء میں ہوا تھا، قطعیت دینے کے لیے ہم نے پوری — کوشش کی۔ خوش گوار حالات میں بھی اور ناخوش گوار حالات میں بھی۔ ہم نے اسے ناقابل تنسیخ اور مکمل کرنے میں نہ کوئی دقیقہ اٹھا رکھا اور نہ ہی اس مقصد کے حصول کے لیے کسی قربانی سے گریز کیا۔ بدقسمتی سے ہماری یہ تمام کوششیں مطلوبہ نتیجے کے حاصل کرنے میں بالکل ناکام ہیں۔ ...... ریاست کے اندر عوام نے دلوں میں تبدیلی کی کوئی علامت ظاہر نہیں کی۔ وہ مصائب سے گذرے، انھوں نے تکلیفیں جھیلیں اور ہندوستان، پاکستان اور اقوام متحدہ کے کیے ہوئے وعدوں کے نفاذ کے مستقل مطالبہ کرتے رہے اس صورت حال کے نتیجے کے طور پر، پیدا ہونے والی بے یقینی اور عدم تحفظ کے احساس نے دائمی کرب میں، سیاسی اور اقتصادی تباہی مزید شامل کر دی ہے، اور عوام، غالباً ریاست کی تاریخ کے بدترین اور انتہائی تکلیف دہ مرحلے سے گزر رہے ہیں۔"

شیخ عبداللہ کی، اپنی خفگی کے اظہار کی ایک اور مثال۔ جی نہیں، یہ بیان بخشی غلام محمد کا ہے جو انھوں نے ۱۹۶۴ء میں اس وقت دیا تھا جب انھیں کشمیر کی وزارتِ اعلیٰ سے ہٹا دیا گیا تھا۔ ۱۹۶۳ء میں، ایکایک پرجوش ہو جانے والے نہرو نے (ذہین اور آتش مزاج مینو مسانی نے کہا — "شکست ان کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی"[۴]) ان اصولوں کو بحال کرنے کی ایک زبردست کوشش شروع کی جنھیں اقتدار کے زمانے میں

زنگ لگ گیا تھا، کابینہ کے بڑے وزیروں اور وزرائے اعلیٰ سے کہا گیا کہ وہ اپنے اپنے عہدے چھوڑ دیں اور اپنا وقت پارٹی کے کاموں میں لگائیں۔ کچھ بدعنوان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے یہ بہت اچھا طریقہ تھا۔ یہی انداز فکر تھا جس میں بخشی غلام محمد کو ہٹا کر ان کی جگہ پر جی ایم صادق کو رکھا گیا اس وقت تک کشمیر میں سیاست بڑی پست سطح پر پہنچ چکی تھی۔ ۱۹۵۳ء سے وہاں کی سیاست میں اختلاط کی یہی کیفیت تھی۔

جھوٹ بولنے والے کی مزید کوئی ضرورت نہیں تھی اسی لیے بخشی غلام محمد کشمیر کے بارے میں اب سچ بول رہے تھے۔ بہر حال وہاں اب بھی ایک آدمی تھا جس کی بات عوام سن سکتے تھے، ایک فرد واحد تھا جس کی زبان ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کے جواز کی ضمانت لے سکتی تھی اور اس شخص کا نام تھا شیخ محمد عبداللہ۔

پنڈت نہرو کے انتقال کے بعد، شیخ عبداللہ کو دلی میں اس نسل کے لوگوں سے مل کر کام کرنا پڑا جن سے ان کا ذاتی کوئی رابطہ یا تعلق نہیں تھا۔ شاستری اور سورن سنگھ اچھے لوگ تھے مگر شیخ کے ساتھیوں اور دوستوں میں سے نہیں تھے، مزید یہ کہ حکومت میں جو فرقہ پرست عنصر تھا اور جسے نہرو نے کچھ قابو میں رکھا تھا از سر نو سرگرم ہو گیا تھا۔ وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے ۱۹۶۳ء کے حضرت بل کے تجربے کی روشنی میں، شیخ کے ساتھ ہمدردانہ رویے کے ساتھ کام شروع کیا۔ مگر ایک دفعہ پھر ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو مفاہمت اور مصالحت کے ہر امکان کو ختم کرنے پر کمر باندھے ہوئے تھے۔ شیخ عبداللہ کو بھی اس بات کا یقین تھا کہ شاستری جی بھی ایسے لوگوں کے خلاف کوئی اقدام نہ کر سکیں گے۔ انھوں نے اپریل ۱۹۶۵ء میں لے مونڈ کو بتایا تھا "مسٹر شاستری میں وہ توانائی نہیں ہے جو نہرو میں تھی۔ جب سے شاستری جی سربراہ حکومت پر آئے ہیں ہندوستان میں صورت حالات کو تھوڑا دھکا لگا ہے۔" شیخ عبداللہ میں ضد کچھ بڑھ ہی گئی تھی۔ جو بات وہ بار بار کہنے میں جھجکتے نہیں تھے اسی میں اب زیادہ تیکھاپن آگیا تھا۔ وہ خود اختیاری کے خیال کو ہرگز ترک نہیں کریں گے اور جب کبھی بھی وہ ایسی کوئی بات کہیں گے دلی کے محب وطن حضرات، بڑا شور کریں گے۔

فروری ۱۹۶۵ء میں حج کے لیے مکہ جانے سے پہلے شیخ عبداللہ بیرونی ملکوں کے ایک طویل دورے پر نکلے۔ اس زمانے میں پاکستان اور چین کے تعلقات بہت بہتر ہو رہے تھے اور چین نے کشمیر میں رائے شماری کی علی الاعلان حمایت کی تھی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۶۵ء کو کراچی کے اخبار "ڈان" کے نامہ نگار مقیم لندن کو دیے جانے والے ایک انٹرویو میں شیخ نے چین کے موقف کی تعریف کی۔ ۲۸ مارچ کو، کراچی میں، چین کے وزیر خارجہ چن ای کے اعزاز میں دیے جانے والے ایک عشایئے میں مسٹر بھٹو نے یہ انکشاف کیا کہ چین نے شیخ عبداللہ کو اپنے

یہاں آنے کی دعوت دی ہے ہندوستان میں، جہاں ایک غدار کی حیثیت سے ان کی مذمت ہوتی رہی تھی، توقع کے عین مطابق بڑا شور ہوا۔ اسی کے ساتھ ہندوستانی پارلیامنٹ میں اس درخواست کی تکمیل کے حوالے سے، شیخ کے خلاف بڑی جم کر کوششیں ہوئیں جو انھوں نے اپنے اس پاسپورٹ کو حاصل کرنے کے لیے دی تھی جو انھیں مئی ۱۹۶۴ میں ان کے پاکستان جانے سے پہلے پنڈت نہرو کی حکومت نے دیا تھا۔ درخواست کے فارم میں قومیت کے خانے میں شیخ عبداللہ نے اپنے آپ کو "کشمیری مسلمان" لکھا تھا۔ نہرو نے اسے یہ کہہ کر نظرانداز کر دیا تھا کہ اگر شیخ عبداللہ ہندوستانی پاسپورٹ پر سفر کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے (نہرو کے لیے) یہی کافی ہے۔ مگر لال بہادر شاستری کے عہد میں اس بات کو غداری کا ثبوت قرار دیا گیا اور پارلیامنٹ میں ایک ممبر کے بعد دوسرا ممبر ہندوستانی حکومت پر اس "علیحدگی پسندی" کی حمایت کرنے کا الزام لگاتا رہا۔ یہ یاد ابھی ہمارے دلوں میں تازہ ہے کہ اگرچہ نہرو کا نام نہیں لیا گیا تھا مگر جب ۲۹ مارچ کو اسپیکر نے ایوان کو یہ بتایا کہ شیخ کے پاسپورٹ کی منظوری نہرو کی حکومت میں "اعلیٰ ترین" سطح پر ہوئی تھی، تو پارلیامنٹ میں ممبران بڑے تمسخر آمیز اور حقارت انگیز طور پر ہنسے تھے۔

۳۰ مارچ کو کشمیر اسمبلی نے، کشمیر جسے ابھی تک گورنر اور چیف منسٹر کے ناموں کی جگہ پر دوسرے خصوصی نام رکھنے کی خصوصی رعایت حاصل تھی، ملک کی دوسری ریاستوں کے مماثل کر دیا۔ ابھی تک جموں اور کشمیر میں گورنر کے بجائے صدر ریاست یا صدر ہوا کرتا تھا اور ریاست کا وزیر اعلیٰ وزیر اعظم کہلاتا تھا۔ مزید یہ کہ صدر کو ہندوستان کا صدر مقرر نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا انتخاب اسمبلی کیا کرتی تھی۔ اب یہ سب کچھ بدل گیا تھا۔

۳۱ مارچ کو وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے ہندوستان کی پارلیامنٹ کے موڈ کی نمائندگی کرتے ہوئے شیخ عبداللہ کو آگاہ کیا کہ اگر انھوں نے چین کا دورہ کیا تو "سخت اقدامات" اٹھائے جائیں گے۔ حکومت نے پاسپورٹ کے مسئلے میں پہلے جو کوتاہی ہوئی تھی اس کے لیے معافی چاہی اور یہ وعدہ کیا کہ اس قسم کی بات اب آیندہ نہیں ہوگی۔ مگر اسی روز، شیخ عبداللہ کوئی ایسی بات کرنے میں مصروف تھے جو ان کے دشمنوں کو ایک اور ہتھیار فراہم کرنے والی تھی۔ الجزائر میں ایک دعوت کے دوران شیخ عبداللہ چین کے وزیر اعظم چو این لائی سے ملے اور گفتگو کی۔

دوسرے دن لال بہادر شاستری نے پارلیامنٹ کو بتایا کہ حکومت نے اس ملاقات کو "سنجیدگی" کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ ۲۱ اپریل کو شاستری جی نے کانگریس پارلیامانی پارٹی کو بتایا کہ شیخ عبداللہ اور چو این لائی کی اس ملاقات کو حکومت ایک معاندانہ فعل سمجھتی ہے اور شیخ عبداللہ کا پاسپورٹ ان کی واپسی پر یا تو ضبط کر لیا جائے گا یا انھیں واپس آنے پر مجبور کرنے کے لیے وہ منسوخ کر دیا جائے گا۔ اگر انھوں نے دشمن ملکوں کا دورہ کر کے حکم عدولی کی تو

انھیں ایک ناپسندیدہ "فرد قرار دے دیا جائے گا۔ بھٹو جو ہمیشہ ہی موقع کی تلاش میں رہتے تھے فوراً میدان میں کود پڑے اور شیخ عبداللہ کو ایک پاکستانی پاسپورٹ کی پیش کش کی۔ شیخ عبداللہ نے ان کی اس فیاضی کو نظر انداز کر دیا۔ ۵۔ اپریل کو وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ نے، تالیاں بجاتی ہوئی پارلیامنٹ میں لوک سبھا کو بتایا کہ شیخ عبداللہ کا پاسپورٹ اب صرف ۳۰۔ اپریل تک قانونی رہے گا اور مزید یہ کہ اس پر ان ملکوں کے سفر کی جو جائے ان کے سفر کے پروگرام میں ہوں یا نہ ہوں، تو شیخ کو ختم کر دیا جائے گا۔ جب ۲۹۔ اپریل تک شیخ کا سفر ختم نہیں ہوا تو حکومت نے انھیں مزید آٹھ دنوں کے لیے ایک خصوصی اجازت نامہ دیا۔ پاسپورٹ رد کر دیا گیا۔ جب ۹ مئی کو شیخ عبداللہ اور ان کی بیگم ہندوستان آئے تو ان کے لیے وہی مانوس بسیرا تھا جس کی ان کے خسر صاحب نے پیشین گوئی کی تھی۔ یعنی جیل خانہ۔ صرف فرق یہ تھا کہ اس دفعہ یہ قید جنوبی ہندوستان کے حسین پہاڑی مقام اوٹی اور کوڈائی کنال میں تھی۔ آزادی کے مزید تیس مہینے ضائع ہو گئے، مگر بہرحال اس دفعہ یہ پنجرہ سونے کا تھا۔ اس دفعہ حراست کے دوران شیخ کے ساتھ رہنے کے لیے ان کی سب سے چھوٹی بیٹی ثریا علی آئیں۔ انھوں نے کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہونے والی یادگار جلد میں لکھا ہے "میرے پاپا کو (سب سے پہلے) ان کے قریبی معتمد مرزا افضل بیگ کے ساتھ اوٹی لے جایا گیا......پاپا کو کوڈائی کنال منتقل کر دیا گیا کیوں کہ وہ وہاں سیاحوں کی دل چسپی کا باعث بن رہے تھے۔ لوگ ان کے خلاف اٹھائے گئے حکومت کے اس اقدام پر نکتہ چینی کرتے تھے..... ہمیں کوہ نور محل نام کی ایک تین منزلہ شاندار اور خوب صورت عمارت میں لے جایا گیا جہاں ہمارا استقبال کرنے کے لیے پاپا دروازے پر موجود تھے۔ ہمیں سب سے اوپر والی منزل میں رکھا گیا۔ دوسری منزل میں سکیورٹی والے تھے اور تیسری منزل ملازموں کے لیے...... پاپا کا کھانا پکانے کی صلاحیتوں سے کم ہی لوگ واقف ہوں گے۔ وہ اپنا صبح کا وقت کھانا پکانے میں صرف کرتے تھے۔ وہ قورمہ، روغن جوش اور شب دیگ پکانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ شب دیگ شلجم گوشت کا سالن ہے جسے دھیمی دھیمی آنچ پر کئی گھنٹے پکانا ہوتا ہے۔ ان کے کھانوں کی خوشبو سکیورٹی والوں کے منہ میں بھی پانی لے آتی تھی۔ میں سکیورٹی عملے کے ایک موٹے آدمی کو خوب اچھی طرح دیکھ سکتی تھی جو زینے پر کھڑا انتظار کرتا رہتا تھا کہ کب ملازمین بچے ہوئے کھانے کو لے کر اتریں اور کب وہ اس میں اپنا حصہ لے۔ میں نے پاپا سے ایک بات یہ سیکھی کہ کسی کو اپنا وقت یوں ہی برباد نہیں کرنا چاہیے۔ انھوں نے اپنے لیے ایک استاد ظاہر ہے کہ حکومت کے خرچے پر، تمل زبان پڑھانے کے لیے رکھا..... ہماری شامیں طول طویل سیروں کے لیے وقف تھیں، اور ان ہی جیل قدمیوں کی وجہ سے ہم نے سارا کوڈائی کنال دیکھ ڈالا۔ کل ملا کر ہم نے ڈھائی سال کی مدت

کوڈائی کنال میں گذاری، دو مہینے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں، اور اپنے وطن واپس آنے سے قبل تقریباً ایک سال دہلی میں تین کوٹھ لین میں۔ یہ ان کی ہمت اور ناقابل تسخیر عزم اور عوام پر ان کا غیر متزلزل اعتماد تھا جس نے اس پورے عرصے میں ان کا ساتھ دیا۔ عوام ان کے لیے آخری اور عظیم ترین قوت تھے۔"

شاید یہ اچھا ہی تھا کہ شیخ عبداللہ پاکستان سے ہونے والی جنگ کے سال میں حراست میں تھے۔ بھٹو اور ایوب خاں نے، جو تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھ سکے تھے، وہی چالیں اپنائیں جو جناح صاحب نے کشمیر ہڑپنے کے لیے اپنائی تھیں۔ قبائلی لٹیرے جہاد کا نعرہ لگاتے ہوئے آئے ان کے پیچھے پیچھے پاکستان کی مسلح فوجیں اور ایک بار پھر کشمیر کے مسلمانوں نے انھیں مسترد کر دیا۔ پاکستان اس بات کو کبھی نہیں سمجھ سکا کہ کشمیر کے لوگ دہلی سے ناخوش ہو سکتے ہیں مگر پاکستان سے بھی انھیں کبھی کوئی دل چسپی نہیں رہی، اور حقیقت تو یہ ہے کہ دونوں میں ہندوستان کی ہمیشہ ترجیحی حیثیت رہی ہے۔ ہندوستان نے نہ صرف یہ کہ پاکستان کے ابتدائی کامیاب حملے کا رخ موڑ دیا بلکہ جنگ بندی کے وقت تک اس نے پاکستان کو مدافعتی صورت حال میں پہنچا دیا تھا۔ ایوب اس جنگ کے مابعد اثرات سے جانبر نہ ہو سکے جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ لٹیروں اور فوجیوں کے اتحاد کی مدد سے وہ جیت لیں گے۔

بہرحال شیخ عبداللہ کے ایک صاحب زادے اس جنگ کے دوران پاکستان کی طرف چلے گئے۔ دونوں لڑکے جنھیں کشمیر کی سیاست میں بعد کو ایک رول ادا کرنا ہے، بڑے فاروق عبداللہ اور چھوٹے طارق عبداللہ دونوں اس وقت انگلستان میں رہتے تھے۔ پنڈت نہرو نے اپنے دوست کے بچوں کی فلاح و بہبود میں ذاتی دل چسپی لی تھی۔ انھوں نے ہی فاروق کو جے پور میڈیکل کالج میں داخلہ دلوایا جہاں سے انھوں نے میڈیسن میں ڈگری لی اور پھر لندن میں رہنے اور پریکٹس کرنے گئے۔ طارق عبداللہ بھی قیام کے خیال سے لندن گئے۔ مسٹر نہرو نے، لندن میں انڈین ہائی کمیشن میں ایک ملازمت حاصل کرنے میں ان کی مدد کی۔ مگر جب ۱۹۶۵ کی جنگ شروع ہوئی، طارق عبداللہ نے پاکستان ہائی کمیشن میں نوکری کر لی۔ پاکستان ان کی اس کارگذاری پر بہت خوش تھا۔ پروپگنڈے کے لیے یہ ایک اچھا مسالہ تھا۔ طارق عبداللہ کو، اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کا ایک رکن بنایا گیا (طارق عبداللہ کے اس غیر یقینی رویے کی ایک پوری تاریخ ہے جو خود شیخ عبداللہ کے لیے اکثر ندامت کا باعث بنی تھی، مثلاً جب شیخ عبداللہ وزیر اعلیٰ ہوئے تو انھوں نے اپنے بیٹے کو ایک سرکاری نوکری دلا دی۔ ان پر ایک دفعہ ناراضگی کا ایسا دورہ پڑا کہ انھوں نے ۳۲۶ ملازموں کو برخاست کر دیا اور ان میں سے ہر ایک کی سبک دوشی کے پروانے بھی خود ٹائپ کیے۔ ان کا ہندوستانی پاسپورٹ ۱۹۷۵ء کے کشمیری معاہدے کے وقت بحال کیا گیا تھا۔)

شیخ عبداللہ کی مسلسل حراست اب ہندوستان کے کم از کم کچھ قومی لیڈروں کے ضمیر پر بوجھ بنتی جارہی تھی۔ ان لیڈروں میں سے ایک تھے سوشلسٹ لیڈر جے پرکاش نرائن۔ انھوں نے ۲۳ جون ۱۹۶۶ کو "بالکل ہی پرائیویٹ" "میں ایک خط مسز اندرا گاندھی کو بھیجا (یہ خط سب سے پہلے بھولا چٹرجی نے اپنی کتاب "کان فلکٹ ان جے پیز پالیٹیکس" اکور پبلشنگ دہلی میں شائع کیا تھا) اس خط میں انھوں نے کشمیر کے مسئلے پر مثالی ایمان داری کے ساتھ غور کیا تھا۔ یہ خط اس قابل ہے کہ اس کا حوالہ تفصیل سے دیا جائے۔ جے پرکاش نرائن نے لکھا تھا۔ "ہم جمہوریت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، مگر کشمیر میں طاقت کے بل پر حکومت کرتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ ہم نے خود اپنے آپ کو اپنے طور پر یہ یقین دلالیا ہے کہ بخشی صاحب کے عہد میں ہونے والے دو انتخابات نے عوام کی خواہش کو ظاہر کر دیا تھا یا یہ کہ صادق صاحب (جو اس وقت وزیر اعلیٰ تھے) کی حکومت، پاکستان دوست غداروں کی ایک چھوٹی سی اقلیت کے علاوہ عوامی حمایت کے بل پر قائم ہے۔ ہم سیکولرازم کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں مگر ہندو قوم پرستی ہمیں دباکر ہم پر زور ڈال کر اسے بزور شمشیر قائم کرنے کی کوشش پر مجبور کر دیتی ہے۔ کشمیر (کے مسئلے) نے دنیا بھر میں ہندوستان کی تصویر جس طرح خراب کی ہے ویسے کسی دوسری چیز نے نہیں کی تھی۔ اس وقت دنیا بھر میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے، روس بھی نہیں، جو کشمیر سے متعلق ہماری پالیسی کو پسند کرتا ہو۔ ممکن ہے کہ کچھ ملک جو اپنے ذاتی مفادات کے پیش نظر اپنی وجوہات رکھتے ہوں، ہماری پالیسی کو پسند کرتے ہوں اور ہماری حمایت کرتے ہوں..... یہ مسئلہ صرف اس وجہ سے نہیں ہے کہ پاکستان کشمیر کو ہڑپنا چاہتا ہے بلکہ اس لیے ہے کہ عوام میں عام طور پر انتہائی گہری بے اطمینانی ہے!

"تاریخی واقعات نے، جن میں سے کچھ پر ہمارا قابو تھا اور کچھ ہمارے قابو سے باہر تھے، توڑ جوڑ کی گنجائش بہت کم چھوڑی ہے۔ مثال کے طور پر، اب ریاست کے کسی بھی حصہ کا کسی طرح کا بھی عدم الحاق جمہوریت اور سیکولرزم کے اصولوں کے مطابق وہ چاہے جتنا مناسب اور حق بہ جانب ہو غیر عملی ہے۔ اب جو بھی حل ہوا سے الحاق کی حدود میں ہونا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں پر شیخ کا رول فیصلہ کن ہو سکتا ہے..... میں یہ نہیں سمجھتا کہ وہ ایک غدار ہیں۔ ہندوستان کی حکومت کسی شخص کو بھی اس وقت تک غدار نہیں ٹھہرا سکتی جب تک کہ یہ جرم تحقیق کے ضروری مدارج سے نہ گذر جائے۔"

"میں اس بات کو شیخ عبداللہ کے ایک اور اقتباس سے ختم کرنا چاہوں گا۔ بیرونی ملکوں کی سیاحت پر جانے سے پہلے انھوں نے ۱۰ فروری ۱۹۶۵ء کو کانسٹی ٹیوشن کلب کی ایک الوداعی تقریب میں یہ کہا تھا "ہم آپس میں اختلافات رکھ سکتے ہیں مگر بہر حال ہندوستان ہم سب کا وطن ہے۔ اگر خدانخواستہ، ہندوستان ہندوستان

نہیں رہتا ہے اس پر تباہی آتی ہے تو دوسروں کو کیسے بچایا جاسکتا ہے؟"...... "میں شیخ عبداللہ کی رہائی کی وکالت کیوں کرتا ہوں، کیونکہ اس سے ہمیں وہ واحد موقع مل جائے گا جو کشمیر کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہمارے پاس ہے۔"

۲ جنوری ۱۹۶۸ء کو رہائی ہوئی مگر مسئلے کے حل کے لیے ہمیں اب ہندوستان اور پاکستان کی ایک اور جنگ کے نتیجے کا انتظار کرنا تھا۔ ملک کی تقسیم جو اسلام کے نام پر ہوئی تھی اور دونوں ملکوں کی طرف سے یہ وعدہ، چاہے وہ اسے باقاعدہ کہیں یا نہ کہیں، کہ کشمیر میں جنگ بندی لائن کو عملی طور سے سرکاری سرحد تصور کیا جائے گا۔

جنوری ۱۹۶۸ء میں یہ بات ہوگئی مگر تبدیلی کوئی نہیں ہوئی۔ اپنی رہائی کے بعد شیخ عبداللہ نے بی بی سی کو بتایا کہ انھیں توقع ہے کہ، پنڈت نہرو کی ۱۹۶۴ء میں موت کے بعد جہاں سے سلسلہ منقطع ہوا تھا وہ وہیں سے پھر آغاز کرسکیں گے۔ عید کی نماز کے بعد مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے لوگوں سے کہا تھا کہ انھیں ہندوستان کو اپنے ملک کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ انھیں یہیں رہنا چاہیے اور یہیں مرنا چاہیے۔ ۳ جنوری کو ایک پریس کانفرنس میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے چواین لائی والی کہانی کا اپنا رخ دکھایا۔ وہ چواین لائی سے ایک پارٹی میں ملے تھے وہاں انھوں نے کشمیر کے اس حصّے کے بارے میں ان سے پوچھا جو اب چین کے قبضے میں ہے، اور ہندوستان سے چین کے تعلقات کے متعلق معلوم کیا۔ شیخ صاحب نے بتایا کہ بعد کو انھوں نے الجزائر میں ہندستان کے سفیر کو اپنی اس گفتگو کا متن بتادیا تھا تاکہ وہ حکومت ہند کو اطلاع دے سکیں۔

مسز گاندھی کے سامنے جواب وزیراعظم تھیں، سوال یہ تھا کہ کشمیر کی گتھی کو کس طرح سلجھایا جائے، اور الحاق کے آئینی مضمرات کو متاثر کیے بغیر کشمیر میں شیخ عبداللہ کے لیے کیونکر کوئی جگہ نکالی جائے۔ جیسا کہ جے پرکاش نرائن نے جواب شیخ عبداللہ کے بہت قریب تھے، اس بات کو کہا تھا کہ "شیخ صاحب کی رہائی ہندوستان کی جمہوری طرز زندگی کا اگرچہ تاخیر کے ساتھ ثبوت ہے مگر یہ اس کا نسبتاً کم اہم پہلو ہے۔ زیادہ اہم بات اس موقع سے تعمیری اور عقلمندانہ طور پر فائدہ اٹھا کر کشمیر کے عوام کی، کشمیر کی اس حیثیت سے متعلق تمناؤں اور آرزوؤں کو پورا کرنا ہے جو ساری ہندوستانی کمیونٹی کے ایک حصّے کے طور پر سلف گورنمنٹ اور احترام نفس پیدا کردے گا۔ جنوری ۱۹۶۸ میں شیخ عبداللہ دو دفعہ مسز اندرا گاندھی سے ملے۔ ظاہر ہے مذاکرات کا آغاز ہوگیا مگر ان کے بار آور ہونے کے لیے ابھی مزید کئی برسوں کی ضرورت ہوگی۔

مسئلے کے حل کی تلاش میں شیخ نے اب، اپنی کوششوں کو ایک فرد کے جہاد تک محدود رکھنے کی بجائے

اس میں دوسروں کو بھی شامل کرنا شروع کیا۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں انھوں نے چھ دن کا ایک آل کشمیر اسٹیٹ پیپل کنونشن تنظیم دیا۔ اس میں تمام اہم پارٹیوں کی نمائندگی تھی۔ جے پرکاش نرائن نے اس کنونشن کا افتتاح کیا۔ انڈین یونین کے تمام صوبوں کی زیادہ خود مختاری کا نظریہ مسئلے کا ایک حل تجویز کیا گیا۔ اس سے کشمیر کی سلف گورنمنٹ کی خواہش کو تسکین ہوگی اور یہ بھی نہیں محسوس ہوگا کہ یہ بات خصوصی طور پر کشمیر کے لیے کی جارہی ہے۔ جے پرکاش نرائن نے یہ بات بالکل واضح کردی کہ ہندوستان سے الگ یا اس کے باہر کشمیر کے خیال کو کوئی بھی منظور نہیں کرے گا، لیکن ساتھ ہی انھوں نے کہا کہ "ہمارے جیسے ایک وسیع و عریض ملک میں، قومی اتحاد کو صرف علاقائی جذبات اور مفادات کی تفہیم اور باہمی تحمل و برداشت کے ماحول ہی میں پروان چڑھایا جاسکتا ہے۔" کنونشن میں شرکت کرنے والوں میں، بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے ۱۹۵۳ء میں شیخ عبداللہ کو جیل بھجوایا تھا۔ بخشی غلام محمد اور شام لال صراف۔ مگر شیخ کا اب بھی اصرار تھا کہ اگر برصغیر کشمیر کے مسئلے پر مزید جنگیں نہیں چاہتا ہے تو پھر ہندوستان، پاکستان اور کشمیر کے نمائندوں کی گول میز کانفرنس ناگزیر ہے۔ اچھا ہوگا اگر کسی ثالث کی بھی مدد لے لی جائے اور ایک ایسا حل نکالا جائے جو خود اختیاری کے مطالبے کو بھی ایک حقیقی روپ عطا کردے گا اور ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لیے باعزت بھی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ شیخ کی آنکھ میں ابھی ایک تنکا باقی تھا، جو ۱۹۷۱ کی جنگ کے بعد پاکستان کے نظریے کی تباہی کے ساتھ ساتھ آخری طور پر معدوم ہوگا۔

۱۹۷۰ء میں پاکستان میں ہونے والے انتخابات مشرقی پاکستان کے لیے استصواب رائے عامہ ہوگئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی زبردست کامیابی کا مطلب بالکل واضح تھا۔ بنگال پنجاب کے ساتھ بڑے معمولی سے تعلقات چاہتا تھا اور اگر اسلام آباد ڈھاکہ کو یہ خود مختاری دینے پر راضی نہیں تھا تو پھر مشرق آزادی کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ مسز گاندھی، ظاہر ہے کہ اس خود مختاری یا آزادی کی دل سے حامی تھیں، مگر یہ بات ذرا مشکل تھی کہ بنگالیوں سے اس ہمدردی کو کشمیر کی صورت حال کے برابر سمجھ لیا جاتا۔ شیخ عبداللہ کا استصواب رائے عامہ محاذ ابھی موجود تھا۔ (اس محاذ کے ایک اہم لیڈر، شیخ عبداللہ کے داماد ان کی بیٹی خالدہ کے شوہر غلام محمد شاہ تھے) دنیا کی نگاہیں برصغیر پر مرکوز ہونے اور خبروں کے لیے نامہ نگاروں کی دھکا پیل میں، مسز اندرا گاندھی، اس امکان کو ظاہر ہے کہ پسند نہیں کرسکتی تھیں کہ شیخ عبداللہ بھی ان کے ساتھ وہ کریں جو شیخ مجیب نے کیا تھا۔ ۹ جنوری ۱۹۷۱ء کو شیخ عبداللہ، ان کے وفادار انلی مرزا افضل بیگ اور غلام محمد شاہ کے کشمیر میں داخلے پر پابندی لگادی گئی۔ استصواب رائے عامہ محاذ کے تقریباً چار سو لیڈر گرفتار کرلیے گئے۔ حکومت جموں و کشمیر کے چیف سکریٹری بی کے دوبے

نے کہا کہ یہ کارروائی، بڑے پیمانے پر تخریبی کارروائیوں کو روکنے کے لیے ضروری تھی جلد ہی استصواب رائے محاذ پر بھی پابندی لگادی گئی ۔ ۵ جون ۱۹۷۲ء کو ہندوستانی فوج کی دسمبر ۱۹۷۱ء کی مشہور فتح کے بعد ہی شیخ عبداللہ کو کشمیر اپنے گھر واپس آنے کی اجازت ملی اس وقت شیخ عبداللہ کو کشمیر سے باہر رکھنا بڑی شرمندگی کا باعث ہوتا کیوں کہ مسٹر بھٹو جون کے آخر میں شملہ میں امن کی بات چیت کرنے کے لیے آرہے تھے ۔

اس وقت تک شیخ عبداللہ کو اس بات کا پورا یقین ہو چکا تھا کہ مسئلے کے کسی حل کی توقع صرف دہلی کے ساتھ براہ راست بات چیت کے ذریعے ہی کی جا سکتی ہے ۔ پاکستان اپنے سہارے کھو چکا تھا ۔ ۳ جون کو حضرت بل کی مسجد میں تقریر کرتے ہوئے شیخ عبداللہ نے اعلان کیا کہ انھوں نے کشمیر کے لیے نسبتاً زیادہ خود مختاری کے بارے میں مسز اندرا گاندھی کے کسی بھی نمائندے سے بات کرنے کا پورا پورا اختیار مرزا افضل بیگ کو دے دیا ہے اور انھوں نے اپنے حامیوں سے کہا کہ وہ دنیا میں ایک ناقابل احترام مقام حاصل کرنے کی اپنی جد و جہد میں مدد کے لیے پاکستان یا کسی دوسری طاقت کی طرف نہ دیکھیں ۔ ۲۵ جون کو، مقبوضہ کشمیر پاکستان میں ہندوستان کے سامنے "گھٹنے ٹیکنے" کی مذمت میں شیخ عبداللہ کے خلاف مظاہرے ہوئے ۔ (ظاہر ہے کہ ان مظاہروں کی قیادت مُلا کر رہے تھے)

۲ جولائی ۱۹۷۲ء پیر کے دن علی الصباح، ذوالفقار علی بھٹو اور مسز اندرا گاندھی نے اس دستاویز کے ذریعے جو "شملہ معاہدے" کے نام سے مشہور ہے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ جموں اور کشمیر میں، ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ بندی کے وقت قبضے میں رہنے والی لائن کی جانبین بغیر کسی تعصب کے دونوں فریقوں کی از سر نو تنظیم دی ہوئی حیثیت کا احترام کریں گے ۔ کوئی بھی فریق اپنے طور پر باہمی اختلافات اور آئینی تاویلوں سے قطع نظر اس میں کسی تبدیلی کی کوشش نہیں کرے گا ۔ دونوں فریق اس لائن کی خلاف ورزی میں طاقت کے استعمال کی دھمکی سے احتراز کرنے کا وعدہ کرتے ہیں ۔ اگرچہ انھوں نے اس کا اقبال نہیں کیا مگر ہندوستان اور پاکستان دونوں نے اس دستاویز کی رو سے کشمیر کو یقیناً تقسیم کر دیا ۔

شیخ عبداللہ اپنے آپ کو بالکل خاموش تو نہ رکھ سکے مگر وہ جانتے تھے کہ کشمیر کے لیے ایک آزاد حیثیت کا اب کوئی امکان باقی نہیں رہا ۔ یہاں سے ۱۹۷۵ء کے کشمیر معاہدے تک صرف وقت کا سوال تھا ۔ اس معاہدے کو کرانے میں جن لوگوں نے کلیدی رول ادا کیا ان میں مقبول سیاست داں ڈی ۔ پی ۔ دھر بھی تھے جنھوں نے بنگلہ دیش کے معاملے میں بڑا کامیاب اور اہم کردار ادا کیا تھا ۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء کو انھوں نے مسز اندرا گاندھی کو بہ صیغۂ راز ایک تحریر بھیجی جس میں انھوں نے ان باتوں کا ایک خاکہ پیش کیا تھا جو وہ سمجھتے تھے کہ شیخ عبداللہ مسئلے کے حل سے

پہلے چاہتے ہے۔" مجھے بہت معتبر ذریعوں سے اجمالی طور پران تجاویز کا پتہ چلا ہے، جو شیخ صاحب وزیر اعظم سے ملاقات ہونے پر پیش کرنے والے ہیں۔" وہ جموں و کشمیر کی قانون ساز اسمبلی کے وسط مدتی انتخاب چاہیں گے ..... اس کا وقت جوان کے ذہن میں ہے وہ غالباً مارچ ۱۹۷۵ء ہوگا۔ وہ اس درمیانی وقفے کو اپنی پارٹی کو جو اس وقت داخلی اختلافات کی وجہ سے بری حالت میں ہے مستحکم کرنے میں استعمال کرنا چاہیں گے تاکہ وہ ایک ایسی حیثیت میں ہو جائیں کہ وادی میں، پاکستان دوست عناصر کے متحدہ حملوں کا مقابلہ کر سکیں...... غیر حل شدہ مسائل جن کا تعلق ان تمام موضوعات سے ہے جو اس وقت دستوری لحاظ سے مرکز کے تحت ہیں، ان کا خیال ہے کہ وہ انھیں اسمبلی کے سامنے اس وقت رکھیں گے جب وہ نئے انتخابات کے بعد اس کی دوبارہ از سر نو تشکیل ہوگی۔"

شیخ نے اب ایک ایسے شخص کی طرح بات کرنا شروع کر دیا تھا جس کی دلی سے لڑائی ختم ہو چکی تھی اور جس کی توجہ اب کشمیر پر اثر انداز ہونے والے دوسرے مسائل کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۷۳ء کو کشمیر کے وزیر اعلیٰ سید میر قاسم نے ڈی پی دھر کو شیخ عبداللہ کی اس تقریر کی تفصیلات بھیجیں جو انھوں نے ۱۹ دسمبر کو جموں گیسٹ ہاؤس میں ہندوستان سے تعلقات کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے ڈیڑھ سو اہم شہریوں کے سامنے کی تھی۔ شیخ نے کہا کہ وہ نہرو اور دوسرے دن ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ خیالات میں ایک ہم آہنگی پاتے ہیں جنھوں نے سارے عوام کے لیے انصاف اور سیکولرزم کی خاطر ذات اور نسل کی تفریق کے بغیر مشترکہ طور پر جدوجہد کی...... بدقسمتی سے ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا مگر اس تقسیم کے باوجود ہم نے سوچا کہ ہمیں کشمیر کو سیکولر ازم کا ایک محل بنانا چاہیے اور خود گاندھی جی نے اس وقت جب سارے ملک میں فرقہ پرستی کی آگ لگی ہوئی تھی، کشمیر کو روشنی کی ایک کرن بتایا تھا...... ہم نے چاہا تھا کہ کشمیر کو باعزت طور پر ہندوستان کا ایک حصہ رہنا چاہیے۔ اس سلسلے میں میں نے لوگوں سے خوراک کے معاملے میں خود کفیل ہونے کے لیے کہا تھا اور چاہا تھا کہ ریاست مرکز پر بوجھ نہ بن جائے مگر مجھے غلط سمجھا گیا اور بعض لوگوں نے میرے موقف کا یہ کہہ کر مذاق اڑایا کہ شیخ عبداللہ لوگوں کو تلقین کر رہے ہیں کہ وہ آلو کھائیں اور بچے کم پیدا کریں، نتیجے کے طور پر ریاست کو خوراک کی اشیا کی قیمتوں میں بہت بڑی امدادی رقمیں دینا پڑیں۔ میں چاہوں گا کہ ریاست ہندوستان پر بوجھ نہ بنے بلکہ خود کفیل ہو اور خود اپنے اوپر بھروسہ کرنے والی ہو۔ ہمیں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرنا چاہیے اور ملک کے سامنے کاسۂ گدائی لے کر نہیں جانا چاہیے۔ اس وقت ریاست مرکز کے قرضے کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے اور اس میں قرضوں کی اصل رقم کا سود ادا کرنے کی بھی استطاعت نہیں ہے۔"

شیخ عبداللہ سے آخری مذاکرات کرنے کی ذمہ داری جس شخص پر ڈالی گئی تھی وہ مسز گاندھی کی حکومت کے ایک انتہائی ذہین اور معتمد فرد جی پارتھا سارتھی تھے۔ ۲۶ فروری ۱۹۷۵ کو چھ نکاتی کشمیر معاہدے کا پارلیامنٹ میں اعلان کیا گیا "جموں کشمیر، انڈین یونین کا ایک حصہ" جس پر بدستور آرٹیکل ۳۷۰ کے تحت حکومت ہوگی۔ ریاست کو آئین سازی کی بقیہ حقوق حاصل ہوں گے مگر پارلیامنٹ، ملک کی علاقائی یک جہتی سے متعلق معاملے میں قانون بنانے کا اختیار اپنے پاس رکھے گی۔ اختیارات کی تقسیم اس مفروضے پر ہوگی کہ مرکز کی ذمہ داری ملک کا اتحاد ہوگا اور ریاست اپنی فلاح وبہبود کی ذمہ دار ہوگی

اس وقت سری نگر میں کانگریس کی حکومت تھی اور میر قاسم وزیراعلیٰ تھے۔ میر قاسم ۱۹۵۳ میں شیخ عبداللہ کے خلاف تھے۔ اب وہ شیخ عبداللہ کے لیے راستے سے ہٹنے پر نہ صرف راضی بلکہ اس کے مشتاق تھے۔ ۲۵ فروری ۱۹۷۵ء کو شیخ عبداللہ کو ایوان کے لیڈر جموں وکشمیر کے وزیراعلیٰ کی حیثیت سے حلف دلایا گیا۔ وہ عہدہ جو ان سے ۱۹۵۳ میں چھین لیا گیا تھا، اکیس سال سے زیادہ کی مدت کے بعد انھیں واپس ملا۔ اکیس برسوں کی اس مدت میں انھوں نے مصائب کا مقابلہ، اس ہمت، وقار اور عزم سے کیا تھا جو ہیرو افراد میں سے اکثر میں نہیں ہوتا۔

مگر شاید یہ سفر کا ایک نسبتاً دشوار مرحلہ بھی اسی دن شروع ہوا تھا۔ تامل ناڈ میں ڈی ایم کے نے اس صدی کی چھٹی دہائی میں خود مختاری اور آزادی کے خیالات کو خیرباد کہا تھا، نیشنل کانفرنس نے یہی بات ساتویں دہائی میں کی، اگر دونوں ریاستوں میں، جمہوریت کے کامیاب نفاذ ہی سے یقین وایمان کی تصدیق ہوتا تھی۔ عوام آزادی وخود مختاری سے زیادہ، درحقیقت خود اپنی حکومت کا احساس اور اپنے مقدر پر اپنا قابو ہونے کا اطمینان چاہتے تھے، صدیوں کے جاگیردارانہ نظام اور استعماریت کے بعد عوام کی خواہش اور یہ آرزو فطری تھی۔ برصغیر کے بعض علاقوں میں یہ خوف چھایا ہوا تھا کہ وہاں جمہوریت میں، غلبے اور تسلط کی کوئی دوسری شکل جاگیردارانہ نظام اور استعماریت کا بدل ہو جائے گی۔ مسلم لیگی لیڈروں کا کہنا تھا کہ ایک جمہوری ہندوستان، ہندو فرقہ پرستوں کی حکومت کا مترادف ہوگا۔ مسلمانوں میں شرکت وشمولیت کا احساس جو حب الوطنی کی پہلی شرط ہے کبھی بیدار نہ ہو سکا۔ ڈی ایم کے کے لیڈروں کو یقین تھا کہ خوب صورت بیانات کا ملمع جب اتر جائے گا تو اس وقت انڈین یونین ہندی ریاستوں کے غیر ہندی ریاستوں پر عموماً اور جنوبی ہندوستان پر خصوصاً غلبے کی شکار ہو جائے گی۔ شیخ عبداللہ کی زیر قیادت چلنے والی نیشنل کانفرنس، نئے ہندوستان کی بنیادی اقدار، سیکولرزم، سوشلزم اور ڈیموکریسی پر ایمان رکھنے کے باوجود یہ سوچنے لگی تھی کہ آیا یہ آئیڈیل ازم، اس نسل کے بعد جس نے ہندوستان کو آزادی دلائی،

کم ظرفوں کے حملوں کی تاب لا سکے گا؟ شبہات حقیقی تھے اور ایک ابھرتے ہوئے اور ایک قطعی شکل اختیار کرتے ہوئے ملک کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان شبہات کا مقابلہ پختگی اور بلوغت کے ساتھ کرے۔ کشمکش اور کھچاؤ کی کمیت اور کیفیت میں فرق تھا۔ تامل علیحدگی پسندی کے خیال پر ردعمل کبھی بھی تلخ اور شدید نہیں ہوا کیوں کہ تامل ناڈ تقسیم ملک کے وقت ہونے والے بھیانک تنازعے میں کسی طرح بھی شریک نہیں تھا۔ مگر مسلمان، ۱۹۴۷ء میں ہندو سے لڑا تھا اور اگرچہ کشمیری مسلمانوں نے اس زمانے میں بڑے عجیب و غریب اور حیرت انگیز آئیڈیل ازم کا مظاہرہ کیا تھا مگر ابھی بھی اسے اس شبہہ کا شکار ہونا پڑتا تھا کہ وہ پاکستان کی طرف ہمدردانہ رویہ رکھتا ہے۔

کشمیر میں، بخشی غلام محمد کے زمانے میں دو بوگس الیکشن ہوئے انھوں نے کشمیریوں کو جمہوری نظام کی خوبیوں کا یقین نہیں دلایا۔ اب شیخ واپس آئے تھے اگر وہ اپنے پیچھے کامیابی کی کوئی یادگار چھوڑنا چاہتے ہیں تو انھیں کشمیریوں کو یہ یقین دلانے میں کافی محنت کرنا ہوگی کہ کشمیر اور ہندوستان کی دوستی ایک اچھا اور مفید فیصلہ تھا۔ شیخ کی آزمائش کا وقت اس سے بہت پہلے آجائے گا جو انھوں نے سوچا ہوگا۔

ساتویں دہائی کے، جو ایک غیر معمولی دہائی تھی، معیاروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی ۱۹۷۵ء ایک بڑا ڈرامائی سال تھا۔ اسی سال جون میں ایمرجنسی کا نفاذ ہوا۔ مارچ ۱۹۷۷ء تک مسز اندرا گاندھی نے انتخابات کرائے اور شکست کھائی، جنتا پارٹی نے حکومت بنائی، مرارجی ڈیسائی وزیر اعظم بنے۔ دہلی میں حکومت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد، کانگریس نے کشمیر میں انتہائی عجیب و غریب ردّ عمل کا اظہار کیا۔ مفتی محمد سعید نے ۲۶ مارچ کو (اسی ہفتہ میں جس میں کانگریس حکومت سے ہٹائی گئی تھی) گورنر ایل۔ کے۔ جھا کو اطلاع دی کہ ان کی پارٹی نے شیخ عبداللہ کو جو حمایت دے رکھی تھی اسے وہ واپس لے رہی ہے۔ ۱۹۷۵ء کے معاہدے کی شرائط کے مطابق، یہ کانگریس پارٹی کے ممبر ہی تھے جنھوں نے اسمبلی کے انتخابات جس میں شیخ کی پارٹی حصہ لے سکتی تھی، نہ ہونے کی وجہ سے شیخ کو ووٹ دے کر وزارت اعلیٰ کا عہدہ دلایا تھا۔ شیخ مبہوت رہ گئے۔ ایمرجنسی سے متعلق کچھ ذہنی تحفظات کے باوجود الیکشن کی مہم کے دوران شیخ کوئی ایسی بات کہنے یا ایسا کچھ کرنے میں بہت محتاط رہے جسے مسز گاندھی مخالف تعبیر کیا جا سکتا۔ مگر اب ۳۰ مارچ کو ایک جلسہ عام میں ایک ناراض اور تلخ شیخ عبداللہ نے کہا کہ کانگریس نے انھیں ہمیشہ دھوکا دیا ہے۔ بہرحال اس وقت دہلی میں ایک ایسی حکومت تھی جو ڈیموکریسی کی نام لیوا تھی اور اس پر ایمان رکھتی تھی اس نے یہ مان لیا کہ اس گورکھ دھندے سے نکلنے کا صرف ایک طریقہ، نئے انتخابات ہیں۔ جوش و کم امیدوں کے ساتھ ساری پارٹیاں میدان میں کود پڑیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر شیخ کے ساتھ متحدہ محاذ بنانے

کے بجائے جنتا پارٹی خود بھی میدان میں آگئی۔ دوسرے لوگوں نے لگتا ہے کہ یہ بھلا دیا کہ کشمیر کے لیے شیخ کا مطلب کیا ہے؟ وہاں ان کی حیثیت کیا ہے؟ شیخ نے ان سب کو جولائی ۱۹۷۷ کے انتخابات میں یہ دکھا دیا۔ انھوں نے انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ مفتی سعید کی کانگریس وادیٔ کشمیر میں ایک نشست بھی نہیں لے سکی۔ ۹ر جولائی ۱۹۷۷ء کو شیخ عبداللہ نے وزیر اعلیٰ کے عہدے کا حلف اٹھایا اور پھر ۸ ستمبر ۱۹۸۲ء تک یعنی اپنے انتقال تک سریر حکومت پر متمکن رہے۔

مگر اقتدار اپنے ساتھ اپنے مسائل لایا۔ سری نگر اور دہلی کے مابین نہ شک و شبہات دور کیے جا سکے اور نہ ہی بھڑکانے والوں کی نسل ہی ختم ہوئی۔ اگرچہ ۱۹۷۷ء کی انتخابی مہم میں جنتا پارٹی نے شیخ اور نیشنل کانفرنس کے خلاف بڑی ترش و تلخ لڑائی لڑی تھی مگر اس نے اتنی شرافت ضرور دکھائی کہ شیخ عبداللہ کو ان کی اتنی زبردست کامیابی کے بعد سکون سے رہنے دیا۔ ۱۹۸۰ کے انتخابات میں شیخ نے جنتا پارٹی کے خلاف مسز اندرا گاندھی کی اعلانیہ حمایت کی۔ اگرچہ وہ خود انتخابی مہم میں کہیں نہیں گئے مگر ان کے بیٹے فاروق عبداللہ نے مہم میں سرگرمی کے ساتھ شرکت کی۔ جیت کے بعد مسز اندرا گاندھی دوسری بار وزیر اعظم کی حیثیت سے جب پہلی بار کشمیر گئیں تو وہاں ان کا زبردست   ہوا مگر یہ ماہِ عسل ایک ایسے ملک میں جہاں ایسے سیاسی رشتے یونہی بڑے ناپائدار ہوتے ہیں بہت ہی مختصر رہا جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ اس بات میں بہت وقت نہیں لگا کہ فاروق عبداللہ نے بھی غداری کی انھیں مانوس لہروں کا اٹھنا محسوس کرنا شروع کر دیا۔

مگر شیخ عبداللہ کو سب سے زیادہ جس بات نے افسردہ خاطر کیا، وہ وہ بدعنوانیاں تھیں جن میں ان کے کچھ اعزا ملوث ہونے لگے تھے۔ اشوک جیٹلی ان بیوروکریٹس میں سے ایک ہیں جنھوں نے ایک ایسے شخص کے ماتحت کام کیا تھا جس کی پوجا کی جا سکتی تھی۔ وہ ایک ایسے کیس کا ذکر کرتے ہیں جس میں شیخ کے رشتہ داروں میں سے ایک نے بدعنوانی میں تعاون نہ دینے والے ایک افسر کی ایمانداری پر ناراض ہو کر اسے پریشانیوں میں مبتلا کرنے کی کس کس طرح کوشش کی۔ شیخ نے مذکورہ افسر کو بلایا اور کہا "میرا رشتہ دار کبھی کبھی اپنا توازن کھو دیتا ہے مگر وہ میرا رشتہ دار ہے۔ آپ اس کی طرف سے میری پر خلوص معافی کو قبول کیجیے" ایسے رشتہ داروں کے لیے بہر حال عزت اور احترام کا کوئی جذبہ باقی نہیں رہ سکتا۔ شیخ کی نسل اور ان کے بعد آنے والوں کا موازنہ کرتے ہوئے بی کے نہرو نے کہا کہ "ہمارے لیڈر اس وقت سیاست داں کہلاتے تھے۔ آج جو حکومت کی گدیوں پر بیٹھتے ہیں وہ بھی سیاست داں کہلاتے ہیں۔ یہ بڑا طرفہ تماشہ ہے کہ یہ دونوں جو ایک دوسرے سے

بالکل مختلف قسم کے انسان ہیں، جن میں کوئی بات بھی مشترک نہیں ہے انھیں ایک ہی نام سے پکارا جائے ......
(اولالذکر نے اپنے اختیارات کا استعمال) ایمان داری، لگن اور بے غرضی سے کیا اور جس کی ان کی ساری زندگی پر فرماں روائی رہی، یہی خوبیاں تھیں جو شیخ میں بدرجہ اتم موجود تھیں اور اپنے نظریات اور اپنے اصولوں کی خاطر جیل گیا بلکہ اس سے بھی زیادہ صعوبتیں برداشت کرنے پر ان کا ہمہ وقت تیار رہنا ہی تھا جس کی وجہ سے وہ قومی ہیرو تھے۔"

بہرحال قومی ہیرو کو بھی اپنے پیچھے جانشیں چھوڑنے ہوتے ہیں۔ جمہوریت کے میلانات اور خاندانی اسٹائل کے جو ہندوستان میں بہت عام ہے، پیش نظر یہ ناگزیر تھا کہ جانشیں خود خاندان سے نکلے۔ انتخاب دو افراد تک محدود تھا۔ پہلے دعوے دار تھے داماد، جی ایم شاہ، ایک سیاسی مددگار کے لحاظ سے جن کی حیثیت مسلّم تھی مگر ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ان میں بہت سی مزید خوبیوں کی ضرورت تھی مگر شاید یہ اپنے بیٹے سے صرف محبت کا جذبہ تھا جس کی بنا پر شیخ نے فاروق عبداللہ کا انتخاب کیا۔ بہرحال، دونوں کے مابین ایک جنگ چھڑ گئی جس میں جانشینی کی مغل سیاست کا پرتو دیکھا جا سکتا تھا۔ اس جھگڑے کی بہرحال ایک بڑی قیمت چکانا ہوگی۔

شیخ پر دل کا پہلا دورہ جون ۱۹۷۷ء میں پڑا۔ دوسرا دورہ، ۵ ستمبر ۱۹۸۲ء کی سہ پہر میں دو بجے کے وقت ہوا۔ اس وقت یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ شیخ اس سے بچ نہ پائیں گے۔ بیماری کی خبر جوں ہی سڑکوں اور وادی کے گاؤں میں پہنچی، لوگ ان کے گھر کے چہار طرف جمع ہونے شروع ہو گئے اور سارے کشمیر نے یہ دعا مانگنی شروع کی۔ "لاالٰہ الا اللہ۔ زندہ تھا اوُن عبداللہ (کوئی معبود نہیں ہے سوائے اللہ کے، وہ عبداللہ کو زندہ رکھے) اور یار بآ استودی بلائی شیر کشمیر سُس" (اے خدا ہماری عمریں لے لے اور انھیں شیر کشمیر کو عطا کر) دوسرے دن مسز اندرا گاندھی دلی سے جہاز کے ذریعے شیخ عبداللہ کو دیکھنے کے لیے سری نگر پہنچیں اس وقت وہ ہوش میں تھے۔ انھوں نے مسز گاندھی کی موجودگی میں پھلوں کے رس کا ایک گلاس پیا مگر ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ کہانی اب ختم ہوئی۔ ان کے اردگرد، شیخ کے بغیر مستقبل کی پریشانی، لوگوں کے دل و دماغ پر چھانے لگی تھی، ان لوگوں کے دل و دماغ پر بھی جو شیخ کو زندہ رکھنے کی کوشش میں اپنی جانیں دے دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ۸ ستمبر کی شام کو چھ بج کر چالیس منٹ پر سری نگر کے دوکان داروں نے اپنی دوکانیں بند کر دیں اور ساری وادی میں آہ و بکا گونجنے لگی۔ شیخ کی موت کا کوئی سرکاری اعلان نہیں ہوا تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ ریڈیو سری نگر نے ایک خبر نشر کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ شیخ ابھی زندہ ہیں۔ ظاہر ہے یہ سچ نہیں تھا۔ عوام، حسب معمول زیادہ جانتے تھے۔

حکومت ہند نے ایک ایسی گھڑی میں جو پالیسیاں مرتب کرنے والوں کے لیے کابوس ہوتی ہے، ذرہ برابر بھی خطرہ مول لینے سے انکار کیا، یہ اصول کو عملی شکل دینے کا سوال تھا۔ "بادشاہ مرگیا۔ بادشاہ امر رہے" ایک طرف دُنیا کو شیخ عبداللہ کی موت کے بارے میں غلط خبر سنائی گئی، تو دوسری طرف ان کے بیٹے، ریاستی کابینہ کے سب سے جونیر وزیر، کو جانشین کی حیثیت سے حلف اٹھوایا گیا۔ ابھی وقتی منصوبہ بندی نے دستوری اور سیاسی دونوں پہلوؤں کا خیال رکھا تھا۔ یہ جی ایم شاہ تھے جن سے، اگلے وزیر اعلیٰ کے عہدے کے لیے فاروق عبداللہ یعنی اس شخص کا نام تجویز کرایا گیا جس سے انھوں نے ہمیشہ نفرت کی تھی۔ شیخ کی موت کی خبر اس رات ساڑھے بارہ بجے بتائی گئی۔ (ایک اخبار کے دہلی ایڈیشن نے ایک عجیب وغریب سرخی لگائی تھی "شیخ کا انتقال ہوگیا ہوگا") مگر دوسرے تمام اخباروں نے زیادہ یقین کے ساتھ خبر شائع کی تھی)

" ازچو ماتم بجا ...... اکسی رو آد باب" (روؤ کہ آج ہم نے اپنا باپ گم کر دیا ہے) کوئی بیان، کوئی نذرانۂ عقیدت اس بات کو کہ شیخ عبداللہ کشمیر کے لیے کیا تھے، عوام کے ردّ عمل سے بہتر ڈھنگ سے ظاہر نہیں کر سکتا۔ وہ پولو گراؤنڈ پر جہاں شیخ کا جسد خاکی رکھا گیا تھا، ٹوٹ پڑے۔ اس کے بعد یہ سب لوگ وہاں سے بارہ کیلومیٹر دور، حضرت بل کی مسجد کے پاس ایک چنار کے درخت کے سائے میں، جو تدفین کی جگہ تھی گئے۔ اس دن وہاں نہ تو کوئی مسلمان تھا اور نہ ہی کوئی ہندو یا سکھ۔ اسی صدی کی چوتھی دہائی میں شیخ نے جو نعرہ دیا تھا آج اس کا بھری مظاہرہ ہو رہا تھا اور جو جنازے کے ساتھ ساتھ مسلسل فضا میں گونج رہا تھا "شیر کشمیر کا کیا ارشاد۔ ہندو مسلم سکھ اتحاد" مرد اور عورتیں بوڑھے اور جوان، غرض ہر وہ فرد جس کا اس عظیم آدمی کی سحر انگیز شخصیت سے ذرا بھی تعلق رہا تھا وہ آج اس موقع پر اسے رخصت کرنے کے لیے موجود تھا۔

اور وہ جسد خاکی، جس پر ساری دُنیا کی نظریں جمی ہوئی تھیں، ہندوستانی ترنگے میں لپٹا ہوا تھا۔ شیخ عبداللہ ایک ہندوستانی رہ کر مرے تھے۔

شیخ عبداللہ کی موت پر، حکومت پاکستان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔



۷

دُوسرا مقدّمہ

شیخ عبداللہ سری نگر میں ہوتے تو وہ ہمیشہ جمعہ کی نماز حضرت بل کی مسجد میں ادا کرتے تھے اور اکثر اس موقع کو وہ اپنے عوام سے گفتگو کا ایک موقع بنا لیتے تھے، اگر کوئی سیاسی بیان ہوتا تو وہ وہاں دے دیتے تھے نہیں تو یہ ان کے لیے ایک موقع ہوتا تھا، لوگوں سے ملنے کا، جو انھیں اپنے عوام سے جو ان کے معتقد تھے اور جن سے انھوں نے خود محبت کی تھی جسمانی طور پر بھی اور جذباتی طور پر بھی قریب کر دیتا تھا۔ ۱۹۸۱ء کے اوائل موسم گرما میں، انھوں نے ایک جمعہ کو، نمازیوں کو بتایا کہ وہ اب اپنے آپ کو بوڑھا اور تھکا ہوا محسوس کرنے لگے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داریاں اب بتدریج کسی نوجوان کے سپرد کر دیں۔ انھوں نے مجمعے سے پوچھا تھا کہ آیا وہ کوئی نام تجویز کر سکتا ہے وہ لوگ اس جواب کو جانتے تھے جو بوڑھا شیر سننا چاہتا تھا۔ مجمعے میں سے کسی نے نام لے ہی لیا "فاروق عبداللہ" دوسروں نے فوراً نہایت وفاداری کے ساتھ اسی نام کو دہرانا شروع کر دیا۔ جمہوریت پسند شہنشاہ نے عوام کی آواز سن لی۔ مسند نشینی کی تاریخ ۲۱۔ اگست ۱۹۸۱ء قرار پائی۔

ماہ اگست کے اس دن کی تقریبات پر شاہی کو بھی رشک آتا جس دن فاروق عبداللہ کو نیشنل کانفرنس کا صدر بنایا گیا اور شیخ عبداللہ کا وارث۔ شہر میں لوگوں کا ہجوم امنڈ پڑا تھا، سڑکوں پر لوگ ٹوٹے پڑتے تھے، کھوے سے کھوا چھل رہا تھا اور انسانوں کا ایک سیلاب تھا جو بہے جا رہا تھا۔ یہ خبر بھی لوگوں کے کانوں میں پڑی کہ شیخ عبداللہ چاہتے ہیں کہ اس دن سری نگر سُرخ دکھائی دے، سُرخ، خونِ شہیداں کی طرح، سرخ، نیشنل کانفرنس کے جھنڈے کی طرح سُرخ، کسانوں کی نجات کی علامت کی طرح۔ ہر فرد پارٹی کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھا، ہر عمارت پر سرخ پرچم لہرا رہا تھا۔ موسم گرما کی ایک خوش گوار سہ پہر، چکیلی دھوپ میں فاروق عبداللہ نے ایک کھلی ہوئی جیپ میں کھڑے ہو کر پارٹی کے ہیڈ کوارٹرز مجاہد منزل سے اقبال پارک کی طرف جلوس کی قیادت کی۔ تین کلومیٹر کے اس فاصلے کو طے

کرنے میں پانچ گھنٹے لگ گئے۔ شام کا دھندلکا چھا رہا تھا جب باپ نے بیٹے سے کہا۔ "یہ تاج جو میں آج تمھارے سر پر رکھ رہا ہوں، کانٹوں کا بنا ہوا ہے۔ تم نوجوان ہو۔ فاروق عبداللہ، اور اتنے نوجوان کہ زندگی کے چیلنجوں کا مقابلہ کر سکتے ہو۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان عوام کے سلسلے میں عائد ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی تم میں ہمت پیدا کر دے۔ یہ لوگ جن کی پرورش میں نے اتنے فخر و ناز سے کی ہے اور اپنی زندگی کے بہترین سال میں نے جن کے لیے صرف کیے ہیں۔" اتنا کہنے کے بعد شیخ عبداللہ رو پڑے اور مجمعے نے بیک آواز کہا۔ آمین۔ باپ نے بیٹے کے سینے پر صدارتی بیج لگا دیا اور مشعل منتقل ہو گئی۔

۸ ستمبر ۱۹۸۲ء کی نصف شب کے قریب، حکومت اس وقت قانونی طور پر فاروق عبداللہ کے ہاتھ میں آگئی جب نئی دہلی کی اجازت سے فاروق عبداللہ نے عہدے کا حلف اٹھایا۔ ۱۱ر ستمبر کو نیشنل کانفرنس کے سارے چھیالیس اراکین اسمبلی نے جی ایم شاہ کی پیش کی ہوئی تجویز کے حق میں ووٹ دے کر نئے وزیر اعلیٰ کے انتخاب کی توثیق کر دی۔ صحیح طریقہ، درحقیقت اس کے برعکس ہوتا مگر دہلی، جانشینی کے معاملے میں، رسوم میں الجھ کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دہلی کو جو چیز سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی وہ تھی کہ چھوٹے مگر منظم اور مالی وسائل کی طرف سے مطمئن پاکستان دوست گروہ کشمیر میں، شیخ عبداللہ کی موت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی افراتفری اور جذباتی اتھل پتھل کے فراہم کیے ہوئے اس موقع سے کہیں فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں اور پھر پاکستان کو بھی مداخلت کی تحریص ہو سکتی تھی۔ تولین سنگھ نے ۶ر ستمبر ۱۹۸۱ء کے ہفتہ وار سنڈے میں، پاکستان دوست تنظیم جماعت اسلامی کے نمبر دو کے قائد سیف الدین قاری کے اسی قول کا حوالہ دیا ہے کہ "شیخ کی موت کے بعد زبردست تبدیلی ہو گی۔ کشمیر کا دانش ور طبقہ ہمارے ساتھ ہے، کیوں کہ ہماری پارٹی، کردار اور اصول رکھنے والی واحد پارٹی ہے ..... ایک دفعہ جب وہ (شیخ صاحب) منظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں تو زبردست تبدیلی وقوع پذیر ہو گی۔"

فاروق عبداللہ کے سامنے ان کے کام متعین تھے۔ انھیں سب سے پہلے تو خفیہ اور کھلے ہوئے علیحدگی پسندوں کے خوابوں کو توڑنا تھا، اس کے بعد بدعنوانیاں تھیں جوان کے بامروت باپ کے سایے میں بڑھ گئی تھیں اور ظاہر ہے کہ مرکز کے ساتھ ریاست کے تعلقات کا ازلی مسئلہ تھا جو اس وقت ری سیٹلمنٹ بل کی وجہ سے اور بھی زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ اس بل کے ذریعے شیخ عبداللہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کو واپس آنے اور اصل وطن میں بسنے کا حق دلانا چاہتے تھے۔ دہلی کا خیال تھا کہ یہ بل پاکستان میں تربیت یافتہ جاسوسوں اور تخریب کاروں کے لیے ایک دعوت نامہ بن جائے گا اس لیے اس نے اپنی منظوری نہیں دی۔ عام تاثر یہ تھا کہ غیر یقینی اور ناتجربہ

کار اور باپ کی رہنمائی سے محروم فاروق عبداللہ اپنے عمل میں محتاط رہیں گے۔ خوب صورت، جوان، گولف کھیلنے والے، مغربی تہذیب میں پروان چڑھے ہوئے بیٹے نے، جس نے ایک ریاست ایک عظیم باپ سے ورثے میں پائی تھی، اُن تمام مشاہدین کو حیرت میں ڈال دیا جو کناروں پر کھڑے انتظار کر رہے تھے کہ وہ کب لڑکھڑائے اور کب پھسلے۔ فاروق عبداللہ نے بہت جلد یہ ظاہر کر دیا کہ وہ کس قسم کے وزیر اعلیٰ ہوں گے۔ ڈرامائی، کھلا ہوا، صاف گو، نڈر اور عوام سے ایک مسلسل رابطے میں۔ فاروق عبداللہ مسند سے اُتر آئے اور سچ مچ ایک موٹر سائیکل پر سوار ہو گئے۔ کوئی محافظ علم شاذ ہی ان کے ساتھ ہوتا۔ اکثر یہ منظر دیکھنے کو ملتا کہ وہ سری نگر کی سڑکوں پر، اپنے تین بچوں میں سے کسی ایک کو موٹر سائیکل پر بٹھائے، پیراکی کے لیے ڈل جھیل کی طرف رواں دواں ہیں۔ یا وزیر اعلیٰ خود اپنی کار چلا رہے ہوں، دفعتاً رکیں اور ٹریفک کے کسی پولیس والے کو تنبیہ کریں کہ گاڑیوں کی بھیڑ کو جلدی ختم کراؤ۔ انھوں نے اختیارات کے استعمال میں احساس ذمہ داری کو مجروح کیے بغیر اپنائیت کا ایک تفریحی عنصر پیدا کر دیا۔ ان کے نکتہ چینوں نے ظاہر ہے کہ یہ سب دیکھ کر انھیں آوارہ یا پلے بوائے کہہ کر ان کی مذمت شروع کی اور کہنا شروع کیا کہ ایسے آدمی پر ایک ایسے عظیم ورثے کی نگہداشت کے سلسلے میں بھروسہ نہیں کیا جا سکتا مگر انھوں نے اپنے مخالفین کو بہت جلد یہ دکھا دیا کہ انھوں نے جب کوئی سیاسی فیصلہ لیا تو نہ صرف یہ کہ سمجھ دار اور ذہین ثابت ہوئے بلکہ وہ سنگ دل بھی نکلے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے تعریف و تحسین بھی حاصل کی۔

حکومت میں آنے کے بعد انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ ان تمام وزراء کو سبک دوش کر دیا، جو شیخ عبداللہ کی شفیق نظروں کے نیچے "بہت اہم" بن گئے تھے۔ فاروق عبداللہ کے اس فعل سے متعلقہ افراد کو دھکا بھی لگا تھا اور وہ خوف زدہ بھی ہو گئے تھے۔ انھوں نے ساری کابینہ کو بدل کر ان لوگوں کو اس میں رکھا جن پر وہ اعتماد کر سکتے تھے۔ اس کارروائی کا نتیجہ یہ تھا کہ ڈی ڈی ٹھاکر جیسے پرانے "سپاہی" وزارت کے مانوس عیش سے محروم ہو گئے۔ جن لوگوں نے بدعنوانیوں میں اپنا نام پیدا کر لیا تھا ان کو بہت جان بوجھ کر اور سختی کے ساتھ عہدوں سے الگ رکھا گیا۔ ان سب کے علاوہ پاکستان دوست تنظیمیں تھیں جن سے نبٹنا تھا۔ فاروق عبداللہ نے اعلانیہ ان سب کو تنبیہ کی کہ وہ شرانگیزی سے باز آ جائیں پھر انھوں نے یہ بھی تجویز رکھی کہ اگر انھیں تمام پارٹیوں کا تعاون حاصل ہو جائے تو وہ ان گروہوں پر پابندی بھی لگا سکتے ہیں۔ جہاں تک دہلی سے تعلقات کا معاملہ تھا، نئے وزیر اعلیٰ نہرو خاندان سے بہترین ذاتی رابطہ رکھتے تھے۔ وہ مسز اندرا گاندھی کو "ممی" کہتے تھے اور راجیو گاندھی کے بہت اچھے دوست تھے انھوں نے اس ذاتی تعلق کو سیاسی اتحاد میں بدلنے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر نہ صرف یہ کہ وہ سری نگر کے ہوائی اڈے

پر راجیو گاندھی کو الوداع کہیں گے بلکہ اس بات کا بھی انھوں نے ہمیشہ خیال رکھا کہ وہ جو فیصلے لے رہے تھے ان سے بھی دلی کو باخبر رکھا جائے۔ تاکہ کسی قسم کے شک و شبہے کی کوئی بنیاد نہ رہ جائے اور آخر میں، اپنے بہنوئی جی ایم شاہ کے ساتھ خاندانی جھگڑا تھا۔ شاہ نے پیش کش کی کہ اگر انھیں نائب وزیر اعلیٰ بنا دیا جائے تو خفگی اور ناراضگی کے جو دورے ان پر پڑتے رہتے ہیں وہ نہیں پڑیں گے۔ مگر فاروق عبداللہ نے فیصلہ کیا کہ وہ ان پر اعتبار نہیں کر سکتے، جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ وزیر اعلیٰ درست تھے۔

دونوں اشخاص کے درمیان سیاسی عناد کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔ فاروق عبداللہ نے ایک ملاقات میں مصنف کو بتایا کہ "میرے والد کو ہمیشہ یہ احساس رہا کہ انھوں نے میری بہن کی شادی جی ایم شاہ سے کر کے سب سے بڑی غلطی کی اور یہ کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس کی تلافی کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ (میرے اور شاہ کے درمیان) علیحدگی اسی وقت ہوئی جب میں پارٹی کا صدر ہوا اور آخر میں وزیر بنا دیا گیا۔ یہی وقت تھا جب شاہ نے کابینہ سے استعفیٰ دیا۔ میری بہن بہر حال والد سے ملنے ہمارے گھر آتی رہی، والد کے انتقال کے بعد بھی وہ والدہ سے ملنے کبھی کبھی گھر آتی تھی، مگر مجھ سے اس کے بہت کم تعلقات تھے، کیوں کہ وہ سمجھتی تھی کہ میں نے اس کے شوہر کے سر سے تاج اتارا ہے۔" ہندوستانی جمہوریت کی مسحور کن اور اشخاص کی بنیاد پر بنی ہوئی دنیا میں یہ چیزیں نہ صرف یہ کہ اہمیت رکھتی ہیں بلکہ، جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ بسا اوقات ایک ریاست کے مقدر کی فیصل و ثالث بن جاتی ہیں۔

مسز گاندھی کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایک وزیر اعظم ہے جس کی بنیادی ذمہ داری ملک کی یک جہتی اور اس کا دفاع ہے اور شیخ عبداللہ اور ان کے خاندان کے مابین قابلِ قبول تعلقات کس طرح استوار رکھیں۔ مزید یہ کہ صدر کی حیثیت سے اس پارٹی کے مفادات کا بھی تحفظ کریں، جو درحقیقت اب ان کے نام سے (کانگریس۔اندرا) وابستہ ہو گئی تھی۔ ۱۹۸۲ء میں ایک فاروق عبداللہ کی حکومت، ہر لحاظ سے کشمیر کے تحفظ اور اس کی سلامتی کے لیے لازمی تھی۔

مگر کیا یہ سمجھنا چاہیے کہ ریاست کے سامنے صرف یہی ایک واحد طریقہ تھا؟ کیا (مسز گاندھی) اپنی پارٹی کو آگے بڑھانے اور ایک جمہوری نظام میں ایک جائز کوشش، انتخابات کو جیتنے کے، ایک سیاسی لیڈر کے فطری حق کو چھوڑ سکتی تھیں، یا انھیں اس حق سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ اس مشکل کا ایک حل شیخ عبداللہ نے تجویز کیا تھا کہ نیشنل کانفرنس جموں اور کشمیر میں کانگریس کی ایک الحاقی پارٹی ہو جائے مگر مسز اندرا گاندھی نے اس میں بھی خطرات دیکھے۔ فرض کیجیے کہ الحاقی پارٹی، قومی یک جہتی اور اتحاد کے مقصد سے انحراف کر دیتی ہے، کیا یہ ضروری نہیں تھا کہ کانگریس ریاست میں اپنا ایک وجود قائم رکھے تاکہ ایسی کسی صورت میں وہ صورت حالات کو سنبھال لے؟ اسی لیے

مسز گاندھی اس صورت حال کو قبول نہیں کر سکتی تھیں کہ کانگریس کشمیر کو کانفرنس کے لیے چھوڑ دے۔ خود شیخ عبداللہ کی زندگی میں انھوں نے اپنی پارٹی کے فروغ و استحکام کے لیے ریاست کے دورے کیے۔ پھر وہ اتنی ظرف کی بھی نہیں تھیں کہ شیخ عبداللہ کے سیکولرزم پر نکتہ چینی نہ کرتیں۔ مثال کے طور پر اپریل ۱۹۸۱ء میں انھوں نے جموں کے ہندوؤں کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا جو ایک مسلم اکثریت والی ریاست میں عدم تحفظ کے مسائل کا سامنا کر رہے تھے۔ انڈین اکسپریس کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے شیخ عبداللہ نے یہ مانا تھا کہ یہ اندازِ گفتگو، پارٹی کے مفادات کے پیشِ نظر لڑی جانے والی لڑائی کا حصّہ ہے مگر ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ "پارٹیوں کی باہمی لڑائی کو ہمارے قومی مفادات کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیے ...... میرے اجداد ہندو تھے۔ کشمیر میں ہم سب کا خون ایک ہے۔ ہم سب بھائی ہیں اور بدستور ایک تہذیب کے وارث ہیں اس لیے ایسی بات ہم سب کو حیرت میں ڈال دیتی ہے اور اگر ایک ملک کا وزیر اعظم ایسے الزامات لگاتا ہے تو ریاست کے باہر کے لوگ انھیں سنجیدگی سے لیں گے۔"

شیخ عبداللہ اور ان کے خاندان سے متعلق افراد کے ذہنوں میں یہ بات ہمیشہ رہی کہ کوئی مضائقہ نہیں وہ چاہے جتنی بار اس بات پر احتجاج کریں مگر پاکستان کی طرف "نرم" رویے اور خُفیہ طور پر علیحدگی پسند لیڈروں کے ساز باز رکھنے کے الزام کے ہدف وہ کسی وقت بھی بنائے جا سکتے ہیں وہ جانتے تھے کہ دلی جب بھی انھیں جھکانا چاہے گی یہ الزام سر اٹھائے گا اور اگر ضروری سمجھا گیا تو ایسے بہانے کو حکومت کو برخاست کرنے کے لیے بھی استعمال کرنے سے گریز نہ کیا جائے گا۔ غدّاری کا الزام سنتے سنتے شیخ عبداللہ نے اپنی عمر بتادی اس کا جواب صرف ان کے ذاتی یقین اور خود اعتمادی میں تھا بہر حال آخر میں وہ ان الزامات سے بری کر دیے گئے۔ فاروق عبداللہ بھی جانتے تھے کہ یہ محض وقت کی دیر سویر ہے نہیں تو متعدد دشمن قوتیں انھیں بھی بدنام کرنے کی تحریک شروع کر دیں گی۔ مین اپنی فطرت کے مطابق انھوں نے اس مسئلے کا مقابلہ دو بدو کرنے کا فیصلہ کیا۔ شیخ عبداللہ نے، بیٹے کی رائے کے مطابق، ایک غلطی یہ کی تھی کہ اپنے آپ کو کم و بیش خود اپنی ریاست تک محدود کر رکھا تھا؛ فاروق عبداللہ نے طے کیا کہ وہ سارے ملک میں ذاتی اور سیاسی روابط قائم کریں گے۔ وہ صرف مسز اندرا گاندھی کو نہیں سارے ملک کو اپنی وفاداری کا یقین دلائیں گے۔ اگر وہ ملک کے لوگوں اور یہاں کی سیاسی پارٹیوں کے ذہنوں کو اس سلسلے میں صاف کر سکے تو انھیں صرف ایک پارٹی کانگریس کی خیر سگالی پر کم انحصار کرنا ہوگا۔ اس کے بعد اگر کبھی انھیں علیحدگی پسند کہا گیا تو انھیں توقع تھی کہ ایک واحد طاقت ور آواز سے زیادہ آوازیں اٹھیں گی جو یہ کہیں گی یہ الزام

ایک جانب دارانہ دھوکا دھڑی ہے جو قوت کے غیر اخلاقی کھیل کی پردہ پوشی کے لیے گھڑا جا رہا ہے۔

فاروق عبداللہ نے تمام فرقہ پرست جماعتوں پر، وہ چاہے ہندو ہوں یا مسلمان، پابندی لگائے جانے کی مانگ شروع کی۔ اس خیال کو خوش آمدید کہنا تو دور کی بات ہے کانگریس اس خیال ہی سے پیچھے ہٹ گئی۔ 'مین اسٹریم' کے ایڈیٹر اور ایک صحافی نکھل چکرورتی جنھوں نے کشمیر کے مسئلے کا عقلی اور آزادانہ مطالعہ کیا ہے کہا ہے کہ "سیکولر ہونے کا دعویٰ کرنے والی پارٹیاں، کانگریس بھی اور کمیونسٹ بھی ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں برسر اقتدار ہیں۔ یہ کیسی بات ہے کہ انھوں نے ابھی تک، فرقہ پرست تنظیموں پر پابندی لگانے کے فاروق عبداللہ کے مطالبے کی پرجوش حمایت نہیں کی ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز جموں اور کشمیر میں فاروق عبداللہ کی اس تجویز پر کانگریس (اندرا) کے لیڈروں کا اگر بالکل گھٹا ہوا نہیں تو دبا دبا ردعمل ہے۔ کانگریس کے ردعمل کے گھٹے ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے خود نیشنل کانفرنس کی حکومت کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی خاطر، فرقہ پرست تنظیموں کو استعمال کرنے سے پرہیز نہیں کیا اور اب بھی وہ اس حربے کو ترک کرنا نہیں چاہتی ہے۔ انتخابات جو آخری دفعہ ۱۹۷۷ء میں ہوئے تھے، بہرحال ۱۹۸۳ء میں پھر ہونے ہیں۔

کشمیر کے کانگریسیوں کے سامنے ایک اور مسئلہ بھی تھا۔ وہ ۱۹۷۵ء سے حکومت سے الگ تھلگ رہے تھے، اور اب جب کہ شیخ عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا اگر ان کے بیٹے کو اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی اجازت دے دی گئی تو پھر ان کے سامنے بے سمتی اور بے کاری کی ایک اور طویل مدت منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ اسی لیے وہ صرف الیکشن لڑنے کے ہی نہیں بلکہ کافی نشستیں حاصل کرنے کے خواہش مند تھے تاکہ وہ نیشنل کانفرنس کے ممبروں کو توڑ کر اپنے ساتھ شامل کر کے حکومت بنا سکیں۔ (کانگریس خود براہ راست حکومت بنانے کی توقع کبھی نہیں کر سکتی تھی)۔ صرف ایک پرانے اور اہم کانگریسی لیڈر تھے جنھوں نے اس انداز فکر کی مخالفت کی اور وہ تھے سید میر قاسم جنھوں نے شیخ عبداللہ کے لیے راہ ہموار کرنے کی خاطر وزارت اعلیٰ کی کرسی چھوڑی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان کی فلاح اور کشمیر کی خوش حالی کے لیے ضروری ہے کہ فاروق عبداللہ کو، اگر وہ الیکشن میں جیت جائیں تو بغیر کسی مزاحمت کے حکومت کرنے کا موقع دیا جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ کانفرنس اور کانگریس کا اتحاد چاہتے تھے، چاہے یہ ان کی اپنی ہی پارٹی کی قیمت پر قائم ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ کانگریس کو، قومی مفاد کے پیش نظر اتنی قربانی تو کرنا ہی چاہیے۔ مگر کوئی سن نہیں رہا تھا۔

۱۸ جون ۱۹۸۳ کو میر قاسم نے مسز اندرا گاندھی کو لکھا۔ "آپ میری اُن کوششوں سے اچھی طرح واقف ہیں جو

میں نے اپنے حقیر طریقے پر (۱۹۷۵ء میں) شیخ عبداللہ کے ساتھ ہونے والے اس تاریخی معاہدے کی تکمیل کے عمل کو تیز تر کرنے کے سلسلے میں کی تھیں جس نے دنیا کے سامنے ہندوستان کی جمہوریت کی اختلاف کو برداشت کرنے اور مشکل ترین مسائل کے دوستانہ حل ڈھونڈنے کی فطری صلاحیت اور توانائی کو آشکارا کر دیا تھا...... ایک حلقے نے، کانگریس (اندرا) کا اس نئی صورت حال سے مطمئن ہونا دشوار سمجھا۔ یہ حلقہ حکومت سے چپکا رہنا چاہتا تھا اور شاید اس نے کبھی بھی وسیع تر قومی مفادات کے پیش نظر حکومت سے الگ رہنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میر قاسم کی نظر میں یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے اتحاد کے موقع کو گنوا دینے کا شعوری اہتمام کیا۔

میر قاسم کی اس تحریر کا جواب دیتے ہوئے مسز اندرا گاندھی نے لکھا "میرے نزدیک (۱۹۷۵) کا معاہدہ ریاست کی تمام سیکولر اور محب وطن قوتوں کے درمیان تعاون کا ایک موثر اور بار آور طریقہ پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ اس کا یہ مطلب یقیناً نہیں تھا کہ کانگریس گوشہ گمنامی میں چلی جائے۔ میں نے معاہدے کی یہ تاویل نہ کبھی مانی تھی اور نہ اب مان سکتی ہوں مگر آپ کا نقطۂ نظر یہی معلوم ہوتا ہے، اور برا یہ ہوا کہ آپ پہلے شیخ عبداللہ اور ان کے بعد فاروق عبداللہ سے اپنے نقطۂ نظر کو منوانے میں کامیاب ہوئے۔ نیشنل کانفرنس میں حکمرانی کی بددماغی کے پس پشت یہی بات ہے۔"

ٹھیک ہے، مگر یہ بددماغی عوامی خواہش اور عوامی ارادے کی بنیاد پر تھی۔ فاروق عبداللہ اور ان کی ماں بیگم اکبر جہاں دونوں جانتے تھے کہ وہ کانگریس کی امداد کے بغیر الیکشن جیت سکتے ہیں۔ اتحاد تو بعد کی امکانی سازباز اور جعل سازیوں سے تحفظ کے لیے بیمے کی ایک پالیسی تھا۔ مگر کانگریس نے ایک قیمت مانگی اور جو بہت زیادہ تھی۔ فاروق عبداللہ کسی ایسے معاہدے یا مفاہمت کو نہیں منظور کریں گے جو اسمبلی میں نیشنل کانفرنس کی زبردست اکثریت کو یقینی نہ بناتی ہو۔ دھوکا دہی اور غداری کی یادیں ابھی تازہ تھیں۔ کانگریس سے ہونے والے مذاکرات ختم ہو گئے۔ طرفین ۵ جون ۱۹۸۳ء کو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے پر تل گئے۔ عفو و درگزر کی نہ تو کسی نے درخواست کی، اور نہ ہی کسی نے کیا۔ کانگریس نے وہ تمام قوت استعمال کی جو اس کے قبضۂ قدرت میں تھی اور یہ قوت اس کے پاس بہت تھی۔ ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی ہونے کی وجہ سے بھی اور مرکزی حکومت کے وسائل کی موجودگی کی وجہ سے بھی۔ چھوٹی پارٹیاں، جو اپنے بل بوتے پر ایک نشست بھی نہیں جیت سکتی تھیں مگر ایک دو حلقہ ہائے انتخاب میں بڑی موثر حمایت دے سکتی تھیں، انھیں خوب لالچ دی گئی۔ اس سارے عمل میں فاروق عبداللہ کو ایک ایسے خاندان کی طرف سے تعاون ملا جو شیخ عبداللہ کے خاندان کا پچھلے پچاس سال سے شدید دشمن رہا تھا۔ یہ خاندان تھا ایک مذہبی لیڈر مولانا یوسف شاہ کا، جو تیسری دہائی میں اس وقت بھی شیخ عبداللہ کے دشمن تھے جب دونوں مسلم کانفرنس میں تھے۔ جب شیخ عبداللہ نے نیشنل کانفرنس

شروع کی تو اس وقت بھی کٹر بنیاد پرست مولانا نے، مسلم کانفرنس کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے رکھی اور بعد کو وہ کچھ دنوں کے لیے پاکستانی مقبوضہ کشمیر بھی گئے۔ مگر شیخ عبداللہؒ کے کشمیر میں وہ طنز و مزاح کا ایک موضوع تھے۔ شیخ کا لقب شیر تھا، مولانا کی عرفیت بکری پڑ گئی تھی۔ مولانا کے وارث میر واعظ فاروق کا بہت دنوں موقف یہ رہا کہ کشمیر پاکستان کو دے دیا جانا چاہیے۔ مگر، ۱۹۷۷ء میں انھوں نے جنتا پارٹی میں شامل ہونے کے لیے اپنے اس خیال کو اعلانیہ ترک کر دیا۔ ۱۹۸۳ء کے انتخابات سے قبل عبداللہؒ خاندان سے ان کی معروف دشمنی کی وجہ سے کانگریس نے میر واعظ کو بہت لالچ دیئے اور ان کی بہت ہمت افزائی کی مگر انھوں نے کانگریس کی بجائے فاروق عبداللہ کی حمایت کا اعلان کر کے سبھوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

فاروق عبداللہ نے اگر کوئی غلطی کی تو وہ اس وقت جب انھوں نے اپنی والدہ جو خاندان میں تفرقہ نہیں چاہتی تھیں، کے زور ڈالنے پر امیدواروں کی فہرست میں شامل کرنے کے لیے جی ایم شاہ کے تجویز کیے ہوئے بارہ ناموں کو مان لیا۔ ان ناموں کا اعلان انھوں نے ۲۹۔ اپریل کے ایک بہت بڑے جلسۂ عام میں کیا۔ مجمعے کو اس بات پر دھکا سا لگا کہ شاہ کے وفادار ابھی ختم نہیں ہوئے۔ لوگوں کا ردّ عمل ظاہر ہوا جب یہ نام سنائے جا رہے تھے، اس وقت انھوں نے شور کیا انھوں نے ڈائس پر چپلیں اور جوتے پھینکے۔ آئندہ چل کر یہ غلطی بڑی مہنگی ثابت ہوگی۔ شاہ نے مستقبل کے اپنے ارادوں کو راز میں نہیں رکھا۔ صرف یہی نہیں کہ انھوں نے کانفرنس کے امیدواروں کے لیے کوئی کام نہیں کیا بلکہ انھوں نے الکیشن کی مہم جب اپنے عروج پر تھی، اس وقت سری نگر میں کانگریسی لیڈروں سے ملاقات کی۔ دوسری طرف جموں میں مسز اندرا گاندھی نے بڑے واضح طور پر ہندو موافق جھکاؤ کے ساتھ ایک جارحانہ انتخابی مہم چلائی ان کا یہ جھکاؤ اس مفروضے پر (اور صحیح طور پر) تھا کہ وادی میں انھیں مسلمانوں کے ووٹ ملنے کا کوئی امکان نہیں اس لیے انھیں میدانی علاقوں کے ہندوؤں کے ووٹوں پر اپنی توجہ مرکوز کرنا چاہیے۔ فاروق عبداللہ نے اپنے اُس باپ کے وارث اور جانشیں کی حیثیت سے مہم چلائی جو کشمیری مسلمان اور ہندوستانی سیکولرزم دونوں کا محافظ تھا ان کے والد کا دیا ہوا "مسلم، ہندو، سکھ اتحاد" کا نعرہ بار بار دہرایا جا رہا تھا۔ انھوں نے عوام کو یاد دلایا کہ شیخ عبداللہؒ نے اپنی وصیت میں کشمیریوں سے اپیل کی ہے کہ "وہ نیشنل کانفرنس کے قلعے" کی ہمیشہ حفاظت کریں ان کے ایک انتخابی کتابچے میں کانگریس کو مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ دونوں نے کشمیر کو 'غلام' بنایا تھا۔ فاروق عبداللہ نے کہا کہ "ان قوتوں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ شیخ عبداللہ نے یہ کام میرے ذمے اپنی زندگی ہی میں کیا تھا۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر فاروق عبداللہ کو اسی لمحے روکا نہ گیا تو کل وہ ایک دوسرا شیخ عبداللہ بن جائے گا اور ریاست کے عوام کو،

ریاست کی خود مختاری، عزت نفس اور ایک خصوصی تشخص کے سبق پڑھائے گا۔ تولین سنگھ نے روزنامہ ٹیلیگراف میں ایک ایسے وزیر اعلیٰ کے جو انگلستان میں رہا تھا، انفرادی انداز کے بارے میں لکھا ہے "ڈاکٹر عبداللہ جین ٹی شرٹ، انگریزی برساتی اور آرمی بوٹ پہنتے ہیں۔ جس قسم کا استقبال ان کا ہوتا ہے ویسا شاید باقی ہندوستان میں کسی سیاست دان کا نہیں ہوتا۔ جب وہ آتے ہیں تو وہ (ان کے حمایتی) زبردستی انھیں گاڑی سے نیچے اتار لیتے ہیں اور سب کے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اسٹیج پر بس یوں سمجھیے کہ لوگ انھیں اٹھا کر پہنچا دیتے ہیں۔ اگر وہاں اسٹیج نہیں ہے تو وہ اپنی ایمبیسڈر کی چھت پر چڑھ جاتے ہیں اور میگافون کی مدد سے تقریر کرتے ہیں۔ وہ ان سے کشمیری زبان میں بات کرتے ہیں، مذاق کرتے ہیں، چٹکلے سناتے ہیں، ان سے نعرے لگانے کو کہتے ہیں اور انھیں بتاتے ہیں کہ یہ بات بہت اہم ہے کہ وہ سب لوگ ۵ جون کو گھر سے جلدی نکلیں اور اپنا ووٹ ڈالیں۔"[۸]

الیکشن کے نتائج نے ثابت کر دیا کہ نیشنل کانفرنس کا قلعہ بالکل محفوظ و مستحکم ہے۔ فاروق عبداللہ نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ اگرچہ جموں میں کانگریس نے اچھی کامیابیاں حاصل کیں۔ بہرحال جموں میں بھی نیشنل کانفرنس نے ۱۹۷۷ء میں شیخ عبداللہ نے جتنی نشستیں جیتی تھیں ان سے زیادہ نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ جموں میں اسے اڑتیس فی صدی ووٹ ملے۔ یہ ۱۹۷۷ء کے مقابلے میں معتدبہ اضافہ ہے۔ الیکشن کا نتیجہ، پارٹی نے کہا شہادت ہے اس کے سیکولر کردار کی اور ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ پارٹی صرف کشمیری مسلمانوں کی نہیں ہے۔

جماعت اسلامی نے ۳۵ امیدوار کھڑے کیے تھے۔ اس کا نقطہ نظر بالکل غیر مبہم تھا۔ "کشمیر میں ہندوستان ایک قابض قوت" ہے اور نیشنل کانفرنس کے لیڈر "ہندوستانی کتے"۔ انھوں نے کہا ہمارا قائد رسول اللہؐ، اور لوگوں سے اپیل کی کہ وہ انھیں ووٹ دیں تاکہ وہ کشمیر میں اسلامی نظام کے قیام کو یقینی بنا سکیں۔ الیکشن میں جماعت اسلامی کا صفایا ہو گیا۔

مگر کانگریس اپنی شکست تسلیم نہیں کرے گی اس نے ذرائع ابلاغ پر اپنے اثر اور اپنے کنٹرول کی مدد سے یہ تاثر پھیلایا تھا کہ یہ الیکشن جیتنے جا رہی ہے، اب اس نے دعویٰ کرنا شروع کیا کہ نیشنل کانفرنس نے دھوکا دیا اور تشدد اور بے ایمانی سے الیکشن میں کامیابی حاصل کی۔ دہلی میں حکومت ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ دن تو یہ الزام موضوع بحث بنا رہا، مگر کچھ عرصہ بعد اپنی موت آپ مر گیا۔ مگر یہ صاف تھا کہ کانگریس اور کانفرنس کے درمیان لڑائی جاری رہے گی۔

الیکشن میں فتح حاصل کرنے کے بعد سری نگر کی جامع مسجد میں نمازیوں کو خطاب کرتے ہوئے فاروق

عبداللہ نے کہا کہ کانگریس (اندرا) سے ان کی لڑائی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے " میں ان سے گلی اور کوچوں میں، اور ملک کے ہر کونے میں لڑوں گا - میری آزمائش پوری ہو چکی - مگر انھیں (ملک کے باقی حصوں میں) ابھی جلد ہی رائے دہندگان کے سامنے جانا ہے ۔ دیکھنا ہے کہ وہ کیا کامیابیاں حاصل کرتی ہے " انھوں نے مزید کہا کہ وہ حزبِ اختلاف کی ان پارٹیوں سے قریبی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کریں گے جو" ہم پر وقت پڑنے پر یہاں آئیں اور ہمارے ساتھ کھڑی ہوئیں - ایچ این بہوگنا اور بیجو پٹنائک جیسے حزب اختلاف کے اہم لیڈروں نے نیشنل کانفرنس کی انتخابی مہم میں عملی طور پر شرکت کی تھی۔

مسز گاندھی سے مقابلہ (تنازعہ) صحیح معنوں میں ۲۸ رمئی ۱۹۸۲ء کو شروع ہوا۔ اسی روز جنوبی ہندوستان کے شہر وجے واڑہ میں، این ٹی راما راؤ نے، جو اب فلمی اداکار کے بجائے سیاست داں بن گئے تھے، سارے ملک کے حزب اختلاف کے لیڈروں کی ایک میٹنگ بلائی۔ میٹنگ کا بظاہر مقصد، مرکز اور ریاستوں کے باہمی تعلقات کے مسائل کو حل کرنے کے لیے مشترکہ جدوجہد شروع کرنا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس امید کی بھی لو جھلملاتی تھی کہ یہ میٹنگ شاید اگلے عام انتخابات میں کانگریس کے خلاف ایک متحدہ محاذ کی تشکیل کی طرف بھی رہنمائی کر دے۔
۲۸ مئی کو، اگرچہ خود ان کی ریاست میں انتخابی مہم اپنے عروج پر تھی - فاروق عبداللہ وجے واڑہ میں موجود تھے۔ مسز اندرا گاندھی نے جو اس وقت اپنی انتخابی مہم کے سلسلے میں جموں اور کشمیر میں تھیں برملا احتجاج کیا کہ فاروق عبداللہ "میرے دشمنوں" سے ہاتھ ملا رہے ہیں ان کے اس احتجاج کے پیچھے ایک حقیقی وجہ تھی، درحقیقت فاروق عبداللہ نے کوئی ایسی بات کی بھی تھی جو خود ان کے والد صاحب نے کبھی نہیں کی۔ شیخ عبداللہ نے اُن لوگوں کے باہمی مسائل کی نوعیت چاہے جو ہو ہمیشہ یہ موقف اختیار کیا کہ نہرو خاندان کی باقی تمام ملک میں حمایت کی جانا چاہیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شیخ ایک سودا کرنا چاہتے تھے۔ نہرو کا خاندان ہندوستان کو رکھ سکتا ہے اگر وہ عبداللہ کے خاندان کو کشمیر دے دے۔ ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۰ء کے دونوں عام انتخابات میں شیخ عبداللہ نے مسز گاندھی کی حمایت کی۔ مگر فاروق عبداللہ کو اپنے انڈوں کے لیے ایک ٹوکری سے زیادہ کی ضرورت تھی اور اسی وجہ سے وہ وجے واڑہ میں ان تین وزرائے اعلیٰ اور گیارہ اہم پارٹی لیڈروں میں تھے جنھوں نے کانگریس (اندرا) پر ملک کو تباہ کرنے کا الزام لگایا اور انھوں نے وہاں یہ وعدہ بھی کیا کہ اس سلسلے کی تیسری میٹنگ سری نگر میں ہو گی جہاں وہ اس کی میزبانی کریں گے۔

کانگریس نے حزب اختلاف کی پارٹیوں کے درمیان اس پنپتے ہوئے اتحاد کو توڑنے کی بڑی سرگرم

کوشش کی۔ تامل ناڈو کے وزیر اعلیٰ ایم جی راما چندرن نے جو دِہ جے واڑہ میں موجود تھے، کانگریس کے ساتھ کچھ ساز باز کی اور حزب اختلاف کا ساتھ دینے سے منکر ہو گئے۔ اس مجوزہ میٹنگ کو منسوخ کرنے کے لیے فاروق عبداللہ پر بہت دباؤ ڈالا گیا مگر انھوں نے سوچا کہ وہ اپنے "بھائیوں" کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ اور اکتوبر کے پہلے ہفتے میں مسز اندرا گاندھی کے مخالف ہندوستانی لیڈر سری نگر میں جمع ہوئے۔ ان کا یہ اجتماع باہمی اتحاد کا ایک مظاہرہ بھی تھا اور ساتھ ہی یہ ایک کوشش بھی تھی مرکز اور ریاستوں کے درمیان اختیارات کے توازن میں تبدیلی کا مطالبہ کرنے کی۔

ردِّ عمل فوری طور پر سامنے آیا۔ فاروق کے حامیوں کو توڑ کر انھیں وزارت اعلیٰ کے عہدے سے ہٹانے کے منصوبے پر عمل شروع ہو گیا۔ جی ایم شاہ سے کہا گیا کہ وہ اپنے خرگوشوں کو نیشنل کانفرنس کے ہیٹ سے نکال لیں۔ اندازہ یہ ہوا کہ یہ کام جتنا آسان سمجھا گیا تھا وہ اتنا تھا نہیں۔ بالکل اسی قسم کے خطرات کا اندازہ کر کے شیخ عبداللہ نے دَل بدلی کے خلاف ریپریزنٹیشن آف دی پیپلز ایکٹ پاس کرایا تھا۔ صرف ایک خالص تکنیکی جواز تھا جس کی مدد سے اس قانون کو جھانسا دیا جا سکتا تھا اور وہ تھا "دَل بدلو" کی تعریف۔ مگر یہاں بھی ایک ایسے گورنر کی ضرورت تھی جو کسی وزیر اعلیٰ کو برطرف کرنے کے لیے حقیقت کی طرف بڑا متزلزل رویّہ رکھتا ہو۔ اکتوبر ۱۹۸۳ میں جموں و کشمیر کا گورنر وہ شخص تھا جو شیخ عبداللہ اور پنڈت نہرو کے ساتھ دہلی میں فلم "دی ریزرس ایج" دیکھنے گیا تھا، یعنی بی کے نہرو۔ وہ ایسی قابل اعتراض حکمت عملی میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ جو کچھ ہو رہا تھا اس سے واقف ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بہنوئی کا بہت خیال رکھ چکے۔ ۶ر اکتوبر کو نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے جی ایم شاہ کو پارٹی سے نکال دیا۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر کانگریس (اندرا) نے اس مانوس الزام کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر دی کہ فاروق عبداللہ ان عناصر کے ساتھ ساز باز میں ملوّث تھے جو ہندوستان کو برباد کرنا چاہتے ہیں۔ کانگریس کے لیڈروں نے (جن میں مسز اندرا گاندھی اور ان کے بیٹے بھی شامل تھے) یہ کہا کہ سکھ انتہا پسند، مسلح جنگ کے فن کی تربیت کشمیر میں حاصل کر رہے ہیں۔ اس کی کوئی شہادت کبھی نہیں ملی۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۴ء میں، فوجی کارروائی کے بعد، حکومت نے پنجاب سے متعلق جو قرطاسِ ابیض شائع کیا تھا وہ بھی یہ ثابت نہ کر سکا کہ فاروق عبداللہ سکھ انتہا پسند لیڈروں سے کوئی رابطہ رکھتے ہیں۔ مگر حکومت کے ماتحت ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے یہ بات سارے ملک میں پھیلا دی۔ ۱۳ر اکتوبر ۱۹۸۳ء کو سری نگر میں ہونے والے، ویسٹ انڈیز اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ میچ کے ایک

واقعے کو بڑھا چڑھا کر ایک بڑا اسکنڈل بنا دیا گیا۔ پاکستان دوست طالب علموں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے میچ کے ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسٹیڈیم کے ایک کونے میں ہندوستان مخالف نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ڈاکٹر عبداللہ کو ندامت تھی، انھوں نے سوپور میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "اس واقعے پر ہمارے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔" مگر بجائے اس کے کہ یہ کہا جاتا کہ فاروق عبداللہ ایک ایسے شخص تھے جو ایسی منفی طاقتوں کا مقابلہ کر سکتے تھے اور ان پر قابو پا سکتے تھے، سرکاری ذرائع ابلاغ نے یہ تاثر پیدا کر دیا کہ گویا وزیر اعلیٰ خود اس مظاہرے کے پس پشت تھے۔ اس حقیقت کا کہ اس واقعے کے بعد فاروق عبداللہ نے جماعت اسلامی کے خلاف خفگی اور مذمت کا ایک سلسلہ شروع کر دیا، شاذ ہی ذکر کیا گیا۔ نہ ہی ابلاغ کے ان سرکاری ذریعوں کے پاس کبھی اتنا وقت ہوا کہ وہ ملک کی یکجہتی اور اس کے اتحاد سے وفاداری کے فاروق عبداللہ کے اعلان کی خبریں نشر کریں بہر حال پھانسی پر لٹکانے سے پہلے فاروق عبداللہ کو برا نام تو دینا ہی تھا، اسی دوران پنجاب کا بحران بھی بھڑکنے والی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ گولڈن ٹمپل میں فوجی کارروائی پر مسز گاندھی کو ملک گیر پیمانے پر حمایت ملی۔ اسی سرمستی میں کسی کے دماغ میں یہ زبردست خیال آیا کہ ایک ہی تیر سے دوسرا شکار بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک بار پھر جی ایم شاہ کو سبز جھنڈی دکھائی گئی۔ مگر اس بار بہتر احتیاطی اقدامات کر لیے گئے تھے۔ بی کے نہرو کا تبادلہ گجرات میں کر دیا گیا تھا اور سری نگر میں ان کی جگہ ایک مطیع و فرماں بردار اشٹیڈیر میجر جنرل (ریٹائرڈ) جگ موہن کو گورنر بنا دیا گیا تھا۔

اسلامی کیلنڈر میں عید کا دن، انتہائی خوشی و مسرت کا دن ہے۔ روزوں، عبادات اور توبہ واستغفار کے متبرک ایک مہینے کے بعد آنے والا یہ دن ایک ایسا موقع ہوتا ہے جب مسلمان اخوت اور بھائی چارہ اور امن و مساوات کا جشن مناتے ہیں کہ یہ ان کے عقائد کی نظریاتی اساس ہے۔ دن کا آغاز شکرانے کی نماز سے ہوتا ہے جس کے بعد تمام مسلمان، سماجی حیثیت اور اقتصادی مرتبے کی تخصیص کیے بغیر ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کے گھروں پر جاتے ہیں اور خوشی و مسرت کی یہ تقریبات اگلے دن تک چلتی رہتی ہیں۔ اس دن غداری اور دھوکہ دھڑی کسی کے ذہن میں آخری خیال ہو سکتا ہے۔

مگر اس کے باوجود کوئی جواز نہیں تھا کہ فاروق عبداللہ اتنے لاپرواہ ہوتے جتنے کہ وہ ۳۰ جون ۱۹۸۴ کی عید کے دن تھے۔ ان کے خلاف سازش کا جال پھیلنا شروع ہو چکا تھا اور ایک زیادہ چوکنا وزیر اعلیٰ جو ہانڈی پک رہی تھی، اس کا بہتر علم رکھ سکتا تھا لیکن جس وقت یہ وزیر اعلیٰ دوستوں اور ساتھیوں سے گلے ملنے میں کھویا ہوا تھا۔ اس کے بہنوئی جی ایم شاہ چھری پر دھار رکھ رہے تھے۔ ایک بار پھر یہ سب کچھ رات کی تاریکی میں ہوا۔ یکم

جولائی، اتوار کے دن، نیشنل کانفرنس کے ایک حمایتی اور مشہور معمار شفیع شائر انے عید کے موقع پر ایک عشائیہ دیا۔ فاروق عبداللہ کے چھوٹے بھائی طارق عبداللہ سے جو اس وقت جی ایم شاہ کے ساتھ ہو چکے تھے، رہا نہ گیا اور انھوں نے مہمانوں کو بتایا کہ فاروق عبداللہ کے دوست بہت جلد ایک سبق پڑھیں گے۔ طارق عبداللہ کو کسی نے سنجیدگی سے نہیں لیا کہ تیزی اور غیر ذمہ داری ان کی عادت تھی اور وہ اکثر ایسی دھمکیاں دیتے رہتے تھے۔ اس رات پونے گیارہ بجے کام مکمل ہو گا۔ جموں اور کشمیر میں قانون ساز اسمبلی کے نیشنل کانفرنس کے بارہ ممبر اور ایک آزاد ممبر، شیخ عبداللہ کے خاندان سے قربت رکھنے والے ایک بزنس مین کے گھر پر جمع ہوئے۔ شب کے گیارہ بجنے کے کچھ بعد انھوں نے گورنر جگ موہن کو بتایا کہ وہ تیار ہیں۔ گورنر نے ان سے کہا کہ وہ علی الصباح ان کی سرکاری رہائش گاہ راج بھون آجائیں۔ انھیں ابھی کچھ اور انتظامات کرنے تھے ان میں سب سے اہم کام تھا فاروق عبداللہ کی برخواستگی کے بعد جب غم و غصے سے بھرے ہوئے عوام سڑکوں پر آئیں تو انھیں دبانے کے لیے نیم فوجی طاقتوں کو موقع پر بلانا۔

ایک ایسے منتخب وزیر اعلیٰ کے بارے میں جو آئینی طور پر ابھی اپنے عہدے پر فائز تھے، ایسے انتظامی فیصلے لینے کا حق گورنر کو کسی طرح بھی نہیں تھا۔ مگر اس رات قانون اور ضابطے مد نا ضل تھے۔ مقصد صرف یہ تھا کہ چاقو میٹھ میں اترنے کے بعد نظم و ضبط قائم رکھا جائے۔ جگ موہن کو دو اور اہم بیوروکریٹس کا تعاون حاصل تھا۔ ایک چیف سکریٹری نور محمد اور ڈائرکٹر جنرل آف پولیس پیر غلام حسن شاہ۔ یہ سرکاری افسران بھی، ایک وزیر اعلیٰ کی موجودگی میں گورنر سے احکامات لے کر ایک بالکل غیر قانونی بات کر رہے تھے۔ درحقیقت شاہ تو ۳۰ جون کو اپنی ملازمت سے ریٹائر ہو رہے تھے مگر فاروق عبداللہ نے ان کی مدت ملازمت میں دو سال کی توسیع کر دی تھی۔ شکر گزاری کے اظہار کا یہ ایک انوکھا طریقہ تھا۔

۲ جولائی کی صبح کو بہت سویرے ہی اہم حکام کو جگا کر یہ ہدایت کی گئی کہ وہ سری نگر ہوائی اڈے پر فوراً پہنچیں کیوں کہ وہاں کچھ خصوصی ہوائی جہاز جلدی ہی اترنے والے ہیں۔ ۶ بج کر ۵۴ منٹ پر، انڈین ایرلائنز سے لیا ہوا پہلا بوئنگ ۷۳۷، سری نگر کے ہوائی اڈے پر اترا اس کے مسافر مدھیہ پردیش اسپیشل آرمڈ پولیس کے افراد تھے۔ یہ ایک خصوصی پولیس ہے جسے ڈاکوؤں کے خلاف کارروائی کرنے کی خصوصی تربیت ملی ہے۔ ایک بار پھر، ان کی آمد بھی یکسر غیر آئینی تھی کیوں کہ اس کی ابھی منظوری منتخب کی ہوئی حکومت سے نہیں لی گئی تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ واحد شخص جو ان لوگوں کی یہاں موجودگی کی منظوری دے سکتا تھا، وہ تھا فاروق عبداللہ مگر اسپیشل

آرمڈ پولیس کے یہاں آنے کے بہت دیر بعد تک خود اسے اس کی خبر نہیں تھی۔

صبح کے کوئی ساڑھے پانچ بجے ہوں گے، فاروق عبداللہ ابھی سو ہی رہے تھے کہ چار کاریں گوپکار روڈ پر ان کے مکان کے سامنے سے گذریں جس میں، پارٹی چھوڑنے والے اور ایک کانگریسی لیڈر افتخار انصاری تھے جو گورنر سے ملنے جارہے تھے انھوں نے گورنر کو ہاتھ سے لکھا ہوا ایک خط دیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ وہ فاروق عبداللہ کی حمایت سے دست کش ہو رہے ہیں۔ گورنر نے وزیر اعلیٰ کو ساڑھے سات بجے صبح کو فون کیا۔ فاروق عبداللہ مبہوت رہ گئے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ ان کی اکثریت وہاں آزمائی جائے جہاں قانون کہتا ہے یعنی اسمبلی میں۔ ۱۹۵۳ء میں ان کے والد نے بھی یہی حق مانگا تھا۔ باپ کی طرح بیٹے کو بھی یہ حق نہیں ملا۔ پھر فاروق عبداللہ نے الیکشن کرائے جانے کا مطالبہ کیا، اس کا ظاہر ہے کہ کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اسی شام جی ایم شاہ کو (جو باقاعدہ منتخب کی ہوئی اسمبلی کے رکن بھی نہیں تھے) جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف دلا دیا گیا۔

تیرہ کے تیرہ مردوں اور عورتوں کو جنھوں نے اپنی جگہیں بدل لی تھیں، کابینہ درجے کی وزارتیں عطا ہوئیں۔

گورنر نے اعلان کیا کہ نئے وزیر اعلیٰ کو ۳۱ جولائی کو اسمبلی میں اپنی اکثریت کا ثبوت دینا ہوگا۔ مگر ظاہر ہے کہ اصل سوال یہ نہیں تھا جس بات پر شبہہ تھا وہ یہ تھی کہ دل بدلی مخالف قانون کے مطابق وہ اراکین جنھوں نے فاروق عبداللہ کو چھوڑا ہے، اسمبلی میں ووٹ دینے کا حق رکھتے ہیں یا نہیں؟ گورنر کی دلیل یہ تھی کہ ان لوگوں نے اپنی پارٹی چھوڑی نہیں ہے، یہ تو تقسیم یا علیحدگی کی بات ہے۔ یہ اس قسم کی دلیل تھی جسے جمہوریت بار بار سننے کی تاب نہیں لا سکتی کہ جمہوریت اتنی ہی اپنی روح کے سہارے زندہ رہتی ہے جتنی کہ آئین و قوانین کے سہارے۔

عوام نے دکھا دیا کہ وہ کس کے ساتھ تھے۔ تمام فاضل پولیس والوں کی مدد مزدوری تھی۔ سری نگر میں ایک اضطراب تھا۔ مسلسل کرفیو اور پولیس کی فائرنگ ہی عارضی اور وقتی امن قائم کر سکی۔ ایک بار پھر کشمیر کے جمہوریت پر ایمان اور منتخب لیڈروں کے اپنے اختیارات کو استعمال کرنے کے حق کی کڑی آزمائش ہو رہی تھی مگر اس دفعہ کشمیر تنہا نہیں تھا ملک کے ہر کونے میں احتجاج ہوا اور مہینے کے آخر میں جب پارلیمنٹ کا سیشن ہوا تو کئی دن شور اور ہنگامے رہے جن میں حزب اختلاف کے لیڈروں نے اس کارروائی کے لیے حکومت سے وضاحت طلب کی۔ نئی حکومت کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرنے اور کشمیریوں کے شانہ بشانہ چلنے کے لیے، ملک بھر سے ہر سیاسی خیال کے لیڈر سری نگر آئے۔ ان میں مغربی بنگال کے مارکسی عالم اور وزیر مالیات ڈاکٹر اشوک مترا تھے اور پارلیمنٹ میں بہار کی نمائندگی کرنے والے سوشلسٹ مقرر جارج فرنانڈیز نے مہاراشٹر سے اپنی آواز اٹھائی، شرد پوار نے جنوب سے،

نفاست پسند کر کے ہیگیڈ سے اور بیلے لباس پوش این ٹی راما راؤ نے اس کارروائی کو جمہوریت کے خلاف جرم قرار دیا۔ جنتا پارٹی کے لیڈر اور اتر پردیش کی طرف سے پارلیمنٹ کے ممبر چندر شیکھر نے وعدہ کیا کہ ان کی پارٹی فاروق عبداللہ کی اس لڑائی کو اپنائے گی۔ ایچ۔ این بہوگنا اور چندر جیت یادو جیسے اتر پردیش کے دوسرے لیڈروں نے اسی طرح کی دل چسپی کا اظہار کیا۔ ۱۲ جولائی کو، چار غیر کانگریسی وزرائے اعلیٰ نے اپنی ناراضگی کے اظہار کے لیے ریاستی سربراہوں اور وزیراعظم کے درمیان ہونے والے نیشنل ڈیولپمنٹ کاؤنسل کے سالانہ جلسے سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ اس غیر جانب دار فورم سے اس طرح کے واک آؤٹ کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۸۴ء میں بہت سی چیزیں مشترک ہوں گی مگر کم از کم ایک بہت بڑا فرق تھا۔ اس دفعہ ملک خاموش نہیں تھا اور یہ اس لیے تھا کہ ہندوستان اپنے بعض ڈیموکریٹس کی کجروی کے باوجود ایک جمہوری ملک تھا اور یہی وجہ تھی کہ فاروق عبداللہ تالیاں بجاتے ہجوم کے سامنے یہ کہہ سکے کہ وہ مسز گاندھی کے خلاف اپنی اس لڑائی کو ملک کے ہر کونے تک لے جائیں گے اور یقیناً اگر وہ اپنی اس لڑائی کو ہندوستان کے کونے کونے تک لے جا سکتے تھے تو پھر اسے پاکستان کے کسی بھی کونے تک لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کشمیر کے مسئلے کا اہم ترین پہلو اعتماد اور بھروسے کا سوال ہے اور مسلمان کی حب الوطنی کی کیفیت اور کمیت کے سلسلے میں ہندو کے شک و شبہات ہیں۔ جموں و کشمیر، ایک مسلم اکثریت والی ریاست ہونے اور پاکستان کے قریب ہونے کی وجہ سے ظاہر ہے کہ شکوک و شبہات کے طوفان کا ہدف ہے۔ غیر مسلم حکمران طبقے کو سرسری طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک وہ جو مسلمانوں سے بحیثیت ایک فرقے کے شدید نفرت کے جذبات رکھتا ہے، وہ چاہے گا کہ اس کمیونٹی کو مطیع و مغلوب بنایا جائے اور ہر ہر طرح سے اسے دکھ پہنچا کر وہ حساب چکایا جائے جسے وہ تاریخ کا ورثہ سمجھتا ہے۔ دوسرا گروہ، سیکولر اور قوم پرست عناصر پر مشتمل ہے۔ پہلے کو منتشر ہونے کی وجہ سے شاید آسانی سے قابو میں رکھا جا سکتا تھا اگر یہ ایک حقیقت نہ ہوتی کہ دوسرے گروہ کے لیے بھی ۱۹۴۷ میں جناح اور مسلم لیگ سے شکست کھانے کے بعد شک کے اسباب مہیا ہو گئے تھے۔ اسی لیے یہ جاننا بڑا مشکل ہو جاتا ہے کہ کب ایک سیاسی فیصلہ لیا جاتا ہے، اور کس نیت سے لیا جاتا ہے۔ ایک انتہا پسند عام طور پر اپنے ڈنک علی الاعلان دکھانے کی غلطی نہیں کرتا۔ بہر حال ہمیشہ کوئی نہ کوئی عقلی دلیل ہوتی ہے جو تنگی فرقہ پرستی کی بنیاد پر لیے گئے فیصلے کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ مسلمان کے لیے جو اس سب کا ہدف ہوتا ہے، خط فاصل کا طے کرنا انتہائی دشوار ہو سکتا ہے اور بالآخر یہ فیصلہ لینا کہ نظام پر بھروسہ کیا جائے یا نہیں، صرف کسی مخصوص قبیلے کی خوبیوں سے زیادہ پچھلے ریکارڈ کی جانچ کے ذریعے ہی ممکن ہوتا ہے۔

آج کل کشمیری ایک اچھا سوال پوچھتا ہے، وہ اس سے انکار نہیں کرتا کہ ۱۹۴۷ء میں وہ ہندوستان کے ساتھ شامل ہوا۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا یہ وہی ہندوستان ہے جس کے ساتھ وہ ۱۹۴۷ء میں شامل ہوا تھا۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتا ہے کہ آیا مہاتما گاندھی، جن کا پاکستان وجود میں آنے سے محض پندرہ دن قبل سری نگر میں تالیوں اور نعروں سے استقبال ہوا تھا، کی اقدار ان مردوں اور عورتوں کے لیے کوئی معنی رکھتی ہیں جو دہلی میں صاحب اختیار ہیں۔ انڈین یونین کی تعمیر اس چٹان پر ہوئی تھی جس کا نام "دستور ہند" ہے ۔

"ہم بھارت کے عوام متانت و سنجیدگی سے عزم کرتے ہیں کہ بھارت کو ایک مقتدر، سماج وادی، غیر مذہبی، عوامی جمہوریہ بنائیں اور اس کے تمام شہریوں کے لیے حاصل کریں انصاف، سماجی معاشی اور سیاسی آزادیٔ خیال، اظہار عقیدہ، دین و عبادت، مساوات باعتبار حیثیت و موقع، اور ان سب میں اخوت کو ترقی دیں جس سے فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور سالمیت کا تیقن ہو۔"

کشمیری سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس وعدے کے تحفظ کے لیے پاکستان سے آنے والے بنیاد پرست حملہ آوروں سے لڑے مگر کشمیری سے اس حملہ آور کا تبادلہ ایک ایسی دہلی سے کر لینے کی توقع نہیں کرنا چاہیے جس میں سیکولر عقیدہ مر چکا ہو۔

کشمیر، جیسا کہ شیخ عبداللہ اور جواہر لال نہرو نے وعدہ کیا تھا آج بھی سیکولر اور جمہوری ہندوستان کا عمل ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے ہندستان کا تصور اور اس کا خیال اس مسلم اکثریت والی ریاست میں کامیاب ہوگا یا ناکام؟

۱۲۔ اگست ۱۹۸۴ء، اتوار کے دن جب برصغیر میں یہ خبر پہنچی کہ اولمپکس میں ہاکی کا طلائی تمغہ پاکستان نے حاصل کر لیا ہے تو نوجوانوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں نے ہرے جھنڈے لہراتے ہوئے ایک جلوس نکالا اور پٹاخے چھوڑے۔ کشمیر میں رائے عامہ کا رُخ کیا ایسے ہی پاکستان دوست افعال کی طرف ڈھلک جائے گا یا پھر ہندوستان کی طرف رہے گا جیسا کہ اب تک رہا ہے، اس سب کا زیادہ انحصار آٹھویں دہائی میں جمہوری عمل کی سمت پر ہے۔ اگر انھیں جو انتخابات میں کامیاب ہوتے ہیں مگر حکومت کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے تو پاکستان اب بھی وہ جنگ جیت سکتا ہے جو وہ ۱۹۴۷ء میں ہار چکا ہے لیکن اگر کشمیر میں سیلف رول ہو جاتا ہے تو اسلام آباد ہنوز دور است۔



۸

'مُجرم'۔ جب تک کہ بے گناہی ثابت نہ ہو

۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو، محمد علی جناح نے ہندوستانی مسلمانوں کے پیدائشی حق کو ایک پیالہ سالن کے بدلے بیچ دیا۔ یہ اصرار کرتے ہوئے کہ مذہب اور قومیت دونوں جزو لاینفک ہیں۔ انھوں نے ایک ایسے ملک کا مطالبہ کیا اور حاصل کر لیا۔ جس کے دو بازو ایک دوسرے سے ایک ہزار میل دور تھے۔ یہ جناح صاحب کی خود پسندی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ مذہب اور قوم کے مترادف ہونے کا ان کا نظریہ، جغرافیائی اور ثقافتی فاصلے کو کم کر دے گا، اس بات کی شہادتیں کہ اسلام ایک جدید قوم کو ایک دوسرے سے منسلک کرنے کے لیے کافی نہیں تھا ساری دنیا میں ملتی ہیں، اور سب سے زیادہ خود عرب دنیا میں۔ ایک مذہب، ایک زبان اور پھر بھی درجنوں قومیں۔ مگر جناح صاحب نے اس برصغیر کے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات خوب اچھی طرح بٹھا دی کہ وہ گاندھی کی سرزمین پر مساوی حیثیت کے شہریوں کی طرح زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور یہ کہ انھیں خود اپنے ایک وطن کا مالک ہونا چاہیے۔ اگرچہ اس کے بنانے کی قیمت بہت ہوگی۔ ان کے نظریے کے تضادات پاکستان کے خیال کی منظوری کے فوراً بعد ہی ایک ایک کر کے سامنے آنے لگے تھے۔ ان کے خیالات کے ریکارڈ پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ انھیں خود بھی، جو کچھ انھوں نے کیا تھا اس پر شبہہ ہونے لگا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ ان شبہات کو بہ آواز بلند ظاہر کرنے کے موڈ میں نہیں تھے، انھیں تو فتح و کامرانی کا بھرم رکھنا تھا مگر ان سوالوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی جن کے جواب نہیں تھے یا ان کے جواب دیے نہیں جا سکتے تھے۔

سب سے اہم اور سیدھا سادا سوال یہ تھا کہ اگر جناح صاحب صحیح تھے تو وہ چار کروڑ مسلمانوں کو "ہندو" انڈیا میں چھوڑ کر کیسے جا سکتے تھے۔ غالباً مشکل یہ تھی کہ پاکستان ان علاقوں میں بنا تھا جہاں ہندوؤں سے تحفظ کی ضرورت نہ ہونے کے برابر تھی کیوں کہ یہ سارے علاقے مسلمانوں کی اکثریت والے علاقے تھے۔ اگر ضرورت تھی تو مغربی پنجاب، سندھ، مشرقی بنگال اور صوبۂ سرحد میں ہندوؤں کو مسلمانوں سے تحفظ کی تھی۔ جناح صاحب نے اس الجھے سوال کا جواب ۱۱۔ اکتوبر

۱۹۴۷ء کو پاکستانی فوج کے افسروں کو خطاب کرتے وقت دینے کی کوشش کی۔ "ہندوستان میں اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے میری یہی نصیحت ہے کہ وہ جس ریاست میں ہوں اس کے ساتھ بغیر کسی جھجک اور تکلف کے اپنی وفاداری کا اظہار کریں" ایک ہندو اکثریت والی ریاست میں وفاداری پر ان کا اصرار دس سال بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لیے یکسر ناقابلِ قبول تھا۔ ۱۱۔اکتوبر والی یہ نصیحت تقریباً بے کار اور ناحق تھی۔

مگر جناح صاحب، جیسا کہ ہم نے دیکھا، پاکستان کے نظریئے کی منظوری کے فوراً بعد اچانک ایک سیکولر ملک کے خیال کے شیدائی ہو گئے تھے۔ یہ وہی تصور تھا جسے جب مہاتما گاندھی یا پنڈت نہرو، ایک نئے اور متحدہ ہندوستان کی اساس کی حیثیت سے سامنے رکھتے تھے تو جناح صاحب ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۴۷ء کی اپنی مشہور پریس کانفرنس میں جناح صاحب نے کہا " اقلیتوں کی حفاظت کی جائے گی۔ (پاکستان میں) ان کے مذہب، ان کے عقائد کا ہر امکانی طور پر تحفظ کیا جائے گا۔ ان کی عبادت کی آزادی میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں ہو گی" اور آج یقیناً احمدیہ فرقہ کے لوگ بھی جناح صاحب کے پاکستان میں برابر کے شہری نہیں ہیں۔ مگر یہ اکیلے جناح صاحب نہیں تھے جو اس پاکستان کا تصور کرنے سے قاصر رہے جو درحقیقت بننے والا تھا۔ متحدہ بنگال کے آخری وزیراعظم کے عہدے سے سبکدوش ہوتے ہوئے ۱۲ اگست کو شہید سہروردی نے کہا تھا "بنگال کا تقسیم ہونا میرے نزدیک ایک تباہی اور تکلیف دہ حادثہ ہی رہے گا۔ مشرق اور مغرب ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ اس تقسیم سے انھیں دھکا نہ لگے اور یہ کہ وہ یہ امید نہ پالتے رہیں کہ کبھی نہ کبھی ہم ایک بار پھر ایک ہو جائیں گے۔ مگر سیاسی بھنور کی تہ سے جو کچھ اُچھلا ہے اسے ہمیں زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانا ہو گا۔ ..... ایک ایسا وقت تو بہرحال آئے گا ہی کہ اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ سرے سے معدوم ہو جائے گا اور ہر حصّے کے ہندو اور مسلمان اس حصّے کے باسیوں کی طرح، اپنے اپنے علاقے کی ترقی اور خوش حالی کے لیے مل کر کام کریں گے۔ اور مشترکہ اقتصادی اور سیاسی اصولوں پر ایک دوسرے سے تعاون کریں گے ..... خدا اس ملک پر پھر ایسے امن اور سکون کی بارش کرے جو حکومت کی قوت سے نہیں بلکہ یہاں کے عوام کی دلی خواہشات سے پیدا ہو۔"

اب اُن لوگوں نے امن کی بات شروع کی تھی جنھوں نے ایک تکلیف دہ خانہ جنگی کے شروع کرنے میں مدد کی تھی۔ اے کے فضل حق نے ۱۴۔ اگست کو کہا تھا۔ "میری پہلی اپیل اپنے مسلمان بھائیوں سے ہو گی۔ میں ان سے عاجزانہ درخواست کروں گا کہ وہ یاد کریں کہ ان کا مذہب اسلام بنیادی طور پر امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ "امن و سلامتی" کے الفاظ ہی سے مسلمان ایک دوسرے کو خوش آمدید کہتے ہیں ..... "وہ منزل جس کی طرف اسلام

لے جاتا ہے جائے امن ہے (قرآن کریم۔ باب ۱۰، سورہ ۲۵) اے بھائیو ٹھہرو اور سوچو، وہ لوگ جو امن کی فضا کو برباد کرنے بلکہ بے گناہوں کو قتل کرنے کے لیے تمھارے جذبات برانگیختہ کرتے رہے ہیں، وہ سیاسی مکار ثابت ہو چکے ہیں۔ جنھوں نے انتہائی بے شرمی اور بے حیائی کے ساتھ آزمائش کی گھڑی میں تمھارا ساتھ چھوڑ دیا اور تمھیں تمھارے مقدر کے حوالے کر دیا۔ اُن سیاسی تحریکوں نے جن کے لیے تمھیں استعمال کیا گیا صرف ان ہی مکاروں کو فائدہ پہنچایا جو اب بڑی بڑی ملازمتیں اور بڑے بڑے عہدے حاصل کر رہے ہیں اور غریب اور بے سہارا لوگوں کو یکا و تنہا چھوڑ دیا ہے ان کی حالت اب پہلے سے بھی زیادہ زبوں ہے۔"

امن کی تلاش میں، صرف ایک شخص تھا جو دو دہائیوں سے زیادہ عرصے تک لگاتار بغیر ہار مانے ہوئے بغیر کسی وقتی مصالحت کے "ہندو مسلم اتحاد سوت کاتنے والے چرخے سے کم اہم نہیں ہے۔ یہ ہماری زندگی کی سانس ہے (لیکن) میں کچھ ایسے ہندوؤں کو اور کچھ ایسے مسلمانوں کو جانتا ہوں جو اگر خالص ہندوستان یا خالص مسلم ہندوستان حاصل نہ کر پائیں تو وہ برطانیہ عظمیٰ کی غلامی کی موجودہ صورت حال کو ترجیح دیتے ہیں" یہ گاندھی جی تھے جنھوں نے یہ بات ۱۹۲۴ء میں، بلگام میں اُنتالیسویں کانگریس سشن میں کہی تھی۔ ایسے ہندوؤں اور ایسے مسلمانوں کی تعداد کم تھی مگر یقیناً موثر تھی اور انھوں نے ہندوستان کے ہندو اور ہندوستان کے مسلمان کے درمیان ایسا تفرقہ پیدا کیا کہ دونوں نے ۱۹۴۷ء میں ملک کو چیر کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

ان کا نفرت کی حماقت آمیزی اور زہر دونوں کو بیک وقت ظاہر کرنے والی حقیقت شاید اس کے علاوہ کوئی دوسری نہ ہو کہ دہلی میں جناح صاحب کے مکان کو ۸۔ اگست کو ایک دولت مند بزنس مین رام کرشن ڈالمیا نے تین لاکھ روپے میں خرید لیا اور اسے ذبیحہ گاؤ مخالف لیگ کا ہیڈ کوارٹر بنا دیا۔ مسٹر پاکستان کے گھر پر گائے کا پرچم لہرا دیا گیا۔ سمجھدار آدمی کے لیے یہ سمجھنا ناممکن ہے کہ وہ اس بات پر ہنسے یا روئے۔

ہندوستانی مسلمان کون ہے؟ اس موضوع پر کلاسیکی کام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب نے کیا ہے (دی انڈین مسلمس، جارج الین اینڈ اَن وِن ۱۹۶۷) اس سوال کا ان کا جواب ہے:
"مردم شماری کا اصول، کہ جو کوئی بھی ہندستانی ہے اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ ایک ہندوستانی مسلمان ہے۔ ظاہر ہے یہ اصول اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا کہ کیا بات ہے جو ہندوستانی مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے...... ہندوستانی مسلمانوں کو باہمی طور پر متحد کرنے والی چیز صرف اسلام کی مشترکہ اطاعت ہے اسی اطاعت نے ایک کمیونٹی سے متعلق و منسلک ہونے کا جذبہ پیدا کیا ہے اور یہی جذبہ وہ نقطہ رہا ہے جس پر کچھ

سکتے ہیں کہ مذہب، بقاء کی جبلت، سیاسی مفاد اور سماجی روایات یکجا ہو جاتی ہیں۔ یہ جذبہ کئی پشتوں تک خوابیدہ اور جامد بھی رہ سکتا ہے لیکن اسے ایک لمحے میں انتہائی بھڑکایا بھی جا سکتا ہے۔۔۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوستانی مسلمان ایک کمیونٹی کے لحاظ سے بے چہرگی کا شکار ہیں۔ اتحاد کی فطری خواہش کی وجہ سے یہ بہت آسان تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے اسلام کے ماننے والوں کے تشخص کو الگ سیاسی وجود اور ایک الگ قوم سے خلط ملط کر دیا جائے جو یہ نہ تو کبھی تھے اور نہ ہی ایسا ہونا چاہتے تھے۔"

مگر ہندو بنیاد پرستوں نے جو اس صدی میں اپنے آپے میں آئے ہیں اور شہری متوسط طبقے کے ایک حلقے کی وفاداری ان کو حاصل ہے، اس حقیقت کو ماننے سے انکار کر دیا کہ یہاں ہندوستانی مسلمان نام کی بھی کوئی شے ہے ان کے نقطہ نظر سے، مسلمان اپنی تعریف کے اعتبار سے ایک تارکِ وطن نہیں بدیسی تھا۔ ہندوستان ایک ہندو ملک تھا اور صرف ہندو ملک ہی ہو سکتا تھا اسی طرح ہندوستانی ثقافت اپنے سنسکرت روپ میں صرف ہندو ثقافت ہی ہو سکتی تھی۔ مشترکہ ثقافت تخلیق کیا ہوا ایک بُرا عیب تھا جسے بہر حال دور کرنا تھا۔ صرف وہی مذاہب ہندوستانی کہلا سکتے تھے جنھوں نے اس ملک میں جنم لیا ہو۔ اسی طرح اگر ایک طرف بدھ ازم اور سکھ ازم نیم ہندو مذہب کی حیثیت سے قابل قبول تھے تو دوسری طرف اسلام، عیسائیت، یہودیت اور پارسی مذاہب بدیسی عقائد کے نظام تھے۔ ہندو قدرتی طور پر ہندوستان کی مقدس سرزمین کے مالک تھے اور وہ ہمیشہ اسی سرزمین کی اولاد رہے تھے باقی لوگ بیرونی حملہ آور تھے۔ قدیم ہندوستانی تہذیب کا زمانہ تاریخ کا ایک شاندار زمانہ رہا ہے۔ ذات پات کے نظام کی عطا کی ہوئی پیوستگی اور ہم آہنگی کی عنایت تھی کہ سماج مستحکم تھا۔ یہ عہد ایک عہدِ زریں تھا، عظیم سلطنتوں کا اور غیر معمولی سائنسی کامرانیوں کا۔ زوال آیا، ظالم مسلمان لٹیروں کی آمد سے جنھوں نے بزورِ شمشیر مذہب تبدیل کرائے اور ہندوستان میں سیاسی اور سماجی تنازعات شروع کرا دیے۔ بپن چندرا (کمیونل ازم اِن ماڈرن انڈیا، وکاس پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۴ء) کے الفاظ میں "اس طرح ...... مسلمانوں کی جو شکل ابھری وہ ایک ازلی ظالم، جنسی عیاش اور لڑاکو کی تھی۔ مسلمانوں کی اس تصویر کو ہندو فرقہ پرستوں نے ڈر کے اُس احساس بلکہ ایک نفسیاتی ماحول کو پیدا کرنے میں استعمال کیا جسے عام حالات میں اکثریت نے محسوس نہ کیا ہوتا۔ اور اس کو استعمال کیا گیا مسلمانوں کو شہری حقوق نہ دینے کا مطالبہ کرنے میں ...... اور زمانہ حال میں ظلم و ستم کی تاریخی یادوں کی بنا پر ہندو مسلم اتحاد کے امکانات کو ختم کرنے میں۔ کٹر فرقہ پرست عناصر نے تو اس نظریے کی ترویج کی کہ ہندوؤں کو انتقام لینا چاہیے یا کم از کم کچھ معاوضہ ان زیادتیوں کا جو ان پر عہد وسطیٰ میں کی گئی تھیں۔ اس

دعوے کے لیے کہ ہندوستان ہندوؤں کا "موروثی علاقہ" ہے یا مقبوضہ سرزمین ہے، یہ موقف ضروری تھا۔ اور صرف یہی نہیں یہ موقف مسلمانوں کی بیرونیت پر زور دینے اور اتنے دن یہاں رہنے کے باوجود انھیں ہندوستانی ہونے کے حق سے محروم کرنے کے لیے بھی ضروری تھا۔"

مگر اس خیال میں ایک گرفت بھی تھی۔ تکنیکی لحاظ سے دیکھیے تو خود ہندو بھی بدیسی تھے کیوں کہ خود آریا، روسی اسٹیپس سے ۱۵۰۰ سال قبل مسیح کے آس پاس برصغیر میں آئے تھے۔ مزید یہ کہ جدید ہندوستان کے ایک عظیم سپوت، جن پر مسلمانوں کا ایجنٹ ہونے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا یعنی لوکمانیہ تلک نے خود تحریری طور پر اس بات کو قبول کیا ہے کہ آریہ دراصل آرکٹک سے یہاں آئے تھے مگر اس دائرے کو چکنا چور کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا۔ اگر ہندو آرکٹک نہیں پہنچ سکتا تھا تو خود آرکٹک کو ہندوستان لایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ، ہندو بنیاد پرست تحریک کے ایک عظیم دانشور ایم۔ ایس گولوالکر نے اپنی کتاب "وِی" میں لکھا کہ "ویدوں میں مذکور آرکٹک وطن دراصل ہندوستان میں تھا، ایسا نہیں تھا کہ ہندو ترک وطن کر کے اس سرزمین پر آگئے، بلکہ آرکٹک کے علاقے نے ترک وطن کیا۔ وہ تو چلا گیا اور ہندوؤں کو ہندوستان میں چھوڑ گیا" اس حماقت آمیز بات پر کچھ کہہ کر کوئی اپنا وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرے گا صرف یہ کہ گولوالکر کے چیلے، آج ہندوستان کی سیاست میں بڑا اثر ورسوخ رکھتے ہیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہمہ وقت موجود اُس تشدد کا سب سے بڑا سبب ہیں جس سے خطرہ ہے کہ وہ ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے گا۔

تاریخ مسلمانوں کے صدیوں کے ظلم وستم کی کہانی کی حیثیت سے پیش کی جاتی رہی ہے بلکہ آج بھی کی جا رہی ہے مسلمان "زناکار" اور "قاتلوں کے گروہ" "ہمارے پرانے اور کٹر دشمن" اور بہت کچھ۔ یہ سمجھنا بہت دشوار نہیں ہے کہ اس طرح کی لسانی سے جذبات کو، خصوصاً کشمکش اور تناؤ کے زمانے میں کس طرح برانگیختہ کیا جا سکتا ہے۔ متعصب مسلمانوں نے تاریخ کے اس انداز کی ہمت افزائی میں مدد کی۔ سر فیروز خاں نون جو ایک دن پاکستان کے وزیر اعظم بنیں گے، ۱۹۴۶ اور ۱۹۴۷ء کے تشویش ناک برسوں میں، اپنی تقریروں میں، ہندوؤں کو ڈرایا کرتے تھے کہ وہ بالکل اسی طرح قتل کیے جائیں گے جس طرح چنگیز خاں نے انھیں قتل کیا تھا۔ سر فیروز خاں یہ نہیں جانتے تھے کہ چنگیز خاں مسلمان نہیں ایک منگول تھا جس کے خدا کا نام تنگری تھا اور جس نے جب بھی کبھی کسی اسلامی سلطنت پر حملہ کیا اتنی ہی بڑی تعداد میں مسلمانوں کا قتل کیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں جیل میں لکھتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں پنڈت نہرو نے لکھا تھا "ہندوؤں میں ایک عام خیال یہ ہے کہ اسلام ایک بے صبرا مذہب ہے اور یہ بزور شمشیر پھیلا ہے۔

اس قسم کے ہندوؤں میں سے اکثر، جابر و ظالم مسلمانوں کی مثال دیتے ہوئے چنگیز خاں، تیمور اور محمود غزنوی کا نام لیتے ہیں۔ مَیں نہیں جانتا کہ ان میں سے کتنے لوگ ہوں گے جنھیں یہ معلوم ہو گا کہ چنگیز خاں مسلمان تھا ہی نہیں، اور تیمور کو سروں کے مینار بنانے کا شوق مغربی ایشیا میں بھی جہاں ہندوستان کی طرح اسلام پھلا پھولا دلیا ہی تھا؟ یا یہ کہ محمود غزنوی نے بغداد کے خلیفہ کو بھیانک سزاؤں کی دھمکی دی تھی۔

چوں کہ ایسی نصف حقیقتیں اور کہانیاں، ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات میں بڑا اہم رول ادا کرتی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ تاریخی ریکارڈوں کو جانچا اور پرکھا جائے۔ نیچے لکھے ہوئے واقعات کی ساری تفصیلات، آرسی موجدار، ایچ۔ سی رلائے چودھری اور کالی کنکر دتا کی معیاری تصنیف[1] میں دیکھی جا سکتی ہیں، مَیں نے ان حضرات کی کتاب دانستہ طور پر چنی ہے کہ ان کی تاویلات اور تشریحات ہندو بنیاد پرستوں کے حق میں ہیں مگر خود ان کے بیان کیے ہوئے حقائق کی روشنی میں یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ پچھلے ایک ہزار برسوں میں لڑی گئی تمام جنگیں بادشاہوں کے درمیان تھیں نہ کہ مذاہب کے مابین۔ یہ سارا کاروبار جاگیردارانہ عزائم صلاحیتوں اور کمزوریوں کا باہمی کھیل تھا جس کا نتیجہ کسی ایک خاندان کے عروج اور دوسرے کے زوال کی شکل میں سامنے آتا تھا۔ مذہبی جوش و خروش اگر کبھی میدان میں آیا تو اس کا استعمال صرف اس حد تک ہوتا تھا جس حد تک کہ آج رجمنٹ کی تشکیل میں نسل کو کام میں لایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد سے شاید ہی کوئی جنگ ایسی رہی ہو جسے آپ خالص ہندو مسلمان معاملہ قرار دے سکیں۔ مقابل فوجوں میں ہمیشہ خلط ملط ہوتا تھا۔

پہلا مسلمان جو ایک فوج کے ساتھ یہاں آیا وہ ایک نوجوان عرب تھا (بعض کے تذکروں کے مطابق اس کی عمر اس وقت محض سترہ سال تھی) عراق کے گورنر کا بھتیجا اور اس کا داماد۔ محمد بن قاسم کو عرب جہازوں پر قبضہ کرنے اور قزاقوں کی ہمت افزائی کرنے پر سندھ کے برہمن راجہ داہر کو سزا دینے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ مگر "بیرونی" عرب مسلمانوں اور "دیسی" برہمنوں کے اس اولین مقابلے میں بھی محمد بن قاسم کی طرف سے بدھ بھکشو اور وہ مقامی سردار تھے جو داہر کے خلاف تھے۔ یہ کھلی ہوئی "غداری" تھی مگر سیدھی سادی حقیقت یہ تھی کہ ان سرداروں نے اس لڑائی کو دو جاگیردارانہ بادشاہوں کی باہمی لڑائی سمجھا اور بس۔ عربوں اور ان کے مقامی حمایتیوں نے وہ سارا علاقہ فتح کر ڈالا جو آج جنوبی پاکستان ہے، یہاں تک کہ شمال میں کراکوٹاؤں نے، جنوب میں چالوکیاؤں نے، اور مشرق میں پرتی ہاروں نے ان کی پیش قدمی روک دی۔ کچھ ہی عرصے بعد عربوں نے اپنے آپ کو خلافت سے الگ کر لیا اور سندھ میں اپنی خود مختار سلطنت قائم کر دی جو شمال میں ہونے والے عظیم نشیب و فراز سے بڑی حد تک محفوظ رہی۔

[1] "AN ADVANCED HISTORY OF INDIA"

ہندوؤں کی نظروں میں سب سے بڑا بدمعاش اور بُرے مسلمانوں کا اصل نمونہ محمود غزنوی ہے جس کا ذکر نہرو کے مندرجہ بالا اقتباس میں ہے ۔ محمود غزنوی آج بھی مشہور و معروف سومناتھ مندر کو لوٹنے اور تباہ و برباد کرنے کے لیے قابلِ نفرین سمجھا جاتا ہے ۔ ہندوستان کی دولت کو لوٹنے کے لیے وہ سترہ مرتبہ یہاں آیا اور ہر بار اتنا مالِ غنیمت یہاں سے لے گیا جتنا کہ لے جا سکتا تھا ۔ اس نے پنجاب کو افغان سلطنت میں شامل کیا مگر اس کی زندگی کا اصل مقصد ایسا خزانہ جمع کرنا تھا جو کبھی خالی نہ ہو ، تاکہ وہ ایک طرف تو اپنی بار بار کی مہموں کو چلا سکے اور دوسری طرف فن و ادب کی سرپرستی کر سکے ۔ موجمدار ، رائے چودھری اور دتا نے اس کا ذکر یوں کیا ہے " سلطان محمود عظیم ترین فوجی لیڈر تھا جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی ۔ اس کی ہمت ، اس کی زیرکی ، اس کی خود تدبیری اور سمجھ بوجھ کے علاوہ اس کی دوسری صلاحیتوں نے اس کو ایشیا کی تاریخ کی دلچسپ ترین شخصیت بنا دیا ہے ۔ ہندوستان میں اس کی فتوحات کے علاوہ ترکوں کے خلاف دو یادگار مہموں کا سہرا بھی اس کے سر بندھتا ہے ، جس میں اس نے الک خان اور سلجوقیوں کے لشکروں کو شکست فاش دی تھی ۔ وہ ایک عظیم سپاہی تو تھا ہی ، ساتھ ہی وہ فن و ادب کا بھی زبردست سرپرست تھا ..... وہ اپنے ملک میں نہ تو اپنے مذہب کا مبلغ تھا اور نہ ہی سلطنت کا معمار " مگر عوامی سطح پر اسے تبدیلِ مذہب کرانے والے تشدد پسند کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے ، اس کی یہ حیثیت رہینِ منت ہے ان ہندوؤں کی جو سومناتھ کے مندر کے لوٹے جانے کی وجہ سے خفا تھے ، اور (فیروز خاں نون جیسے) ان مسلمانوں کی جو اسے اسلام کی زبردست تلوار قرار دیتے تھے ۔ محمود کی تلوار محمود کے فائدے کے لیے استعمال ہوئی تھی ، اور اس معاملے میں وہ کسی بھی جاگیردارانہ حکمراں سے مختلف نہیں تھا ۔

دہلی میں مسلمانوں کی اوّلین سلطنت قائم کرنے والا غور سے آنے والا محمد غوری نام کا ایک افغان تھا ۔ وہ ایک معمارِ سلطنت تھا اور وہ شخص جو اس کی راہ میں مزاحم ہوتا تھا اسے اس کا مقابلہ کرنا ہوتا تھا ۔ اس کی پہلی کامیابی ۱۱۷۵ء میں ملتان کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف ہوئی تھی ، اُس وقت اِس نے لاہور کے مسلمان حکمراں خسرو ملک کو شکست دینے کے لیے جموں کے ایک ہندو راجہ وجے دیو کے ساتھ اتحاد کا ایک معاہدہ کیا تھا ۔ عوام میں پوجے جانے والے اور دہلی اور اجمیر کے درمیانی علاقے کے حکمراں پرتھوی راج چوہان اور اس کے درمیان کشمکش اس کے بعد ہی پیدا ہوئی ۔

۱۱۹۱ء اور ۱۱۹۲ء میں پرتھوی راج چوہان اور محمد غوری کے درمیان ہونے والی دونوں لڑائیاں بڑی بڑی کہانیوں کی تخلیق کا سبب بنیں ۔ ان تحقیقات کے لیے ہمیں برطانوی مورخ کرنل جیمس ٹوڈ کی خیالی تحریروں کا مرہونِ

منت ہونا چاہیے۔ اس وقت شمال کے راجاؤں میں سب سے زیادہ طاقت ور راجا جے چند رایا جے چند تھا جو قنوج سے حکومت کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ خوب صورت نوجوان پرتھوی راج جے چند کی بیٹی کو لے کر بھاگ گیا تھا۔ خود جے چند کو بھارت ماتا کا غدار کہا جاتا ہے، کیوں کہ مبینہ طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے پرتھوی راج چوہان پر حملہ کرنے اور دہلی پر قبضہ کرنے کے لیے غوری کو دعوت دی تھی۔ اسی واقعہ کی بنیاد پر یہ کہانی بنی ہے کہ ہندوستانی ہیرو پرتھوی راج نے بدیسی مسلمان لیڈروں سے شکست اسی غداری کی وجہ سے کھائی۔ آیئے ہم ذرا اپنی "ایڈوانس ہسٹری" میں چھان بین کریں۔ بہر حال یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے غوری کو جے چند نے بلایا۔ اس ملک پر حملہ، پنجاب میں غزنوی حاکم محمد غوری کی مکمل فتح کا لازمی نتیجہ تھا مگر ہمارے طالب علموں کو یہ بات نہیں بتائی جاتی ہے۔

محمد غوری اور پرتھوی راج چوہان کے درمیان پہلی لڑائی، دہلی سے ۸۴ میل شمال میں ترائن کے مقام پر ہوئی۔ متحدہ راجپوت ریاستوں کی سربراہی کرتے ہوئے، پرتھوی راج کے پاس دو لاکھ گھوڑے اور تین ہزار ہاتھی اس کی کمان میں تھے۔ میسرہ اور میمنہ کی معیت میں، غوری خود قلب فوج کی سربراہی کر رہا تھا۔ تعداد کے لحاظ سے راجپوت غالب ہوئے، غوری کو پسپا ہونا پڑا۔ میسرہ اور میمنہ دونوں کو میدانِ جنگ سے پسپا کر دیا گیا، اور پرتھوی راج کے بھائی گوبند رائے کے ہاتھوں غوری کے زخمی ہونے کی وجہ سے قلب بھی بکھر گیا۔ افغانوں کا چالیس میل تک پیچھا کیا گیا مگر ان کے گھوڑے زیادہ تیز رفتار تھے اور وہ اگلے سال پھر لڑنے کے لیے بچ گئے۔" اس دفعہ غوری ایک لاکھ بیس ہزار فوجیوں اور لڑائی کی ایک مختلف منصوبہ بندی کے ساتھ آیا تھا۔ دس دس ہزار سپاہیوں کے چار ڈویژن ہاتھیوں سے بچنے، میمنہ، میسرہ اور قلب پر حملہ کرنے اور گھیرے میں لے کر پشت پر حملہ کرنے پر مامور کیے گئے۔ لڑائی صبح کے نو بجے شروع ہوئی، سہ پہر تک غوری دشمن کو شکست فاش دینے کے لیے تیار تھا۔ اس نے اپنے بارہ ہزار تازہ دم اور چنیدہ سپاہیوں کو لے کر قلب پر دھاوا بول دیا اور راجپوت عمارت ڈھ گئی۔ پرتھوی راج بھاگتے ہوئے دریائے سرسوتی کے قریب پکڑا گیا اور قتل کر دیا گیا، اور اس طرح دہلی میں مسلمانوں کی حکومت کا آغاز ہوا۔

ایک زناکار، جنسی گرسنگی کے شکار، بدمعاش اور بد مسلمان کے تصور کا، جو اُن ہندو رانیوں کی ہوس دل میں لیے تھا، جو اپنے آپ کو بدمعاش فاتح کے سپرد کر دینے پر، خودکشی کر لینے کو ترجیح دیتی تھیں، آغاز عظیم توسیع پسند علاء الدین خلجی (۱۲۹۶ء۔۱۳۱۶ء) (جو دوسرا سکندر بننا چاہتا تھا) کی کہانی سے ہوا۔ وہ جلال الدین فیروز کے بہترین جرنیلوں

میں سے ایک تھا (یہ فیروز وہی ہے جو اشوک کی لاٹ دلی میں لایا تھا) دکن میں اپنی فتوحات کے نشے میں سرشار اس نے ۱۹ جولائی ۱۲۹۶ء کو چاقو کے انتہائی موثر استعمال سے دلی کی حکومت پر قبضہ کیا۔ جلدی ہی اس نے اپنی سلطنت کو بڑھایا۔ ۱۲۹۷ء تک گجرات کے شہزادے رائے کرنا دیو کو شکست ہو چکی تھی بعد کو اس کی بیوی کملا دیوی خلجی بادشاہ کی چہیتی بیوی بنی۔ خلجی کا اگلا ہدف راجپوت قوت کی علامت، رنتھمبور کا قلعہ تھا اس پر ہمیر دیو کا قبضہ تھا، مگر ہمیر دیو نے "نئے مسلمان" کہے جانے والے باغیوں کو پناہ دے کر خلجی کی ناراضگی مول لی۔ قلعے کا دفاع راجپوتوں اور مسلمانوں نے مل کر کیا اور مقابلے میں جمے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود خلجی کو رنتھمبور پر قبضہ کرنے کے لیے ۱۳۰۱ء میں پھر آنا پڑا۔ مسلمان پکڑے گئے اور مار دیئے گئے۔ راجپوتوں نے اپنی معروف بہادری کے مثالی مظاہرے پیش کیے۔ لڑتے ہوئے مرے اور ان کی عورتوں نے ستی ہو ہو کر خودکشی کر لی۔ یہ ایک سیدھی سادی کہانی ہے مگر لوک کتھا یہ ہے کہ خلجی کو راجپوت شہزادی پدمنی کی ہوس تھی اور اسی کو حاصل کرنے کے لیے اس نے رنتھمبور کو مسمار کیا۔ کتھا میں یہ بھی ہے کہ شکست کے بعد پدمنی نے خلجی کے حرم میں شامل ہونے کے مقابلے میں ستی ہو کر جان دینے کو ترجیح دی۔ ہمارے مورخ کیا کہتے ہیں؟ "اگر روایت پر یقین کیا جائے تو اس (رنتھمبور کی مہم) کا فوری سبب رانا رتن سنگھ کی ملکہ پدمنی سے اس کا (خلجی کا) عشق تھا مگر یہ بات وضاحت کے ساتھ کسی عصری کرانیکل یا کتبے میں نہیں ملتی۔"

پروپگنڈے کے ذریعے اگر حال کو مسموم بنایا جا سکتا ہے تو پروپگنڈا بازوں کو اس سے کوئی مطلب نہیں کہ ماضی کے بارے میں کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔ کبھی کبھی صاف جھوٹ کارگر ہوتا ہے جیسا کہ خلجی کی کہانی میں ہوا اور کبھی کبھی انتخاب کی ضرورت پڑتی ہے۔ پانی پت کی پہلی اور تیسری لڑائی کو ہی لے لیجیے۔ دونوں جنگوں میں دلی کو للکارنے اور شکست دینے کے لیے درۂ خیبر کے پار سے ایک فوج آئی مگر ان جنگوں میں کون کس سے لڑا؟ اس میں یہ سوال کہاں سے آیا کہ ہندوستان کی آن کو بچانے کے لیے ایک ہندوستانی ہندو نے ایک مسلمان حملہ آور سے مقابلہ کیا؟ کبھی بھی نہیں۔ ہلدی گھاٹی کی لڑائی ہی کو لیجیے جس کا بہت ذکر ہوتا ہے اور جس کے بارے میں واقعات کو بے پناہ مسخ کیا گیا ہے۔ آیئے ان کچھ مشہور لڑائیوں پر ایک سرسری نظر ڈالیں جن کی کہانیاں ہندوستانی شعور میں گھر کیے ہوئے ہیں۔

چنگیز خاں اور تیمور کا خلف، بابر جب درۂ خیبر سے گذر کر اٹک کے مقام پر دریائے سندھ کو پار کر کے ہندوستان میں داخل ہوا تو اس وقت اس کے پاس صرف بارہ ہزار آدمی تھے۔ یہ تعداد مقدونیہ کے سکندر کی کمان میں جتنے سپاہی تھے ان سے کم ہے۔ بابر نے دریائے بیاس کو جو دلی سے پہلے آخری قدرتی رکاوٹ تھی،

۲ جنوری ۱۵۲۶ء کو پار کیا۔ اس وقت دلی افغان ابراہیم لودھی کے ماتحت تھا۔ ابراہیم لودھی اُس سلسلے کا وارث تھا جس نے ۱۴۵۱ء میں بہلول خاں کی معیت میں حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ (اس وقت تک ابراہیم خاں اپنی عادتوں کے اعتبار سے ہندوستانی ہو چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے نجومیوں سے مشورہ کیا تھا اور انھوں نے اس کی فتح و کامیابی کی بشارت دی تھی مگر اس خیال سے کہ کہیں ان کی یہ پیشین گوئی غلط نہ ثابت ہو، ابراہیم کی دسترس سے کہیں دور چلے گئے تھے)

بابر یکم اپریل کو پانی پت کے میدان میں پہنچا اور اپنے دفاع کو جایا اس کا کلیدی ہتھیار توپ تھی۔ ابراہیم خاں جس نے بابر کو چار سو میل تک بغیر کسی حقیقی مزاحمت کے، آنے دیا تھا۔ اب ایک لاکھ فوج کے ساتھ آیا اور ۲۱۔ اپریل کو جنگ میں شامل ہو گیا۔ افغان بہادر تھے مغلوں کے پاس مہارت تھی، ان کی منصوبہ بندی اور توپ خانے نے فتح دلائی، ابراہیم لودھی لڑتے ہوئے مارا گیا۔ ۲۷۔ اپریل جمعہ کے دن پہلی دفعہ دلی کی مسجدوں میں ایک عظیم مغل کے نام پر نمازیں ادا کی گئیں۔ مگر افغان کو آخری اور قطعی شکست ابھی نہیں دی جا سکی تھی۔ ابراہیم کا بھائی محمود لودھی راجپوتوں کے پاس امداد کا طالب ہو کر گیا۔ ایک آنکھ، ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ سے محروم، اور زندگی بھر لڑتے بھڑتے رہنے میں آئے ہوئے اسّی زخموں کے نشانات لیے ہوئے میواڑ کے رانا سانگا نے اعلان کیا کہ وہ دلی کے سلطان کی حیثیت سے محمود کے دعوے کی حمایت کرے گا۔ غاصب بابر کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے راجپوتوں کا ایک عظیم اتحادی مورچہ منظم کیا۔ ۱۵۲۷ء میں رانا سانگا نے ایک ایسی فوج کے ساتھ پیش قدمی شروع کی جس میں مارواڑ، آمبیر، گوالیار، اجمیر، اور چندیری کے حکمرانوں کے علاوہ اسّی ہزار گھوڑوں اور پانچ سو جنگی ہاتھیوں کے ساتھ متعدد چھوٹے چھوٹے راجپوت سردار شامل تھے اور ان سب کے ساتھ ہی محمود لودھی دس ہزار گھوڑوں کے ساتھ، حسن خاں میواتی بارہ ہزار گھوڑوں اور رائے سین کا صلاح الدین تیس ہزار گھوڑوں کے ساتھ شریک تھے۔ آگرہ کے مغرب میں ایک گاؤں کنوا میں جب یہ عظیم لشکر جمع ہونے لگا تو بابر کے جنرل گھبرا گئے۔ یہ ایک بار پھر ایسی گھڑی تھی جس میں ہندوستان کا مستقبل ایک شخص کی قائدانہ صلاحیتوں پر منحصر تھا۔ بابر نے اپنی تمام طاقتِ لسانی اور سارے جوش و جذبے کو کام میں لاتے ہوئے اپنے جرنیلوں کو بالآخر اس بات پر تیار کر لیا کہ بغیر لڑائی کے دلی سے دستبردار نہیں ہوا جا سکتا۔ ۱۶ مارچ ۱۵۲۷ء کو بابر نے راجپوتوں اور افغانوں کی ان فوجوں کو تتر بتر کر دیا اور اُس حکومت کی بنیاد ڈال دی جسے دلی کی عظیم ترین سلطنت ہونا تھا۔

یہ معاملات تاریخی حقائق کے ہیں مگر اس سے یہ نتیجہ کیسے نکلتا ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمان حملہ آوروں کا مقابلہ

محب وطن، ہندو، ہندوستانی کرتے ہیں؟ یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بابر ۱۵۲۶ء میں بیرونی بھی تھا اور مسلمان بھی۔ مگر اس کے مقابلے پر آنے والی فوجوں میں، مسلمان بھی تھے جن میں سے ہزاروں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ ان کے اسلاف دوسرے ملکوں سے آئے تھے مگر اب وہ یہیں بس گئے۔ چغتائیوں نے افغانوں کو حکومت سے ہٹایا مگر ۱۹۴۷ء کی طرح انگریزوں کی مانند افغان اپنے وطن واپس نہیں گئے۔ یہ ملک ان کا وطن بن گیا، ان کا گھر ہو گیا۔ ان کے خلف آج بھی شمالی ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں اور بھوجپوری یا دوسری مقامی بولیاں بولتے ہیں۔ انھیں اگر کوئی بدیسی کہہ دے تو انھیں بڑی حیرت ہوگی۔ جہاں تک کنواہا کی لڑائی کا تعلق ہے بہت سے لوگ ہیں جو اسے ایک ایسی جنگ قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں جس میں "قوم پرست" راجپوت ہندوؤں نے بدیسی مسلمان مغلوں کا مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ مگر پھر اس حقیقت کی توجیہ ناممکن ہو جاتی ہے کہ مسلمان افغانوں نے ایک ہندو، ہندوستان کی دفاع میں، راجپوتوں کے شانہ بشانہ اپنا خون کیوں بہایا؟ چوں کہ ایسے سوالات کا جواب نہیں دیا جا سکتا اس لیے حقائق کو اکثر مصلحتاً چھپایا جاتا ہے۔ یہ بات جادوناتھ سرکار جیسے ممتاز مورخ کی تصنیفات میں بھی نظر آتی ہے۔ ۴۰-۱۹۳۰ء میں سر جادوناتھ نے ریاست جے پور کے آخری راجا مہاراجہ سوائی مان سنگھ دوم کے حکم سے "اے ہسٹری آف جے پور" لکھی۔ اس مسودے کو ۱۹۸۴ء میں عام آدمی کے مطالعہ کے لیے اورینٹ لانگ مین نے شائع کیا۔ شہنشاہ اکبر اور میواڑ کے مہارانا، پرتاپ سنگھ کے درمیان ہونے والی معروف ہلدی گھاٹی کی لڑائی کا بیان کرتے ہوئے سر جادوناتھ سرکار نے جان بوجھ کر اس حقیقت کا ذکر نہیں کیا کہ اس معرکے میں مہارانا پرتاپ کی طرف سے مسلمان افغان بھی تھے۔ سبب یہ ہے کہ اگر وہ اس بات کا اعتراف کرلیں کہ مہارانا پرتاپ کے ساتھ مسلمان بھی لڑے تب وہ اس طرح کے نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے جو وہ نکالتے ہیں: "یہ شکست کھانے والی فوج (رانا پرتاپ کی) تھی جس نے اس پیلی مٹی والی گھاٹی کو ہندوستانی حب الوطنی کے زائرین کے لیے ایک مقبول عام زیارت گاہ بنا دیا۔" ہلدی گھاٹی، ایک طویل عرصے سے بیرونی مسلمان حملہ آوروں کے خلاف، ہندو ہندوستانی حب الوطنی کی بڑی پسندیدہ "مثال" رہی ہے۔ حقیقت اس طرح کی تفریق یا درجہ بندی کو یکسر فاش کر دیتی ہے۔ اور یہ ثابت کر دیتی ہے کہ یہ لڑائی شاہی قوت کے خلاف علاقائی چیلنج سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھی۔

ہلدی گھاٹی جنگ ۱۸ جون ۱۵۷۵ء میں اس وقت لڑی گئی جب شہنشاہ اکبر نے اپنے ممتاز جنرل راجہ مان سنگھ (جو خود بھی ایک راجپوت شہزادہ تھا) سے میواڑ کو قابو میں لانے کے لیے کہا جو ابھی تک دہلی کی آقائیت کو قبول کرنے سے منکر تھا۔ پہاڑیوں کے درمیان واقع تین میل لمبی تنگ گھاٹی، جو ہلدی گھاٹی کہلاتی تھی، کے آخری

کنارے پر رانا پرتاپ کا براہ راست مقابلہ اس مغل فوج سے ہوا جس کی سربراہی راجہ مان سنگھ کر رہا تھا۔ میواڑ کی فوجوں کی صف بندی کا ذکر کرتے ہوئے سر جادو ناتھ سرکار لکھتے ہیں: "کمانڈر ان چیف کے لیے جو عام قاعدہ ہے قلب کی قیادت خود مہارانا کر رہا تھا۔ دائیں اور بائیں بازو کی قیادت، بالترتیب رام ساہ ٹونور اور جھالا سردار بیدا کر رہے تھے۔ ہراول دستے کے آگے سب سے خطرناک مقام پر بہت صحیح طور پر رام داس راٹھور کو تعینات کیا گیا تھا، راٹھور چتوڑ کا دفاع کرنے والے شہید جے مل کا ساتواں لڑکا تھا"۔ اس بات کا کوئی ذکر کہیں نہیں ملتا کہ رانا پرتاپ کے ساتھ ایک افغان حکیم خاں سور کی زیر قیادت گھوڑ سوار فوج کا ایک دستہ بھی تھا اور جس نے جنگ کی ابتدا میں شاہی فوجوں کو تتر بتر کر دیا تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ رانا پرتاپ بھاگا اور بچ گیا، حکیم خاں ہلدی گھاٹ میں مارا گیا۔ آر سی موجدار، بہرحال، اپنی کتاب "دی مغل ایمپائر" (بھارتیہ ودیا بھون۔ ۱۹۷۴ء) میں از راہ نوازش یہ مانتے ہیں کہ "میواڑ کی فوج اچھی خاصی مرعوب کن تھی اور ہر لحاظ سے مغل فوج کے مقابلے کی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس فوج کو تیار کرنے، اس کے لیے مناسب اسلحہ فراہم کرنے، اور حکیم سور پٹھان جو ہلدی گھاٹ میں میواڑ کی طرف سے لڑا تھا جیسے افغانوں کی امداد حاصل کرنے میں خاصہ وقت صرف کیا گیا ہوگا، کتاب کے جس باب میں اس نکتے کو تسلیم کیا گیا ہے، اس کی سرخی بہرحال ہے "مسلمانوں کے غلبے کی ہندو مزاحمت" اسی طرح حقائق کی پردہ پوشی کر کے مورخوں نے ہندو مسلم عناد کا ہاتھ بٹایا ہے۔ معلوم کرنے کی بات یہ ہے کہ ہلدی گھاٹی میں حقیقتاً ہوا کیا تھا؟

طلوعِ آفتاب کے تین گھنٹے بعد جنگ شروع ہوئی، شاہی فوج تقریباً دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ فوج میں سب سے آگے مان سنگھ تھا در اجپوت کمانڈر رائے لون کرن اور راجہ جگناتھ، ان کے ساتھ بارہا سید، غیاث الدین اور علی آصف خان تھے۔ رانا پرتاپ کی فوج میں تین ہزار گھوڑ سوار، دو ہزار پیدل، ایک سو فوجی ہاتھی اور چار سو تیر کمان والے سپاہی تھے۔ مان سنگھ نے اپنی فوجوں کو قدیم مغل انداز پر مرتب کیا تھا۔ ہراول، قلب، میمنہ میسرہ، سپاہِ عقب اور ایک اِلتمش یا فاضل دستہ جسے جہاں ضرورت پڑے بھیجا جا سکے۔ رانا کی فوجوں کو میدانِ جنگ میں آنے کے لیے ایک تنگ راستے (درّہ) سے گذرنا پڑا اس لیے وہ اپنے کو کوئی باقاعدہ اور منظم ترتیب نہیں دے پائے۔ لڑائی کا پہلا دور رانا پرتاپ کے حق میں رہا۔ افغان حکیم خاں سور کے ایک حملے نے لُون کَرن راجپوت کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ شاہی فوج بلندیوں سے پیچھے ہٹ کر ایک ایسے مقام پر آگئی جہاں سے وہ لڑائی اپنی مرضی کے مطابق لڑ سکتی تھی۔ یہ مقام آج کل رکت تلاؤ یعنی "خون کا تالاب" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مان سنگھ کی حکمتِ عملی کی صلاحیت کام آئی۔ جب وہ رانا کے ہاتھیوں کے آخری حملے کے مقابلے پر جا رہا تو دشمن کی فوج

کی پسپائی مکمل ہوگئی۔ بدایونی، جو چشم دید گواہ ہے، کے مطابق میواڑ کی فوج کے پانچ سو آدمی مارے گئے۔ اس کے مقابلے شاہی فوجوں میں ڈیڑھ سو افراد مارے گئے، اور ساڑھے تین سو زخمی ہوئے۔ مگر ہلدی گھاٹی سے متعلق کہانیوں میں یہ ہے کہ بدمعاش مسلمانوں سے ہندو و ہندوستان کی ناموس کی حفاظت کرتے ہوئے اسی ہزار راجپوت بہادروں کی جانیں تلف ہوئیں۔ تعداد کا نسبتاً کم ہونا برطرف۔ جس طرح رانا کی فوج میں راج پوت تھے اسی طرح اکبر کی فوج میں بھی راج پوتوں کی اچھی خاصی تعداد تھی مگر معمولی معمولی سیاسی جدوجہد میں وہ چاہے علاقائی خودمختاری سے متعلق ہوں یا ان کا تعلق اقتصادی مطالبات سے ہو، مذہبی قومی جنگوں میں تبدیل کی جاتی رہی ہیں جیسا کہ تاریخ داں ڈاکٹر ستیش چندر نے اپنے ایک مضمون "دی رُوٹس آف ہندو کمیونل ازم" میں اشارہ کیا ہے "حکومت کی مخالف تمام تحریکوں کو، ان کے مقاصد اور ان کے سماجی متن سے قطع نظر، مسلم جبر وظلم کی ہندو مزاحمت قرار دے کر "تعصب" کو ایک درجہ اور آگے کر دیا جاتا ہے۔ اسی لیے، رانا پرتاپ اور شیواجی جیسے لیڈروں کو جنھوں نے علاقائی خودمختاری کے لیے جدوجہد کی، یا پھر کسی مخصوص سماجی طبقے کی نمایندگی کی، انھیں جابر بدیسی حکومت کے خلاف لڑنے والے قومی لیڈروں کا مرتبہ عطا کر دیا جاتا ہے اس نقطۂ نظر سے پھر یہ کہنا دشوار نہیں رہتا کہ ہندوستان میں بدیسی مسلمانوں کی حکومت کا سارا زمانہ ایک بدیسی حکومت کا زمانہ تھا، اور ایک اکبر، ایک دارا شکوہ بھی اس کے بنیادی کردار کو بدل نہیں سکا۔

شیواجی، مشاہیر میں ایک اہم حیثیت کے مالک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صحیح معنوں میں اسی مرہٹہ سردار کے زیر اثر ہندو ازم کا عسکری احیا شروع ہوا۔ شیواجی کو ہندو احیا، کی مسیحائی کے میدان میں اپنے حریف رانا پرتاپ پر جو فوقیت حاصل ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ شیواجی نے جس شخص کو چیلنج کیا اسے بڑی آسانی سے مسلم جبر و تشدد کی علامت بنایا جا سکتا ہے اور یہ شخص تھا، اورنگ زیب۔ دوسری طرف رانا پرتاپ کا دشمن عظیم اور روشن خیال شہنشاہ اکبر تھا۔ وی ڈی ساورکر نے تیسری دہائی کے اواخر میں، ہندو مہاسبھا کو خطاب کرتے ہوئے ہندوستان میں بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ "ہندوستان کی فرقہ وارانہ تاریخ میں "شیواجی کی حیثیت اور ان کے مقام کا تعین یوں کیا تھا: "ہزاروں اور لاکھوں شہزادوں اور کسانوں نے مل کر اپنے غیر ہندو دشمنوں کے خلاف بغاوت کی، اور ہندو جھنڈوں کے سایے میں، ہندوؤں کی حیثیت سے کھڑے ہوئے، "لڑے" جانیں دیں۔ یہاں تک کہ شیواجی کا جنم ہوا۔ ہندوؤں کی فتح وکامرانی کی گھڑی آگئی، مسلمانوں کے غلبے اور فوقیت کا سورج ڈوب گیا۔" یہ بالکل صحیح ہے کہ شیواجی نے "ہندو پادشاہی" کا اعلان کیا اور ۱۶ جون ۱۶۷۴ء کو ان کے سر پر "چھتر پتی" کا

تاج رکھا گیا۔ مگر اس بات کی شہادت کہیں نہیں ملتی کہ انھوں نے بدیسی اور جابر و ظالم سمجھ کر، تمام مسلمانوں کو ملک سے نکال باہر کرنا چاہا۔ کچھ دہائیوں بعد رنجیت سنگھ نے خالصہ سلطنت قائم کی مگر یہ نہ تو ہندوؤں کے خلاف تھی اور نہ ہی مسلمانوں کے۔ شیواجی صحیح معنوں میں ایک ذہین اور طباع آدمی تھے۔ انھوں نے اٹھارہویں صدی میں ایک غالب طاقت بننے کے لیے مراٹھوں کی بہت ہمت افزائی کی۔ مگر مغلوں کے خلاف ان کی لڑائیوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑی جانے والی جنگوں کا رنگ دے دینا، بدنفس اور شر پسند تاویل کرنے والوں کا کارنامہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اکثر لڑائیاں انھوں نے کسی مسلمان جاگیر دار کے تعاون سے لڑیں۔ زندگی کے آخری برسوں میں، پڑوس کے گولکنڈا کا سلطان اورنگ زیب کے خلاف اپنے مشترکہ مقصد کے پیش نظر ان کا سب سے بڑا ساتھی تھا۔ اورنگزیب درحقیقت ایک ایسا بادشاہ تھا جس نے بیجاپور اور گول کنڈا کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف جنگوں میں، مراٹھوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ وقت، قوت اور روپیہ صرف کیا۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ مراٹھا مغلوں کو اچھوت سمجھتے تھے جب اورنگ زیب کے بیٹے شہزادہ اکبر نے بغاوت کی اس وقت شیواجی کا لڑکا شمبھوجی اس کا اصل ساتھی تھا۔ کچھ مدت کے لیے تو شیواجی کا شمار اورنگ زیب کے درباری رؤسا میں بھی تھا۔

شیواجی کے باپ، شاہ جی نے احمدنگر کے سلطان کی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے کام شروع کیا تھا، ان کی صلاحیتوں نے انھیں اعلیٰ عہدوں تک پہنچایا۔ ۱۶۳۶ء میں وہ ریاست بیجاپور کی ملازمت میں شامل ہوئے۔ اس وقت تک شیواجی پیدا ہو چکے تھے مگر شاہ جی اپنی بیوی جیجا بائی کو چھوڑ کر، اپنی دوسری بیوی کے ساتھ بیجاپور میں اپنی جاگیر پر چلے گئے۔ جیجا بائی دیواگری کے یادو حکمرانوں کی نسل میں سے تھیں۔ اپنے باپ کی طرف سے شیواجی میواڑ کے مشہور سیسودیا راج پوتوں سے اپنے سلسلے کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ شیواجی کی وراثت میں اچھی عسکری روایات ملی تھیں اور انھوں نے بہت جلد ہی یہ دکھا دیا کہ وہ عام صلاحیتوں سے زیادہ کے حامل ہیں۔ ۱۶۴۶ء میں انھوں نے تورنا کا قلعہ فتح کیا اور اس کے قریب ہی، توسیع کے لیے ایک اڈے کے طور پر راج گڑھ کا قلعہ تعمیر کیا۔ انھوں نے قلعوں کا ایک سلسلہ بنا لیا جہاں سے بیجاپور کو پریشان کیا اور ایک عظیم سلطنت قائم کر لی۔ جنوری ۱۶۵۶ء تک انھوں نے جاؤلی کے حکمران چندر راراؤ کو قتل کر کے جاؤلی کو ہڑپ کر لیا۔ (اس فتح نے ان کی ٹیکسوں سے ہونے والی آمدنی کو دوگنا کر دیا) اب وہ اس حالت میں تھے کہ مغلوں سے نبرد آزما ہو سکتے تھے چنانچہ اُن سے ان کی پہلی جھڑپ ۱۶۵۷ء میں ہوئی۔

۱۶۵۹ء میں وہ واقعہ ہوا جو ابھی تک متنازعہ فیہ ہے۔ بیجاپور کے سلطان نے اپنے جنرل افضل خان

کو شیواجی کے مقابلے میں بھیجا۔ امن کی ایک کانفرنس میں، جس کا اہتمام ایک برہمن ثالث نے کیا تھا، شیواجی نے خفیہ آہنی پنجوں سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شیواجی کے حامیوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے دھوکا دیا مگر زیادہ اہم بات شاید یہ ہے کہ جنگ اور ان ہنگامی حالات کے باوجود شیواجی کے باپ، بیجاپور کے دربار میں ایک اہم افسر رہے اور یہ وہی تھے جنھوں نے اس وقت بیجاپور اور شیواجی کے مابین مصالحت کرائی تھی، جب شائستہ خاں کی قیادت میں، اورنگ زیب نے اس ابھرتی ہوئی مراٹھا طاقت کو زیر کرنے کے لیے مغل فوجیں بھیجی تھیں۔ بالکل واضح ہے کہ شیواجی بیجاپور کے سلطان کو ایک "بدیسی" نہیں سمجھتے تھے جو ہندوستان کے ہندوؤں کو غلام بنا رہا تھا۔ جی نہیں وہ ہندوستان کی الجھی ہوئی سیاست کی شطرنج پر ایک اوسط درجے کی طاقت کا محض ایک اور مظہر تھا۔ شائستہ خاں اپنی ابتدائی کامیابیوں کے باوجود شیواجی کو زیر کرنے میں ناکام رہا۔

اب اورنگ زیب نے مراٹھوں کو مطیع بنانے کے لیے اپنا بہترین جنرل بھیجا اور یہ آدمی، کوئی زہریلا اور متعصب مسلمان نہیں تھا بلکہ بہترین روایات کی پاسداری کرتے ہوئے ایک راجپوت تھا۔ آمیر کے مرزا راجا جے سنگھ نے ۱۶۶۵ء میں شیواجی کے خلاف ایک تیز رفتار اور مستعد فوج کی قیادت کی۔ ۲۲ جون کو شیواجی کے ۳۵ قلعوں میں سے ۲۳ قلعے مغلوں کی نذر کر دیئے گئے۔ اس کے علاوہ مغل فوج کے لیے پانچ ہزار گھوڑ سوار فراہم کر دینے کا وعدہ کیا گیا۔ درحقیقت، بیجاپور سے مغلوں کی اگلی جنگ میں خود شیواجی نے مغلوں کی حمایت کی۔ شیواجی کو اورنگ زیب نے بہار میں ایک جاگیر عطا کی۔ اور پانچ ہزار گھوڑ سواروں کے ایک دستے کی قیادت کرنے والے (پنج ہزاری) سردار کا مرتبہ۔ بہرحال شیواجی نے اس پنج ہزاری کے عہدے کو اپنی حیثیت اور مرتبے کے اعتبار سے اپنی تحقیر سمجھا۔ انھیں اس سے اعلیٰ مراتب دیئے جانے چاہیے تھے۔ یہ خدشہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ دہلی میں ایک پر شکوہ قیدی سے زیادہ کچھ نہیں ہوں گے، شیواجی اپنے قلعوں کی طرف فرار ہو گئے۔

اگلے تین برسوں میں مغلوں کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ لیکن ۱۶۷۰ء تک شیواجی ایک بار پھر فتوحات کی جلو میں تھے۔ ۱۶۷۴ء تک انھوں نے اپنے آپ کو چھترپتی اعلان کرنے کے لائق سیاسی قوت و استحکام حاصل کر لیا تھا۔ ۱۶ اپریل ۱۶۸۰ء میں اپنے مرتے وقت انھوں نے ایک مضبوط و مستحکم سلطنت اپنے پیچھے چھوڑی۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ دوسری کمیونٹیز کے ساتھ دوستی اور مساوات پر ذاتی طور پر ایمان رکھنے والا (یہ خصوصیت اس کے دوسرے مراٹھا وارثوں میں نہیں تھی) شیواجی جیسا ایک شخص ہندو عسکریت کی علامت بن جائے۔ شیواجی ایک زبردست کمانڈر تھے جنھوں نے ایک علاقائی قوت قائم کی اور جس کے قائم کرنے میں انھیں دہلی کو بغیر اس کا

خیال کیے ہوئے کہ وہاں تخت پر کون متمکن ہے، چیلنج کرنا پڑا۔ ان کی فوج کے سنیر افسروں میں مسلمان تھے (افغان احمد شاہ ابدالی کے خلاف لڑی جانے والی انتہائی اہم پانی پت کی تیسری لڑائی میں مراٹھا توپ خانہ اور میسرہ کی قیادت ابراہیم خاں گاردی کر رہا تھا۔ روایت ختم نہیں ہوئی تھی)

شیواجی کی فتوحات کی غلط تاویل کی زیادہ وجہ یہ ہے کہ شیواجی پہلے ہندو حکمراں تھے جنھوں نے ناقابلِ تسخیر مسلم راجپوت مغل متحدہ فوجوں کے مقابلے میں اپنے وجود کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ انھیں شکست بھی دی۔ شیواجی نے یہ سب کچھ باہمی اخوت اور اتحاد و مساوات کا وہ احساس بیدار کر کے کیا جو ماضی کی ہندو فوجوں میں شاذ ہی نظر آتا ہے۔ ہندوستانی تاریخ کے بہت سے مشکل سوالات میں سے ایک سوال یہ ہے کہ بار بار ایسا کیسے ہوتا تھا کہ چھوٹی چھوٹی فوجیں جن کی سربراہی مسلمان کر رہے ہوتے تھے اور جنھیں مشکل ترین مہموں میں اپنے مرکزوں سے سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنا پڑتی تھی، اتنی حقارت آمیز آسانی کے ساتھ، اُن فوجوں کی شکست و ریخت کر دیتے تھے جن سے ان کا راستے میں یا پھر دہلی میں سامنا ہوتا تھا۔ آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا، میں ونسینٹ اسمتھ ایک جواب فراہم کرتا ہے: "ہندوؤں کی حکمت عملی اور طریقہ کار فرسودہ تھا جن کی بنیاد ان قدیم کتابوں پر تھی جنھوں نے بدلتے طریقوں کا کوئی لحاظ نہیں رکھا تھا اور پھر ہندوستانی فوجوں کی قیادت کا اتحاد، کم و بیش ہمیشہ، قبائلی، فرقہ وارانہ یا ذات کی تفریق کی وجہ سے مشکل ہوتا تھا۔"



(۹)

بھارت ماتا کی جے

ہندوستان کے ذات پات کے نظام نے یہاں کی عسکری کارکردگی پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ یہ نقطۂ نظر اگرچہ مصدقہ نہیں ہے مگر دلچسپ اور منطقی ضرور ہے۔ اپنے اس ذات پات کے نظام کی بنا پر ہندو سماج یقیناً اثر پذیر رہا اور صرف فوجی اعتبار سے مفتوح ہونے کے معاملے میں ہی نہیں بلکہ تبدیلِ مذہب کے سلسلے میں بھی۔ یہاں کی فوجوں کا بے لوچ ڈھانچہ درحقیقت، یہاں کے سماجی ڈھانچے کی بے لوچ فطرت ہی کا پرتو ہے اور ایک قبائلی ہندوستان کو مسلمان بنانے والی چیز کوئی عظیم شمشیر بازی نہیں بلکہ ہندو ازم کی فطری کمزوری تھی۔ بلاشبہ جبریہ تبدیلِ مذہب کا یا حکمراں طبقے کے مذہب کی کشش کا ایک عنصر ضرور تھا مگر مشرف بہ اسلام ہونے کے واقعات کی کثرت اور اس کی توانائی کی وضاحت اس سے نہیں ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو یہاں فتح حاصل کرنے آئے تھے اپنے عقائد اور اپنی معاشرت کو ساتھ لائے، اور ان سب کے ساتھ یہاں بس جانے کی وجہ سے ان کی حیثیت درحقیقت تارکِ وطن کی ہوگئی تھی۔ وہ یہاں کے لوگوں میں کچھ اس طرح گھل مل گئے کہ جسے آپ محض سیاسی کنٹرول کا کرشمہ نہیں قرار دے سکتے صوفیا کی مثال اور ان کی ترغیب و تحریک نے سماجی درجات کے خصوصاً نچلے حصوں کو بہت متاثر کیا۔ اس حقیقت کو آج تسلیم کیا جا رہا ہے۔ چرن سنگھ (جو جنتا حکومت کے عہد کے آخری زمانے میں ایک مختصر مدت کے لیے وزیر اعظم بھی ہوئے تھے) جیسا آج کے زمانے کا لیڈر کہتا ہے کہ وہ لوگ جو شعوری طور پر اپنی ذات کی حدبندیوں کو توڑ کر نکلتے ہیں (مثلاً شادی بیاہ کے ذریعے) انھیں سرکاری نوکریوں سے سرفراز کیا جانا چاہیے، کیونکہ یہ بنیادی طور پر ہندو سماج کو مزید تباہی سے بچانے کا ایک اقدام ہے۔ شیخ عبداللہ بار بار یہ کہا کرتے تھے کہ اگر ہندوستان میں یہ ذات پات کا نظام نہ ہوتا تو تبدیلِ مذہب کے واقعات بھی نہ ہوتے۔

اس بات کو سمجھنا کوئی بہت مشکل نہیں ہے کہ ہندوؤں میں اس وقت تک اتحاد نہیں ہو سکتا جب تک ان

ہیں ذات پات پر عقیدہ ہے۔ عوامی ووٹ کے نقطۂ نظر سے، ہندو بنیاد پرست تنظیمیں بہت کامیاب نہیں ہو سکتی ہیں اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ ملک کا ۸۲٫۷ فی صد حصہ جو ذات پات کو مانتا ہے وہ ووٹ دینے والے ہندوؤں کا ہے۔ اچھوت اور قبائلی ذات پات والے ہندو سماج سے خفا ہیں، ان کی یہ خفگی محض اقتصادی استحصال کی بنا پر نہیں ہے۔ سماجی تحقیر اتنی زیادہ ہے کہ ملک کے دیہی علاقوں میں انھیں جان بوجھ کر ایک فاصلے پر رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ برہمنوں اور ٹھاکروں کے اعلیٰ طبقات سے لے کر بمشکل قابل برداشت ادنیٰ ذاتوں تک۔ خود اس نظام میں جو اختلاف اور ضمنی اختلافات ہیں وہ ایک سیاست داں کے لیے جو ووٹ حاصل کرنے اور کامیاب ہونے کے لیے کوئی متحدہ گروہ بنانے کی کوشش کرنا چاہتا ہے، بھیانک خواب کی حیثیت رکھتے ہیں "سنہرے قدیم ہندو سماج" کی دل کشی اور دلربائی درحقیقت اوپر کی چند اعلیٰ ذاتوں تک محدود ہے اسی لیے اس بات پر کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ ملک میں سب سے زیادہ بااثر ہندو تنظیم کی قیادت، جو افغانستان سے برما تک ایک ہندو سلطنت کے سبز باغ دکھاتی رہتی ہے اور جس کے لیڈر گولوالکر اور ساورکر جیسے لوگ ہیں حقیقتاً برہمنوں کی جاگیر ہے۔ یہی ہے راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ جو عام طور پر آر۔ ایس۔ ایس کہلاتی ہے۔

آر ایس ایس کا مقصد اور اس کی سمت بالکل واضح ہے۔ "یہ مذکورہ پارٹی، ایک نیم فوجی تنظیم ہے۔ یہ ملک و قوم پر قبضہ کرنا اور نازی لیڈروں کے نمونے پر ایک تحکمانہ حکومت قائم کرنا چاہتی ہے" یہ لکھا تھا جنتا پارٹی کے لیڈر اور ممتاز نظریہ ساز مدھو لیمائے نے ۱۰۔ جون ۱۹۷۹ء کے رسالہ 'سنڈے' میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں۔ یہ واقعہ ہے کہ دہلی میں آر ایس ایس سے اپنے تعلق کو باقاعدہ ختم کرنے پر نہ تیار ہونے کے تنازعے کی بنا پر جنتا حکومت ٹوٹی تھی۔ لیمائے کی بات، درحقیقت بازگشت تھی گاندھی جی کے خیالات کی جس کا اظہار انھوں نے بہت پہلے کیا تھا۔ گاندھی جی کے سکریٹری پیارے لال کے مطابق، گاندھی جی نے آر ایس ایس کو ایک یک جماعتی نقطۂ نظر رکھنے والی فرقہ پرست پارٹی کہا تھا اور نازیوں اور فاشسٹوں سے اس کی مثال دی تھی۔ اور یہ سب کچھ اس وقت ہوا تھا جب بیسویں صدی کی بیسویں دہائی میں گاندھی جی کانگریس کو انتہائی عزم کے ساتھ سیکولرزم کی جانب لے گئے تھے۔

کیشو ہیڈگیوار یکم اپریل ۱۸۸۹ء کو پیدا ہوئے۔ یہ دکن میں کنڈ کرتی گاؤں کے ایک برہمن پروہت بلی رام ہیڈگیوار کے تیسرے بیٹے تھے۔ ۱۹۰۲ء تک ان کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور خاندان کی دیکھ بھال ان کے بڑے بھائی مہادیو نے شروع کی تھی۔ ان کا بچپن کوئی خوش گوار بچپن نہیں تھا۔ بڑا بھائی مسلسل چھوٹے بھائی

کو مارتا تھا۔ کیشو نے، جنھوں نے ڈاکٹر بننے کا تہیہ کر لیا تھا، کلکتہ میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ سیاست میں ان کی دلچسپی کو مہمیز لگائی مہاراشٹر کے ڈاکٹر بی۔ ایس مونجے نے۔ اور ان ہی نے طالب علمی کے زمانے میں بھی کیشو کی امداد بھی کی تھی۔ ڈاکٹر مونجے جیسے لوگ دوسری دہائی میں کانگریس کے اس نظریاتی رُخ سے بہت پریشان تھے جو گاندھی جی اسے دے رہے تھے۔ کانگریس کے پلیٹ فارم پر گاندھی جی کا مقابلہ کرنے میں ناکامی کے بعد انھوں نے ایسی نئی تنظیموں کے قیام کے سلسلے میں سوچنا شروع کیا جو صحیح معنوں میں ان کی آرزوؤں کی عکاسی کریں اور ان کے خوابوں کے ہندوستان کی جو بنیادی طور پر ہندوؤں کے مفادات کو پیش نظر رکھے گا، تشکیل کر سکیں۔ انھیں اس خیال پر بھی طیش آتا تھا کہ صدیوں کی مسلم حکمرانی کے بعد بھی گاندھی جی ایک بار پھر مسلمانوں کے سامنے گھٹنے ٹیک رہے تھے اور ان کے ساتھ اس ہندو ملک میں برابر کے شہریوں کی طرح سلوک کر رہے تھے۔

آر ایس ایس کا قیام کیوں ہوا؟، اس کے بارے میں ہیڈگیوار کے سوانح نگار سی پی بھشیکار لکھتے ہیں "ڈاکٹر جی (ہیڈگوار) کافی مدت تک قومی تشخص کے مسئلے پر غور و خوض کرتے رہے ..... (وہ سوچتے تھے) کہ ہندوستان میں قومیت کے سلسلے میں کوئی ابہام کیوں ہو؟ ..... قوم پرست مسلمان اور قوم پرست عیسائی جیسے انوکھے طرز اظہار کا چلن کیوں کر ہوا؟ آر ایس ایس کے غصے کا ہدف بالکل واضح تھا۔ ہندو قوم پرستی کو سب سے بڑا خطرہ "سانپوں" سے تھا۔ ہیڈگیوار کی یہ اصطلاح مسلمانوں کے لیے تھی۔ آر ایس ایس کی ایک آفیشل کتاب "شری گروجی۔ دی مین اینڈ ہز مشن" میں وضاحت کی گئی ہے۔ "یہ بات صاف ظاہر ہو چکی ہے کہ بھارت میں ہندو قوم ہیں اور یہ کہ ہندوتوا، راشٹریتوا تھی (یعنی ہندوازم، قوم پرستی تھی) حسن اتفاق ہے کہ جناح صاحب نے اس سے اتفاق کیا کہ ہندو ایک الگ قوم ہیں) ..... اس عظیم شخصیت کی روحانی الجھن نے، راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے قیام میں اپنے آپ کو ظاہر کر دیا۔ چار دوستوں کے ساتھ مل کر انھوں نے آر ایس ایس کے یومیہ پروگراموں کا آغاز کیا۔ اس تنظیم کے آغاز کا دن تھا ۱۹۲۵ء میں دسہرے کا متبرک دن۔

پانچ دوست جنھوں نے آر ایس ایس کو شروع کیا تھا، وہ تھے ڈاکٹر بی ایس مونجے، ڈاکٹر ایل وی پرانجپے، ڈاکٹر تھولکر، بابا راؤ ساورکر اور خود ڈاکٹر ہیڈگیوار۔ ابتدا میں تنظیم کے نام کے سلسلے میں ایک دقت تھی۔ ۱۹۲۱ء میں کانگریس نے اسی نام کی ایک تنظیم قائم کی تھی۔ یہ تنظیم چل نہ سکی اور ختم ہو گئی۔ مگر اس نئی تنظیم اور اس متبرک کوشش پر قابل نفرت کانگریس کا ذرا سا بھی سایہ مردود و ملعون تھا۔ ایک متبادل نام "ہندو سویم سیوک سنگھ" تجویز

ہوا مگر نام میں قوم پرستی کے پر تو پر ہیڈ گیوار ڑ نے اصرار کیا۔ اسی لیے یہ راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ ہی رہا۔ آر ایس ایس نے ستمبر ۱۹۲۷ء کے ناگپور کے ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات میں اپنی کارگزاریوں کی بنا پر سب سے پہلے ظاہر ہے کہ ہندوؤں کی "محافظ" تنظیم کا عوامی رتبہ حاصل کیا۔

آزادی کی جدوجہد سے آر ایس ایس نے اپنے آپ کو الگ رکھا، کیوں کہ جو شخص اس کی قیادت کر رہا تھا (یعنی گاندھی جی) اس کے لیے سنگھ کے پاس نفرت کے علاوہ کچھ نہیں تھا، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بعض لوگوں کو یہ شک بھی تھا کہ آر ایس ایس گاندھی جی کی مخالفت میں انگریزوں کی مدد بھی کر رہی ہے۔ آر ایس ایس نے فرقہ وارانہ فسادات کے زمانے میں اپنی اصل حیثیت اور اپنا حقیقی مقام حاصل کیا۔ ۱۹۴۵ء تک اس کے دس ہزار والنٹیر تھے اور اس کے پاس سرمایہ بھی اتنا ہو گیا تھا کہ اس نے ایک سال سے کم مدت میں "ہیڈ گیوار بھون" کے نام سے اپنے ہیڈ کوارٹرز بھی تعمیر کر لیے۔ تقسیم سے قبل کے، پاگل پن کے زمانے میں، خود حکومت کے اعلیٰ ترین حلقوں میں امپیریل سول سروس میں ایک بازو آر ایس ایس کا تھا۔ امپیریل سول سروس کے زیادہ تر لوگ آکسفورڈ اور کیمبرج یونی ورسٹیوں کے گریجویٹس تھے۔ آر ایس ایس کو درحقیقت یہ یقین تھا کہ روایتی جمہوریت کے وسیلے سے نہیں بلکہ نظام حکومت پر قابو کے ذریعے قوت اس کی گرفت میں تھی اس کا ہدف تعداد نہیں اصل تکمیل تھی۔ اور آر ایس ایس کو اس بات کا بھی یقین نہیں تھا کہ انگریز، حکومت ان کھدر پوشوں کے حوالے کر دیں گے۔ آر ایس ایس کے ایک سابق ممبر دیس راج گوئل اپنی بڑی معلوماتی کتاب "آر ایس ایس" (رادھا کرشن پرکاشن، نئی دہلی) میں لکھتے ہیں کہ وہ کادر کی ایک میٹنگ میں موجود تھے جسے ہیڈ گیوار ڑ کے جانشین گرو گولوالکر نے خطاب کیا تھا۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے کے بعد آر ایس ایس کا کیا رول ہوگا؟ تو گولوالکر نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا کہ "کیا تم کو یقین ہے کہ انگریز ہندوستان چھوڑ دے گا؟ وہ جن کمزور اور بے وقوف لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور دے رہے ہیں وہ اسے دو مہینے بھی نہ سنبھال پائیں گے۔

۱۹۳۹ء میں آر ایس ایس نے، اپنے ممبروں کے لیے باقاعدہ طور پر ایک سنسکرت پرارتھنا شروع کی:

" اے مُشفق ماتر بھومی! میں تیرے سامنے سر جھکاتا ہوں،

اے ہندوؤں کی سرزمین! تو نے سکھ چین میں میری پرورش کی،

اے مقدس اور اچھی سرزمین! میں اپنا سارا وجود تیرے لیے وقف کرتا ہوں، میں تیرے سامنے بار بار سر جھکاتا ہوں۔

اے شکتی شالی بھگوان! ہم ہندو راشٹر کے اٹوٹ اراکین تجھے انتہائی عقیدت کے ساتھ سلام کرتے ہیں۔"

آر ایس ایس کی مقدس صفوں میں داخلے سے پہلے ہر ممبر کو ایک حلف لینا ہوتا ہے:

"حاضر و ناظر بھگوان اور اپنے اجداد کے نام پر میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ہندو مذہب، ہندو سماج اور ہندو سنسکرتی کو بڑھانے میں اور اس طرح اپنے دیس بھارت کی عظمت کو حاصل کرنے کے لیے راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کا ممبر بن رہا ہوں۔ میں سنگھ کا ہر کام اپنا نفع نقصان دیکھے بغیر اپنے جسم، اپنے دماغ اور اپنی روح سے ایمانداری کے ساتھ کروں گا۔ اور اپنے اس عہد کو جیون بھر نہیں توڑوں گا بھارت ماتا کی جے۔"

۱۹۴۸ء میں آر ایس ایس کو ایک دھکا پہنچا۔ خود سردار پٹیل بھی اس جرم سے صرف نظر نہ کر سکے جس کی ہمت افزائی اس تنظیم نے کی تھی، اور یہ جرم تھا مہاتما گاندھی کا قتل۔ وزیر داخلہ سردار پٹیل نے آر ایس ایس کو ممنوع قرار دے دیا۔ کیوں کہ "عملی طور پر اس کے ممبروں نے اپنے اعلان کیے ہوئے نظریات کا پاس نہیں کیا تھا۔" بہر حال سنگھ کی قابل اعتراض بلکہ نقصان دہ سرگرمیاں اور سنگھ کی ان سرگرمیوں سے جذبہ اور توانائی حاصل کرنے والی پُر تشدد کارروائیاں بدستور جاری رہیں اور بہت سے لوگ ان کے شکار ہوئے۔ سب سے قیمتی جان جو ان کی نذر ہوئی وہ خود گاندھی جی کی تھی۔ سنگھ پر سے یہ پابندی ۱۹۴۹ء میں اس وقت اٹھا لی گئی جب سنگھ نے یہ کہا کہ آئینی طور پر اس کے خلاف کوئی جرم بھی ثابت نہیں کیا جا سکا ہے۔ مگر اس بار اس نے "ایک تحریری اور طبع شدہ آئین کے تحت، اور اپنی سرگرمیوں کو ثقافت تک محدود رکھنے، تشدد اور پوشیدگی کو ترک کرنے، ہندوستان کے آئین اور قومی جھنڈے سے وفاداری کا اعلان کرنے اور ایک جمہوری تنظیم" بنانے پر رضامندی ظاہر کی۔ جب ان کا یہ آئین شائع ہوا تو اس میں دفعہ ۵ تھی "اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ ملک کا وفادار ہو اور ملک کے جھنڈے کا احترام کرے، سنگھ ہند و تہذیب کی ایک قدیم علامت بھگوا دھوج کو اپنا جھنڈا بنائے گی۔" دفعہ ۶ (الف) میں درج تھا کہ اٹھارہ برس یا اس سے زیادہ کا صرف ہندو مرد ہی آر ایس ایس کا ممبر ہو سکتا ہے۔

دوسری بار آر ایس ایس پر پابندی ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد لگی۔ مسز اندرا گاندھی نے تمام فرقہ پرست جماعتوں کو ممنوع قرار دے دیا تھا، جن میں آر ایس ایس بھی تھی اور جماعت اسلامی بھی۔ بعد کو جب ایمرجنسی ختم ہو گئی، آر ایس ایس نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ گویا انھوں نے اس اہم دور میں بڑا دلیرانہ رول ادا کیا ہے، مگر حقیقت بالکل مختلف تھی۔



⑩

جمہوریت کا مظہر

جب ۴ جولائی ۱۹۷۵ کو آر ایس ایس پر پابندی لگی ہے اس وقت اس کے سربراہ مدھوکر دتاتریہ دیورس حراست میں تھے۔ جیل سے، آر ایس ایس کے سربراہ نے مصالحت کی درخواست شروع کی۔ اس بات کی شہادت اس وقت ملی جب ان خطوط کا انکشاف شروع ہوا جو سربراہ نے ایمرجنسی کے زمانے میں حکومت کو لکھے تھے۔ دیورس نے پہلا خط مسز اندرا گاندھی کو اس کمزور سے بہانے کا سہارا لے کر لکھا کہ وہ ان کی پندرہ اگست کی تقریر پر اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں۔ دیورس نے لکھا "آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونے والے قوم سے آپ کے بڑے متوازن خطاب کو میں نے غور سے سنا تھا اسی لیے میں نے آپ کو خط لکھنے کے لیے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔" خط میں آر ایس ایس کے خالص ثقافتی تنظیم ہونے، سیاست میں کوئی دلچسپی نہ رکھنے اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے نیک خواہشات کے علاوہ دل میں کچھ نہ رکھنے پر ایک طول طویل وعظ کے بعد خط کو ختم اس بات پر کیا گیا تھا کہ مسز گاندھی سے شرفِ ملاقات، دیورس کے لیے انتہائی مسرت اور خوشی کی بات ہوگی۔ ایک دوسرے خط میں مسز اندرا گاندھی کو ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں بدعنوانیاں کرنے کے الزام سے بری کرنے کے سپریم کورٹ کے فیصلے پر مبارک باد دی گئی تھی اور ملک و قوم کی خوش حالی کے لیے آر ایس ایس کے ایک لاکھ والنٹیرز مسز گاندھی کی ماتحتی میں دینے کی پیش کش کی گئی تھی۔ آر ایس ایس کے اخبار اور رسائل نے مسز گاندھی اور ان کے بیٹے سنجے گاندھی کی تعریف و توصیف کرنا شروع کر دی تھی۔ بعد کو جب ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں جنتا پارٹی نے کامیابی حاصل کی تو ظاہر ہے کہ آر ایس ایس نے دعویٰ کرنا شروع کیا کہ ایمرجنسی کے زمانے میں جد و جہد کی اصل ہیرو وہی ہے۔ اس تنظیم نے اہم اور کلیدی جگہوں پر اپنے ہمدردوں کو پہنچانے میں جنتا پارٹی کے عہدِ حکومت کو بڑے موثر طور پر استعمال کیا۔ جھوٹی تاریخ کے رول سے اچھی طرح واقف ہونے کی وجہ سے آر ایس ایس دوست سیاست دانوں نے

رومیلا تھاپر جیسی ایمان دار تاریخ دانوں کی کتابوں کو تعلیمی اداروں کی منظور کی ہوئی فہرستوں سے خارج کرنے کے لیے جنتا حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی، مگر ان کے ناکام ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انھوں نے کوشش میں کوئی کمی کی تھی۔ بہرحال ان کے ناجائز دباؤ اور مسلمانوں کے خلاف فسادات میں ان کے جارحانہ رول نے جنتا حکومت کے پرخچے اڑا دیے۔

مگر آر ایس ایس کے ایمرجنسی کے زمانے میں اتنی بزدلی کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے کی وجہ اس کی امدادی بنیاد کی نوعیت تھی۔ برہمن اور ٹھاکر آر ایس ایس کے حوصلوں کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار تو کر سکتے تھے مگر ان دونوں ذاتوں کی سیاست کا کم و بیش تعلق، مشترک اور اجتماعی بنیادوں والی پارٹیوں سے رہا ہے۔ آر ایس ایس کو اس کے کٹر اور نرم دونوں طرح کے ممبر شہروں کے متوسط طبقوں اور خاص طور پر چھوٹی بورژوا طبقے سے ملتے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ بہت سے علاقوں میں آر ایس ایس کو "بنیا" یا "تجارت پیشہ" لوگوں کی پارٹی ہی کہا جاتا ہے۔ یہی تاجر افراد تھے جو حکومت کی سختیوں، خصوصاً ٹیکس کی وصولی کی کارروائیوں سے ڈر گئے۔ آر ایس ایس کے اس "تاجرانہ" تاثر سے اسے مدد نہیں ملی، کیونکہ اس نے مزارعوں کو اس سے دور کر دیا۔ مگر آر ایس ایس اپنے اس تاثر سے اپنے دامن کو چھڑا نہیں سکا، کیوں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے طرزِ زندگی سے اس کا براہِ راست تعلق ہے۔

ہندوستان کی آبادی میں مسلمان گیارہ فی صدی ہیں، مگر سوائے جموں و کشمیر اور علاقائی اعتبار سے اہم لکش دیپ کے جزائر، کہیں بھی اکثریت میں نہیں ہیں۔ کشمیر میں بھی چھ اضلاع ہیں جن میں ریاست کے چھیاسٹھ فی صدی مسلمان رہتے ہیں، لیکن ہندوستان کے دوسرے تین سو چھپن اضلاع میں صرف دو اور ضلع ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ ان میں ایک مغربی بنگال میں مرشد آباد، اور دوسرا کیرالا میں نیا بنا ہوا مالاپورم کا ضلع۔ ملک کے دو سو چونتیس اضلاع میں مسلمانوں کی تعداد آبادی کے تناسب کے لحاظ سے دس فیصدی سے کم ہے۔ صرف تیس اضلاع ایسے ہیں جن میں مسلمان بیس فی صدی سے زیادہ ہیں۔ مسلمانوں کی کل آبادی کا تقریباً نصف حصہ، اتر پردیش، بہار اور بنگال کے وسیع و عریض صوبوں میں بستا ہے۔ اگرچہ اسباب تاریخی ہیں مگر ان کی آبادی کا اس طرح بکھرا ہونا ان میں ایک طرف عدم تحفظ کا احساس پیدا کرتا ہے اور دوسری طرف ان میں خود اعتمادی بھی نہیں ہے جو ہونی چاہیے تھی۔

مزید یہ کہ، مسلمانوں کی اقتصادی قوت روایتی طور پر زمین (زراعت) تک محدود رہی ہے اتر پردیش

کے زمیندار طبقے اور ان کے ساتھی بیوروکریٹس ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلے گئے۔ جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے ان میں گاؤوں میں، چھوٹے کاشت کار، کھیت مزدور اور اہلِ حرفہ اور شہروں میں نچلے متوسط طبقے کے لوگ تھے اگرچہ مسلمان شہری علاقوں میں ہمیشہ بہت بڑی تعداد میں رہے مگر ان میں کوئی سرمایہ دار طبقہ کبھی نہیں تھا۔ ۱۹۷۱ کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی شہری آبادی میں ۱۶٫۲۱ فی صدی مسلمان تھے اور دیہی آبادی میں ان کا تناسب محض ۹٫۹۶ فی صدی تھا۔ ملک کی تقسیم جمہوری ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ایک زبردست دھکا تھی۔ گاؤوں میں، زمینداروں کی سرپرستی معدوم ہو گئی۔ دستکار نئے کارخانوں کا مقابلہ کر نہ پایا۔ اس بے چارے کے پاس نہ تو تجارتی صلاحیت تھی اور نہ ہی سرمایے کی سہولت۔ شہری علاقوں میں، بنیوں کے سرمایے اور ایک غیر ہمدرد نوکرشاہی کے زیرِ اثر چلنے والی ملازمتوں کی منڈی میں جہاں یوں ہی بہت مجمع تھا، مسلمانوں کو شدید تر امتیاز و تفریق کا ہدف بننا پڑا۔ دیہی علاقوں میں پرامن بقا کے امکان اگرچہ مبہم تھے مگر ممکن تھے لیکن شہری علاقوں خصوصاً چھوٹے قصبوں میں زندگی انتہائی بے رحم اور مقابلہ انتہائی شدید تھا اور مسلمانوں کے سامنے، حرفوں اور تجارت کے ذریعے اپنے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے علاوہ کوئی صورت نہیں تھی۔ پیٹی بورژوا ہندو کے ساتھ ہونے والے مقابلے نے علی گڑھ، جمشید پور، جبل پور، احمد آباد، مراد آباد یا بھیونڈی جیسے چھوٹے اور متوسط شہروں میں بالآخر فرقہ پرستی اور تشدد کا رخ اختیار کر لیا۔ یہ تمام جگہیں مذہبی تشدد کے لیے مستقل طور پر سازگار ہو گئیں۔ کلکتہ اور بمبئی جیسے بڑے ساحلی علاقوں میں مسلمان نوجوانوں کو ایک دوسرا موقع ہاتھ آیا اور یہ لوگ اسمگلنگ کے روز افزوں کاروبار میں لگ گئے۔ اور ان کی سرپرستی، بدمعاشوں کی دنیا کے مسلمان لیڈروں نے کی جو سیاہ اقتصادیات میں آگے آگے تھے۔ قصبوں میں، ہندو پیٹی بورژوازی کے لیے تحفظ و سرپرستی کی بہترین ضامن آر ایس ایس بن گئی۔ جہاں اقتصادی مفادات کو ایک نسبتاً بڑے مقصد کے پردے میں چھپایا جا سکتا تھا جس نے ہندو ہندوستان پر ایمان رکھنے والے نوجوانوں اور سیدھے سادے پرولی ٹیریٹ (عوام) دونوں کی حمایت حاصل کی۔ مسلمانوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا کیوں کہ وہ اپنی متوازی تنظیموں کے لیے حکام کی خاموش اور خفیہ امداد و تعاون کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔

جہاں تک اہم اور با اثر ملازمتوں کا تعلق ہے، وہ کسی ایک سبب یا کسی دوسری وجہ کی بنا پر ان کے لیے نہیں تھیں اس صورت حال کی ایک وجہ ان کے اُس تعلیم کی طرف سے تحفظات تھے جو ایک ایسے سماج کے لیے ضروری تھی جو ایک سست رفتار ملی جلی اقتصادیات کے سہارے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور جس پر

قدامت پسند مفادات کا غلبہ تھا۔ اگرچہ اعداد و شمار، حقائق کو ظاہر نہیں کرتے، مگر حقیقت کی راہ ضرور سجھا دیتے ہیں۔ سید شہاب الدین جو فارن سروس میں ایک ذہین افسر تھے، اور جنھوں نے سیاست میں حصہ لینے کے لیے اپنے شاندار کیریر کو ترک کر دیا ہے، آج کل جنتا پارٹی کے جنرل سکریٹری ہیں، ایک ماہنامے "مسلم انڈیا" میں جسے وہ خود نکالتے ہیں، اکثر بڑے معلوماتی اعداد و شمار شائع کرتے رہتے ہیں، ان کا یہ ماہنامہ تحقیق، حوالہ جات اور دستاویزی حیثیت رکھتا ہے ان کے دیئے ہوئے اعداد و شمار ملاحظہ ہوں:

۱۹۸۱ء تک، ملک میں انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کے تین ہزار آٹھ سو تراسی افسروں میں صرف ایک سو سولہ مسلمان تھے۔ انڈین پولیس سروس میں بھی تناسب کا کچھ یہی حال تھا۔ ایک ہزار سات سو ترپن میں پچاس۔ قومی بنکوں کے ایک لاکھ تیرہ ہزار سات سو بہتّر افسروں میں سے مسلمان صرف دو ہزار چار سو اُناسی تھے۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے دفاتر میں تناسب بالترتیب ۴۱ر۴ اور ۱٫۰۶ تھا۔ عدلیہ میں چار ہزار آٹھ سو اٹھانوے حکام میں تین سو تین مسلمان تھے۔ صرف ایک جگہ ہے جہاں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق ہے اور وہ ہے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے پبلک سیکٹر کے کاروبار۔ ان کاروباروں میں کام کرنے والے افسروں کی کل تعداد چار لاکھ چھہتّر ہزار نو سو بہتّر تھی اور ان میں اکیاون ہزار سات سو پچپن مسلمان تھے۔ نجی سیکٹر میں کام کرنے والے سنیئر مسلم ملازموں کی تعداد کا سرسری جائزہ بھی کچھ بہت ہمت افزا نہیں ہے۔ پونڈس انڈیا لمیٹیڈ ۱۱۵ میں ایک، دہلی کلاتھ ملز ۹۸۷ میں دو۔ بروک بانڈ میں ۶۸۲ میں پانچ، آئی ٹی سی میں ۹۶۶ میں سترہ۔ جے کے سینتھیٹکس میں ۵۳۶ میں ۵، امبالال سارا بھائی میں ۶۲۸ میں ۵ مسلمان ہیں۔ (یہ اعداد و شمار کمپنیوں کی سالانہ رپورٹوں سے لیے گئے ہیں جن میں سنیئر ملازموں کی تنخواہ کی فہرست دینا لازمی ہوتا ہے) مسلمانوں کے اقتصادی مسائل کی وجہ غفلت بھی ہے اور بے توجہی بھی۔ غفلت خود مسلمانوں کی اور بے توجہی ملک کی۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں، مسلم قیادت یا تو مایوسی کا شکار تھی یا پھر اس پر بے یقینی کی کیفیت طاری تھی، دوسری طرف مسلم لیگ کے جو لیڈر ہندوستان میں رہ گئے تھے انھوں نے مایوسی اور ناامیدی میں باتیں بنانا شروع کر دی تھیں۔ نمونے کے طور پر اڑیسہ اسمبلی میں مسلم لیگ کے لیڈر لطیف الرحمٰن کا وہ بیان ہے جو انھوں نے ۲۵ ستمبر ۱۹۴۲ء کو دیا تھا۔ "انڈین یونین کے مسلمانوں کو اب اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ انھوں نے پاکستان کی تحریک کی موافقت کر کے ایک فاش غلطی کی ...... آیئے اب ہم دو قومی نظریے کو بھول جائیں اور اپنی تمام تر وفاداریاں انڈین یونین کے لیے وقف کر دیں کیوں کہ پاکستان اپنے بار

بار دہرائے جانے والے اور فرسودہ دعووں کے باوجود ہمارے تحفظ کے لیے کچھ نہیں کر سکا اور یہ ہمارے لیے ایک فعل عبث ہوگا کہ ہم اپنے تحفظ اور اپنی سلامتی کے لیے ان کی طرف دیکھیں۔" سر فہرست تحفظ کا مسئلہ تھا، جس کا تعلق شدت پسند اور بجا طور پر ناراض رفیوجیوں اور مقامی ہندوؤں سے تھا۔ گاندھی جی نے متعدد بار یہ کہا کہ وہ یہ دیکھنے کے بجائے کہ ان کا ہندوستان ایسے تشدد کی گرفت میں جکڑ جاتا ہے وہ جان دے دینا پسند کریں گے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو انھوں نے اپنی جان کی قیمت دے دی مگر ان کی موت وہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی جس کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے ساری زندگی کوشش کی تھی۔ ان کی اس قربانی نے پاگل پن کو ختم کر دیا۔ مسلمانوں کو اچھا خاصہ وقفہ مل گیا۔ انھوں نے اپنے بکھرے ہوئے شیرازے کو جمع کرنا شروع کیا مگر اہم قوم پرست مسلمان لیڈر، مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے نہ تو وقت ڈھونڈ پائے اور نہ کافی توانائی۔ تین افراد جو مسلمانوں میں از سر نو زندگی پیدا کر سکتے تھے، وہ تھے، مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی اور شیخ عبداللہ۔ شیخ عبداللہ کشمیر میں رہے۔ رفیع احمد قدوائی کا جلد ہی انتقال ہو گیا اور ان کے کچھ ہی دنوں بعد مولانا آزاد بھی چل بسے۔ حکمراں پارٹی نے ان مسلمانوں کو آگے بڑھانے کی طرف توجہ کی جو اس کی ووٹ کی ضرورتوں اور مسلمانوں کی امدادی ضرورتوں کے درمیان توازن قائم رکھ سکیں اس کا آسان طریقہ یہ تھا کہ دشوار طلب اقتصادی ضرورتوں کو نظر انداز کیا جائے اور تشخص اور مذہبی حقوق کے تحفظ پر توجہ کو مرکوز کیا جائے اسی لیے زور دیا گیا، اپنی ذات پر ہونے والے حملوں سے بچاؤ کے لیے فرقے کی تنظیم پر، اس کے مذہبی قوانین کے مسلم پرسنل لا کے اور دینی اسکولوں اور اوقاف جیسے اداروں کے تحفظ پر۔ اردو زبان کے تحفظ کا مسئلہ اس حد تک موت اور زیست کا مسئلہ بن گیا کہ شدت پسند ہندوؤں نے اس کی تباہی کو اپنا مقصد ٹھہرا لیا۔ (یہ ضرور ہوا کہ اس عمل میں ایک خوب صورت زبان کو نقصان پہنچ گیا) تعلیم یافتہ اور پیسے کی طرف سے مطمئن تھوڑے سے مسلمان ابھی بھی پاکستان پر نظر جمائے ہوئے تھے اس سلسلے کی شاید معروف ترین مثال کرکٹ کے کھلاڑی آصف اقبال کی ہے جو پاکستان گئے اور وہاں کی کرکٹ ٹیم کے کپتان بنے۔ انھوں نے اپنے کھیل کی زندگی کا آغاز ریاست حیدر آباد کی کرکٹ ٹیم کے ممبر کی حیثیت سے کیا تھا اور چھٹی دہائی کے وسط تک پاکستان جانے سے قبل رانجی ٹرافی کے میچوں تک کھیلے تھے۔ تعلیمی اعتبار سے مسلم عوام اردو اسکولوں کے چکر سے نکل نہیں پائے۔ مولانا آزاد نے ان سے بار بار کہا کہ وہ ہندی کو ایک دشمن زبان نہ سمجھیں بلکہ اسے سیکھیں کہ ایسا کرنا ان ہی کے مفاد میں ہوگا۔ مولانا کی نصیحت پر کسی نے کان نہ دھرا اور انگریزی، اس کے حصول کی خواہش (اگر ہوتی) کے باوجود اقتصادی پسماندگی کی وجہ سے

اس فرقے کی دسترس سے باہر تھی۔

رویوں میں تبدیلی کی اگر کوئی تاریخ متعین کرنا ہو تو وہ سن انیس سو اکہتر ہوگی۔ وہ سال جب پاکستان کی موت ہوئی، اس وقت تک ۱۹۴۷ء کے بعد کی نسل (مڈنائٹس چلڈرن) بھی بلوغت کو پہنچ رہی تھی۔ مقابلہ کرنے کے لیے مسائل کی کمی نہیں تھی مگر اس آغاز میں انھیں ایک آسانی ضرور تھی اور وہ یہ کہ ملک کو تقسیم کرانے کے سلسلے میں ان میں کوئی احساسِ جرم نہیں تھا اور اس نے جلدی ہی یہ بات واضح کر دی کہ یہ زور زبردستی کو خاموشی سے انگیز کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہ نسل اس بات سے بخوبی واقف تھی کہ اسے خود اس ملک میں جہاں وہ پیدا ہوئی ہے رہنا اور مشقت کرنا ہوگا۔ خواب اور اس کا توڑ دونوں ختم ہو چکے تھے اور باقی رہ گیا تھا عزت اور تکریم کی آگ بجھانے کے ساتھ ایک اقلیت کی بقا کو یقینی بنانے کا دشوار کاروبار۔ مگر تکریم کی اس آگ کو بجھانے کے لیے کیا جتن ہوں گے؟ کیوں کر ہوں گے؟ خصوصاً اس صورتِ حال میں کہ ملک کی اقتصادیات خود اکثریت ہی کے ولولوں کو پورے طور پر نہیں سنبھال سکتی ہے۔ صرف ایک راستہ تھا خود امدادیت کا اور اس کے لیے ضرورت تھی جمہوری عمل میں زیادہ سے زیادہ شریک ہونے کی، حکومت میں ان لوگوں کو چن کر بھیجنے کی جو مسلمانوں کی حقیقی احتیاجات کو سمجھے اور اس کے مطابق عمل کرنے کے لائق ہوں۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ چشم زدن میں نہیں ہو سکتا تھا، اسے ایک طول طویل عمل ہونا تھا، مگر ایک بڑی اہم بات یہ ہوئی کہ مسلم ووٹ پہلے کی طرح کانگریس کی جیب میں نہیں رہا۔ کانگریس کو مسلمانوں کے ووٹ در اصل وہ قیمت تھے جو مسلمان تحفظ اور سلامتی کے وعدے کی ادا کرتے تھے جس لمحے انھوں نے اپنے ووٹوں کو اپنی ضرورتوں کے مطابق استعمال کرنے شروع کیا، اسی گھڑی سے وہ خود بھی اس واحد عمل کا ایک جزو لاینفک بن گئے جو انھیں ان کی قابلِ رحم حالت سے نکال سکے گا۔

۱۹۶۸ء میں کانگریس کے لیڈر ہمایوں کبیر نے عثمانیہ یونی ورسٹی میں آزاد میموریل لکچر دیا اس میں انھوں نے کہا "جوں جوں صنعت کا فروغ ہوتا ہے، جیسے جیسے اقتصادی خوش حالی بڑھتی ہے، ہم توقع کریں گے کہ ناانصافی، تفریق و امتیاز بھی بتدریج ختم ہو جائیں گے" اس کے بعد انھوں نے وہ نکتہ پیش کیا جو اہم ترین تھا "وہاں، جہاں جمہوریت نہیں ہے وہاں اقلیتوں کا مسئلہ بذاتِ خود اٹھ ہی نہیں سکتا۔ جہاں ریاست مستبد، یک جماعتی، یا شاہی ہو وہاں غالب بااختیاروں کی آواز بلند ترین ہوگی مگر جمہوریت میں ہر عنصر دعویدار ہوتا ہے اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنی شناخت کی بقا، اور اس کے تحفظ کا حق رکھتا ہے..... اس لحاظ سے اقلیتیں

بنیادی طور پر جمہوریت کی ایک مظہر ہیں، جذب پذیری، شرکت، بھروسہ، اعتماد اور پھر ہندوستانی مسلمانوں کی نشو و نما اور ترقی بھی وہی راہ اپنائے گی جو ہندوستانی جمہوریت اپنائے گی۔"

۱۵-اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے وجود کو متعدد اقسام کے خطرات تھے۔ مگر پانچ نکتے تھے جن پر ہندوستان کے نقشے کو پھر بھی بدلا جا سکتا تھا۔ وہ ہندو اکثریت والی چھوٹی سی جوناگڑھ کی ریاست تھی، اور ایک چالاک مسلمان حکمراں تھا جو پاکستان جانا چاہتا تھا۔ آزادی ملنے کے چند مہینوں بعد ہی وہ اپنے کتوں کو ساتھ لیکر (بیویوں کو چھوڑکر) پاکستان چلا گیا - وہاں حیدرآباد کی بڑی ریاست تھی جہاں کی اکثریت ہندو تھی ور حکمراں ایک ضدی اور مُزمن مسلمان تھا اور جو خودمختاری کا دعوے دار تھا اور پاکستان میں ہوائی جہاز ہندوستان سے لڑنے کے لیے تیار تھے۔ چند ہی مہینوں میں انھوں نے بھی اپنی یہ اعلیٰ خواہش ترک کردی۔ حیدرآباد کے پڑوس میں ہی جنوب میں، تامل ناڈو میں ایک علیحدگی پسند تحریک شروع ہوئی۔ شمال میں سکھوں نے اپنی حکومت اور اپنے ایک وطن کا مطالبہ شروع کیا۔ اور پنجاب کے شمال میں، ایک سیکولر کشمیر کا وعدہ اس وقت کھوٹا ہونے لگا جب شکوک وشبہات اور بدنفسی اور بدنیتی نے مل کر شیخ عبداللہ کو جیل میں ڈال دیا

۱۹۶۳ء میں تامل ناڈو کے لوگوں نے علیحدگی پسندی کے اپنے خیالات کو چھوڑ دیا، اور ۱۹۶۷ء تک اپنی ریاست پر خود اس مضبوطی کے ساتھ سر پر حکومت پر آئے کہ تادمِ تحریر وہ اس پر سے ہٹے نہیں ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں سکھ لیڈروں نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ اعلان کیا کہ سکھ اکثریت والے پنجاب کی تشکیل سے ان کے مسائل حل ہو گئے۔

۱۹۷۵ء میں شیخ عبداللہ نے مان لیا کہ کشمیر سے ہندوستان کا الحاق قطعی تھا اور ۱۹۸۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ہندوستان کی ایک ریاست کے منتخب شدہ لیڈر کی حیثیت سے ان کے جسدِ خاکی پر ہندوستان کا ترنگا جھنڈا لپٹا ہوا تھا۔

مگر اس صدی کی آٹھویں دہائی تک، سوالات پھر سر اٹھا رہے ہیں، کشمیر میں، سلف رول کے نظریے کو ایک بار پھر دھکا لگا ہے، پنجاب میں بے مقصدیت اور شرارت نے ایک خطرناک شدت پسند جرنیل سنگھ بھنڈراں والا کو اس بات کی آزادی بخش دی کہ وہ صرف ملک ہی کو نہیں بلکہ ان سکھوں کو بھی نقصان پہنچائے جنھیں وہ آزاد و خودمختار بنانا چاہتا تھا۔ یہاں سے اب کہاں؟ کدھر؟ اس کا جواب ملے گا، جمہوریت کے چلنے کے ڈھنگ میں، عوام کے تجربات میں اور اس بات میں کہ آیا ان کے غصّے کو (جیسا کہ پانچویں اور چھٹی

دائی میں ہوا تھا) جذب کیا جاسکتا ہے اور ان کے جذبات کے رُخ کو تعمیری کاموں کی طرف موڑا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کو، نظم وضبط قائم کرنے والی قوتوں کے ذریعہ اس وقت تک قابو میں نہیں رکھا جاسکتا جب تک کہ عوام خود نظم وضبط کی حمایت نہ کریں اور نظم وضبط کو قائم کرنے میں عملی طور پر حصّہ نہ لیں۔ ابھی تک ناکامیوں کے مقابلے میں کامیابیوں کا پلڑا بھاری ہے۔ جہاں تک کہ مستقبل کا سوال ہے ایک ہی نظیر کو دیکھنے کے ہمیشہ دو طریقے ہوتے ہیں اور ایک ہی چیز سے دو راہیں ڈھونڈی جاسکتی ہیں۔

۱۹۴۹ء میں مولانا آزاد، خطبۂ جلسہ تقسیم اسناد دینے کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گئے۔ یہ وہی ادارہ ہے جو پاکستان بنانے میں اتنے ہی حصّے کا دعویدار ہو سکتا ہے جتنا کہ پاکستان بننے میں جناح صاحب کا تھا۔ مولانا جنھوں نے ہندوستان میں اپنے پیدائشی حق کا سودا کرنے سے انکار کیا تھا کہا "مَیں نہیں جانتا کہ آج تمھارے ذہنوں کی حالت کیا ہے اور یہ بھی نہیں جانتا کہ مستقبل کی کیا شکل تمھاری نظروں میں ہے۔ کیا یہ تمھیں بند ہوتے ہوئے کواڑوں کا پیغام دیتے ہیں یا وا ہوتے ہوئے ان دروازوں کا جو تمھیں تجربات کی نئی راہوں سے متعارف کرائیں گے؟ مَیں نہیں جانتا کہ کون سے مناظر تمھارے سامنے ہیں مگر میں تمھیں یہ ضرور بتاؤں گا کہ میں کیا خواب دیکھتا ہوں۔ فارسی زبان کے ایک شاعر کے الفاظ میں:

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستنِ درد من فتحِ باب می شنوم



خدا بخش لائبریری کی چند اہم مطبوعات

مطبوعات اردو ● **من موہن کی باتیں** (قرآن مجید کا ترجمہ): مولانا شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی۔ ۱۵ روپے ● **صراط مستقیم**: مولانا آزاد، مرتبہ پروفیسر قمر استان خاں۔ ۴۰ روپے ● مولانا ابوالکلام آزاد کا نادر اخبار **پیغام** (مکمل فائل)۔ ۱۰۰ روپے ● **تصوف برصغیر میں**: ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں موجود مخطوطات پر مخطوطات، نادر اور اہم غیر مطبوعہ مخطوطات پر تحقیقی مقالات کا مجموعہ۔ ۱۵۰ روپے ● **طب اسلامی**: ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں موجود مخطوطات طب پر تحقیقی مقالات کا مجموعہ۔ ۵۰ روپے ● **قطعات دلدار**: (عہد میر و سودا کے صوفی شاعر شاہ دلدار کا کلام)۔ ۱۵ روپے ● **یادگار روزگار** (تذکرہ کاملان پٹنہ) از سید بدرالحسن (۲ حصے ایک جلد میں)۔ ۲۰۰ روپے ● **قومی یکجہتی کی روایات**: بشمبر ناتھ پانڈے۔ ۵ روپے ● **ہندستانی مسلمانوں کے مسائل**: از سید حامد۔ ۳۰ روپے ● **اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر**: از ادم پرکاش پرشاد (اورنگ زیب عالمگیر کی شخصیت پر لگائے گئے الزامات کا مدلل اور مفصل جواب)۔ ۱۵ روپے ● **مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علیگڑھ میں**: رشید احمد صدیقی۔ ۲۰ روپے ● **ایک نادر روزنامچہ**: از مولوی مظہر علی سندیلوی (انیسویں صدی کے نصف آخر سے بیسویں صدی کے ربع اول تک) تحقیق ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ ۳۰ روپے ● **داستاں میری**: از ڈاکٹر اقبال حسین: بہار کے مسلمانوں کی پچھلے سو برسوں کی ادبی، تہذیبی، سماجی تاریخ۔ ۳۰ روپے ● **ہندستانی مسلمان عصری دستاویزات کی روشنی میں**: (پہلی جلد آزادی کے بعد علی گڑھ کا فضا)۔ ۱۰۰ روپے ● **فارسی اور ہندستان**: از پروفیسر نذیر احمد۔ ۱۰ روپے ● **العصر لکھنؤ**: ۱۸-۱۹۱۳ء (انتخاب و تعارف)۔ ۵۰ روپے ● **ادیب الہ آباد**: ۱۳-۱۹۱۰ء (انتخاب و تعارف)۔ ۵۰ روپے ● **صبح امید لکھنؤ**: ۲۱-۱۹۱۸ء (انتخاب و تعارف)۔ ۵۰ روپے ● **معیار**: قاضی عبدالودود کا رسالہ (مکمل فائل) ۱۹۳۶ء۔ ۵۰ روپے ● **نگار کا جدید غزل گو نمبر**: ۱۹۴۰ء۔ ۳۵ روپے ● **زبان گجرات**: ۲۸-۱۹۲۶ء (مکمل فائل)۔ ۵۰ روپے ● پنڈت موتی لال نہرو کا ۱۹۰۰ء کا **خطبہ صدارت**: ۱۰ روپے ● **رقعات رشید صدیقی**: مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خاں۔ ۳۰ روپے ● **مقدمہ طلسم ہوشربا**: ۲۰ روپے ● **طلسم ہوشربا مع مقدمہ** (آٹھ جلدیں)۔ ۸۲۰ روپے ● **ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت**: منشی رام پرشاد ماتھر (علیگ)۔ ۳۰ روپے ● **جنید احمد کی آٹوگراف بک**: ۲۰ روپے ● **دیوان مصحفی**: منتخبہ امیر مینائی و اسیر۔ ۵۰ روپے ● **شخصیات و واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا**: جنید احمد۔ ۴۵ روپے ● **گیتا اور قرآن**: پنڈت سندر لال۔ ۴۵ روپے ● **تحفۃ السعداء**: خواجہ کمال (م بعد ۱۱۰۱ھ) پیشکش حکیم حسین خاں شفا۔ ۲۰ روپے ● **بہار اردو لغت**: یوسف الدین احمد بلخی۔ ۱۵ روپے ● **تواریخ نادر العصر**: منشی نولکشور تقدیم ڈاکٹر انوار الحسن۔ ۲۵ روپے ● **ہندستان کی آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ**: از ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین۔ ۱۰۰ روپے ● **سکوں پر اشعار**: از سید نور محمد اکیلوی۔ ۱۲۵ روپے ● **ہندو دھرم اکبر کے عہد میں**: تصنیف ابوالفضل ترجمہ فدا علی۔ ۱۰۰ روپے ● **اعمال نامہ**: ایک اہم آپ بیتی از سر رضا علی۔ ۱۰۰ روپے ● **شریمد بھگوت گیتا مع گیتا بودھ**: از مہاتما گاندھی۔ ۲۰ روپے ● **لیلیٰ کے خطوط مجنوں کی ڈائری**: از قاضی عبدالغفار۔ ۴۰ روپے ● **حکایات لقمان**: از ایلیس فیبلز۔ ۴۵ روپے ● **میرا مذہب**: از محمد علی رُدولوی۔ ۳۰ روپے۔

مطبوعات فارسی ● **قطعات حسرت**: ۱۰ روپے ● **کنز تواریخ**، شاہ غلام یحییٰ عظیم آبادی کے تاریخی قطعات۔ ۱۰ روپے ● **مجمع النفائس**: سراج الدین علی خاں آرزو۔ ۱۰ روپے ● **باغ معانی**: تذکرہ شعرائے فارسی (نقش علی)۔ ۱۰ روپے ● **صحف ابراہیم**: تذکرہ شعرائے فارسی، علی ابراہیم خاں خلیل۔ ۱۰ روپے ● **فرہنگ زفان گویا**: مرتبہ پروفیسر نذیر احمد۔ ۵۰ روپے ● **دیوان حافظ**: شاہان مغلیہ کے ذاتی نسخہ کی عکسی اشاعت۔ ۱۰۰ روپے۔

مطبوعات ہندی ● **من موہن کی باتیں**: مولانا شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی کا ترجمۂ قرآن۔ ۱۰ روپے ● **دلدار کے دوہے**: ۱۲ویں صدی ہجری کے مشہور صوفی کا کلام۔ ۱۰ روپے ● **اورنگ زیب: ایک نئی درشٹی**: ڈاکٹر ادم پرکاش پرساد۔ ۱۵ روپے ● **بھارت میں قومی ایکتا کی پرمپرائیں**: بی۔ این۔ پانڈے۔ ۵ روپے ● **مولانا آزاد کی یاد میں**: ۱۵ روپے ● **اقبال ہندستان اور پاکستان**: پروفیسر سید حسن احمد۔ ۱۵ روپے ● **بہار تیر راشٹریہ اندولن اور مولانا ابوالکلام آزاد**: ڈاکٹر راجے انوم۔ ۲۰ روپے ● **سامپردائکتا اور دیش کی ایکتا**: ہندو مسلم فسادات کو کیسے روکا جائے (قومی یکجہتی پر سیاسی سماجی دانشوروں کے مقالات کا مجموعہ)۔ ۱۵ روپے ● **خدا بخش لائبریری ایک پریچے**: لائبریری پر پہلی کتاب ہے جسے ایک انگریز مسٹر اسکاٹ او کونار نے اب سے ساٹھ سال قبل لکھی جسے تازہ ترین زمانہ تک لایا گیا ہے۔ ۱۵ روپے

مطبوعات انگریزی ● **ایک مشرقی کتب خانہ**: ۵ روپے ● **اسلام اور ہندستانی تہذیب**: بی۔ این۔ پانڈے۔ ۱۵ روپے ● **عہد سلطنت کے صوفی ادب کا جائزہ**: بروس لارنس۔ ۱۰ روپے ● **صوفیا کے مکتوبات اور ملفوظات**: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۱۰ روپے ● **ملفوظ الشیخ کبیر**: ڈاکٹر ضیاءالدین احمد ڈیسائی۔ ۱۰ روپے ● **افکار اسلامی بدلتی دنیا میں**: پروفیسر سید وحید الدین۔ ۱۰ روپے ● **مجموعۂ مقالات**: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۱۰ روپے ● **بہار میں اسلام اور مسلمان عہد وسطیٰ میں**: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۵۰ روپے ● **بہار عہد سلطنت اور مغل دور میں**: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۵ روپے ● **اسلامی تقویم کی تشکیل نو**: ڈاکٹر ہاشم امیر علی۔ ۱۰ روپے ● **مشرق وسطیٰ**: پروفیسر آصف علی اصغر فیضی۔ ۱۰ روپے ● **خدا بخش**: ۱۰ روپے ● **مغل آرٹ**: ۱۵ روپے ● **حضرت امیر خسرو**: پروفیسر سید حسن عسکری۔ ۲۵ روپے ● **فارسی ادب میں ہندستان کا حصہ**: پروفیسر امیر حسن عابدی۔ ۱۰ روپے ● **وہابی تحریک اور دوسرے مقالات**: از علی اشرف۔ ۱۵ روپے ● **ٹیپو سلطان، حیدر علی، کشمیر**: ڈاکٹر محب الحسن۔ ۱۵ روپے ● **خدا بخش لائبریری میں محفوظ عربی فارسی اردو مخطوطات۔ کی توضیحی کیٹلاگ**: ۳۴ جلدیں، قیمت ہر جلد ۵۰ روپے۔

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی
(علیگڑھ)

وصی احمد بلگرامی کی ایک نادر تحریر

مثنوی ابرِ کرم مصنف امیر مینائی، مطبع نظامی کانپور سے ۱۲۸۹ھ میں شائع ہوئی اس کا ایک مطبوعہ نسخہ جو ناقص الآخر تھا، سید وصی احمد بلگرامی کی ملکیت تھا انھیں اس کا ایک مکمل نسخہ ملا جس سے اس نقص کو دور کرکے مثنوی کے اپنے نسخہ کی انھوں نے تکمیل کرلی یعنی اپنے ہاتھ سے اتنا حصّہ نقل کرلیا۔

اس کی دلچسپ روداد اپنے مخصوص اسلوب میں وصی احمد صاحب مرحوم نے اپنے اسی نسخہ کے آخر میں پانچ، چھ صفحوں میں لکھ دی ہے۔

یہ حکایت لطیف چونکہ ان کے اپنے خط میں ہے اور ان کا اپنا طرز اس معمولی بات کے لکھنے میں بھی قائم رہا ہے، اس لیے جی چاہا کہ یہ خدا بخش لائبریری جرنل کے ذریعہ اردو دوستوں تک پہنچ جائے، سو حاضر ہے۔

●●

یاد داشت از کاتب این حروف بتاریخ ۳ ؍ دسمبر روز دوشنبہ سنہ ۱۹۳۴ء
وقت ۹½ بجے شب بمقام ڈالٹن گنج ضلع پلامو - ۲۴ ؍ شعبان ۱۳۵۳ ہجری

مثنوی ابر کرم مطبع نظامی کانپور میں ۱۲۸۹ ہجری میں شائع ہوئی -
اسکا ایک کرم خوردہ اور نامکمل نسخہ مجھکو اپنے گھر کی کتابوں میں ملا -
اسکی دل آویزی نے مجبور کیا کہ اسکو آرہ سے ہم اپنے ساتھ لائیں اور
گمشدہ اوراق کا سراغ لگائیں - چونکہ کتاب کو چھپے ہوئے چونسٹھ ۶۴
برس ہو چکے تھے اور اس قسم کی کتابوں کو کوئی اب پوچھتا نہیں اور
امیر مینائی مرحوم کے باقیات الصالحات میں اسکا کہیں نام بھی نہیں
اسلئے خیال تھا کہ یہ کتاب ناپید ہو چکی -

کل شب کو اسی وقت مولوی سید عبدالرشید صاحب قانون گو حال مقامی ڈالٹن گنج ہم سے عندالتذکرہ فرمانے لگے کہ عام خیال یہ ہے کہ امیر مینائی نے صفائی زبان میں داغ کا تتبع کیا۔ ہمنے کہا کہ یہ غلط خیال ہے۔ اور ثبوت میں یہی مثنوی پیش کی اور چند حکایتیں پڑھ کر سنائیں کہ دیکھئے سہل ممتنع اسکو کہتے ہیں۔

آج کچہری میں مولوی سید محمد یوسف علی صاحب ڈپٹی کلکٹر پنشن یافتہ ساکن سہسرام ضلع شاہ آباد اتفاقیہ ہم سے ملنے آئے اور کچھ ذکر ایسا آیا کہ ہمنے آنریبل سید عبدالعزیز ساکن نیورہ ضلع پٹنہ وزیر گورنمنٹ صوبہ بہار کے متعلق یہ کہا کہ وہ سخی ہیں اور قرینہ یہ ہے کہ حاتم کی امت سے روز محشر اللہ حساب کتاب شاید ہی لے۔ اس پر جناب موصوف نے فرمایا کہ یہ نہ کہو۔ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ کس سے حساب کتاب ہوگا اور کس سے نہیں ہوگا۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے فرمایا کہ امیر مینائی نے اپنی مثنوی ابر کرم میں کیا خوب فرمایا ہے۔ ہمنے وہ جملہ ختم کرنیکی اجازت نہ دی اور ابر کرم کا نام سنتے ہی کہا کہ کیا وہ مثنوی آپ کے پاس ہے؟ اونھوں نے فرمایا کہ ہاں ہے ازبر نہیں ہے۔ ہمنے کہا کہ للہ اوسکو دکھلا دیجئے۔ اونھوں نے کہا کہ وہ مثنوی ہمنے اپنے بچپن میں اپنی ممانی صاحبہ کے پاس دیکھی تھی۔

اوسکے بعد پھر کہیں نہیں دیکھی - تین چار سال ہوئے کہ اتفاقیہ کلکتہ میں ایک کتب فروش کے یہاں پرانی کتابوں میں یہ مثنوی بھی دیکھی - ہمنے خرید لی چنانچہ وہ مثنوی ہمارے ساتھ ہے - ہمنے کہا کہ ہم اپنا چپراسی آپ کے ساتھ کر دیتے ہیں - ہمکو کتاب بھیج دیجئے - ہم گم شدہ اوراق کی نقل لیکر آپکو واپس کر دینگے - چنانچہ جناب موصوف نے مثنوی ہمکو بھیج دی ہے اور ہمنے اوسکی نقل لیکے یہ یاد داشت لکھ دی - غور کرنیکی

بات یہ ہے کہ جو بندہ یا بندہ - اللہ اپنے بندوں کی خواہش پوری کرنے پر آتا ہے تو یوں پوری کر دیتا ہے کہ مولوی حبیب محمد یوسف علی صاحب کو دھکے مار کر سید وصی احمد بلگرامی کے پاس بھیج دیتا ہے اور پھر روز محشر اور حساب کتاب کا تذکرہ اوسکی زبان سے کراتا ہے - اور پھر مولوی سید محمد یوسف علی صاحب سے کہتا ہے کہ تمام دنیا کو بھول جاؤ اور دنیا کی تمام کتابوں کو بھول جاؤ - اسوقت صرف مثنوی ابر کرم کا نام لو - اللہ رے انتظام اور پیش بندی! سچ کہا ہے سعدی شیرازی نے ؎

دیدم گل تازہ چند دستہ   بر گنبدے از گیاہ بستہ

گفتم - چہ بُوَد گیاہ ناچیز   تا در صفِ گل نشیند او نیز
بگریست گیاہ و گفت خاموش   صحبت نکند کرم فراموش
گر نیست جمال و رنگ و بویم   آخر نہ گیاہِ باغ او یم
با آنکہ بضاعتے ندارم   سرمایۂ طاعتے ندارم
من بندۂ حضرت کریمم   پروردۂ نعمتِ قدیمم
او چارۂ کارِ بندہ داند   چوں ہیچ وسیلتش نماند

یعنی کسی گنبد پر ایک گلدستہ تھا - دیکھنے والے نے گھاس سے کہا کہ تیری کس شامت نوبت آئی ہے؟ اپنے کو دیکھ - اور پھولوں کو دیکھ - اور پھولوں کی صف میں اپنا بیٹھنا دیکھ! گھاس نے آب دیدہ ہوکر کہا کہ خاموش! تم نے ہمکو ابھی پہچانا ہیں - یہ صحیح ہے کہ میرے پاس رنگ ہیں - بُو ہیں - حُسن ہیں - اور یہ بھی صحیح ہے کہ میرے پاس کوئی پونجی ہیں - سرمایہ ہیں - اطاعت کیلئے کسی نہ کسی پونجی کی ضرورت ہوتی ہے - تو میرا نام ہی گھاس ہے جس سے بڑھکر ناچیز شاید ہی کوئی ہو - مگر بات یہ ہے کہ ہم اوسی باغ کی مولی ہیں جس باغ میں پھول اپنی بہار دکھلاتے ہیں - اور ہمکو اوسکی کنیزی کا فخر ہے جو بہت

بڑا کریم ہے اور جسکی نعمتوں نے ہمیشہ میری پرورش کی ہے۔
میرے مالک کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے غلاموں اور کنیزوں
کو دیکھتا ہے کہ ان غریبوں کا کوئی وسیلہ نہیں۔ تو وہ
غیب سے وسیلہ پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ اوس نے جب دیکھا کہ
گل باغ میں بادشاہی کر رہے ہیں اور گھاس پاؤں کے نیچے
روندی جا رہی ہے تو اوس مسبب الاسباب نے گھاس کو
عروج دینے اور گلاب کا سر جھکانے کیلئے ایک شگوفہ چھوڑ دیا۔
شگوفہ یہ کہ پھولوں کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش ہمکو
کوئی گلدستہ بنا کر اپنے پاس رکھتا اور ہمارے حسن و جمال اور
رنگ و بو کا نظارہ کرتا۔ پھولوں کے دل میں یہ خواہش پیدا
ہوئی تو سوال یہ چھڑ گیا کہ گلدستہ بندھے تو کسطرح بندھے۔
ریشم کا تاگہ باوجود اپنی خوبیوں کے پھولوں کیلئے پھانسی کی رسّی
ہے۔ سونے اور چاندی کا تار کتنا ہی باریک اور ہلکا ہو پھولوں کو
ذبح کر ڈالے گا۔ آسمان اور زمین کے بیچ میں کوئی ایسی چیز
نہیں ہے جس سے پھولوں کا گلدستہ باندھا جا سکے۔ الاّ اوس

گھاس کے جو ابتک پامال ہونے کیلئے وقف تھی -

چنانچہ اللہ نے گھاس کو اسی بہانہ سے اور اسی وسیلہ
سے پھولوں کی صف میں پہونچا دیا - اور اب بادشاہ سلامت
اپنے غلاموں کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں اور دم نہیں مار سکتے -
اللہ جب مشکل آسان کرنا چاہتا ہے تو یوں آسان کرتا ہے -
کس نے کہا تھا کہ امیر مینائی کی مثنوی ابر کرم کانپور سے
سہسرام جائے اور مولوی محمد یوسف علی صاحب کی مہمانی اوسکو
پڑا پا کریں - کس نے کہا تھا کہ محمد یوسف علی اپنے بچپن میں
اوسکو دیکھیں - اور پھر پچاس برس کے بعد ایک کتب فروش کی
دکان میں اوسی کتاب کو دیکھیں - اور کس نے کہا تھا کہ وہ
اوس کو خرید بھی لیں - اور خریدی تھی تو پھر اون سے کس نے
کہا تھا کہ ڈالٹن گنج آتے وقت زمانہ بھر کی کتابوں کو چھوڑ کر
وہی کتاب سہسرام سے لائیں - اور لائے بھی تھے تو اون سے
کس نے کہا تھا کہ آج ہم سے ملنے بھی آئیں - اور آئے بھی تھے تو اون سے
کس نے کہا تھا کہ دنیا جہان کی کتابوں کا تذکرہ چھوڑ کر صرف

اسی کتاب کا نام بس ہے۔

اسکو کہتے ہیں بندہ نوازی اور مشکل کشائی - عالم الغیب
آج پچاس برس پہلے سے یعنی میری پیدائش کے پہلے سے سامان کر رہا
تھا اور برابر کرتا رہا محض اسلئے کہ آج کے دن مثنوی ابر کرم
کے پانچ گم شدہ معنوں کی زیارت ہمکو نصیب ہو جائے اور اوسکی نقل ہم
لے سکیں - خدا کرے ابر کرم ہمارے سر پر اسیطرح عالم نزع اور
صف محشر میں بھی موتی برسائے - شگون اچھا ہے -. آمین!

سید وصی احمد بلگرامی

- پریم چند سرسید کے عہد علیگڑھ میں

—— • مکتوب پریم چند، ۱۹۳۴ء

- سرسیّد پر پریم چند کا ایک مضمون

—— • پریم چند کی 'باکمالوں کے درشن' سے

پریم چند سرسیّد کے عہد علی گڑھ میں

علی گڈھ میں دعوتیں کھانے کے سوائے اور کچھ نہ ہوا۔ ہماری اسکیم کو لوگوں نے پسند تو بہت کیا، مگر ان دنوں یونیورسٹی بند تھی۔ اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن old Boys Association کے جلسے ہو رہے تھے۔ اس لئے کچھ بولنے کا اوسر نہ ملا۔ ہاں لوگوں نے جس طرح میرا سواگت کیا، اس سے میرا چت بہت پرسن ہوا۔ مجھے آشچریہ ہوا کہ وہاں کتنی ہی مسلم لڑکیاں پردہ نہیں کرتیں اور وہ سب میری نئی سے نئی اردو پرکاشت کتاب 'غبن' پڑھ چکی تھیں۔ میں نے پلاؤ اور گوشت کھایا، انھیں کے دسترخوان پر اور یہاں آکر دو تین دن Nux Vomica کھانا پڑا۔

مکتوب پریم چند، بنام جینیندر کمار، مورخہ ۳۰ اپریل ۳۲ء

ماخذ، مدن گوپال، پریم چند کے خطوط

سرسید پر پریم چند کا ایک مضمون

کیا بہ حیثیت مدبر، کیا بہ حیثیت مصنف، کیا بہ حیثیت مذہبی پیشوا اور مصلح اور کیا بہ حیثیت خادمِ قوم، سرسید احمد کو جو شہرت دوام حاصل ہے وہ ہندوستان کے دنیاء اسلام میں شاید ہی کسی بزرگ کو حاصل ہو۔ ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ ہم اس بزرگ کے سوانح زندگی کو غور سے مطالعہ کریں اور تحقیق کریں کہ ان میں وہ کیا خوبیاں تھیں جن کی بدولت وہ اس قدر اعزاز و امتیاز حاصل کر سکے اور قوم کی اتنی خدمت کر سکے۔ اُن کی انگریزی استعداد بہت کم تھی، وہ گھر کے مالدار نہ تھے قوم میں بھی اُن کے حامیوں کی تعداد اُن کے مخالفوں سے زیادہ نہ تھی لیکن باوجود ان سوانحات کے اُنھوں نے دنیاء علم و ادب اور دنیاء عمل میں لافانی یادگاریں چھوڑیں۔ یہ محض خدمت قوم کا جوش تھا جس نے ساری دشواریوں پر فتح پائی۔

سید احمد ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں بھی اُن کے قوائے جسمانی غیر معمولی طور پر مضبوط تھے لیکن ذہنی اعتبار سے اُن کا شمار عام طلبا میں تھا۔ اُس وقت کون یہ پیشین گوئی کر سکتا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب یہ لڑکا اپنے ملک اور قوم کے لئے باعث فخر ہو گا۔ اُن کی تعلیم بھی عام مسلمان بچّوں کی طرح قرآن شریف سے شروع ہوئی۔ اُن کی استانی ایک شریف پردہ نشین خاتون تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں بھی شریف

گھرانوں میں بچّوں کی تعلیم استانیوں ہی کے سپرد کی جاتی تھی۔ آج یوروپ میں مدارس کی ابتدائی جماعتوں میں بالعموم عورتیں ہی پڑھاتی ہیں۔ اپنی خلقی نرم دلی، تحمل ضبط اور محبت کے باعث وہ فطرتاً بچّوں کی تعلیم کے لئے موزوں ہوتی ہیں۔

سیّد احمد خاں نے قرآن ختم کرنے کے بعد فارسی اور عربی شروع کی۔ اٹھارہ انیس برس کی عمر میں انھوں نے پڑھنا چھوڑ دیا؛ مگر کتابوں کے مطالعہ کا شوق انھیں مدّت العمر رہا۔ اُس وقت دہلی کی سلطنت کا صرف ایک مٹا ہوا نشان رہ گیا تھا۔ بادشاہ قلعہ دہلی میں کسی سجّادہ نشین کی طرح رہتا تھا اور انگریزی سرکار کا وظیفہ خوار تھا۔ بابر اور اکبر کی اولاد اب قریب قریب دہلی میں قید تھی۔ سیّد احمد کے والد شاہی دربار میں ملازم تھے۔ لیکن اُن کے انتقال کے بعد تنخواہ بند ہوگئی اور سیّد احمد خاں کو معاش کی فکر پیدا ہوئی۔ انھوں نے انگریزی سرکار کی ملازمت قبول کر لی اور ۱۸۳۹ء میں کمشنری آگرہ کے نائب منشی مقرر ہوئے۔ یہاں انھوں نے اتنی جانفشانی سے کام کیا کہ دو ہی سال میں اُن کی ترقی منصفی کے عہدہ پر ہوگئی اور مین پوری میں تعینات کئے گئے۔ اِسی زمانہ میں انھوں نے اپنی مشہور کتاب آثار الصنادید لکھی جس میں قدیم شاہی عمارتوں کے حالات بڑی تفصیل اور تحقیق سے قلمبند کئے گئے ہیں۔ یہ تصنیف زبان اُردو کے کلاسک میں شمار ہوتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں سیّد احمد خاں بجنور میں منصف تھے۔ یہ وہ پُر آشوب زمانہ تھا جب کہ انگریز افسر اور اُن کی بیویاں اور بچّے باغیوں کے خوف سے جائے امن تلاش کرتے پھرتے تھے۔ باغی کمال بیدردی سے جس انگریز کو پا جاتے قتل کر ڈالتے تھے۔ اُس وقت باغیوں کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنا خود اپنی جان خطرہ میں ڈالنا تھا۔ لیکن سیّد احمد خاں نے

اُس وقت بھی حق کی حمایت سے دریغ نہ کیا اور مظلوموں کی حمایت میں سینہ سپر ہو گئے جو انسان کا اخلاقی فرض ہے۔ اُن کی کوشش سے کتنے ہی انگریزوں کی جان بچ گئی۔ باغیوں کو اُن پر شک ہوا۔ انھوں نے آپ کے مکان کا محاصرہ کر لیا، اُنھیں طرح طرح کی دھمکیاں دیں، یہاں تک کہ اُن کا مکان اُن سے جبراً خالی کرا لیا اور اُن کا اثاثہ بھی لوٹ لیا۔ سید احمد خاں نے استقلال کے ساتھ یہ ساری مصیبتیں جھیلیں مگر جنھیں پناہ دی تھی اُنھیں باغیوں کے حوالے نہ کیا۔ جب غدر فرو ہو گیا اور سرکار کا مُلک پر دوبارہ تسلّط ہوا تو باغیوں کے جرم کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی۔ سید احمد خاں اُس کمیٹی کے ممبر بنائے گئے۔ اُس وقت اِس کا بڑا اندیشہ تھا کہ گنہگاروں کے ساتھ بے گناہ نہ پس جائیں، حملہ کرنے والوں کے ساتھ اپنی محافظت کے لئے شمشیر بہ کف ہونے والے اشخاص پر بھی عتاب نہ نازل ہو جائے۔ سید احمد اِس نیک ارادہ سے کمیٹی میں شریک ہوئے کہ حتی الامکان بیگناہوں کی حفاظت کریں۔ ذاتی مفاد یا کسی صِلہ کی انھیں مطلق تمنّا نہ تھی۔ چنانچہ جب ایک باغی مسلمان رئیس کی جائداد کثیر ضبط کر لی گئی اور سرکار نے اُسے سید احمد خاں کو اُن کی خدمات کے صلہ میں دینا چاہا تو انھوں نے اُسے شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا۔ ایک مصیبت زدہ بھائی کی تباہی سے مستفید ہونا اُنکی باحمیت اسلامی فطرت نے گوارا نہ کیا۔

دو سال بعد سید احمد خاں نے "اسباب بغاوت ہند" نامی ایک رسالہ شائع کیا۔ اُس میں انھوں نے دلائل اور واقعات سے ثابت کیا کہ یہ غدر ملکی بغاوت نہ تھی، نہ جنگ آزادی، نہ کسی قسم کی سازش، بلکہ صرف سپاہیوں کی عدول حکمی تھی اور وہ بھی بوجہ جہالت اور توہمات۔ چونکہ

گورنمنٹ کا یہ خیال تھا کہ اس غدر کے محرک مسلمان ہیں اس رسالہ کا ایک منشا یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے سر سے یہ الزام دور کر دیا جائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سید احمد خاں کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔ انھوں نے اس رسالہ کو گورنمنٹ آف انڈیا اور پارلیمنٹ میں بھیجا، اور چونکہ سرکار کو اُن کی خیر خواہی اور وفاداری پر کامل یقین تھا اُس نے اُن اسباب و دلائل پر ٹھنڈے دل سے غور کیا اور جو شکایتیں اُسے صحیح معلوم ہوئیں اُن کے دور کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ سید احمد خاں کی اس اخلاقی جرأت کی کن لفظوں میں تعریف کی جائے۔ جس زمانہ میں کہ سرکار سختیوں کی جانب مائل تھی اور کسی کی زبان کھولنے کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ مبادا اُس پر بغاوت کا شبہ کیا جانے لگے اُس وقت گورنمنٹ کے طرز عمل پر نکتہ چینی کرنا اور اُسکی بے عنوانیوں کا پردہ فاش کرنا بیش بہا ملکی اور قومی خدمت تھی۔

سید احمد خاں کو جو خدمت عطا ہوئی تھی اُسے دل وجان سے انجام دیتے تھے۔ وہ اِس مقولہ کے پابند تھے کہ جو کام کرنا ہو اُسے دل سے کرنا چاہئے۔ بیدلی سے یا بیگانہ سمجھکر وہ کوئی کام نہ کرتے تھے۔ وہ مراد آباد میں تھے جب امساک باراں نے فصل تباہ کردی اور ملک میں شدید قحط پڑ گیا۔ سرکار نے وہاں ایک محتاج خانہ کھولا اور اُس کا انتظام سید احمد خاں کے سپرد کیا۔ اُس وقت جتنی تندہی سے اُنھوں نے قحط زدوں کی امداد کی، پردہ نشین مستورات اور سفید پوش مفلسوں کی جس انسانیت اور ہمدردی کے ساتھ دستگیری کی، وہ تعریف سے مستغنی ہے۔ کسی فرقہ یا مذہب کا آدمی کیوں نہ ہو، اُن کی ہمدردی سب کے ساتھ یکساں تھی۔

آج کل تو مذہبی مباحثوں کا زور کچھ کم ہو گیا ہے، لیکن اُس زمانہ میں عیسائی مشنری عیسائیت کی منادی کے جوش میں ہندو اور مسلمان مذاہب پر علانیہ اعتراضات کیا کرتے تھے۔ اور چونکہ اُس وقت علما اور پنڈتوں میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ مذہبی احکام اور روائتوں کی معقولیت کے ساتھ تشریح کر سکیں اور الفاظ کے پردہ میں چھپے ہوئے معانی کو واضح کر سکیں اُس لئے عیسائی مشنریوں کے سامنے وہ لاجواب ہو جاتے تھے اور اس کا عوام پر بہت بُرا اثر پڑتا تھا۔ سید احمد خاں نے مشنریوں کے اِس حملہ سے اسلام کو بچانے کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ عیسائیوں کے اعتراضات کا دنداں شکن جواب دیا جائے اور قرآن اور بائبل کا موازنہ کرکے دکھایا جائے کہ دونوں کتابوں میں کس قدر یکسانیت ہے۔ اِسی ارادہ سے اُنھوں نے بائبل کی تفسیر لکھنی شروع کی، مگر یہ کتاب پوری نہ ہو سکی۔ لیکن ملازمت سے پنشن لینے کے بعد جب اُنھیں زیادہ یکسوئی ہوئی تو اُنھوں نے اِس خیال کو اپنی معرکتہ الآرا تصنیف تفسیر القرآن کے ذریعہ پورا کیا۔ اسلامی تعلیمات پر فلسفہ سے پیدا ہونے والے اعتراضات کے اُنھوں نے بڑی تحقیق سے جواب دئے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی عام تعلیم نہ ہونے کے باعث عام مذہبی احکام اور شریعت کو آنکھ بند کرکے مانتے آتے تھے۔ اُن احکام کی معقول تشریح وہ کیا کرتے۔ اُن کے دل میں شکوک ہی نہ پیدا ہوتے تھے، کیونکہ شکوک تو تعلیم اور تفتیش کی برکات ہیں۔ وہ لوگ بزرگوں کی تقلید میں ہی خوش تھے یہ مذہب محض ایک رسمی اور روایتی چیز ہو گئی تھی، گویا جسم سے جان نکل گئی ہو۔ یہی باعث ہے کہ ہندو اور مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنے مذہب سے بے اعتقادی

ہونے لگی تھی۔ انگریزی تعلیم کے ابتدائی دور میں کتنے ہی تعلیم یافتہ ہندو عیسائی ہو گئے۔ آخر راجہ رام موہن رائے کو ایک ایسے فرقہ کی بنیاد ڈالنی ضروری معلوم ہوئی جو کلیتہً فلسفیانہ دلائل پر قائم ہو، اور اس میں وہ سب ہی آسانیاں اور آزادیاں حاصل ہوں جو لوگوں کو عیسائی ہو جانے پر آمادہ کرتی تھیں۔ اس نئے فرقہ کا نام برہم سماج رکھا گیا۔ برہم سماج میں سے ذات پات، چھوت چھات، تیرتھ اشنان، مورتی پوجا اور شرادھ اور وہ جملہ رسوم جن پر عیسائیوں کے اعتراضات ہوا کرتے تھے نکال دیئے گئے، یہاں تک کہ عبادت کا طریقہ بھی تبدیل کر دیا گیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس فرقہ نے ہندوؤں میں عیسائیت کے سیلاب کو بہت کچھ روک دیا۔ اس کے بہت عرصہ بعد سوامی دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی جسنے مغربی ہند میں تقریباً وہی کام کیا جو برہم سماج نے مشرق میں کیا تھا۔ تفسیر القرآن بھی اسی ارادہ سے لکھی گئی تاکہ نوجوان مسلمانوں کے دل میں اسلام کی جانب سے جو شکوک پیدا ہوں ان کی تشفی کر دی جائے۔ مگر مسلم علما اس کتاب کے شائع ہوتے ہی سید احمد خاں پر کفر کا فتوے لے کر دوڑے، ان پر دہریہ اور ملحق اور نیچریہ ہونے کا الزام لگایا۔ ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگ گئی اور جوابی کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مصنف پر طرح طرح کے بیجا اور بے معنی الزامات عائد کئے جانے لگے۔ بعضوں کا تو یہ بھی خیال ہوا کہ سید احمد خاں ولایت جا کر عیسائی ہو آئے ہیں اور اسلام کو تباہ کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی ہے۔ بہت دنوں کے بعد یہ شور و غوغا فرو ہوا اور آج تفسیر القرآن متلاشیانِ حقیقت کے لئے مشعل کا کام کر رہی ہے۔

سید احمد خاں کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ مدرسۃ العلوم علی گڈھ ہے جو اب مسلم یونیورسٹی کی صورت میں اُن کی لازوال یادگار ہے۔ مسلمانوں میں افلاس اور بے روزگاری کی بڑھتی ہوئی رفتار کو روکنے کے لئے انہیں مغربی تعلیم کی سخت ضرورت تھی - اور مدرسۃ العلوم نے اِس ضرورت کو کماحقہٗ پورا کردیا۔ مگر اُس وقت لوگ مغربی تعلیم سے ایسے بدظن ہو رہے تھے کہ اُنھیں خوف تھا مبادا ہمارا مذہب بھی ہاتھ سے جائے اور وہ کہیں کے نہ رہیں۔ مگر سر سید اپنے ارادہ میں مستقل تھے - اِس غرض سے اُنھوں نے ولایت کا سفر کیا تاکہ وہاں کی قدیم یونیورسٹیوں کے نظام کا مطالعہ کریں اور اُسی نمونہ پر ہندوستان میں مدرسۃ العلوم کی داغ بیل رکھی جائے۔ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو سر سید ولایت روانہ ہو گئے۔ لندن میں جس شان سے اُن کا استقبال کیا گیا اور اُن کی جتنی خاطر و تواضع کی گئی اُس نے سر سید کو ہمیشہ کے لئے انگریزوں سے متحد کردیا۔ وہ تقریباً دو سال تک ولایت کے کالجوں کے انتظام کا مطالعہ کرنے کے بعد ہندوستان واپس آئے اور مدرسۃ العلوم کے افتتاح کی تیاریاں کرنے لگے - اِس ارادہ کی تکمیل اور نیز مسلمانوں میں صحیح ادبی اور علمی مذاق پیدا کرنے کے لئے اُنھوں نے تہذیب الاخلاق نامی ایک ماہوار رسالہ جاری کیا - مگر طبقہ علما نے اِس رسالہ کی مخالفت شروع کی اور مدرسہ کی تحریک سے عوام میں بدگمانی پیدا کرنے لگے - شاید کچھ لوگوں کا خیال ہوا ہو کہ وہ انگلینڈ سے اپنا مذہب کھو کر آئے ہیں - لیکن سر سید نے ہمت نہ ہاری اور متواتر پانچ سال کی شبانہ روز سعی کے بعد ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم کا علی گڈھ میں افتتاح ہوا - اِس میں کوئی شک نہیں کہ مدرسۃ العلوم کے قیام

سے مسلمانوں کو جتنا فروغ ہوا وہ اور کسی طرح ممکن نہ تھا۔ آج مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی قومی یادگار ہے اور اس کے طلبا ہندوستان کے ہر ایک گوشہ میں اس کے علم بردار بنے ہوئے ہیں۔

سید احمد خاں محض ان وجوہ سے ہندوؤں سے بدگمان ہو گئے تھے کہ ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں کی جانب سے یہ کوشش ہوئی کہ اس صوبہ میں ناگری کو عدالتی زبان بنایا جائے۔ سید احمد خاں نے اسے ہندوؤں کی زیادتی سمجھی، حالانکہ یہ کوشش محض عوام کی آسانی کے خیال سے جاری ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ جس صوبہ میں ہندوؤں کی آبادی ۸۰ فیصدی سے زیادہ ہو اور اُس میں بیشتر لوگ دیہات کے رہنے والے اُردو سے ناآشنا ہوں وہاں اُردو کا عدالتی زبان ہونا صریح بے انصافی ہے اور تھوڑے سے اُردو داں اشخاص کے فائدے یا آرام کے لئے آبادی کے بہت بڑے حصّہ کو زیر بار کرنا کسی طرح قرین مصلحت نہیں۔ اور نہ اس تحریک کا منشا یہ تھا کہ اُردو ایک سرے سے فنا کر دی جائے لیکن سرسید کے دل میں یہ شبہہ جاگزیں ہوا کہ ہندو مسلمانوں کو زک دینا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے بعض ایسے اسباب اور بھی پیدا ہو گئے ہوں جن سے اس خیال کو تقویت ہوئی ہو کہ ہندو مسلمانوں کا اتفاق اور اتحاد ممکن نہیں ہے۔ ان دونوں قوموں میں تاریخی اور مذہبی اختلافات پہلے ہی سے موجود تھے۔ مغل سلطنت کی تباہی اور انگریزی عملداری نے ان اختلافات کو مٹانا اور پرانے زخموں کو بھرنا شروع کیا تھا کہ یہ نئے اختلافات پیدا ہو گئے اور متحدہ قومیت کی منزل ایک عرصہ دراز کے لئے نظروں سے دور ہو گئی۔ مذہبی فرقوں کے اختلافات کا عملی عناد کی صورت میں منتقل ہو جانا کتنا آسان ہے، یہ ہم آئے دن آنکھوں سے

دیکھ رہے ہیں۔آج ذرا ذرا سی فروعی باتوں پر آپس میں خونریزیاں ہو جاتی ہیں اور ملکی طاقت کا ایک بڑا حصہ باہمی ناچاقیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ ایسا کوئی سال نہیں جاتا کہ دو چار مقامات میں ہولناک شروفساد نہ ہو جاتے ہوں۔ جائے افسوس ہے کہ اس زمانہ میں فریقین کی تنگ خیالیوں نے اُس رواداری اور باہمی مصالحت میں رخنہ ڈال دیا جس کی بنیاد پر متحدہ قومیت کی عمارت کھڑی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے سرسیّد نے مسلمانوں کے لئے سابق حکمرانوں کی روداد کی حیثیت سے کسی قدر امتیاز ضروری سمجھا ہو مگر ہندو مساوی سے زیادہ کسی قسم کی رعایت کے لئے آمادہ نہ تھے۔ اگر سرسیّد نے اس وقت فراخدلی سے کام لیا ہوتا تو آج ہندوستان کی حالت کچھ اور ہوتی۔ لیکن انھوں نے وقتی اور قریبی فوائد کو دائمی اور قومی اغراض پر مرّجح سمجھا۔ موجودہ حکمرانوں سے اتحاد اُس سے کہیں زیادہ نفع بخش تھا جتنا محکوم ہندوؤں کے ساتھ۔ انگریزی گورنمنٹ کے ہاتھ میں اختیار تھا۔ مناصب تھے۔ ترقی کے غیر محدود ذرائع تھے۔ ہندوؤں کی دوستی میں بجز باہم مل کر رونے کے اور کیا رکھا تھا۔ سرسیّد کے خیالات میں یہ تغیر اُس وقت سے اور زیادہ نمایاں ہو گیا جب وہ ولایت گئے۔ وہاں انھوں نے جو کچھ دیکھا اُس سے وہ اسی نتیجہ پر پہونچے کہ مسلمانوں کا مفاد انگریزوں سے موانست اور اتحاد میں ہے۔ اس طرح اس طرز عمل کی بنیاد پڑی جو روز افزوں خوفناک صورت اختیار کرتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اُس نے باہمی ارتباط کو محال ہی نہیں کر دیا

بلکہ ملک کی فضا کو مسموم کر دیا ہے ۔ ملک دو مخالف حصّوں میں منقسم ہو گیا ہے اور اُس کے تباہ کن اثرات گشت و خون کی صورت میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور ہر دو فریق ایک تیسرے فریق کا برسرِ اقتدار ہونا اپنے اپنے وجود اور بقا کے لئے ناگزیر سمجھتے ہیں ۔ سرسید جیسے ذی اثر اور بیدار مغز بزرگ قوم نے اگر متحدہ قومیت کی حمایت کی ہوتی تو آج ہندوستان کہیں سے کہیں پہونچا ہوتا ۔ غار کے جراثیم اس قدر سخت جان ہوتے ہیں کے ایکبار تقویت پاکر پھر ناقابل ہلاک ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ اُس وقت سے اب تک اتحاد کی جتنی کوششیں کی گئیں وہ سب ناکام ہوئیں اور اتحاد کی منزل اب بھی اُتنی ہی دور ہے ۔

سرسید نہایت مردم شناس تھے ۔ اور جس شخص سے اُنھیں ایکبار حسنِ ظن ہو جاتا پھر اُس کے خلاف کوئی شکایت نہ سُنتے تھے ۔ اُن کی محنت کا یہ حال تھا کہ وہ تنہا جتنا دماغی کام کر سکتے تھے اتنا کئی آدمی مِل کر بھی نہ کر سکتے تھے ۔ بہت ہی زندہ دل، بامروت، فیاض طبع اور خوش بیان بزرگ تھے ۔ اُن کی تقریر میں جادو تھا ۔ سامعین محوِ حیرت ہو جاتے تھے ۔ اُن کا قول تھا کہ کسی بڑے کام کی تکمیل کے لئے علمی لیاقت کی اِتنی ضرورت نہیں ہے جتنی تجربہ اور موقع شناسی کی ۔ مخالفین ہی اُن کے سامنے جاکر معاون بن جاتے تھے ۔ اُن کی ذہانت سے متاثر نہ ہو جانا غیر ممکن تھا ۔

سرسید نے اُردو زبان کی جتنی خدمت کی اُس کی تعریف کن الفاظ میں کی جائے ۔ یوں کہو کہ اُردو نے اُن کے دامن میں

پرورش پائی۔ اُس وقت تک اُردو میں شاعری کا بازار گرم تھا۔ ادبیت اور شعر گوئی شعرا کے تذکروں تک محدود تھی۔ اس میں نہ گھرائی تھی نہ بلندی۔ دقیق مسائل اور سنجیدہ مطالب کے ادا کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔ تاریخی، تنقیدی، اور علمی موضوعات پر اُسے اقتدار نہ تھا۔ سر سیّد نے اِن موضوعات پر تہذیب اخلاق میں جو مضامین لکھے وہ اُردو زبان کے کلاسک ہیں۔ اُن کے ایک ایک لفظ سے دقیق مطالعہ، وسیع تجربہ فطرت انسانی کے غائر مشاہدہ اور علمی مسائل کی عالمانہ تحقیق ٹپک رہی ہے بیان میں اتنی سلاست ہے کہ تھوڑی استعداد کا آدمی بھی بے تکلف سمجھ سکتا ہے۔ نہ پیچیدہ ترکیبیں ہیں، نہ اُلجھے ہوئے جملے، نہ مشکل الفاظ۔ مشکل سے مشکل مطالب کو وہ اِتنی بے ساختگی سے ادا کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ مضامین سب کے سب طبع زاد نہیں ہیں، بیکن اور آڈیسن اور بعض دیگر ادیبوں کے خیالات کا چربہ لیا گیا ہے، مگر اندازِ بیان اُن کا اپنا ہے اور اِس انداز نے مضامین میں جدّت پیدا کر دی ہے۔ اُن کی ادبی اور قومی خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ نے اُنھیں "سر" کا خطاب عطا کر کے قدردانی کا ثبوت دیا۔

عمر کے آخری ایّام میں سر سیّد مسلسل بیماریوں سے بہت نقیہہ ہو گئے تھے۔ مگر اُس وقت بھی یہ فنا فی القوم بزرگ خدمتِ قوم میں ہی منہمک تھا۔ آخر ۱۸۹۸ء کی ۲۷ مارچ کو پیامِ اجل آ پہنچا اور اُس نے اپنی زندگی کی لازوال یادگاریں چھوڑ کر عالمِ فانی سے رحلت کی۔

"باکمالوں کے درشن" از پریم چند

جماعۃ احمدیہ

گذشتہ اشاعت میں ہم مولوی حکیم نور الدین صاحب رئیس جماعۃ احمدیہ کے انتقال کی خبر درج کرچکے ہیں جو رسالے کے مرتب ہونے کے بعد پہنچی تھی، اب جو واقعات شائع ہوے ہیں اُنسے معلوم ہوتا ہے کہ اس جماعت میں مسئلۂ خلافت اور تکفیر و عدم تکفیر مسلمین کی بنا پر باہم اختلاف و نزاع پیدا ہوگیا ہے -

ایک عرصے سے اس جماعت میں مسئلہ تکفیر کی بنا پر دو جماعتیں پیدا ہوگئی تھیں - ایک گروہ کا یہ اعتقاد تھا کہ غیر احمدی مسلمان بھی مسلمان ہیں گو وہ مرزا صاحب کے دعووں پر ایمان نہ لاے ہوں - لیکن دوسرا گروہ صاف صاف کہتا تھا کہ جو لوگ مرزا صاحب پر ایمان نہ لائیں وہ قطعی کافر ہیں : ان للہ و انا الیہ راجعون - آخری جماعت کے رئیس صاحبزادہ بشیر الدین محمود ہیں - اس گروہ نے انھی کو اب خلیفہ قرار دیا ہے، مگر پہلا گروہ تسلیم نہیں کرتا -

مولوی محمد علی صاحب ایم - اے نے اس بارے میں جو تحریر شائع کی ہے، اور جس عجیب و غریب جرأت اور دلاوری کے ساتھہ قادیان میں رہکر اظہار راے کیا ہے جہاں زیادہ تر پہلے گروہ کے رؤسا ہیں، وہ فی الحقیقت ایک ایسا واقعہ ہے جو ہمیشہ اس سال کا ایک یادگار واقعہ سمجھا جائیگا !

اس جماعت کا بیان ہے کہ انکی تعداد کم از کم تین لاکھہ ہے، لیکن مسلمانان عالم کی تعداد آج چالیس کرور تک اندازہ کی گئی ہے -

پس اگر غیر احمدیوں کو کافر سمجھہ لیا جاے تو اس نئی مردم شماری کی بنا پر چالیس کرور میں سے انتالیس کرور ستانوے لاکھہ کی تعداد نکال دینی پڑیگی - پھر افسوس اُس دین الٰہی پر جس کا درخت خدا نے لگایا، پر آج اُسکی شاخوں میں صرف تین ہی لاکھہ پھل باقی رہگئے ہیں !! (الہلال، ۲ جمادی الآخر ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۳ء)

جناب فرخ جلالی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

تاریخ مجمل مفصل مخطوطہ خدابخش

سوانح جان جاناں پر نئی روشنی

خدابخش اورینٹل لائبریری میں ایک کتاب قلمی ہے جس کا نام فہرست میں تاریخ مجمل مفصل ہے اور مصنف امی محمد براری ہے اوراق ۱۴۴ نمبر شمار ۴۰۲۸ ہے۔

مصنف نے سنہ خمس وستین والف ہجری (۱۰۶۵) میں یہ کتاب لکھی۔ اب جس کتاب کا سنہ تصنیف ۱۰۶۵ھ ہو وہ ۱۰۰۹ھ میں کیسے لکھی جاسکتی ہے۔ اصل میں یہ ۱۰۹۰ھ ہوگا جو اس نے اس زمانہ کے مخصوص طرز کتابت کی بنا پر ایک اور نو کے درمیان دو صفر لکھ دیئے۔

کتاب کا مصنف محمد براری اپنے پرداداکا نام مجنوں خاں قاقشال لکھتا ہے جو عہد اکبری کے امیر ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مظہر جان جاناں کے جد کا نام مجنوں خاں قاقشال بتایا جاتا ہے۔ مصنف نے اپنا شجرہ یوں لکھا ہے "محمد براری امی ابن محمد جمشید ابن جباری خاں ابن مجنوں خاں قاقشال" مرزا مظہر جان جاناں کے شجرہ میں یہ نام نہیں ہیں۔ ایک کتاب میر سید حبیب اللہ ہیں۔ شمس الدین حبیب اللہ مرزا مظہر کا نام بتایا جاتا ہے۔ ۱۰۹۰ھ میں مرزا مظہر پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ کہیں مرزا مظہر کے والد کا نام تو حبیب اللہ نہیں ہے۔ مرزا مظہر کے والد کی عرفیت مرزا جان ہے اور نسبا علوی بتائے جاتے ہیں۔ دراصل یہ کتاب نامکمل ہے ورق ۱۴۴ کے بعد کے اوراق گم ہوگئے اور امضا یا ترقیمہ کا ورق مل گیا وہ آخر میں لگا دیا گیا۔

اسی مصنف محمد براری امی بن محمد جمشید ابن جباری خاں قاقشال کی ایک اور کتاب عقول عشرہ ہے جس کا موضوع بہت دلچسپ یہ اصل میں علوم پر ہے اور کئی کاتبوں نے پٹنہ بلاد عظیم آباد میں نواب شمشیر خاں کے حکم سے لکھی ہے۔ یہ کتاب مشہور کتابوں کے عاشق مظفر حسین ۱۲۷۷ھ کے کتابخانہ کی ہے ان کی مہر موجود ہے پٹنہ میں نقل ہوئی، لکھنؤ گئی اور واپس پٹنہ آگئی بہت دلچسپ کتاب ہے اور شاہجہاں کے عہد میں تصنیف ہوئی۔

••

ڈاکٹر اختر امام (شری لنکا)

کچھ سر علی امام کے بارے میں

"سر علی امام کو میں نے لڑکپن میں دیکھا تھا اور ان کے ارشادات اب بھی یاد ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ سر علی امام نیورا نہیں بلکہ کرائے پرسرائے ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے تھے جو عظیم آباد پٹنہ سے جنوب مشرق کی جانب تقریباً بیس یا پچیس میل پر واقع ہے۔ یہاں پہلے شرفاء کی آبادی تھی جس کی خاک سے ممتاز ہستیاں پیدا ہوتی رہیں۔ یہیں سر علی امام کے آبائی گھر میں بلکہ یوں کہئے کہ ان کے دادا اور پردادا کے گھر میں میر قاسم بھی جنگ آزادی کے زمانے میں ٹھہرا کرتے تھے۔ نواب امداد صاحب اثر کرائے پرسرائے میں نہیں بلکہ ۱۶ راگست ۱۸۴۰ء میں سالار پور ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے تھے اور بیسیوں گرانمایہ تصانیف کو چھوڑ کر ۱۷ راکتوبر ۱۹۳۴ء میں آبگلہ میں سپرد خاک ہوئے۔ موجودہ شہر گیا میں دریائے پھلگو کے اس پار آبگلہ اب بھی موجود ہے۔ میں تقریباً ہر سال دو مرتبہ علیگڈھ سے آبگلہ جایا کرتا تھا اور نواب صاحب مرحوم یعنی اپنے بڑے دادا کے یہاں ٹھہرا کرتا تھا۔ پھر چند دنوں بعد وہاں سے رخصت ہوتا تھا۔ نیورہ سر علی کا ننہال تھا' مولد نہیں تھا۔ سر علی کے بارے میں ایک خواب کا ذکر بھی شاید نامناسب نہ ہوگا۔ پٹنہ میں نواب امداد صاحب بلکہ درحقیقت پٹنہ سٹی میں زندگی کے ابتدائی دور میں طبابت کیا کرتے تھے۔ جب سر علی نے ہوش سنبھالا تو نواب صاحب کے حقیقی چھوٹے بھائی یوسف امام صاحب یعنی ہمارے دادا نے انگریزی تعلیم کے لئے اپنے بھتیجے کو بانکی پور بھیجا جہاں ان کا داخلہ T. K. G مدرسہ

اسکول میں ہوا۔ وہیں پڑھتے رہے۔ چھٹیوں میں کرائے پر سرائے جایا کرتے تھے۔ جب انٹرنس میں داخل ہوئے تو دل لگا کر پڑھتے رہے مگر خلاف اُمید وہ فیل ہو گئے۔ اپنے والد ماجد سے ملنے کے بعد جو ان کا معمول تھا کرائے پر سرائے گئے۔ اور چچا کو سنایا کہ بدنصیبی سے وہ فیل ہو گئے ہیں۔ چچا نے کہا اس میں غمگین ہونے کا سوال ہی بے معنی ہے۔ اگلے سال پھر امتحان میں بیٹھنا۔ اسی اثنا میں ہمارے دادا مرحوم نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ سفید ریش اور گیسو دراز تشریف لائے اور کہا کہ یوسف اپنے بھتیجے کو ولایت بھیج دو تا کہ اس کا ستارہ چمکے۔ یوسف امام صاحب مرحوم کی مالی حیثیت اپنے بڑے بھائی سے کہیں زیادہ تھی۔ انہوں نے اپنے بھتیجے کو بلا کر خواب بیان کیا۔ لائق بھتیجے نے فوراً جواب دیا "سرکار (سر علی عمر بھر تک جب بھی اپنے والد ماجد یا چچا سے ملتے تھے تو سرکار سے مخاطبت کیا کرتے تھے) ولایت ضرور جاؤں گا۔ اس وقت لندن میں بیرسٹری کے داخلہ کے لئے انٹرنس شرط نہ تھی۔ ہمارے دادا خود بمبئی تک اپنے لاڈلے بھتیجے کو خدا حافظ کہنے گئے تھے۔ جب بیرسٹری کی سند لیکر واپس ہوئے تو پھر وکالت شروع کر دی تھی اور پھر دنیا نے دیکھا کہ وہ کہاں تک پہنچے۔ ان کے چھوٹے بھائی حسن امام کو ان کے والد ماجد نے اپنی آمدنی سے ولایت روانہ کیا تھا۔

سر علی کو میں نے خود دیکھا ہے کہ کرائے پر سرائے میں چچا کے سامنے چوکی پر جس پر قالین بچھی رہتی تھی پاؤں لٹکا کر بیٹھے ہیں اور چچا سامنے وہیں گاؤ تکیہ سے ٹکے ہوئے نیم دراز ہیں۔ یوسف امام صاحب ناس لیا کرتے تھے اور جب گلا صاف کرنے کے بعد کھکھار کی نوبت آتی تو سر علی (جبکہ وہ حیدر آباد میں صدر اعظم تھے) فوراً اٹھے اور اگالدان اٹھا کر بڑھا دیا۔ پھر ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حیدر آباد سے استعفا دے کر جب پٹنہ آئے تو اولین فرصت میں چچا کو سلام کرنے کے لئے حاضر ہوئے۔ میں اس وقت میٹرک میں پڑھتا تھا خود سر علی کو کہتے سنا کہ سرکار

جب میں ملازم ہو کر حیدرآباد گیا تو مجتہدین شیعہ سمجھ کر (کیونکہ نواب امداد امام صاحب جوانی میں لکھنؤ اور رامپور کے زیر اثر شیعہ ہو گئے تھے) حضرت عمرؓ کے خلاف طنزیہ جملے کہنے لگے۔ میں نے کہا کہ اگر حضرت عمرؓ کو امیرالمومنین اور خلیفہ نہیں تسلیم کرتے ہیں تو پھر جو اسلامی جہاد ایران پر ہوا وہ جہاد نہیں بلکہ اس کی حیثیت محض لوٹ مار کی سی تھی۔ ہاں پھر یہ بھی تو قابل غور بات ہے کہ جب حضرت عمر کو خلیفہ تسلیم نہیں کرتے تو پھر جہاد ایران کے بعد جو مال غنیمت مسلمانوں کو ملا وہ مال غنیمت نہیں بلکہ ناجائز ہی متاع تھی۔ اور پھر شہر بانو کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے جسے حضرت عمرؓ نے امام حسین کی زوجیت میں دیا تھا۔ اور اس کے بعد سادات بھی صفر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ باتیں سر علی نے چچا کو خوش کرنے کے لئے نہیں کہی تھیں بلکہ ہم لوگ جانتے تھے کہ وہ حنفی المذہب سُنّی تھے۔ جب ہماری چچی لیڈی امام صاحبہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے کہا کہ انہیں اپنے پیر شاہ بدرالدین علیہ الرحمتہ کے گورستان میں دفن کیا جائے تقریباً چار سال ہوئے جبکہ میں پھلواری شریف گیا تھا تو چچی مرحومہ کی قبر پر فاتحہ کے لئے حاضر ہوا تھا۔

سر علی کو درباری سازشوں نے چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ بلکہ یہ بھی ایک دردناک سانحہ ہے کہ زہر دے کر انہیں نڈھال کر دیا تھا۔ اور پٹنہ آنے کے بعد بھی چند ہی سال زندہ رہ سکے۔ یہ بھی ہم لوگوں کو معلوم ہے کہ زہر دینے میں کس کا ہاتھ تھا۔ مگر مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ دامن بچا کر گذر جاؤں۔

یوسف امام صاحب مرحوم کے یہاں جب سر علی آیا کرتے تھے تو پورے گاؤں میں ایک تہلکہ سا مچ جایا کرتا تھا اور زمینداری کے گماشتے بھی سلام کرنے کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے۔ ان گماشتوں میں ایک سن رسیدہ راجپوت بھی تھے۔ جنہوں نے ہمارے سامنے اپنی ٹھیٹھ مگدھی زبان میں کہا کہ سرکار فلاں جگہ ایک بڑا

علاقہ بک رہا ہے اسے خرید لیا جائے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ سر علی نے اسی زبان میں کہا بابو پرمیشر سنگھ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر اسی زبان میں کہا کہ "کہ ڈی ناکہ بر بر با چو ّاں سے ۔۔۔۔۔۔"

میں خود کرائے پر سرائے میں پیدا ہوا تھا مگر علیگڈھ کی تعلیم سے مگدھی بھول گیا تھا۔ وہ یعنی سر علی عربی بقدر ضرورت ہی جانتے تھے مگر فارسی ایرانی لہجہ اور انگریزی انگلستانی تلفظ سے بولتے تھے۔ اردو تو دھلی ہوئی تسنیم و کوثر کی تھی۔ کیا مجال کہ اردو میں انگریزی الفاظ ٹھونسے جائیں۔

ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے جسے سر علی آبدیدہ ہو کر یاد کرتے تھے۔ کہنے لگے کہ جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے سمندری جہاز سے جا رہا تھا اور جب بحر احمر سے گذر کر سوئز کا رخ آ رہا تھا تو میں زار و قطار رونے لگا۔ ڈیک پر کھڑا تھا کہ اقبال آئے اور پوچھا کہ علی خیر تو ہے روتے کیوں ہو؟ میں نے جواب دیا کہ اقبال دیار حبیبؐ ہم سے چھوٹ رہا ہے۔ یہ سنتے ہی اقبال بھی گلے لگ کر رونے لگے۔ اللہ اللہ یہ تھا عشق رسولؐ جس دولت سے سر علی اور اقبال دونوں بے حد مالا مال تھے۔

سید یوسف الدین بلخی صاحب نے "بہار اردو لغت" کے زیر عنوان ان تمام علاقائی الفاظ اور محاورات کو الفبائی طریقہ پر مرتب کیا ہے جسے خدابخش لائبریری "جرنل" نے ۲۸ ر شمارہ میں شائع کیا ہے۔ یہ ایک لائق تحسین کام ہے۔ اردو ہند و پاک کے مسلمانوں کی مشترکہ زبان رہا کی ہے جس میں مشرقی پاکستان بھی شامل تھا۔ اردو بولنے والوں نے بنگالیوں کی اردو پر قہقہے لگائے اور یہ نہ جانا کہ اس زہر خند سے وہ زبان کی شریعت میں گناہ کبیرہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس کا رد عمل نفسیاتی طور پر یہ ہوا کہ بنگلہ دیش میں اردو کا جنازہ نکلا۔ علیگڈھ میں ابتدائی جماعتوں سے لیکر ایم۔ اے

تک میں نے تعلیم پائی ہے۔ اسکول کے بچے اگر بنگالی ہم سبق کی اردو پر ہنسیں تو یہ ایک حد تک قابل معافی ہے۔ مگر جب گریجویٹ اس بدزبانی کا ہمنوا ہو تو ظاہر ہے کہ اردو کے حق میں کانٹے بو رہا ہے۔ ہمارے اردو کے اساتذہ اعلیٰ تعلیمی سطح پر دو قابل ذکر ہیں۔ ایک تو حضرت مولانا احسن مارہروی اور دوسرے رشید احمد صدیقی صاحب۔ مولانا احسن اپنے طلبار کا دل بڑھاتے تھے۔ خواہ وہ بنگالی ہوں، بہاری یا گجراتی۔ مگر رشید صاحب یوپی کے سوا غیر یوپی طلباء کو ہمیشہ اہل زبان سے گرا ہوا فرد سمجھتے تھے۔ معین دردائی مجھ سے جونیئر تھے اور اردو کے پرستار تھے مگر ان کے ذوقِ شفیق کو رشید صاحب نے قابل اعتنا نہ سمجھا۔

ڈاکٹر انیس امام

امام برادران کے متعلق مشہور ہے کہ وہ لوگ شیعہ تھے حالانکہ وہ ایک سنی گھرانے کے چشم چراغ تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے والد نواب امداد امام اثر کا تعلق بھی ایک محترم سنی گھرنے سے تھا لیکن جب وہ نواب رامپور کی صحبت میں بیٹھے تو شیعہ مذہب اختیار کرلیا اور حضرت عمرؓ کے خلاف ایک کتاب بھی لکھ دی لیکن ان کے دونوں بیٹوں علی امام اور حسن امام کے متعلق ڈاکٹر اختر امام نے جو واقعات سنائے ہیں ان سے ایک نتیجہ نکالا جا سکتا ہے ڈاکٹر اختر امام پاکستان میں سفیر رہ چکے ہیں اور سری لنکا یونیورسٹی میں شعبہ عربی کے صدر ہیں انھوں نے کہا کہ ایک مرتبہ ہمارے رشتہ داروں میں شادی ہو رہی تھی سر علی امام اور حسن امام دونوں شادی میں شریک تھے میرے خاندان کے افراد شیعہ بھی ہیں اور سنی بھی نکاح پڑھانے کے لیے شیعہ علماء بلائے گئے شیعہ علماء کے خطبۂ نکاح کے بعد حسن امام نے علی امام سے کہا کہ بھائی جان قانون میں نے بھی پڑھا ہے

اور آپ نے بھی شیعہ علمأ نے جو نکاح پڑھایا اس میں براہ راست ایجاب و قبول نہیں ہوا اس لیے نکاح نہیں ہوا سر علی نے ان کے خیال کی تائید کی اس کے بعد سنی علمأ بلائے گئے اور نکاح پڑھایا گیا۔ سر علی امام خانقاہ مجیبیہ اور خانقاہ سلیمانیہ پھلواری شریف کے بہت معتقد تھے اور صاحب خانقاہ کی محبت سے فیض اٹھاتے۔

ایک مرتبہ حسن امام راجہ صاحب محمود آباد کے یہاں قیام پذیر تھے انھوں نے راجہ صاحب سے موٹر طلب کی تاکہ دیوا شریف تشریف لے جائیں راجہ صاحب کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے کہا کہ ہم لوگ شیعہ ہیں دیوا شریف سے ہمارا کیا تعلق حسن امام نے کہا کہ ہم چار باتوں کو تسلیم نہیں کرتے اس کے علاوہ ہم شیعہ ہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ متعہ کو ہم زنا (FORNICATION) سمجھتے ہیں، تقیہ کو ریاکاری (HYPOCRACY) اور تبرا کو ناشائستگی (INDECENCY) خیال کرتے ہیں۔ چوتھی بات اختر امام سے پھر دریافت کروں گا۔ ●●

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

کچھ اپنے بارے میں

محمد طفیل مدیر نقوش کے دربار سے ایک "درخواست نما" حکم نافذ ہوا کہ اپنے حالات لکھ بھیجیے۔ لکھ کر کیا کروں۔ سچ بولوں تو جیل میں جاتا ہوں اور جھوٹ بولوں تو جہنم میں۔ پھر میرے حالات ہیں کس مرض کی دوا۔ ولی ہوتا، تو منازلِ ولایت طے کرنے کی داستان لکھتا۔ موجد ہوتا تو کامیابی سے پہلے کی ناکامیوں کا حال سناتا۔ فاتح ہوتا تو فتوحات کی کہانی قلم بند کرتا۔ میں ٹھہرا خالص خشک ہیڈ مدرس، جس کی زندگی ایک لق و دق بیابان کی طرح اجاڑ اور ایک سنگلاخ وادی کی طرح ناہموار ہے۔ اس میں خاردار جھاڑیوں اور نکیلے پتھروں کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔ ایسی "آپ بیتی" سن کر آپ کیا کریں گے۔ اچھا! اگر آپ مُصر ہیں تو سنیے۔

بچپن میں میرے ہمجولی مجھے جانی کہا کرتے تھے۔ جانی ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کے والد پٹواری تھے۔ ان کی تنخواہ سبکدوشی کے وقت (۱۹۲۱ء) چودہ روپے ماہانہ تھی۔ اس زمانے کے چودہ آج کے چار سو سمجھیے۔ گندم ۳ من روپے میں تھی۔ گھی روپے میں تین سیر اور دودھ دس سیر آتا تھا۔ لٹھا تین آنے، ریشمی کپڑا چھ آنے اور سفید کھدر پانچ پیسے گز تھا۔ اس ارزانی کا نتیجہ یہ کہ جانی کے والدین دودھ کے لیے بھینس رکھ سکتے تھے، اور سواری کے لیے گھوڑی۔

سکونت۔ ولدیت کیمبل پور سے بیس میل جنوب میں ایک چھوٹا سا گاؤں بسال کے نام سے مشہور ہے۔ یہی جانی کا مولد و مسکن ہے۔ اس کے والد کا نام محمد قاسم تھا۔ جانی نے ۱۹۰۵ء کے قریب ہوش سنبھالا۔ اور دیکھا کہ اس کے والد کافی عمر رسیدہ ہیں۔ داڑھی کو حنا سے رنگتے ہیں۔ نماز تہجد کے پابند ہیں اور کبھی کبھی جانی کو بھی نماز تہجد کے لیے مسجد میں ساتھ لے جاتے ہیں۔

تعلیم بسال میں صرف تین جماعتوں تک ایک مدرسہ تھا۔ ۱۹۰۵ء میں جانی اسی سکول میں داخل ہوا۔ وہاں ایک ہی مدرس تھا ماسٹر جگت سنگھ جو پڑھاتا کم اور مارتا زیادہ تھا۔ صبح آتے ہی ایک کلاس کو کان پکڑوا دیتا۔ دوسری کو اٹھ بیٹھ پہ لگا دیتا۔ اور تیسری کو پڑھانا شروع کر دیتا۔ یہ پروگرام ہر گھنٹے کے بعد بدل جاتا اور ہر جماعت کو باری باری ان منازل سے گزرنا پڑتا۔ چونکہ جانی جماعت میں بدترین لڑکا تھا اس لیے ماسٹر جگت سنگھ اس پر خاص توجہ دیتے اور دن میں تین چار مرتبہ لاتوں اور گھونسوں سے اس کی تواضع فرماتے۔ سال بھر کے بعد ماسٹر صاحب

تبدیل ہو گئے اور اس کی جگہ ماسٹر دیوان چند تشریف لائے۔ لیکن حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ جانی کی پٹائی اسی طرح جاری رہی۔ آخر تنگ آ کر وہ تیسری جماعت میں سکول سے بھاگ نکلا۔ ہر روز گھر سے نکل کر سیدھا کھیتوں کا رُخ کرتا۔ دن بھر غلیل سے پرندے مارتا سانڈھوں کے پیچھے بھاگتا دوسروں کی فصلیں اُجاڑتا۔ اور شام کو گھر آ جاتا۔ والد صاحب اس صورتِ حال سے بالکل بے خبر تھے والدہ کو سب معلوم تھا لیکن ماں ماں ہی ہے بچہ بھلا ہو چاہے یا بد قماش اس کا کام دُعا و عافیت ہے۔

غیبی امداد ضلع جھنگ میں میرہ شریف ایک مشہور گدی ہے۔ جس پر بڑے بڑے باکمال لوگ متمکن رہے۔ ان میں سے ایک خواجہ احمد رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جن کا انتقال [illegible] کے قریب ہوا۔ جانی کے والد انہی کے مرید تھے۔ [illegible] کی ایک شام کو یہ خبر آئی کہ حضرت صاحب بسال تشریف لا رہے ہیں۔ اس خبر سے جانی کے گھر میں بڑی بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ مٹھائیاں بن رہی ہیں جوڑے سل رہے ہیں۔ نیاز نذر کے لیے نقدی، قرآن شریف اور بعض دوسری نوادرات کا انتظام ہو رہا ہے اور جانی بہت خوش کہ وہ اپنے بزرگوں کے ہمراہ حضرت مرشد کی خدمت میں جائے گا۔ نذرانہ پیش کرے گا وہ سر و پشت پر ہاتھ پھیریں گے اور دعا دیں گے

آخر وہ صبح آ ہی گئی پیر صاحب کے خیمے گاؤں سے باہر ایک نالے کے کنارے نصب تھے جانی اپنے والد اور اپنے بڑے بھائی پروفیسر غلام ربانی عزیز، آج کل پرنسپل اسلامیہ کالج قصور، کے ہمراہ ایک خیمے میں داخل ہوا۔ اندر مریدوں کے دائرے میں حضرت صاحب تشریف فرما تھے سر پر سلیٹی ٹوپی، سفید کرتہ، نیلا تہمد، سفید نورانی چہرہ، سفید داڑھی، شخصیت میں بلا کی کشش۔ اور آنکھیں گویا دو دہکتی ہوئی قندیلیں۔ جانی والد صاحب کے ساتھ ان کے گھٹنوں پر جھک پڑا۔ چاندی کا ایک روپیہ نذر کیا۔ انھوں نے سر اور منہ پر ہاتھ پھیرا اور دعا فرمائی۔ بعد میں والد صاحب سے پوچھا

"لالو، لالو، یہ دونوں بچے کہاں پڑھتے ہیں۔"

حضور، انگریزی سکول میں۔

"لالو لالو بہت بُرا بہت بُرا۔ لالو انھیں آج ہی وہاں سے اُٹھا کر علم دین پڑھاؤ، لالو یہ آج ہی کرو۔"

والد صاحب نے تعمیل ارشاد کا وعدہ کیا۔ اور گھر آ کر پہلا کام یہ کیا کہ بچوں کو سکول سے اُٹھا لیا۔ اور گھر ہی میں سب سے بڑے بھائی پروفیسر نور الحق ٹ کی شاگردی میں دے دیا۔ جو دیوبند سے تازہ تازہ فارغ ہو کر آئے تھے۔

بھائی صاحب گاؤں کی مسجد میں درس دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ اُن کے ہاں درجن بھر طلبہ جمع ہو گئے۔ جن میں سے ہر ایک کا سبق دوسرے سے الگ تھا۔ جب جانی اور اس کا بھائی بانی کریما، نام حق اور پند نامۂ عطار کے بعد بوستان تک پہنچے تو بھائی صاحب دوبارہ دیوبند چلے گئے اور جانی کو پڑھائی کے عذاب سے نجات مل گئی۔ اب جانی کا کام دن کو تیتر، بلبلیں اور کبوتر پکڑنا، اور بیر کھانا، چوری خربوزے توڑنا۔ اور رات کو ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ مل کر مختلف کھیل کھیلنا۔ کبڈی، چور سادھ، بادشاہ وغیرہ کھیلنا تھا۔ جانی کی چیرہ دستیوں کے خلاف ایک نہ ایک شکایت ہر روز والد صاحب کے پاس پہنچ جاتی۔ اور وہ روزانہ پٹتا۔

جب والد نے دیکھا کہ جانی آوارہ گرد، چور اور لٹیرا بن رہا ہے تو وہ دونوں بھائیوں کو سات میل دور ایک گاؤں رنگ آباد میں لے گئے۔ جہاں دو عالم درس دیا کرتے تھے۔ ایک باپ تھا اور دوسرا بیٹا۔ باپ کا نام محبوب شاہ تھا۔ سفید داڑھی۔ سرخ چہرہ، اشراق و تہجد کے سخت پابند حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کے خلیفہ اور سارے علاقے کے پیر و مرشد۔ آپ عموماً مولانا روم کی مثنوی، خواجہ حافظ کا دیوان یا عربی صرف و نحو پڑھاتے تھے باقی علوم مثلاً فقہ، منطق، فلسفہ، میراث۔ حدیث اور تفسیر کا درس ان کے فرزند ارجمند حضرت جناب شاہ دیا کرتے تھے۔ جناب شاہ ایک متبحر عالم تھے اور ان سے فیض درس لینے کے لیے بلخ و قندھار تک سے طلبا آتے تھے۔ جانی ایک کتاب بیٹے سے اور دوسری باپ سے پڑھا کرتا تھا۔ اس نے شاہ بزرگ سے مثنوی کے تمام دفتر سبقاً سبقاً پڑھے اور چھوٹے شاہ سے عربی نحو و منطق کی کئی کتابیں پڑھیں۔ یہ سلسلہ آٹھ سال تک جاری رہا۔

جانی اور اس کے بھائی ہر روز صبح اپنے گھر سے نکلتے سات میل دور رنگ آباد جاتے سبق پڑھتے۔ طلبہ کی بحث و تمحیص میں حصہ لیتے اور شام کو گھر لوٹ آتے۔ اگر بارش وغیرہ کی وجہ سے کبھی وہاں رہنا پڑتا تو رات کو دونوں بھائی فرشِ زمین پر سوتے۔ وہاں زمین پر سونا میراثِ علیؓ و عمرؓ متصور ہوتا تھا۔

ٹ عربی ادب، تاریخ، حدیث، سیرت اور تفسیر کے ممتاز عالم۔ المبرد الکامل۔ نحو کی کتاب کے شارح۔ عربی زبان پر بے پناہ دسترس۔ بیس برس اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر رہے وفات ۱۹۵۱ء

طلبہ کا کھانا گاؤں سے آتا تھا۔ ہر صاحبِ حیثیت ایک روٹی اور تھوڑا سا سالن دیا کرتا تھا۔ اسے جمع کرنا کمسن طلبہ کا فرض تھا۔ جس شام جانی کو رنگ آباد میں رکنا پڑتا اُس سے نان اندوزی کا کام بھی لیا جاتا تھا۔

استادِ محترم مولوی جناب شاہ صاحب داڑھی کو خضاب لگاتے تھے۔ اس غرض کے لیے جمعرات کے دن وہ طلبہ کی یہ ڈیوٹی لگاتے تھے کہ وہ دس میل دور ایک قصبے جنڈ سے ایک پیسے کی مہندی اور ایک پیسے کی کھٹ لے آئیں۔ مہینے میں ایک بار جانی بھی اس مہم پر جاتا۔ ایک دن جانی اپنے ساتھی سے پوچھنے لگا۔ کہ استادِ محترم یہ چیزیں اکٹھی کیوں نہیں منگوا لیتے۔ وہ کہنے لگا: "موت کا کیا اعتبار کیا معلوم کس وقت آ جائے۔" جانی کہنے لگا یہ بھی تو ممکن ہے کہ جب ہم یہ خضاب لے کر گاؤں میں داخل ہوں تو استاد جی کا جنازہ نکل رہا ہو۔ اس پر اُس کے ساتھی نے جانی کو وہ دھمکی کہ عمر بھر یاد رکھے گا۔ پھر مسجد میں پہنچ کر دوسرے طلبہ سے بھی اُسے پٹوایا۔

یقین مانیے۔ کہ وہ طلبہ اپنے استاد کو نبی سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ استاد کے سامنے نہایت باادب ہو کر بیٹھتے حلقے سے اٹھتے تو اُلٹے پاؤں چلتے تاکہ استاد کی طرف پیٹھ نہ ہونے پائے۔ اُستاد کے ہر حکم کی ہر حالت میں تعمیل کرتے۔ اُن کی زمینوں میں ہل چلاتے ان کے ڈھور چراتے۔ ان کی فصلیں کاٹتے، رات کو اُن کے پاؤں دابتے اور ان تمام خدمات کو وہ زادِ آخرت سمجھتے تھے۔

نہ جانے وہ اساتذہ و تلامذہ آج ہمارے کالجوں میں کیوں نہیں ملتے۔ غالباً وجہ یہ ہے۔ کہ موجودہ نصابِ تعلیم میں اخلاق و ادب پر کوئی کام کی کتاب نہیں ہے۔ انگریز نے جو نصابِ تعلیم ہمیں بے ادب، گستاخ، بداخلاق، اور لذت پرست بنانے کے لیے وضع کیا تھا وہی چل رہا ہے اور ہمارے ناظمینِ تعلیم اس صورتِ حال پر مطمئن ہیں۔ کیونکہ ان کی اکثریت اسلامی فکر و نظر سے محروم اور فکرِ فرنگ سے مرعوب ہے اور وہ موثر عمل کب ہو سکی، زن اور زر کو حاصلِ زندگی سمجھتی ہے۔

اساتذہ میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے وہ لوگ خدا اور رسول کے پیرو، عابد و زاہد، قناعت شعار، پاکیزہ کردار، ایثار پیشہ، دنیا کے غلام اور اپنے شاگردوں کے لیے ایک مقدس نمونہ تھے۔ دوسری طرف ہمارے کالجوں کے بیشتر اساتذہ بے عمل، بے کردار، لذت پرست فرنگ مزاج اور مذہب سے متنفر واقع ہوئے ہیں۔ ان کی شخصیتوں میں وقار کہاں سے آئے اور ان میں رہبری پیدا ہو تو کیوں کر۔ ڈاکٹر برق عموماً کہا کرتے ہیں کہ گزشتہ ستر برس کی عمر میں صرف ایک صداقت پر یقین حاصل ہوا ہے کہ عبادت اللہ سے رابطہ پیدا کرنے کا واحد راستہ ہے اور اس رابطے کے بغیر شخصیت میں نہ سوز آتا ہے نہ ساز نہ جمال پیدا ہوتا ہے نہ کمال۔ اسی رابطے کا نام عشق ہے جو حیاتِ انسانی کا محور ہے یہ ہے تو خودی خدائی ہے نہیں تو روسیاہی۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی — کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے — جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

وہ ماحول

اُس مکتب کا ماحول عجیب تھا۔ وہاں ہر وقت درس کا سلسلہ جاری رہتا اور رات کو عشاء کے بعد طلبہ کسی فقہی نحوی یا منطقی مسئلے پر جھگڑتے نظر آتے تھے۔ اُن کا انداز عجیب تھا۔ موضوع کو چھوڑ کر مقابل کو کسی ایسے مسئلے میں الجھا دیتے جس سے وہ قطعاً ناآشنا ہوتا۔ مثلاً

خرگوش حرام ہے یا حلال ؟
امام شافعی کے نزدیک حلال ہے !
امام شافعی کا مقام فقہ میں کیا ہے ؟
وہی جو امام ابو حنیفہ کا ہے۔
لاحول ولا قوۃ ۔ یہ کفرِ صریح ہے۔
تم کفر و اسلام کی تعریف کرو۔
تم یہ بتاؤ کہ کفر و اسلام گرامر میں کیا ہیں۔
اور ان سے کتنے باب بنتے ہیں۔
تم یہ بتاؤ کہ مُسْتَغْنٰی کیا صیغہ ہے۔

تم اَجوف و ناقص کی تعریف کرو۔

تم وجہ تخفیفِ مُظلقہ ... کا عکس بتاؤ۔

تم وحدت الوجود و وحدت الشہود میں فرق سمجھاؤ

تم ۔ ... تم ... تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اسے کج بحثی نہ کہیے۔ بلکہ مناظرانہ داؤ پیچ کی مشق تھی اُن طلبہ کی زندگیاں تبلیغ اسلام کے لیے وقف تھیں۔ انھیں معلوم تھا کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد دیگر مذاہب کے مبلغوں سے اُن کی ٹکر ہوگی۔ اور اس ٹکراؤ میں کبھی کبھی کج بحثی سے بھی کام لینا پڑے گا۔

کردار و نظر

ان طلبہ کی اکثریت عابد، زاہد، پاکیزہ کردار، قناعت شعار، لذتِ دنیا سے نفور، اور خدا اور رسول کی گرویدہ تھی۔ لیکن اِن میں خال خال ایسے بھی تھے جو تسکین جنسیت کیلئے نازیبا وسائل اختیار کرتے تھے۔ ان کا تناسب ہزار میں ۲ سے زیادہ نہیں تھا۔

ان طلبہ کو ان کے اساتذہ آزادیٔ فکر و نظر کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ امام ابو حنیفہ اور دیگر درجنوں مجتہدین ہر مسئلے پر اپنی رائے دے چکے ہیں احادیث کے حسن و قبح پہ حافظ ابن حجر، علامہ ابنِ ذہبی اور یحییٰ بن معین جیسے بیسیوں نقاد بحث کر چکے ہیں۔ میراث کے اصول منضبط ہو چکے ہیں اور دین کے ہر پہلو پر ہر طرح کی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اس لیے تم لوگ ان مسائل پہ مت سوچو ورنہ نزاع و اختلاف کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور شیرازۂ ملت بکھر جائے گا۔ وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے۔ کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے۔ اُس وقت تو یہ بات انوکھی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن آج سو فیصد صحیح نظر آتی ہے۔ ذرا اپنے گریجوایٹوں کو دیکھو، اہلکاران حکومت اور اساتذہ پہ نظر ڈالو کہیں اسلام دکھائی دیتا ہے؟ یہ کرشمہ ہے انگریزی ادب و فلسفہ کا، فحش انگریزی فلموں کا، اُن معتبر انگریزی رسالوں کا جن کی تصاویر جذبات سفلی کی مہیج اور حیا و عفت کی قاتل ہیں۔ اُن ناچ گھروں کلبوں اور شراب گاہوں کا جو انگریزی تہذیب کا لازمہ ہیں۔ آج اگر پنڈت نہرو ہیگ کی بین الاقوامی عدالت سے یہ مقدمہ دائر کر دے کہ صاحب! نامعلوم زمانوں سے ہندوستان ایک وحدت چلا آرہا تھا۔ اِن مسلمانوں نے شور مچایا کہ ہم اپنی آئیڈیالوجی کے مطابق الگ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اس لیے ہندوستان کے دو ٹکڑے کیجیے ہم نے کر دیئے۔ لیکن اُنھوں نے پاکستان میں اسلامیک آئیڈیالوجی کی وہ مٹی پلید کی ہے کہ توبہ ہی بھلی یقین نہ آئے تو پروفیسر ہاسویل سمتھ کی تازہ کتاب "اسلام اِن ماڈرن ہسٹری" پڑھیے یا پاکستان میں خود جا کر دیکھیے اِن کی برباد مسجدیں آباد رقص گاہیں بے نور سینے اور ویران چہرے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اسلام پاکستان میں دم توڑ رہا ہے۔ ان حالات و حقائق کی روشنی میں تقسیم ہند کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اس لیے پاکستان کو ختم کیا جائے

اے اہل پاکستان! ہے اس بات کا کوئی جواب؟

اے مسلماناں! فغاں از فتنہ ہائے علم و فن

اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیریاب

انقلاب انقلاب اے انقلاب

جانی سے مولی جی

جانی ۱۹۱۶ء کے آغاز تک رنگ آباد میں رہا۔ اس کے بعد مختلف دیہاتی مکاتیب میں گھومتا ہوا ۱۹۱۸ء میں چکوال کے ایک اسلامی مدرسہ میں جا داخل ہوا۔ وہاں ایک سال رہا۔ اس کے بعد لاہور کے نعمانیہ میں اور دو ماہ بعد مسجد نیلا گنبد میں جا پہنچا۔ وہاں حضرت مولانا غلام مرشد (آج کل خطیب شاہی مسجد لاہور، عمر ۹۰) سے فیض اُٹھانے کا موقع ملا۔ اس مسجد کے ذیلی کمرے دراصل دار الاقامہ تھے جہاں اورینٹل کالج کے طلبہ بھی ٹھہر سکتے تھے۔ ان سب کو کھانا مفت ملتا تھا۔ جانی اورینٹل کالج میں داخل ہو گیا۔ وہاں دو جلیل القدر ہستیاں تدریس پہ مامور تھیں یعنی مولانا نجم الدین وزیر آبادی جیلپی جو منطق، عربی ادب، فلسفہ، تفسیر اور حدیث میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ سید محمد طلحہ جو شعرِ جاہلیت کا درس دیا کرتے تھے۔ جانی نے ۱۹۱۹ء میں منشی فاضل اور ۱۹۲۰ء میں مولوی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ اور وہ اپنی علمی فضیلت نیز دو انچ لمبی داڑھی کی وجہ سے مولوی جی کہلانے لگا۔ جب اپنے گاؤں کو لوٹا تو صرف مُولی جی رہ گیا۔

مُولی سے مسٹر

نومبر ۱۹۲۰ء میں مُولی جی اسلامیہ ہائی سکول نوشہرہ (سرحد) چالیس روپے ماہوار پر معلم عربی مقرر ہوگئے۔ وہاں دو برس رہے ۱۹۲۲ء میں ادیب فاضل کرنے کے بعد مُولی جی کو احساس ہوا کہ انگریزی کے بغیر بات نہیں بنتی چنانچہ انھوں نے اپنے ایک شاگرد

سید انوار الحق سے، جو آج کل پشاور یونیورسٹی کے شعبہ پشتو میں کام کر رہے ہیں اور خوشحال خان خٹک پر اردو میں ایک ضخیم کتاب لکھ چکے ہیں، اے۔ بی۔ سی شروع کی۔ جب کچھ شُد بُد ہو گئی۔ تو آزادانہ مطالعہ شروع کر دیا۔ ایک سال بعد میٹرک، ۱۹۲۰ء میں ایف اے اور ۱۹۲۲ء میں بی اے کر لیا اور ۱۹۲۳ء میں دارمی کو الوداع کہا۔ اور اس طرح ٹرنکی جی مسٹر بن گئے۔

مسٹر سے برق

جب غالب، اقبال اور حالی کی شہرت مسٹر جیلانی تک پہنچی۔ تو اس نے ۱۹۲۳ء میں شاعر بننے کا فیصلہ کر لیا تخلص برق رکھا اور کئی غزلیں اور نظمیں لکھ ماریں۔ لیکن اسے نہ کسی حلقے سے داد ملی۔ نہ کسی رسالے میں جگہ۔ برق آج تک غزلیں لکھ رہا ہے۔ لیکن دنیا سے ابھی تک تسلیم نہیں کرا سکا، کہ وہ شاعر بھی ہے۔

مسٹر سے پروفیسر

مسٹر برق ۱۹۲۶ء کو ایم اے فارسی میں جا بیٹھے اور فیل ہو گئے۔ ان دنوں یہ گورنمنٹ ہائی سکول کیمبل پور میں ماسٹر اور رائے بہادر لالہ رتن لال کے تحت تھے جو راولپنڈی ڈویژن کے انسپکٹر تھے۔ رائے بہادر اعلیٰ درجے کے پاکستانی تھے ان معنوں میں کہ اگر ہندوؤں میں ایسے حضرات نہ ہوتے۔ تو پاکستان کا تصور ہی پیدا نہ ہوتا۔ برق صاحب نے ان کے خلاف تین چار آرٹیکل لکھ مارے اور وہ ان کے پیچھے پڑ گئے۔ تیسرے دن تبدیلی اور وہ بھی بدترین مقامات پر۔ برق صاحب تنگ آ گئے۔ ایک سال کی رخصت لے لی اور ساتھ ہی سوچنے لگے کہ ایام رخصت کیسے کاٹے جائیں۔ کسی نے ایم اے میں داخلے کا مشورہ پیش کر دیا۔ بات معقول تھی۔ سیدھے لاہور پہنچے اور اسلامیہ کالج میں داخل ہو گئے۔ ان دنوں اسلامیہ کالج بڑے عروج پر تھا۔ شکسپیئر کے مشہور عالم ایم اے حنی، خواجہ دل محمد، سید عبدالقادر، سردار یو کرامت، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، ڈاکٹر برکت علی قریشی اور مولانا اصغر علی روحی جیسے اساتذہ تھے اور سراج سجاد محمود نظامی، بشیر آذری، جہانگیر، نثار، خضر تمیمی اور مقبول بیگ بدخشانی جیسے تلامذہ۔ تیسرے دن بڑے بڑے ادبی اجلاس منعقد ہوتے تھے۔ جن میں مولانا ظفر علی، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، احمد شاہ بخاری (پطرس)، شیخ عبدالقادر اور ڈاکٹر اقبال جیسی ہستیاں شریک ہوتی تھیں۔

ایم اے عربی کے طلبہ تاریخ عربی کا سبق ڈاکٹر برکت علی قریشی سے لیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے ہی خوش صورت، خوش پوش اور خوش خلق انسان تھے اور مہینے میں ایک دو مرتبہ پوری کلاس کو چائے پر مدعو فرمایا کرتے تھے۔ اسی کلاس کو گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر ڈاکٹر صدر الدین عربی شعر و ادب پڑھاتے تھے۔ اور دنیائے اسلام کے مایہ ناز فرزند خان بہادر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع "الشعر والشعرا" کا درس دیتے تھے مولوی صاحب بے حد حسین کم گو اور پُر وقار شخصیت کے مالک تھے۔ بہت کم ہنستے تھے۔ کسی بات پر محظوظ ہوتے تو ہلکی سی ایک مسکراہٹ ان کے لبوں سے اٹھتی اور ان کی بڑی بڑی مونچھوں میں جذب ہو کر رہ جاتی۔ جب وہ نرم اور دھیمی آواز میں کسی موضوع پر بحث کرتے تو ان کے متوازن خیالات چھوٹے چھوٹے چُست فقرات اور بے پناہ معلومات سے جماعت پر لرزہ سا طاری ہو جاتا۔ ان عظیم و جلیل اساتذہ سے سال بھر پڑھنے کے بعد برق صاحب ایم اے میں بیٹھے۔ اور درجہ اوّل میں پاس ہو گئے۔

اُس دور کی ناقابل فراموش ہستیوں میں سے ایک ڈاکٹر تاثیر تھے۔ ہنس مکھ، ملنسار، لطیفہ سنج، مہمان نواز اور شرقی و غربی تہذیب کے سنگم۔ علم تھا کہ چھٹی کے دن برق اپنے احباب سمیت اُن کے دولت کدے پر حاضر ہوا اور غروب آفتاب تک وہیں رہے۔ ڈاکٹر صاحب شاعری، تصوف، نقاشی اور ادب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اور ان مسائل پر وہ ہر نشست میں ہمیشہ بولتے تھے۔ گوئٹے، رومی، اقبال اور عبدالرحمٰن چغتائی کا آرٹ موضوع سخن ہو۔ اور بولنے والا تاثیر جیسا ادیب شاعر اور فلسفی ہو۔ تو رنگ محفل کا اندازہ خود ہی لگا لیجیے۔

ایم اے پاس کرنے کے بعد برق صاحب دو سال تک سکولوں ہی میں خوار ہوتے رہے۔ آخر اُن کی دُعا قبول ہوئی۔ اور ۱۹۳۰ء کے اواخر میں وہ نقد اسی روپے ماہوار پر گورنمنٹ کالج ہوشیار پور میں لیکچرر، عرف عام میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ایک سال بعد ایم اے فارسی بھی کر لیا۔

پروفیسر سے ڈاکٹر

اب پروفیسر صاحب ڈاکٹر کے خواب دیکھنے لگے۔ لیکن دقت یہ کہ ڈاکٹریٹ کے لیے کتاب انگریزی میں لکھنا پڑتی تھی۔ اور پروفیسر صاحب انگریزی میں مطلق بودم بے دال تھے۔ صحیح انگریزی نہ لکھ سکتے تھے۔ نہ بول سکتے تھے۔ مختلف یونیورسٹیوں کے کیلنڈر دیکھنے کے بعد انھیں معلوم ہوا کہ اگر کوئی سکالر کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے اردو کرے۔ تو وہ ڈاکٹریٹ کے لیے اردو میں مقالہ لکھ سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایم اے اردو کلکتہ کی تیاری شروع کر دی۔ فیس داخل کی وہاں سے رول نمبر آ گیا۔ اور یکم جولائی

تھرو۔ اور ایک کونے سے رول نمبر نکل آیا۔ وہ خوشی میں ایک قلابازی لگانے کو تھے کہ ایک آواز آئی "سنبھل بیٹھیے حضرت! کہیں گر جائیں۔" اور پروفیسر صاحب کا شوقِ قلابازی سرد پڑ گیا۔ اب انھوں نے رول نمبر پڑھا، دوبارہ اور سہ بارہ پڑھا، آنکھیں مل کر پھر عینک لگا کر پڑھا اور دفعتاً آنکھیں بند کر لیں۔ بعد از چند لمحات "ہائے رے بدقسمتی" کہہ کر سیٹ پر گر پڑے۔ رول نمبر میں لکھا تھا:۔

اس امیدوار کو جس کا نام غلام جیلانی برق ہے ہر جوتی کو امتحان کے ہال میں داخل ہونے دو اور آپ امتحان سے پورا ایک ماہ بعد کلکتہ جا رہے تھے۔ مال و محنت کی بربادی اور مستقبل کی تباہی کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ پروفیسر صاحب کو کئی سو میل تک ہوش نہ آیا۔ آخر وہ سنبھلے، سامان اٹھایا اور کسی اسٹیشن پہ اتر گئے۔ رات بھر اپنی بدحواسی پہ لعنت بھیجتے رہے۔ اور ساتھ ہی سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ بالآخر انگریزی ہی میں مقالہ لکھنے کا فیصلہ کیا۔ اور صبح پہلی گاڑی پہ بیٹھ کر لاہور جا اترے سیدھا مولوی محمد شفیع صاحب کی رہائش گاہ پہ پہنچے انھیں ساری کہانی سنائی۔ اور ساتھ ہی التماس کی کہ وہ مقالہ کے لیے کوئی عنوان تجویز فرمائیں۔ آپ نے چند لمحے سوچنے کے بعد پوچھا "کیا آپ "ابن تیمیہ" پہ کام کر سکیں گے" جواب ملا "ضرور" "ارشاد ہو تو جائیے کام شروع کیجیے اور جو مواد یونیورسٹی لائبریری سے مل سکتا ہے۔ وہ لیتے جائیے۔" برق صاحب اٹھے۔ استاد و مرشد کے ہاتھ کو چوما اور دعائیں لے کر چلتے بنے۔ سوا چار سال کی تلاش و تحقیق کے بعد کتاب مرتب کی۔ اس کے سات باب تھے۔ اصلاحِ زبان کے لیے ایک ایک باب حضرات ذیل کو بھیجا۔ انھوں نے کمال بندہ نوازی سے کام لیا اور زبان و محاورات کی تمام اغلاط دور کر دیں۔

۱۔ پروفیسر پیر غلام وارث[1]

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد صادق[2]

۳۔ پروفیسر ڈاکٹر تاثیر مرحوم

۴۔ پروفیسر شیخ عبدالحق[3]

۵۔ خواجہ عبدالحمید مرحوم[4]

۶۔ گورنمنٹ کالج ہوشیارپور کے شعبہ انگریزی کے ایک پروفیسر سردار ہر نام سنگھ

۷۔ ساتواں نام یاد نہیں رہا۔

اس کے بعد یہ مقالہ قبلہ شفیع صاحب کو دیا، انھوں نے لاتعداد خامیاں پکڑ دیں۔ جنھیں کسی حد تک دور کر دیا گیا۔ اور پھر یہ کتاب یونیورسٹی کو بھیج دی گئی۔ سوا سال کے بعد نتیجہ نکلا اور پروفیسر برق ڈاکٹر برق بن گئے۔

داؤ

یوں تو پروفیسر برق سیدھے ہی لیکن حماقت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ لیکن ڈاکٹریٹ کے سلسلے میں ایک بڑا بھاری داؤ کھیل گئے۔ وہ یہ کہ رسوائی کے خوف سے کیمبل پور میں اپنی ٹیچنگ کو نہ بتایا کہ وہ ڈاکٹریٹ کے لیے چار سال تک کام کر چکے ہیں اور ان کی کتاب کی دو نقلیں پنجاب یونیورسٹی کی وساطت سے جرمنی اور امریکہ میں جا چکی ہیں۔ جب نتیجہ کا تار آیا۔ تو وہ بھاگے بھاگے اپنے ایک دوست پروفیسر فضل احمد قریشی[5] کے پاس پہنچے۔ انھوں نے خبر سن کر زور کا ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگے، مرید شفتہ ایا نی ڈاڑ۔ پھر وہ پرنسپل کے پاس گئے وہاں بھی یہی سلوک ہوا۔ اب انھوں نے قسم کھا کھا کر لوگوں کو بتانا شروع کیا۔ لیکن کوئی نہ مانتا۔ آخر وہ سائیکل پہ سوار ہو کر گھر پہنچے۔ مقالے کی نقل اور یونیورسٹی سے چار سال کی خط و کتابت اٹھا لائے۔ تب کہیں کالج والوں کو یقین آیا۔

---

[1] پیر غلام وارث گورنمنٹ کالج لاہور میں سائنس کے پروفیسر تھے۔ ۱۹۶۵ء میں ریٹائر ہوئے، آج کل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن لاہور کے سیکریسی آفیسر ہیں۔

[2] ڈاکٹر محمد صادق گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر تھے ریٹائرڈ ہونے کے بعد دیال سنگھ کالج میں کام کر رہے ہیں۔

[3] آج کل دیال سنگھ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔

[4] گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ غالباً ۱۹۶۵ء میں وفات پائی۔

[5] پروفیسر فضل احمد قریشی گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں بیس برس تک انگریزی اور تاریخ کے پروفیسر رہے آج کل محکمہ تعلیم کی انتظامیہ میں سیکشن آفیسر ہیں۔ میری ایک کتاب "ایک اسلام" کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ عنوان ہے "اسلام دی ریلیجن آف ہیومینٹی" مرحوم کے گم جگہ

بحیثیت معلم

بحیثیت معلم ڈاکٹر برق میں چار امتیازی صفات کے مالک ہیں۔
اوّل ہفتے میں ایک دو دن کلاس میں پہنچتے۔ اور باقی یہ کہہ کر بھول گیا ہوں
دوم۔ پڑھاتے کم اور لطیفے زیادہ چھوڑتے ہیں تجربہ یہ کہ قہقہوں کے شور کے ساتھ کے ایک دو گردوں میں بھی پڑھائی نہیں ہو سکتی۔
سوم: چونکہ اسلامی تاریخ، فلسفہ، سیاست، فکری تحریکات، قرآن، سیرت اور ادبیات کا مطالعہ خاصہ ہے۔ اس لیے پڑھاتے وقت ادھر ادھر نکل جاتے ہیں۔ تعلق ہو یا نہ ہو اقبال کے فلسفۂ عقل و عشق کو بات بات میں گھسیٹ لاتے ہیں اور ہفتوں ان دو افکار مسائل پر بولتے رہتے ہیں چونکہ ان کی آواز گمبیر، زبان فصیح و بلیغ اور بات کہنے کا ڈھنگ نرالا ہے۔ اس لیے طلبہ ذوق و شوق سے سنتے ہیں۔
چہارم: رہا نصاب، تو اس کا نصف ڈاکٹر صاحب پڑھا دیتے ہیں اور نصف دیگر طلبہ خود تیار کر لیتے ہیں یہ عجیب بات ہے کہ اس قسم کے کاہل، بےپروا، موڈی اور فرض ناشناس معلم کے تقریباً تمام شاگرد ہر امتحان میں بخیر پاس ہوتے رہے لوگ کہتے ہیں کہ اس کے پاس گیدڑ سنگھی ہے۔

مست و ہوشیار

یوں تو ڈاکٹر صاحب بکار خود بڑے ہوشیار ہیں لیکن جب کوئی کتاب یا مقالہ لکھ رہے ہوں تو آٹھوں پہر اپنے خیالات میں گم اور حوادثِ عالم سے بے خبر رہتے ہیں۔ ایسے میں جب گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ تو موٹروں والے لاکھوں بجائیں۔ یہ سڑک کو نہیں چھوڑتے۔ ایک مرتبہ ایک ڈرائیور نے لمبے ہارن بجائے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب سر جھکائے چلتے ہی گئے۔ موٹر پاس آکر رکی۔ اور ڈرائیور نے غصے سے پوچھا۔ کیا آپ کی عقل ٹھکانے ہے؟ یا موٹر سے ایک اور تو لنا ہی؟ "ارے تیرے کام آ۔ یہ ڈاکٹر برق ہیں"۔ یہ باہر آتے ہیں۔ تو عقل گھر ہی میں چھوڑ آتے ہیں۔" یہ چبھتے ہوئے جملے سن کر غصہ آ تو بہت گیا۔ لیکن تھوک ڈالا۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ پرانی عادت ہے کہ جس شخص کا کچھ نہ بگاڑ سکیں اُسے معاف کر دیتے ہیں۔
ڈاکٹر صاحب جب کبھی عزمِ سفر باندھتے ہیں۔ تو بیگم صاحبہ ایک طوفان اٹھا دیتی ہیں۔ "میں یہ چادر اور رضائی یہ ٹرنک آپ کو نہیں دوں گی ہو نہ ہو آپ کچھ نہ کچھ ٹرین یا تانگے میں بھول آتے ہیں۔" ۱۹۴۲ء میں مجھے لاہور جانا پڑا تو اپنی بڑی لڑکی کو ساتھ کر دیا کہ سفر میں ہر چیز کا خیال رکھے۔ جب لاہور سٹیشن سے ایک تانگے میں سوار ہو کر اپنے ایک عزیز کے گھر پہنچے تو دونوں اتر کر سیدھے اندر چلے گئے اور سارا سامان تانگے میں چھوڑ گئے۔ لڑکی کو آج تک اپنے کپڑوں، زیور اور قیمتی گھڑی کا غم ہے اور ڈاکٹر صاحب کو اپنے قرآن کا جس سے انھوں نے سورتیں کاٹ کاٹ کر بے تعداد مضامین و مقالات لکھے تھے۔
ڈاکٹر صاحب کو ۱۹۴۳ء میں پھر لاہور جانا پڑا۔ خوش قسمتی سے اس مرتبہ کیمبل پور کالج کے وائس پرنسپل پروفیسر محمود احمد ان کے رفیقِ سفر تھے۔ وہ راہ میں بار بار کہتے، "ڈاکٹر صاحب سامان کا خیال رکھنا۔" گوجرانوالہ سٹیشن سے ایک اور مسافر اسی ڈبے میں آ گیا اور اوپر والی سیٹ پر بیگ رکھ کر نیچے بیٹھ گیا۔ محمود صاحب کہنے لگے، "ڈاکٹر صاحب یہ بیگ آپ کے بیگ کا ہم رنگ ہے کہیں بدل نہ جائے۔" ڈاکٹر صاحب اُٹھے اپنے بیگ کا رنگ دیکھا اور پھر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ لاہور پہنچ کر ڈاکٹر صاحب ایک ہوٹل میں چلے گئے۔ رات کو کپڑے بدلنے کے لیے بیگ کھولا۔ تو اوپر پڑا ایک چھوٹا ہوا ہاتھی نظر آیا۔ خیال آیا کہ شاید محمود صاحب نے مذاق کیا ہو۔ نیچے سے ایک میلا کچیلا پاجامہ نکلا پھر دو پرانے سیپارے اور بارہ انچ لمبے جوتوں کا ایک جوڑا اب معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اس مسافر کا بیگ اٹھا لائے ہیں۔

طبی شاہکار

درس نظامی میں طب کی چند کتابیں بھی شامل ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں مولوی جی ان کتابوں کو پڑھ کر چند روز کے لیے اپنے گاؤں گئے تو اتفاقاً ان کی ہمسائیگی میں ایک لڑکی اور اس کا باپ تپ محرقہ میں مبتلا تھا۔ مولوی جی نے اپنے طبی علم کا چرچا کیا تو اس کے گھر سے ایک عورت آئی اور مولوی جی کو علاج کے لیے ساتھ لے گئی۔ وہاں پہنچ کر مولوی جی نے مریضوں کی نبض دیکھی۔ زبان کا معائنہ کیا۔ پانچ سات سوال پوچھے۔ اپنی کتب دیکھیں اور کہا انشاء اللہ بہت جلد آرام آ جائے گا گھر پہنچ کر دوا تیار کی اور کہا کہ ایک گرم گولی بیٹی کو کھلا دو باپ کا علاج کل صبح شروع ہوگا۔ آدھا ہی گھنٹہ گزرا ہوگا کہ اس گھر سے رونے دھونے کی صدا بلند ہوئی۔ معلوم ہوا کہ لڑکی فوت ہو گئی ہے ۔ ایک کونے سے تایا جی کی آواز آئی "بے او حکیم کے بچے اب جیل کی تیاری کر۔" یہ سن کر مولوی جی خوف سے کانپنے لگے اور تایا جی کے پاؤں پکڑ لیے "خدا را مجھے بچائیے ورنہ یہ مرجائیں گے" تایا جی اٹھ کر مسجد کو چل دیئے۔ وہاں امام مسجد کو ساتھ لیا اور امام صاحب سیدھے اس گھر میں جا پہنچے۔ وہاں عورتیں اس قسم کے بین کر رہی تھیں "او ظالم مولیا! او حکیم کے بچے نے تیرا کیا بگاڑا تھا، اس مولوی کو سانپ ڈسے۔ اس کی ودھ مر جائے گی" وغیرہ وغیرہ امام صاحب نے پہنچتے ہی سب کو ڈانٹا کہ "او ظالم کی بچیو! یہ کیا کفر بک رہی ہو۔ موت کا وقت مقرر ہے اور سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ رونا دھونا بند کرو اور درود شریف پڑھو

وہ متوفیہ کی روح آسمان کے کناروں پر پڑی رہے گی اور اسے بہشت میں جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔ اس پر سب عورتیں خاموش ہو گئیں اور مردوں نے بھی لعن طعن چھوڑ دیا۔ اللہ کی شان کہ ایک گھنٹے بعد اس لڑکی کا والد بھی فوت ہو گیا۔ اس کے بعد حکیم صاحب کے متعلق لوگوں کی بدگمانی رفع ہو گئی اور شام کے وقت جب دو جنازے گاؤں سے نکل رہے تھے تو حکیم صاحب کی گاڑی گوجر خاں سے نکل چکی تھی۔

کردار

ڈاکٹر کا کردار کسی پہلو سے بھی قابلِ ستائش نہیں۔ اس کا بچپن ٹیر پالنے، خربوزے چرانے، گالیاں بکنے اور لفنگاپن میں گذرا، جوانی عالم کی پرستوں اور افلاس کی صورتوں میں بیتی اور بڑھاپا جوانی کے ماتم میں گذر رہا ہے۔ زندگی کو گرانے کی کبھی فرصت ہی نہ ملی، اگر ملی بھی تو بے سروسامانی آڑے آئی۔ سچ پوچھیے تو ایک گناہ نے اسے کئی گناہوں سے بچائے رکھا اور وہ برج یہ تاش کا ایک انگریزی کھیل ہے۔ جو جوئے کی ایک قسم ہے ڈاکٹر نے یہ کھیل ۱۹۳۳ء میں شروع کیا تھا۔ اور اب تک کھیلتا ہے۔ فرق یہ کہ شروع میں وہ داؤ لگاتا تھا اور اب داؤ کے بغیر کھیلتا ہے گناہ کے متعلق سوچنے کا موزوں ترین وقت شام ہے۔ اور ڈاکٹر کی ہر شام کلب میں گذر جاتی ہے جہاں وہ رات کے گیارہ بجے تک ہنستا، بولتا، اور کھیلتا ہے گو اس کی زندگی کا آفتاب زرد ہو چلا ہے۔ لیکن اس کی زندہ دلی لطیفہ بازی، چہچہوں اور قہقہوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بات بات پہ وہ دانشورانِ ایران و عرب کے اقوال، حکایات و واقعات سناتا اور بلند پایہ شعرا کے اشعار پڑھتا ہے، فلسفی، مؤرخ اور مفسر ہونے کے علاوہ وہ ایک شاندار جوکر بھی ہے اس نے کالج میں کئی ڈرامے کرائے اور ایک دو مرتبہ مسخرے کا پارٹ نہایت کامیابی سے ادا کیا۔

ڈاکٹر صاحب اوّل درجے کے احمق واقع ہوئے ہیں۔ ان معنوں میں کہ جس آدمی سے ملتے ہیں اُسے سو فیصد شریف سمجھ لیتے ہیں۔ اور اس وقت اپنی رائے نہیں بدلتے۔ جب تک کہ پیہم فریب کھانے کے بعد انھیں یقین نہ ہو جائے کہ وہ بدنیت بدگو اور بداندیش ہے۔

بے اصول ہونے کے باوجود آپ نہایت استقلال سے چند اصولوں کی پابندی کرتے ہیں۔

اوّل: اپنے دوست کو کسی قیمت پہ نہیں چھوڑتے اور رشتۂ محبت کو قائم رکھنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کر گزرتے ہیں۔

دوم: اقارب میں صلح و آشتی کے پُرجوش مبلغ ہیں اور اس بات پہ نازاں کہ زندگی کی کسی منزل پر بھی اُن کا اپنے بھائیوں سے اختلاف نہیں ہوا اور جو تعلقات مہر و وفا، آغوشِ مادر میں پروان چڑھے تھے وہ بدستور قائم ہیں۔

سوم: آپ اپنے محسن کو کبھی نہیں بھولتے۔ اس میں ہزار عیب ہوں وہ آنکھیں بند کر کے اس کے گن گاتے رہتے ہیں۔ آپ کی نگاہ ان معنوں میں حسن پرست ہے کہ آپ ہر چیز اور ہر انسان کا صرف روشن پہلو دیکھتے ہیں۔ اور جب تک مجبور نہ ہو جائیں عیوب و نقائص کی طرف توجہ نہیں کرتے

چہارم: آپ اپنے علمی مخالفین سے قطعاً نہیں اُلجھتے اس وقت تک آپ کے خلاف آٹھ کتابیں اور درجنوں مضامین نکل چکے ہیں جن میں آپ کو کافر، مرتد، ملعون اور نہ جانے کیا کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن آپ جواباً خاموش رہے صرف ایک مرتبہ آپ نے حماقت کی۔ کہ مولانا عبدالماجد دریا بادی کو ایک نہایت تیز خط لکھ دیا۔ انھوں نے وہ خط اپنے اخبار صدقِ جدید میں چھاپ دیا۔ اور بعض اردو اخبارات و رسائل پنجے جھاڑ کر ڈاکٹر صاحب کے پیچھے پڑ گئے۔

پنجم: آپ اُن لوگوں سے میلوں بھاگتے ہیں جو دولت یا اونچی کرسی ہی کو معیارِ عظمت سمجھتے ہیں۔

ششم: آپ حسنِ فطرت کے شیدائی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ کیمبل پور کو کسی قیمت پہ نہیں چھوڑتے۔ اس چھوٹی سی صاف پاکیزہ بستی کی کھلی فضائیں حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے کھیت اور گرد و پیش چشمے اور سرسبز وادیاں، گھنے جنگل، اُن میں ہرنوں تیتروں اور چکوروں کے ڈار وہ نعمتیں ہیں جو شہروں کی غلیظ، متعفن گرد آلود اور دُخان اندود فضا میں نہیں مل سکتیں۔ حدیث میں مذکور ہے کہ سحر کے وقت خدائے ذوالجلال زمین کے قریب آکر آواز دیتا ہے۔ کہ کوئی ہے جو مجھے پکارے اور میں اُس کی فریاد سنوں، خدا ان بستیوں ہی میں زمین کے قریب آتا ہے۔ بڑے شہروں کا شراب آلودہ متعفن ماحول اس شرف کا سزاوار کہاں:

شاہدِ فطرت کو اپنی بے نقابی کے لیے | ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن (اقبال)

ہفتم: اس حقیقت پہ محکم ایمان رکھتے ہیں۔ کہ زندگی یہاں مسافر ہے اور اس کی منزل اللہ ہے۔ مسافر کو صرف زادِ راہ کی ضرورت ہے۔ ذکریم و نور کے انباروں کی کم خودی، سادہ پوشی قناعت اور لاامتناہی میراث انبیا ہے اور دولت میراث فرعون۔ دولت ایک سیلاب ہے جو اخلاق و فضائل کی تمام تعمیریں بہائے جاتا ہے اور پیچھے شراب و گناہ کی سڑاند چھوڑ جاتا ہے۔ دولت غرور، نخوت، بدمستی اور نفرت پیدا کرتی ہے اور انسان کو وحشی

بلندیوں سے اٹھا کر اس جہنم میں پھینکتی ہے۔ جہاں بڑے بڑے فرامین و نمارود گل سڑ رہے ہیں۔ یہ لوگ اللہ سے صرف لینا جانتے ہیں اور اگر ان سے اللہ کے نام پر کچھ واپس مانگو، تو جبیں پر بل پڑ جاتے ہیں

"ہم اگلی دنیا میں ان کے جوں کو اسی کے زر سے داغیں گے۔ اور کہیں گے۔ کہ زر اندوزی کا مزہ چکھو۔" (قرآن)

کسب دولت معیوب نہیں۔ آپ جائیں ایک لاکھ روزانہ کمائیں۔ لیکن اس دولت کو عیاشی پر صرف کرنا اور قومی اداروں کے لیے کچھ نہ دینا ایک ناقابل عفو جرم ہے۔ ایسے بد قماشوں کی زاید از ضرورت دولت کو قومی ملکیت میں لے لینا ہی اس روگ کا واحد علاج ہے۔

ہشتم:۔ ڈاکٹر صاحب جھوٹ، فریب، بد دیانتی، نظر بازی، نفاق، بد عہدی، حرص، حسد، سستی اور دیگر عیوب سے قطعاً بری ہو چکے ہیں۔ نماز و عبادت کے پابند ہیں اور سحر خیز بھی آپ کہیں گے یہ ڈاکٹر تو ملا ہی ہے۔ جی ہاں! آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ ملائیت ہی دوام زندگی، عین زندگی ہے۔

تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا جہان تازہ تری آہِ صبحگاہی میں ہے (اقبال)

قلابازیاں ڈاکٹر صاحب نے جوانی سے لے کر اب تک جہان فکر میں بڑی بڑی قلابازیاں کھائیں ۱۹۲۱ء تک آپ چار قسم کے مقلد تھے ائمہ فقہ کی رائے کو آخری سمجھتے تھے۔ اور اہل سنت کے سوا باقی تمام فرقوں اور مذہبوں کو گمراہ قرار دیتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں انہیں مرض تشکیک لاحق ہوا اور بڑھتا گیا پہلے قرآن کے الہامی ہونے پر اعتراض سوجھے، پھر رسالت میں شک ہونے لگا، اور ۱۹۲۴ء میں خدا کی ہستی تک سے منکر ہو گئے یہ تھا دورِ الحاد۔ اس دور میں آپ نے نئے مذہب کی تلاش شروع کی۔ پہلے عیسائیت کا مطالعہ کیا انجیل تو سمجھ میں آ گئی لیکن مذہب سمجھ میں نہ آیا۔ ایک تین، تین ایک۔ ایسا گورکھ دھندا تھا جو آپ کی محدود فہم سے ورا تر تھا اور اس سے مشکل تر یہ مسئلہ کہ مسیح علیہ السلام ساری اُمت کے گناہ ساتھ لے گئے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر عیسائی عدالتیں عیسائی چوروں کو سزائیں کیوں دیتی ہیں؟ انجیل کے بعد وید اٹھا کر دیکھا۔ تعلیم تو پسند آئی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوا کہ جب چالیس کروڑ ہندو اپنی مقدس تعلیمات کو چھوڑ کر بت پرستی، قمار بازی، سود خوری، اچھوت چھات، تعصب، ذات پات، زر اندوزی اور جھوٹ چھات کو اپنا مذہب سمجھ بیٹھے ہیں۔ تو تم ہندو بن کر رہو گے کہاں؟ بھارت میں؟ وہ تمہیں نمک حرام، پلید اور مردود سمجھ کر مار ڈالیں گے۔ چنانچہ آپ نے ان مذاہب پر الحاد کو ترجیح دی اور مذہب کا خیال ترک کر دیا۔

اس پر پانچ چھ برس گزر گئے۔ ایک دن اُن کے ایک دوست ایک کتاب لا کر کہنے لگے کہ ایک بہت بڑے سائنس دان نے یہ کتاب اسلام پر لکھی ہے۔ ذرا پڑھ لیجیے۔ ڈاکٹر صاحب کتاب لے کر ایک الگ کمرے میں چلے گئے اور پہلے ہی فقرے پر پھڑک اُٹھے۔ مصنف کا اسلوب بیان از بس شاعرانہ تھا۔ اور استدلال بے حد حیرت انگیز قرآن کی عظمت رسول کی بے پناہ دانش اور اسلام کے جہاں آرا پیغام پر مصنف کے خیالات اس قدر مؤثر تھے۔ کہ محمد برق لرز اٹھا اور اس کے کفر کا شیش محل دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ اس نے کتاب بند کی، کپڑے بدلے، مصلے بچھایا۔ اور سجدے میں گر کر دیر تک اپنی نادانی پر روتا رہا۔ یہ تھا برق کا دور ثانی کا آغاز۔ اس کتاب کا نام ہے "تذکرہ" از علامہ عنایت اللہ خان المشرقی (امام اللہ فی خلقہ)۔

تصانیف

نمبر شمار	عنوان	سال تحریر	موضوع
۱	پیام ادب	۱۹۲۹ء	منطق پر ایک رسالہ
۲	انتقال	۱۹۳۰ء	اصلاح رسوم پر ایک ڈرامہ
۳	لمعات برق	۱۹۳۲ء	پچاس ادبی مضامین کا مجموعہ
۴	انقلاب	۱۹۳۵ء	آپ بیتی (رسالہ)
۵	ابن تیمیہ (انگریزی)	۱۹۳۹ء	امام ابن تیمیہ کے حالات جس پر ڈاکٹریٹ عطا ہوئی۔ غیر مطبوعہ
۶	ابن تیمیہ (اردو)	۱۹۴۰ء	ترجمہ اردو
۷	حیات سکندر	۱۹۴۲ء	سر سکندر حیات کے سوانح (غیر مطبوعہ)

۸	آئینِ فطرت	۱۹۴۳ء	اسلام کے مختلف پہلوؤں پر ایک ضخیم تبصرہ (غیر مطبوعہ)
۹	دو قرآن	۱۹۴۴ء	قرآن کا مطالعہ سائنس کی روشنی
۱۰	حکمائے عالم	۱۹۴۶ء	القفطی مصری کی تاریخ الحکما کا اردو ترجمہ اس میں اندازاً تین سو مسلم اور ایک سو چودہ یونانی حکما کے حالات ہیں۔
۱۱	جہانِ نو	۱۹۴۸ء	مختلف اسلامی مسائل پر بحث
۱۲	دو اسلام	۱۹۴۹ء	حدیث پر ایک تنقیدی نظر
۱۳	ہم اور ہمارے اسلاف	۱۹۵۰ء	صحابۂ کرام کی داستانہائے عدل و ایثار
۱۴	ایک اسلام	۱۹۵۲ء	وحدتِ مذاہب پر تفصیلی بحث
۱۵	حرفِ محرمانہ	۱۹۵۳ء	احمدیت پر ایک نظر
۱۶	اللہ کی عادت	۱۹۵۴ء	نیکی سُکھ ہے اور بدی دُکھ
۱۷	سلاطینِ اسلام	۱۹۵۵ء	انگلستان کے مشہور مؤرخ لین پول کی ایک کتاب "محمڈن ڈائنا سٹیز" کا اردو ترجمہ
۱۸	بھائی بھائی	۱۹۵۸ء	شیعہ و سُنی اختلافات تاریخ کی روشنی میں بے بنیاد ہیں۔
۱۹	تراجم	۱۹۵۸ء	اردو انسائیکلو پیڈیا کے لیے جو پنجاب یونیورسٹی مرتب کرا رہی ہے ایک سو دس مقالات کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ
۲۰	من کی دُنیا	۱۹۶۱ء	روح، اشیرہ، دعا، عبادت وغیرہ پر بحث
۲۱	دانشِ رومی و سعدی	۱۹۶۳ء	رومی و سعدی کا پیغام (زیرِ طبع)
۲۲	کئی سو مقالات و مضامین		

تاریخ وفات

گو ابھی تک ڈاکٹر صاحب تندرست اور چاق و چوبند ہیں، جوانوں کے سے قہقہے لگاتے اور گردِ خضر کی طرح دوڑتے پھرتے ہیں۔ لیکن تاہم بڑھاپے کی چند عادات آہستہ آہستہ گھر میں پہنچا کر ہی دم لیں گی۔ اوّل حقّہ، دوم چائے، سوم مطالعہ شوق سے فراواں، چہارم دن کو پورے بارہ گھنٹے پڑھنے لکھنے کا التزام خیال یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء کے قریب وہ جوارِ یزداں میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن دنیا ان کی وفات سے اصلاً بے خبر رہے گی۔ کیوں کہ ہمارے اخبارات صرف شاندار لوگوں مثلاً وزیروں اور سفیروں کے متعلق خبریں دیتے ہیں، اور بے چارے علمی لوگ تو ان کے ساتھ ہمیشہ وہ ایک جیسا سلوک کرتے آئے ہیں کہ اوّل تو ان کی موت کی خبر چھاپتے ہی نہیں، تاکہ ان کے قارئین خبرِ بد کے صدمے سے محفوظ رہیں اور اگر چھاپیں بھی تو آخری صفحہ پر اشتہاروں کے پیچھے ایک کونے میں صرف اتنا لکھ دیتے ہیں۔

• "اختر شیرانی کا انتقال"

• "کل شام کو فلیمنگ روڈ پر اختر شیرانی کا انتقال ہو گیا ہے۔ کل رسم قل ادا ہو گی"

یقین نہ آئے تو دنیائے اسلام کے سب سے بڑے محقق خان بہادر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے سانحۂ انتقال پر نظر ڈالیے، کتنے اخبارات نے ماتم کیا؟ کتنے سیاستدانوں نے تعزیت کے پیغام بھیجے، ملک کی کتنی درسگاہیں ان کے سوگ میں بند ہوئیں؟ میرا اندازہ یہ ہے کہ ڈاکٹر برق کا انجام انشاء اللہ ان سب سے بہتر ہو گا۔ ان کی موت پر بعض مذہبی رسائل "خس کم جہاں پاک" کے عنوان سے طویل مضامین لکھیں گے اور زمین و آسمان سے شور بلند ہو گا۔

ڈاکٹر برق در جہنم رفت

(نقوش، آپ بیتی نمبر)

فصیح الدین بلخی

نیپال میں عربی فارسی و اردو کے مخطوطات

مخطوطات کی یہ فہرست فصیح الدین بلخی (م ۱۹۶۲ء) نے ۱۹۵۶ء میں نیپال میں اپنے قیام کے دوران تیار کی تھی

نیپال میوزیم میں عربی و فارسی اور اردو زبانوں کے متعدد مخطوطات محفوظ ہیں۔ کچھ مخطوطات ذاتی کتب خانوں میں بھی ہیں۔ "دارالمطالعہ اندرا چوک کاٹھمنڈو" میں فارسی کے درج ذیل مخطوطات محفوظ ہیں:

(۱) "قواعد التاریخ" مصنفہ فضیل اللہ (۲) "مفتاح العلوم" مصنفہ محمد حیات۔ (ان مخطوطات کے اواخر میں ارضہ میں جنسیات سے متعلق اہم اطلاعات ملتی ہیں) (۳) "تزک تیموری" مصنفہ شاہ تیمور مرقومہ ۱۲۴۴ھ (۴) "مکاتیب علامہ ابو الفضل" مرتبہ عبد الصمد افضل (بھتیجا ابو الفضل) سال کتابت درج نہیں لیکن یہ تگ بھگ دو سو سال پرانا نسخہ ہے۔ (۵) "مراتب المجاہدین" مرقومہ ۱۱۲۳ھ۔ اس مخطوطہ کا پہلا صفحہ غائب ہے۔ اس کتاب میں اسلامی فلسفہ سے بحث کی گئی ہے۔ (۶) "تاریخ بنگلہ" مرقومہ ۱۸۹۲ء۔ اس تاریخ میں شہنشاہ اورنگ زیب سے لے کر نواب علی وردی خاں ناظم بنگالہ اور سراج الدولہ کی شہادت کے حالات ملتے ہیں۔ یہ ایک نادر نسخہ ہے۔ اس مخطوطے کے چند ہی نسخے موجود ہیں، جن میں برٹش میوزیم اور حیدرآباد اسٹیٹ لائبریری قابل ذکر ہیں۔ اس کے مصنف سلیم اللہ ہیں۔ موجودہ نسخہ کے نقل نویس راج محل کے گوپال لال ہیں، جو بنگال کے باشندہ ہیں۔ (۷) "بادشاہ نامہ" اس تاریخ میں شہنشاہ شاہجہاں کے دور حکومت، ۱۶۲۵ء سے لے کر ۱۶۵۷ء تک کے حالات ملتے ہیں۔ اس کا پہلا اور آخری صفحہ غائب ہے۔ (۸) "جواہر التفسیر" قرآن حکیم کی تفسیر ہے۔ یہ نہایت ہی قدیم اور اہم مخطوطہ ہے۔ اس پر اعلیٰ حکام کی مہر بھی ہے۔ اس کی نمائش پانچ موقعوں پر ہندستان کے سلاطین کے سامنے کی گئی اور یہ مخطوطہ ۹۱۳ھ میں شہنشاہ اکبر کے دور حکومت میں مکمل ہوا۔ (۹) "دیوان شوکت" فارسی ادیب و شاعر شوکت کے مختلف اصناف شاعری پر مشتمل ہے۔ اس کے مرتب التفات خاں ہیں جو اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ یہ نسخہ ۱۱۴۳ھ میں مرتب ہوا۔ (۱۰) "سکندر نامہ" نظامی گنجوی مرقومہ ۱۲۵۹ھ۔

ان مخطوطات کے نام ملاحظہ فرمائیں جو ایک نیپالی باشندہ حکیم حسن شاہ (باغ بازار کاٹھمنڈو) کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں:

(۱) "انیس العاشقین" ایک پرانا اور نادر مخطوطہ جس میں تصوف کے رموز و نکات پر بحث کی گئی ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۰۲۳ھ میں مرتب ہوا جو شہنشاہ جہانگیر کا آخری عہد حکومت تھا۔ (۲) "شرح خلاصۃ النصیح" مرتبہ

عبدالعزیز طاہر' ایک قدیم مخطوطہ ہے۔ جس میں اخلاقی و مذہبی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ (۳) "بیاض واقف" مرقومہ ۱۲۷۴ھ ایک نادر مخطوطہ ہے جس میں شاعر کے فارسی و اردو کے کلام ہیں۔ اس کے علاوہ ٹھمریاں سوہجان اور کلاسیکی گیت ہیں جو ہندی اور اردو میں ہیں۔ (۴) کتاب لامعلوم الاسم۔ (۵) ایک نادر مخطوطہ جس میں لذیز کھانا بنانے کے طریقے بتائے گئے ہیں جس کے اوّل اور آخر کے صفحات غائب ہیں۔ ساتھ ہی کتاب نہایت خستہ حالت میں ہے (۶) "کنز الرقیق" مرتبہ نظر اللہ بن محمد بن حمید۔ یہ مخطوطہ شہنشاہ اورنگ زیب کے پینتیس سالہ عہد حکومت میں مرتب ہوا۔ اس میں فلسفہ کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے مولف نے سلطنت مغلیہ کے مختلف شہنشاہوں کے عہد حکومت کے حالات لکھے ہیں۔ (۷) "اصل المعرفت" مرقومہ ۱۲۱۱ھ' ایک نادر مخطوطہ ہے جس کا پہلا صفحہ غائب ہے۔ اس مخطوطہ میں کئی دیگر مخطوطات بھی شامل ہیں مثلاً صوفی طریقت شاہ تراب علی ابن محمد کاظم قلندری کی "مطالب رشیدی" اور انھیں کی دوسری تصنیف جس میں مختلف تاریخی واقعات درج ہیں ———— (۸) "شرح مثنوی مولانا روم" از ہدایت اللہ ابن عبدالفتح حسین' ایک مشہور صوفی کی شرح، جو مکمل، مفصّل اور قابلِ تحسین ہے۔ (۹) "سلامۃ الزیب" دفتر دوم' ایک قدیم مخطوطہ جس میں اسلامی فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے۔ (۱۰) انشائے فائق جس میں مکتوبات نگاری کے طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ اس کو نواب میر قاسم نے اپنے بچہ کی تعلیم کیلئے ۱۱۸۴ھ میں لکھا تھا (۱۱) "بیاض خصوصی یا ملفوظات خواجہ سید عظیم الدین بدخشانی" اس بیاض پر برجیس قدر آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ نے اپنی جائداد کو بیچا ہے۔ اس کی تین مختلف روداد اس میں ملتی ہے (۱۲) تاریخ حسن بن عبدالرسول شہوا" جلد اول۔ یہ کشمیر کی تاریخ ہے۔ جس میں مفصل حالات ملتے ہیں۔ یہ ۱۲۱۰ھ میں مکمل ہوئی مولف نے تاریخ لکھنے کے سلسلے میں مختلف ذرائع کا سہارا لیا ہے جس میں لگ بھگ سو کتابوں کے حوالے ہیں (۱۳) شرح سرائے یک محرکہ" مولفہ قاضی شہاب الدین' مرقومہ ۱۱۶۲ھ' اس میں [illegible] پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ (۱۴) "رسالہ وجیہ المغظ" مرتبہ لطف اللہ' مرقومہ ۱۲۲۲ھ (۱۵) کتاب ادائے عبادت۔

پیش کش: ڈاکٹر نسیم اختر
پٹنہ سیٹی

یادداشتہائے ودود

قاضی عبدالودود



قاضی صاحب ہمارے عہد کے سب سے بڑے اردو دانشور تھے۔ اپنے پیچھے انھوں نے اچھا خاصا تحریری سرمایہ چھوڑا ہے۔

آخری زمانے میں عالم یہ تھا کہ لکھتے تھے اور ادھر اُدھر ڈال دیتے تھے۔ کبھی کبھی اسی نوشتے کے سامنے نہ رہنے کے سبب دوبارہ سہ بارہ لکھتے تھے۔ الگ الگ موضوعات پر ان کی یہ یادداشتیں ہزاروں چھوٹے بڑے پرزوں کی شکل میں موجود ہیں۔ انھیں وقتاً فوقتاً پیش کیا جاتا رہے گا، شاید کوئی چیز کسی کے کام آجائے۔ ان یادداشتوں میں کئی ایسی ہیں جو کسی نہ کسی مضمون کی شکل میں آچکی ہیں، کچھ بالکل نئی چیزیں ملیں گی۔ کچھ رقعے بھی۔

——— ادارہ

ادبی تحقیق کے بارے میں

موسیو ژوردان مولیئر کی مشہور عالم بورژوا ژانتی اوم کی روح رواں ہیں۔
یہ ابتدا میں جاہل محض تھے مگر یہ بات ان کی [illegible] دی جا سکتی ہے کہ [illegible] کی ساتھ (۱۱)
انھیں دولت ہاتھ آئی تو انھیں اس کمی کو پورا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ استاد
نے انھیں تعلیم دینا شروع کیا اور بتایا کہ نثر بھی ہے اور نظم بھی تو یہ حیران ہو کر چلائے: تو پھر میں عمر
بھر تو بغیر جانے ہی استعمال کرتا رہا ہوں۔ تحقیق کا بھی یہی حال ہے۔ بیکن نے [illegible] جو
مضمون لکھا ہے اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے: What is truth said jesting Pilate and would not stay for an answer.
یعنی پائلٹ نے سوال کیا، لیکن اس کے لیے نہیں رکا، اس کا جواب حاصل کرنے کی
ضرورت اسے محسوس نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ اس کے خلاف ہوتا اور کوشش
کرتا، تو اس کا عمل تحقیق کہا جا سکتا تھا۔ تحقیق جیسا کہ ظاہر ہے سچ کی تلاش ہے
اور یہ کسی امر کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ آپ [illegible] اگر
یہ نہیں جانتے کہ [illegible] قرۃ العین حیدر ادیب ہیں یا [illegible] اور
اپنی ہی کوشش سے اس کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو یہ تحقیق کی [illegible]
[illegible] آپ عالم پیشہ دیکھتے ہیں تو [illegible] تحقیق [illegible]۔ اس کا
جواب نہیں دے سکتے آپ یہ پوچھتے ہیں کہ [illegible] بتلا اور آپ کو یہ معلوم ہو گیا
[illegible] ریلوے [illegible] تازہ ریلوے [illegible] کی طرف
رجوع کرتے ہیں یا ریلوے انکوائری آفس سے وقت کے بارے میں دریافت کرتے ہیں
تو یہ بھی تحقیق ہے۔ تحقیقات کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہے جتنا یہ عالم وسیع ہے اور
[illegible] کوئی چیز نہیں [illegible] کے متعلق تحقیق نہ کی
~~جا سکتی، جس تحقیق کی اس وقت [illegible] وہ ادبی تحقیقات کے~~
اصطلاحی معنی میں تحقیق ہر سوال کا جواب حاصل کرنا تحقیق نہیں، سوال
ایسے جن کا جواب عام طور پر معلوم نہ ہو اور اس کے حصول میں کد و کاوش

ادبی تحقیق کے بارے میں

ایک خاص تیج سے منظم طور پر کرنی پڑتی ہے — اس وقت میرا موضوع گفتگو
یہ تعریف کافی نہیں، لیکن ایسی تعریف جو منطق کے مطابق تمام الزامات کو پورا کر سکے
ممکن بھی نہیں ہے۔ اس وقت میرا موضوع گفتگو عام تحقیق نہیں بلکہ ادبی تحقیق ہے۔
ادبی تحقیق اور ادبی تنقید ایک چیز نہیں [illegible] اگرچہ
پہلی بات [illegible] مفصل بحث کا وقت نہیں میں مجملاً [illegible] پر قناعت
کروں گا کہ محقق یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ کیا ہے۔ نقاد اس کا [illegible]
نقاد یہ بتاتا ہے کہ کیا ہونا چاہیے۔ محقق اگر بھی اقدار سے بحث کرتا ہے تو [illegible]
خاص دائرے میں محدود رکھتا ہے۔ اور نقاد واقعات کا ذکر کرتا ہے تو وہ وہی
تحقیق کا فرض انجام دیتا ہے۔ میتھو آرنلڈ نے اپنی ایک مقالے میں ایک [illegible]
ترجمے سے بیر پر اعتراض کیا تھا اور مترجم نے اس کا جواب دیا تھا۔ جواب الجواب
آرنلڈ نے لکھا کہ میں علم میں مترجم کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا، مگر میں سمجھتا ہوں [illegible]
وہ کئی جملے [illegible] درمیان حاجب ہوتا ہے اور اس کی صحیح روح سمجھ میں
مانع ہوتا ہے۔ [illegible] صحیح ترجمانی اس سے ہوتی ہے [illegible] یہ وہ
دانش [illegible] حقیقت کسی کی زبان سے بھی یہ بات نہیں نکل سکتی۔ وہ [illegible]
لونی کی طرح [illegible] much [illegible] کہا دیتا — وہ معلومات [illegible]
وہ یہ کہ [illegible] علم [illegible] کبھی نہیں [illegible]
[illegible] اس کی [illegible] علم ضرورت سے زیادہ [illegible]

ہم جو مستقبل [illegible] ہیں وہ ہر لمحہ حال میں تبدیل ہوتا ہے اور حال ماضی میں [illegible]
بروقت [illegible] ادبی تحقیق [illegible] المطبوعات [illegible] کی تحقیق
نہیں کہ یہ [illegible] کی تحقیق [illegible] اگرچہ [illegible] بحث آتی ہیں
تو اس طرح کہ کسی خاص مصنف کا ان کا مسلک کیا تھا، فلسفہ نہیں جس
کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ ایک اندھے کا اندھیری کوٹھری میں ایک کالی بلی کی تلاش ہے
جو وہاں نہیں ہے داخل ہوتا ہے۔ ادبی تحقیقات [illegible]
ہم ادبی تحقیق کے دائرے میں تجارت اور بصیرت کی کمی ہو سکتی ہے لیکن [illegible]

ادبی تحقیق کے بارے میں

وہ داخل ہوتا جاتا ہے۔ اس میں اندھیرا یا دھندلکا ہو گا ... کہانی ملی
جس کی اسے تلاش تھی ... یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنی گریز پا ہو کر

پانچواں بین کلیاتی ادبی اجتماع

... اسے پا نہ سکے یا پا بھی سکے تو وہ ٹلو نہ بھگ جائے۔ مستقل حال ...
ماضی میں ... بزم ادب اردو کالج کے زیر اہتمام پانچواں بین کلیاتی ادبی اجتماع ... جا پائے ...

اکتوبر ۱۹۵۹ء شام کے ۵ بجے اردو ہال جامعہ ...
سر واقعہ صرف ایک ... ظہور میں آیا ... ایک خاص گمنام
زمانے میں وقوع میں آیا ... اور خاص اشخاص ... ان کا تعلق ...
کام اس کی صحیح شکل کا دریافت کرنا ہے ... کہ اس میں کامل طور پر
کامیابی ہو۔ بعض اوقات ... ایک مدت کی
کدو کاوش کا صرف یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ واقعہ کی اصلی شکل معلوم نہیں ہو سکی۔

صلاح الدین نیّر
ہاشم مہاجر

تحقیق جب سچائی کا دریافت کرنا ہے تو اس کو اس کی ... نہیں کہنا چاہیے لیکن
جب ہماری بہت بڑی اکثریت ادب کی اعلیٰ قسموں ہی سے بے پرواہی اور صرف
اسی ادب سے دلچسپی ہے جسے "تعلیم یافتہ" ... "ادب" کا ادب کہا جاتا ہے
تو ادب سے متعلق تحقیقات سے اتنی کچھ ... کچھ بحث کی بات ...
لیکن ایسے احباب ہیں جن کا شمار عوام الناس میں ... ادبی تحقیقات کو
لاحاصل بلکہ [illegible] سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ابھی حال ہی میں ہندوستان کے ایک ادبی و علمی مرکزی
اخبار میں مقالہ ... ادبی انجمن کی طرف
سے نکلتا ہے ایک نظم "وبائے تحقیق" شائع ہوئی تھی۔ میری نظر میں ادبی تحقیقات
کی الف کی افسانوں ... پیش کی گئی ہیں:

اول ... کچھ ایسے لوگ ہیں جو خود ادبی تخلیق کرتے ہیں ان کا خیال ... ہے
جو ... کہ ادب سے متعلق زیادہ چھان بین سے ہماری ادراک میں وہ ...

ادبی تحقیق کے بارے میں

باقی نہیں رہتی جو ادب کو لاحق تھی کہ یہ ضروری ہے میں اس سے اتفاق نہیں کرتا،
بلکہ میرا خیال ہے کہ اگر ہمارے سامنے کسی خالق ادب کی صحیح تصویر ہو یعنی معلوم
ہو کہ کوئی ادب پارہ کس زمانے میں اور کن حالات میں وجود میں آیا، اور اس
کا صحیح متن کیا ہے، تو ہم اسے بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں
(۵) انھیں احباب میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو تحقیقات کو کوئی الف لیلیٰ سمجھتے ہیں، وہ

۱۔ سید محبوب علی ہاشمی — انجینئرنگ کالج
یہ جانتے ہیں کہ وقت اور توانائی محدود ہے، اگر یہ سچ ہے اس کا بہترین مصرف یہ ہے

۱۲۔ ابوالفیض [illegible]
کہ خود انھی کے متعلق لکھا جائے اور ان احباب کے جو اس دنیا میں نہیں رہے تو جتنی

۳۔ توفیق احمد ارشد — سٹی کالج ۔ ۱۳۔ منیر صدیقی
یہ دراصل خالص کاروباری نقطۂ نظر ہے اور مجھے اس سے مطلق ہمدردی نہیں ہے اور

۴۔ خورشید عسکری
[illegible] ان کے نزدیک اور بعض ہیں کہ اپنی موت کی تحقیق کرتے ہیں

۵۔ سعید الدین انصاری سعید — سٹی کالج
اسی طرح بھلا دیئے جاتے ہیں زمانہ بڑا ظالم ہے یہ تو نہ تھا کہ انھیں وسیع

۶۔ قدرت قسیم
تر دیکھ لوگ اگلوں کو بھلا دیں لیکن یہ تحقیق عملی ہے کہ خود فراموش کر دیے جائیں

مشترکہ ان احباب کا ہے جو کسی سیاسی یا معاشی نظریے سے اس قدر وابستہ ہیں کہ

۸۔ ثاقب خوشترکی — آرٹس کالج ۔ ۱۸۔ سیدہ مجیدہ
اپنا سارا وقت اسی کی اشاعت پر صرف کرنا چاہتے ہیں۔ تحقیقات سے اگر

۹۔ عبداللہ حسین شہنشاہ — طبیہ کالج ۔ ۱۹۔ یوسف ادیب
ان کے مقاصد کے حصول میں مدد مل سکتی ہے تو وہ اس کا خیر مقدم کریں گے لیکن

۱۰۔ حلیم افسر — [illegible] کالج ۔ ۲۰۔ خواجہ اکرام الدین شاہد — سٹی کالج
اگر اس سے ورنہ نہیں — ابھی حال میں [illegible] آخر اس [illegible]
اس سے ہمارے مستقبل کی تعمیر میں مدد نہیں مل سکتی یہ نہیں کہ [illegible]
نمبری بحث کی [illegible] صحیح نہیں

مراسلہ

عبدالرؤف خاں

۲ اگست ۱۹۹۲ء

مکرم بندہ! ڈاکٹر صاحب

۳۰ جولائی کا عریضہ خدمت میں پہنچا ہوگا۔ آج تعطیل کے سبب شمارہ نمبر ۷، ۵-۹۲ کے صفحات ۱۷-۱۸ کو از سر نو دیکھا تو معلوم ہوا کہ تا حال اس Table میں سہوِ کاتب کے سبب بعض سنین وغیرہ کی اغلاط باقی ہیں۔ اس سے درج ذیل سطور بھی ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو گزشتہ عریضے کی سطر ۱۸ یعنی "۱۲ یوم ہوتی ہے" کے بعد یہ اضافہ فرما لیا جائے تاکہ جدول میری دانستِ ناقص میں ایک حد تک درست ہو جائے اور شمارہ سے مراجعت کرنے والے حضرات مغالطے کا شکار نہ ہوں:-

- ص ۱۸ خانہ ۱۵ یعنی ابو النصر مجاہد الدین احمد شاہ کا سالِ وفات ۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ دیا ہوا ہے۔ یہ تاریخ و سن دراصل احمد شاہ کو نابینا کرنے کا ہے نہ کہ اس کی وفات کا۔ احمد شاہ کی وفات کا درست سن ۲ شعبان ۱۱۸۸ھ/ ۲۱ اکتوبر ۱۷۷۴ء ہے نیز مدت سلطنت تقریباً چھ سال اور تاریخ جلوس ۱۱۰۶ھ کے بجائے ۱۱۶۱ھ ہے۔
- ص ۱۸ گوشوارہ کے خانہ ۱۷ میں علی گوہر شاہ عالم بادشاہ کے سالِ وفات کے خانہ میں صرف ۷ رمضان دیا ہوا ہے اسے ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ ہونا چاہیے۔
- اسی صفحہ ۱۸ خانہ ۱۸ میں ابو النصر معین الدین محمد اکبر شاہ کی ولدیت کا خانہ خالی ہے۔ یہ شاہ عالم کے شہزادے تھے نیز خانہ ۱۹ میں بہادر شاہ ظفر کی ولدیت اکبر شاہ ثانی ہونی چاہیے جو خالی ہے۔
- ص ۱۵ میران شاہ کے سلسلے میں عرض ہے کہ اس کا سالِ وفات ۸۱۰ھ ہے "تند یوے بزم تنا" مادہ کی رو سے درست ہے۔ آپ پسند فرمائیں تو اس مادہ کو پچھلے عریضہ کی سطر ۱۰ (سالِ ولادت نہ مل سکا) کے بعد جوڑ دیں۔ فقط والسلام۔

نیاز مند

عبدالرؤف خاں

جناب مصطفیٰ خلیل شیروانی
حیدرآباد

نہرو، علی گڑھ، راس مسعود اور وائسرائے

> ماہنامہ "بیسویں صدی" کے حالیہ فروری ۱۹۹۳ء کے شمارہ میں گاندھی جی، سر راس مسعود اور والد ماجد مرحوم پروفیسر ہارون خاں شروانی کے متعلق میرا جو خط شائع ہوا ہے اس کی فوٹو کاپی آپ کی خدمت میں ملاحظہ ہے۔ اس خط میں میرا تعلق بہ اشتراک "علی گڑھ" طبع ہوا ہے۔ اس سے قبل ہی السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کے ۱۰ مارچ ۱۹۷۹ء کے شمارہ میں میرے خط کے آخر میں میری جانب سے بہ اشتراک ابوظبی طبع ہو چکی ہے، حالانکہ ابوظبی جانے کا کبھی اتفاق بھی نہیں ہوا۔

"بیسویں صدی" اکتوبر ۱۹۹۲ء کے شمارے میں پروفیسر محمد حسن نے اپنے سلسلے وار ناول "غم دل وحشت دل" کی اسی قسط کے صفحہ ۱۰۴ پر وائسرائے ہند کے جواہر لال نہرو کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اس دور کے وائس چانسلر سر راس مسعود کے مدعو فرمانے پر اعتراض کیا تھا کہ کس نے جواہر کو علیگڑھ بلا لیا۔

میری دانست میں اس واقعہ میں کچھ اشتباہ ہے اسلیے کہ اول تو سر راس مسعود وائسرائے لارڈ ریڈنگ کی توثیق پر ۹ فروری ۱۹۲۹ء کو مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر کیے گئے۔ اور اپنے عہدہ وائس چانسلری کے پانچ سال مکمل کر کے بھوپال منتقل ہوئے۔ اور ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء کو بھوپال میں انتقال ہوا۔ کیمبرج انگلستان میں جواہر لال نہرو سر راس مسعود کے ہمعصروں میں تھے۔ اور ۱۹۱۲ء میں جواہر لعل نہرو اور میرے والد محترم پروفیسر ہارون خاں شروانی مرحوم نے ایک ساتھ بیرسٹری پاس کی تھی۔ سر راس مسعود کا بغیر لارڈ ریڈنگ (وائسرائے) کی ایما کے اس دور میں مسلم یونیورسٹی میں کسی کو مدعو کرنا بعید از قیاس ہے اسلیے جواہر لعل نہرو کے علی گڑھ جانے پر وائسرائے پر اگر اعتراض کیا ہوگا تو یقین نامناسب ہوگا۔

اس سے قبل ۱۹۱۷ء میں جب گاندھی جی نے علی گڑھ جانے کا اور وہاں مسلم یونیورسٹی میں از خود معائنہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس زمانہ میں پروفیسر ہارون خاں شروانی مرحوم نے علیگڑھ میں انڈین نیشنل کانگریس کے دفتر کے انچارج کی حیثیت سے گاندھی جی سے ایک جلسۂ عام سے خطاب کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا جسے گاندھی جی نے اس شرط کے ساتھ منظور کیا کہ صرف پانچ منٹ جلسے میں تقریر کریں گے، پھر مسلم یونیورسٹی جائیں گے۔ بعد میں مسلم یونیورسٹی میں گاندھی جی نے دو (۲) گھنٹے گزارے اور کسی انگریز افسر یا وائسرائے نے قطعی اعتراض نہیں کیا تھا۔ تسلی کے لیے ۱۰ مئی ۱۹۸۰ء کا السٹریٹڈ ویکلی کا اداریہ ملاحظہ کریں۔

●●

حرفے چند

لقمان سے سعدی تک، سعدی سے اردش فوکو تک، خود ہمارے زمانے تک، ہر عصر کی دانش کا نچوڑ ہمیں مقولوں کی شکل میں ملتا رہا ہے۔ یہ مقولے آج بھی ایسے ہی کارآمد ہیں جیسے اس وقت تھے جب یہ پہلی بار کہے یا لکھے گئے تھے، اور وہی قدر و قیمت رکھتے ہیں، شاید کچھ زیادہ ہی، جو قدر و قیمت ان کی اس وقت تھا جب پہلی بار کسی نے انہیں پڑھا یا سنا تھا!

ہم نیک رفتگاں ہی ہمارے لیے کافی تھا۔ کہنے پر بسا گیا یہ کہ ہمارے عظیم دانشور قاضی صاحب (قاضی عبدالودود) کو یہ مقولے بہت پسند تھے۔ موقع موقع سے بعض مقولوں کو دہرایا بھی کرتے تھے (خاص طور سے شکریہ والا مقولہ)۔ وہ اس کی اشاعت کے لیے کئی بار فرمائش کر چکے تھے۔ اب وہ تو ہمارے درمیان نہیں مگر ان کی یاد میں بہت سے اچھے کام ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کیسا مبارک، کیسا مقبولِ بارگاہ رہا ہوگا اللہ کا وہ شریف النفس بندہ، جس کی محض یاد بھی فیضان پہنچا رہی ہے۔ اللہ انہیں اپنی رحمتوں میں سمیٹے رکھے!

امید ہے اس کتاب کی اشاعت سے اس حکمت کی بازیافت کی طرف ایک قدم اور بڑھ جائے گا جسے مومن کی کھوئی ہوئی میراث کہا گیا ہے۔

عرب •———

لاروش فوکو کے مقولے

ایک تعارف

ڈاکٹر نظیر صدیقی

مقولے نہ صرف غیر معمولی مشاہدے اور تجربے پر مبنی ہوتے ہیں بلکہ حیرت انگیز اسلوب کے حامل بھی۔ مثال کے طور پر کچھ مقولے دیکھئے جن کے مصنفین لامعدوم ہیں۔

"جس شخص کو سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ دھوکا دیا جا سکتا ہے وہ اپنی ذات ہے"۔

"آپ کے خالی اوقات سے متعلق سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دوسروں کو ان کے استعمال سے کیسے روکا جائے"۔

"اگر آپ کو حق بجانب ہونے کا یقین ہے تو آپ خاموش رہ سکتے ہیں"۔

"ہر خود غلط آدمی کہیں نہیں پہنچتا کیونکہ وہ اپنے خیال میں پہلے سے وہاں موجود ہوتا ہے جہاں اسے ہونا چاہیے"۔

"یا تو ایسی چیزیں لکھو جو پڑھنے کے قابل ہیں یا ایسے کام کرو جو لکھنے کے قابل ہیں"۔

"مجرمانہ زندگی اختیار کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے جبکہ بے ایمانی کے سو قانونی طریقے موجود ہیں"۔

مقولے بالارادہ نہیں لکھے جاتے۔ عام طور پر لکھنے کے دوران کہیں کہیں ایسے جملے آجاتے ہیں جن میں مقولے کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ زیادہ تر مقولے صاحب طرز نثر نگاروں کے ہاں ملتے ہیں مقولہ نگاری عام نثر نگاروں کے بس کی بات نہیں۔ ایک اچھے مقولے میں ایک اچھے شعر کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک اچھے شعر کی طرح ایک اچھے مقولے میں ایجاز بیان بھی ہوتا ہے اور اعجاز بیان بھی۔ انگریزی ادب میں شیکسپیر کے منظوم ڈرامے بھی بصیرت آمیز اور حکمت آموز اقوال کا ایک بہت بڑا خزانہ ہیں۔ پھر انگریزی ادب میں لارڈ بیکن (۱۵۶۱ — ۱۶۲۶) ایک ایسا انشا پرداز گزرا ہے جس کا ہر مقالہ مقولوں سے پُر نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن جو انگریزی کے دو ایک عظیم ترین خوش گفتاروں میں شمار کیا جاتا ہے اس کی گفتگو (جسے اس کے سوانح نگار بوزویل نے محفوظ کیا ہے) کے بہت سے جملوں میں مقولوں کی لطافت اور تکمیل (PERFECTION) موجود ہے۔ عہد حاضر کے انگریز اہل قلم میں برنرڈ شا اور چسٹرٹن نہایت منفرد نثر نگاروں میں سے تھے۔ ان دونوں کی تحریروں میں کثرت سے مقولے ملتے ہیں۔ لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ انگریزی ادیبوں میں سب سے بڑا مقولہ نگار آوسکر وائلڈ

(۱۸۵۶ — ۱۹۰۰) تھا جس کا نام فرانسیسی ادب کے مقولہ نگار لاروشں فوکو (۱۶۱۳ — ۱۶۸۰) کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔

لاروش فوکو (LA ROCHEFOUCAULD) دنیا کا واحد ادیب ہے جس نے مقولوں کے سوا کچھ لکھا ہی نہیں اور جو اپنے ۶۴۱ مقولوں کی بنا پر گزشتہ تین سو سال سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اردو ادب میں لاروشں فوکو کا ذکر تقریباً نہ ہونے کے برابر رہا ہے۔ اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر اس مضمون میں اس کے حالاتِ زندگی اختصار کے ساتھ بیان کردیئے جائیں۔ اور نمونے کے طور پر اس کے کچھ مقولے نقل کردیئے جائیں۔ اس کے مقولوں کے انگریزی ترجمے کا جو نسخہ اس وقت میرے پیشِ نظر ہے وہ ایل ڈبلیو ٹینکوک (L.W.TANCOCK) کا مرتب کردہ ہے۔ ٹینکوک نے لاروشں فوکو کے اقوال (MAXIMS) کا ترجمہ بھی کیا ہے اور لاروشں فوکو کا "تعارف" بھی لکھا ہے۔ میں اسی "تعارف" سے ایسے حصے پیش کر رہا ہوں جو لاروشں فوکو کے حالاتِ زندگی، ادبی پس منظر اور "اقوال" کی تصنیف سے متعلق ضروری باتوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

لاروشں فوکو فرانس کے ایک نہایت معزز خاندان کا فرد تھا۔ اس کی رسمی تعلیم برائے نام تھی۔ اس کا کردار متضاد عناصر کا حامل تھا۔ ایک طرف وہ شرمیلا اور غور و فکر کا عادی تھا۔ جس کی وجہ سے اس میں فوری فیصلے اور بے رحمانہ کارروائی کی صلاحیت مفقود تھی۔ دوسری طرف اس کے کردار میں مطلب پرستی، جاہ طلبی اور سازش پسندی کے عناصر تھے جنہوں نے اسے ہر طرح کی منصوبہ بازی اور ریشہ دوانی میں اُلجھایا۔ لیکن چونکہ اس کے مزاج میں ایثار و قربانی اور زیردستوں کی حمایت کے جذبات بھی موجود تھے جن کے زیرِ اثر اس نے کمزوروں، مظلوموں اور بدنصیبوں کے لئے بااثر لوگوں کی عداوت مول لی نتیجتاً وہ اپنے ارادوں اور آرزوؤں میں ناکام رہا۔ چالیس سال کی عمر میں وہ مالی اعتبار سے تباہ و برباد ہو گیا۔ اس کی صحت خراب ہو گئی۔ اس کی محبوبہ نے اس سے بے وفائی کا ثبوت دیا۔ اس کے لئے پبلک کیریر کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ اس کی زندگی کے تجربے نے اسے بتایا کہ عسکری جاہ و جلال محض تصنع ہے۔ سیاسی زندگی مقدرت آزماؤں کا جنگل ہے۔ مذہب ریاکاری ہے یا فرار۔ عورت سے محبت دھوکا ہے اور انسانی اطوار و کردار کی تہہ میں جو محرکات کارفرما ہوتے ہیں وہ یا تو خودبینی ہے یا تساہلِ محض۔ دوستی اور وفاداری پر کسی قدر ایمان یوں باقی رہ گیا تھا کہ زندگی کے آخری حصے میں جب اس کی صحت اور مالی حالت دونوں خستہ ہو چکی تھیں اسے مہربانی اور محبت وہاں سے ملی جہاں سے ملنے کی

کوئی توقع نہ تھی۔ اس کا ایک ملازم تھا جس کا نام تھا گوردیل (GOURVILLE) جو اس کا سکریٹری رہ چکا تھا اور اس کی ملازمت کے دوران دولت مند بن گیا تھا۔ اس نے اپنی احسان مندی اور شکرگزاری کا ثبوت دیا۔ گوردیل کے مشوروں اور مالی مدد کی بدولت لاروشفوکو کی تنہائی اور تلخی کے ایام کی شدت کم ہوگئی۔ گوردیل ایک جاں نثار اور وفادار دوست ثابت ہوا۔

سنہ ۱۶۵۹ء میں جب لاروشفوکو پیرس واپس آیا تو (MME DE SABLE) کے حلقے (SALON) سے اس کا گہرا تعلق پیدا ہوگیا۔ یہ خاتون اس کی زندگی میں دوسرا عظیم نسوانی اثر ثابت ہوئیں۔ ان کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ وہ اپنی پسندیدہ شخصیتوں کے ماحول میں ایک پاکیزہ معاشرتی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ ان کی بزم کا ایک رکن لاروشفوکو بھی تھا۔ ان کے حلقے کا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کے ہاں یا تو ذاتی گفتگو ہوتی تھی یا ادبی۔ جو موضوعات انہیں اور ان کے دوستوں کو پسند تھے ان کا تعلق نفسیات ادب اور لسانیات سے تھا۔ بیان میں صفائی اور اظہار میں وضاحت انہیں بہت مرغوب تھی ان کا حلقہ احباب لاروشفوکو کے لئے صحیح ماحول ثابت ہوا۔ اندرونی طور پر وہ ایک مبصر، انسانی فطرت کا نبض شناس اور انسانی طربیہ والمیہ کا ایک خاموش گواہ تھا۔ وہ اپنی زندگی کے بیس سال لاحاصل سرگرمیوں میں ضائع کر چکا تھا۔ فوجی اور سیاسی میدانوں میں شہرت کے حصول کے لئے جو کوششیں اس نے کی تھیں وہ بے سود ثابت ہو چکی تھیں۔ اب وہ فرانسیسی ادب میں ایک شاندار اور منفرد مقام حاصل کرنے میں کوشاں تھا۔

فرانس میں (MME DE SABLE) کے جیسے حلقوں سے سترھویں صدی کے نصف اول میں فرانسیسی ادب زبان اور فکر کو بڑے فائدے پہنچے۔ سترھویں صدی کے نصف آخر کے بعض عظیم ترین فرانسیسی اہلِ قلم کی ذہنی پرورش انہی حلقوں میں ہوئی تھی۔ مجرد خیالات کے اظہار میں فرانسیسی زبان جس صفائی، صحت اور پاکیزگی کے لئے مشہور ہے وہ انہی حلقوں کے اثرات کا معجزہ ہیں۔ ان حلقوں کے اراکین کا مقصد دلچسپ اور پاکیزہ گفتگو سے لطف اندوز ہونا ہوتا تھا۔ اس لئے وہ سیاست اور مذہب جیسے موضوعات سے احتراز کرتے تھے کیونکہ ان موضوعات پر گفتگو میں عموماً تلخی آجاتی ہے۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ معاشرے میں انسانی طرزِ عمل سے متعلق عام موضوعات پر بات چیت کی جائے۔ مرد اور عورت کے درمیان جو رشتہ ہے خصوصاً اس طرح کے موضوع پر گفتگو پسند کی جاتی تھی کہ کسی مرد اور عورت کے درمیان باہمی دلچسپی کا آغاز کہاں سے ہوا اور وہ دلچسپی کن راستوں سے گزر کر شعوری محبت بن گئی۔ اس قسم کی دلچسپیاں اور شخصی خاکے لکھنے کا رواج عام تھا۔ شخصی خاکوں میں بھی ناخوشگوار خصوصیات کو

نمایاں کرنے سے پہلوتہی کی جاتی تھی۔ ۱۶۵۹ء میں اس طرح کے خاکوں کا ایک مجموعہ شائع کیا گیا جس میں لاروشش فوکو کا اپنا لکھا ہوا ذاتی خاکہ بھی تھا۔

اس طرح کے حلقوں کی نشستوں میں دوسری جس چیز کو فروغ حاصل ہوا وہ انسانی اطوار کے بارے میں کہاوتوں کی سی تعمیم تھی۔ اس طرح کے اقوال میں جس کمال کا مظاہرہ کیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ صفائی اور صداقت کو اس طرح جمع کر دیا جائے کہ سننے والا یا پڑھنے والا اسے آسانی سے یاد رکھ سکے۔ غرضیکہ اقوال سازی ایک مجلسی مشغلہ بن گئی تھی۔ اراکین حلقہ اقوال کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت، پُرمغز اور پُراثر بنانے کے لئے کاٹ چھانٹ کی اجتماعی کوششیں کرتے تھے۔

لاروشش فوکو کے 'اقوال' چھ سات سال کی صبر آمیز موشگافی، دقیقہ سنجی اور نفاست آفرینی کے نتائج ہیں۔ ان چھ سات برسوں میں (MME DE SABLE) کا حلقہ اسے بار بار اپنے مشوروں اور تنقید سے نوازتا رہا۔ لاروشش فوکو انسان اور انسانی اطوار پر اپنے افکار کو اپنے ادبی دوستوں کے سامنے بحث و تمحیص کے لئے پیش کر کے انہیں آہستہ آہستہ نکھارتا رہا۔ لاروشش فوکو کے اقوال میں اس کے احباب لطافت اور نزاکت پیدا کرتے رہے، لفظوں کو زیادہ سے زیادہ معنی خیز بناتے رہے اور کسی بات پر ضرورت سے زیادہ زور دینے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے رہے۔

۱۶۶۵ء میں جب لاروشش فوکو نے اپنے اقوال کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو یہ وہ زمانہ تھا جب اس کے ساتھ (SABLE) کے حلقے کی ایک دوستی اس کی آخری محبت کا رنگ اختیار کر چکی تھی۔ یہ محبت فرانسیسی ادب پر زبردست اثر چھوڑ گئی۔ لاروشش فوکو کی محبوبہ (MME DE LA FAYETTE) اس سے بیس سال چھوٹی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے قریب رہتے تھے، اگرچہ (FAYETTE) جوان سال تھی لیکن اس کی صحت خراب رہا کرتی تھی۔ لاروشش فوکو بھی پرانا مریض بن چکا تھا۔ جوں جوں سال گزرتے گئے خصوصاً ۱۶۷۰ء کے بعد جب لاروشش فوکو کی بیوی وفات پا چکی تھی اور لاروشش فوکو گٹھیا کا مریض بن کر مریضانہ کرسی کے سہارے چلنے لگا تھا دونوں محبت بھری دوستی کی پُرسکون زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ (FAYETTE) کے احساس توازن، مادرانہ توجہ اور مضبوط فہم و فراست نے لاروشش فوکو کی تنہائی اور زندگی کی تلخی اور اس کے 'اقوال' کے بعد کے ایڈیشنوں میں بعض بیانات کو نرم بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ بعض بیانات کی درشتی کو دور کرنے سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ لاروشش فوکو تمام انسانوں کو قابلِ ملامت نہیں گردانتا اور غالباً اس کا قاری ایک استثنا ہے۔

جس طرح (MME DE FAYETTE) کی ذات سے لاروش فوکو مستفید ہوا اسی طرح لاروش فوکو کی ذات سے بھی (FAYETTE) کو بڑے فائدے پہنچے وہ سولہویں صدی کی تاریخ پر تحقیقی کام کر رہی تھی۔ لاروش فوکو کے مشوروں ہی سے (FAYETTE) کی تحقیقات نے ایک شاہکار (LA PRINCESSE DE CLEVES) کی شکل اختیار کی جسے فرانسیسی ادب کا پہلا عظیم ناول کہہ سکتے ہیں۔

"اقوال" لاروش فوکو کی واحد تصنیف ہے جسے اس نے خود شائع کیا۔ اس کی زندگی میں اس کتاب کے پانچ ایڈیشن (۱۶۶۵ء، ۱۶۶۶ء، ۱۶۷۱ء، ۱۶۷۵ء اور ۱۶۷۸ء) شائع ہوئے۔ ۱۶۷۸ء کے ایڈیشن کی تصحیح لاروش فوکو نے کی۔ ایل ڈبلیو ٹینکرک نے اسی ایڈیشن کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔ مختلف ایڈیشنوں میں "اقوال" کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہی۔ پہلے ایڈیشن (۱۶۶۵ء) میں کل ۳۱۷ اقوال تھے۔ اب ان کی تعداد ۶۴۱ ہے۔

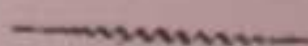
لاروش فوکو نے اپنے دوستوں کے مشوروں کی روشنی میں اپنے اقوال کی کاٹ چھانٹ پر کئی سال صرف کئے۔ اس کی ریاضتوں اور کاوشوں کا مقصد یہ تھا کہ وہ انسانی فطرت سے متعلق جو حقائق پیش کر رہا ہے اسے ہر زمانے کے تمام لوگ پورے طور پر سمجھ سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے اپنے ذخیرۂ الفاظ کو سادہ اور صاف لفظوں کی محدود ترین تعداد تک محدود رکھا۔ چونکہ مقامی تلمیحات، صنائع وبدائع سے بھری ہوئی زبان، استعارے، فنی اصطلاحیں غرضیکہ وہ تمام چیزیں جو زمان ومکاں پر منحصر ہوتی ہیں اور جن کے بارے میں یہ امکان ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ کسی زمانے کے کسی طبقے کی سمجھ میں نہ آسکیں ایسے استعمال سے احتراز کیا گیا اور رفتہ رفتہ ایک ایسی زبان پیدا کی گئی جو رنگ، ذائقے اور بو سے خالی صرف ایک آلۂ اظہار ہے جس کی واحد خوبی مفہوم (نہ کہ قواعد) کے اعتبار سے صحیح ہونا ہے۔ ان حدود میں لاروش فوکو اور دوسرے فرانسیسی کلاسیکی فن کاروں نے لفظوں کے صحیح انتخاب اور ان کی صحیح ترتیب پر بے انتہا محنت کر کے مکمل طور پر واضح ہونے کے نصب العین کو حاصل کیا۔

لاروش فوکو کے اقوال گزشتہ تین سو سال سے کیوں زندہ ہیں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ٹیلرک والٹیر (۱۶۹۴ء۔۱۷۷۸ء) نے اپنی ایک کتاب میں لاروش فوکو کے اقوال کو ان کتابوں میں شمار کیا ہے جنہوں نے فرانسیسی قوم کے ذوق کی تشکیل میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے اور جنہوں نے اسے موزونیت (APTRESS) اور صحت (PRECISION) کا احساس عطا کیا ہے۔

یہاں میں نمونے کے طور پر تھوڑے سے اقوال کے ترجمے پیش کرتا ہوں اس احساس اور اعتراف

کے ساتھ کہ یہ ترجمے یقیناً ترجمے کا حق ادا نہ کر سکے:

ہماری نیکیاں دراصل ہماری وہ برائیاں ہیں جنہوں نے بھیس بدل لیا ہے۔
ہمیں اپنے جذبات کی پائیداری میں اُتنا ہی دخل ہے جتنا کہ اپنی زندگی کی پائیداری میں۔
ہم سب لوگوں میں اتنی طاقت ضرور ہے کہ دوسروں کی مصیبتوں کو برداشت کر سکیں۔
بدنصیبی کے مقابلے میں خوش نصیبی کو برداشت کرنے کے لئے عظیم تر خوبیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔
اگر ہمارے اندر عیب نہ ہوتے تو دوسروں کے اندر عیب دیکھنے میں ہمیں اتنا مزہ نہ ملتا۔
تمام لوگ مساوی طور پر مغرور واقع ہوئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اظہارِ غرور کے طریقے الگ الگ ہیں۔
ہم لوگ کبھی اتنے خوش نصیب یا بدنصیب نہیں ہوتے جتنا کہ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ہم ہیں۔
بعض اوقات ہم اپنے آپ سے بھی اتنے ہی مختلف ہوتے ہیں جتنا کہ دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں۔
کمزور مخلص نہیں ہو سکتے۔
پاگل پن کا علاج ممکن ہے لیکن کج فہمی کی اصلاح ممکن نہیں
وقار کے بغیر قابلیت ممکن ہے لیکن تھوڑی بہت قابلیت کے بغیر وقار ممکن نہیں۔
تمام جذبات ہمیں غلطیاں کرنے پر مجبور کرتے ہیں لیکن محبت سب سے زیادہ احمقانہ غلطیوں کی ذمہ دار ہوتی ہے۔
ہمارے متعلق ہمارے دشمنوں کی رائیں ہماری رایوں سے زیادہ صحیح ہوتی ہیں۔
عقل مند آدمی جنگ جیتنے سے زیادہ جنگ میں شریک نہ ہونے کو مفید سمجھتا ہے۔
نہ جوانی حسن کے بغیر کچھ حاصل کر پاتی ہے نہ حسن جوانی کے بغیر۔
حالات ہمیں دوسروں پر منکشف کرتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ خود ہمیں اپنے آپ پر۔



We always dread the sight of the person we love when we have been coquetting elsewhere.

We ought to console ourselves for our faults when we have strength of mind to confess them.

To be confident of pleasing is often an infallible means of displeasing.

There is a kind of revolution of so general a character that it changes the mental tastes as well as the fortunes of the world.

We like to divine others, but we do not like to be divined ourselves.

Preserving the health by too strict a regimen is a wearisome malady.

The generality of women yield through weakness rather than through passion. Hence it is that enterprising men succeed generally better than others, although they may not be the most amiable.

Coldness in love is a sure means of being beloved.

In mankind is not found any great excess either of good or evil.

Those who are incapable of committing great crimes do not easily suspect others of them.

The pomp of funerals is more interesting to the vanity of the living than to the memory of the dead.

Men more easily set bounds to their gratitude than to their hopes or their desires.

We do not always regret the loss of friends in consideration of their merit, but in consideration of our wants, and of the good opinion they entertained of us.

To be always good others must believe that they can never appear wicked to us with impunity.

The most subtle folly is produced by the most subtle wisdom.

Great souls are not those which have less passion and more virtue than common souls, but those only which have greater designs.

Kings do with men as with pieces of money—they give them what value they please, and we are obliged to receive them at their current, and not at their real value.

Natural ferocity makes fewer cruel people than self-love.

There are some crimes which become innocent, and even glorious, by their renown, their number, and their excess. Hence it is that public robberies become proofs of talent, and seizing whole provinces unjustly is called making conquests.

experience at the good fortune of our friends does not always arise from the goodness of our nature, nor from the friendship we have for them. It is more often a result of self-love which flatters us with the hope of being fortunate in our turn, or of deriving some advantage from their good fortune.

In the adversity of our best friends we often find something which does not displease us.

How can we expect another to keep our secret if we cannot keep it ourselves?

There are no people who are so troublesome to others as the indolent; when they have satisfied their indolence they wish to appear diligent.

It is a proof of very little friendship not to notice a cooling in that of our friends.

Moderation is like temperance; we should wish to eat more, but are afraid of injuring our health.

Every one blames in his neighbour what the world blames in himself.

It is a kind of happiness to know to what extent we may be unhappy.

When we cannot find contentment in ourselves, it is useless to seek it elsewhere.

We must be able to answer for our fortune to be able to answer for our future conduct.

Justice in moderate judges is only love of their elevation.

When we are tired of loving we are very glad of some act of infidelity towards ourselves to disengage us from our own fidelity.

The first movement of joy which we

with it to work its own destruction, because, at the same time that it is overthrowing itself in one place it is re-establishing itself in another. When we suppose that it is relinquishing its pleasures, it does nothing but suspend or vary them; and even when defeated, and supposed to be annihilated, we find it triumphing in its own defeat. This is the picture of self-love, the whole existence of which is nothing but one long and mighty agitation. The sea is a sensible image of it, and self-love finds in the ebb and flow of the waves a faithful representation of the turbulent succession of its thoughts, and of its ceaseless movements.

Moderation in good fortune is commonly nothing but dread of the shame which attends excessive elation, or fear of losing what we possess.

it, but which it pursues because it wills to have them. It is whimsical, and often throws its whole application into the most frivolous pursuits; it finds its whole delight in the most insipid, and preserves all its pride in the most contemptible. It is present to all states and in all conditions of life; it lives everywhere, it lives on everything; it lives on nothing. It accommodates itself to advantages, and to the deprivation of them; it even goes over to the side of those who are at war with it; it enters into their schemes, and, what is wonderful, it joins them in hating itself, it conspires its own destruction, it labours for its own ruin. In short, it cares for nothing but its own existence, and, provided that it do exist, will readily become its own enemy. We must not be surprised, therefore, if it unites with the most rigid austerity, and enters boldly into league

cruel, timid and daring; it has various inclinations according to the various temperaments which affect it, and devote it, sometimes to glory, sometimes to riches, and sometimes to pleasure; it changes them according to the changes of our age, our fortune, and our experience. It is indifferent to it, whether it has many inclinations, or only one, because it shares itself among many, or collects itself into one as may be necessary or agreeable to it. It is inconstant, and, besides the changes which arise from external causes, there are an infinity which spring from itself, and from its own resources. It is inconstant from inconstancy, from levity, from love, from novelty, from weariness, from disgust. It is capricious, and we sometimes see it labouring with extreme earnestness and with incredible toil, to obtain things which are by no means advantageous, and even hurtful to

much so, that one is tempted to believe that each of our passions has a magic peculiar to itself. Nothing is so close, and so firm as its attachments, which it vainly endeavours to break off at the appearance of the extreme evils which menace it. Sometimes, however, it accomplishes in a short time, and without effort, what it had not been able to effect in the course of several years with all the efforts in its power: whence we may conclude, not unjustly, that its desires are excited by itself, rather than by the beauty and merit of their object; that its own taste is the price which gives them value, and the cosmetic which sets them off; that it is only itself which it pursues, and that it follows its own taste when it follows things after its taste. It is a compound of contraries, it is imperious and obedient, sincere and dissembling, compassionate and

is unable to recognise them, or cannot resolve to own them. From this darkness which conceals it, spring the ridiculous ideas it has of itself; hence come its errors, its ignorances, its grossness, and its follies with respect to itself. Hence it comes that it fancies its sentiments dead when they are only asleep, it thinks that it has no desire to arise from its repose, and believes that it has lost the appetites which it has satiated. But this thick darkness which conceals it from itself does not prevent its seeing perfectly every external object — in this, resembling our eyes, which see everything, and are only blind to themselves; in fact, in its greatest interests and in its most important affairs, where the violence of its desires calls for all its attention, it sees, it perceives, it understands, it imagines, it suspects, it penetrates, it divines every thing; so

makes men idolise themselves, and would make them tyrants over others if fortune were to give them the means. It never reposes out of itself, and only settles on strange objects, as bees do on flowers, to extract what is useful to it. There is nothing so impetuous as its desires, nothing so secret as its plans, nothing so clever as its conduct. Its pliancy cannot be depicted, its transformations surpass those of Ovid's 'Metamorphoses,' its refinements those of chemistry. We cannot sound the depths, nor penetrate the darkness of its abysses. There it is concealed from the keenest eyes, it goes through a thousand turns and changes. There it is often invisible to itself; it conceives, nourishes, and brings up, without being conscious of it, a vast number of loves and hates. Some of these it forms so monstrous, that when brought to light it

time ago amused himself with dancing on the scaffold on which he was about to be executed. Thus, though motives may differ, they often produce the same effects. So that it is true that whatever disproportion there may be between great men and common people, both the one and the other have been a thousand times seen to meet death with the same countenance; but it has been with this difference, that in the contempt which great men show for death it is the love of glory which hides it from their view; and in common people, it is an effect of their want of intelligence which prevents their being acquainted with the greatness of their loss, and leaves them at liberty to think of other things.

Self-love is the love of one's self, and of every thing on account of one's self; it

It is flattering ourselves to believe that death appears to us when near, what we fancied it at a distance, and that our sentiments, which are weakness itself, are of a temper so strong as not to suffer from the attack of the harshest of trials. It is also but a poor acquaintance with the effects of self-love, to think that it can aid us in treating lightly what must necessarily destroy itself, and reason, in which we think to find so many resources, is too weak in this encounter to persuade us of what we wish. On the contrary, it is reason which most frequently betrays us, and instead of inspiring us with the contempt of death serves to reveal to us all that it has dreadful and terrible. All that reason can do for us is to advise us to turn away our eyes from death, to fix them on other objects. Cato and Brutus chose illustrious ones. A lacquey a short

the shipwreck. To put a good face on the matter, let us content ourselves with not discovering to ourselves all that we think of it, and let us hope more from our constitutions than from those feeble reasonings which would make us believe that we can approach death with indifference. The credit of dying with firmness; the hope of being regretted; the desire of leaving a fair reputation; the certainty of being freed from the miseries of life, and of no longer depending on the caprices of fortune, are remedies which we should not reject. But at the same time we should not believe that they are infallible. They do as much to assure us as a simple hedge in war does to assure those who have to approach a place to the fire of which they are exposed. At a distance it appears capable of affording a shelter, but when near it is found to be a feeble defence.

itself in different shapes to their imagination, and appearing more instant at one time than at another. Thus it results that after having despised what they knew nothing of they end by fearing what they do know. If we would not believe that it is the greatest of all evils, we must avoid looking it and all its circumstances in the face. The cleverest and bravest are those who take the most respectable pretexts to prevent themselves from reflecting on it; but any man who is able to view it in its reality finds it a horrible thing. The necessity of dying constituted all the firmness of the philosophers. They conceived they should go through with a good grace what they could not avoid, and as they were unable to make their lives eternal, they had nothing left for it but to make their reputations eternal, and preserve all that could be secured from

opinion is never sincere. Every thing however has been written which could by possibility persuade us that death is not an evil, and the weakest men as well as heroes have given a thousand celebrated examples to support this opinion. Nevertheless, I doubt whether any man of good sense ever believed it, and the pains men take to persuade others and themselves of it let us see that the task is by no means easy. We may have many causes of disgust with life, but we never have any reason for despising death. Even those who destroy their own lives do not reckon it as such a little matter, and are as much alarmed at and recoil as much from it as others, when it comes upon them in a different way from the one they have chosen. The inequality remarkable in the courage of a vast number of brave men arises from the fact of death presenting

passion, without being so with the person they love.

Love, all agreeable as it is, is more pleasing from the manner in which it displays itself than from its own nature.

A small degree of wit accompanied by good sense is less tiresome in the long run than a great amount of wit without it.

Jealousy is the greatest of all evils, and the least pitied by those who cause it.

After having spoken of the falsity of so many apparent virtues it is reasonable to say something of the falsity of the contempt of death; I mean that contempt of death which the Pagans boast of deriving from their own strength, without the hope of a better life. There is a difference between enduring death with firmness, and despising it. The first is common enough, but the other in my

lightens them, and gives them views so just as to make them suppress or disguise the least things which might be condemned.

Young people on entering the world should be either timid or giddy: a composed and settled demeanour generally changes into impertinence.

Quarrels would not last long, if the fault was only on one side.

It is of no advantage to a woman to be young without being pretty, or to be pretty without being young.

There are some persons so fickle and frivolous, that they are as far from having real faults as solid qualities.

There are some people so full of themselves, that when they are in love, they find means to be occupied with their



these they cultivate with so much assiduity, that they become at length natural defects which are no longer capable of correction.

One fact which lets us see that men are better acquainted with their faults than is generally thought, is, that they are never wrong when they speak of their own conduct; the same self-love which generally blinds, on such occasions en-

to believe that it is false, or suppose it capable of crimes.

Men often proceed from love to ambition, but they seldom return from ambition to love.

Extreme avarice almost always mistakes itself; there is no passion which more often deprives itself of its object, nor on which the present exercises so much power to the prejudice of the future.

Avarice often produces opposite effects; there is an infinite number of people who sacrifice all their property to doubtful and distant expectations; others despise great future advantages to obtain present interests of a trifling nature.

It would seem that men do not find enough defects in themselves; they augment the number by certain singular qualities which they affect to put on, and

remains of a passion, we are more ready to receive a new one than when we are entirely cured.

Those who have had great passions find themselves during the whole of their lives both happy and unhappy at being cured of them.

There are even more people without interest than without envy.

We have more indolence in the mind than in the body.

The calm or agitation of our temper does not depend so much on the important events of life, as on an agreeable or disagreeable adjustment of little things which happen every day.

However wicked men may be, they dare not appear to be enemies of virtue; and when they wish to persecute, they pretend

gentle are in general only of a weak character, which easily changes into asperity.

Timidity is a fault for which it is dangerous to reprove persons whom we wish to correct of it.

Nothing is so rare as real goodness of heart; even those who fancy they are possessed of it, have in general only complaisance or weakness of character.

The mind attaches itself from indolence and from constancy to whatever is easy and agreeable to it. This habit always sets limits to our knowledge, and no one ever took the trouble to enlarge and guide his mind to the extent of its capacities.

Men are more satirical from vanity than from malice.

When the heart is still agitated by the

Rare as is true love, true friendship is still rarer.

There are few women whose merit outlives their beauty.

The desire of being pitied, or admired, often makes the greatest part of our confidence.

Our envy always outlives the happiness of those we envy.

The same firmness which serves to resist love serves also to render it violent and durable, and weak persons who are always agitated by passions are scarcely ever really taken up with it.

Imagination cannot invent so many different contrarieties as naturally exist in the heart of every individual.

It is only persons of firmness that can have real gentleness; those who appear

Of all violent passions, that which sits least ill on women is love.

Vanity makes us commit more faults against our taste than reason does.

There are some bad qualities which make great talents.

Men never wish ardently for what they only wish for from reason.

All our qualities are uncertain and doubtful, as well in good as in evil, and they are almost always at the mercy of conjunctures.

In their first passions women love the lover, in the others they love love.

Pride has its oddities as well as other passions; men are ashamed to avow that they are jealous, and yet take a pride in having been and in being capable of becoming so.

There are many cures for love, but none of them infallible.

We are very far from knowing all that our passions make us do.

Old age is a tyrant, which prohibits all the pleasures of youth upon pain of death.

The same pride which makes us censure the faults from which we fancy ourselves exempt, induces us to despise the good qualities which we want.

There is often more pride than goodness in our sorrow for the misfortunes of our enemies; it is to make them feel that we are superior to them that we give them marks of our compassion.

There is an excess of good and evil which passes our sensibility.

Innocence is very far from finding as much protection as crime.

In important affairs we ought not so much to apply ourselves to create opportunities, as to make use of those which present themselves.

It would seldom be a bad bargain for us to renounce the praise, on condition of escaping the censure of the world.

Whatever disposition the world may have to judge incorrectly, it more often shows favour to false, than injustice to true, merit.

We sometimes see a fool with wit, but never one with judgment.

We should gain more by letting ourselves be seen such as we are, than by attempting to appear what we are not.

Our enemies come nearer the truth in their judgments of us, than we do in our judgment of ourselves.

Propriety is the least of all laws, and the most obeyed.

A well-regulated mind has less difficulty in submitting to ill-regulated ones than in governing them.

When fortune surprises us by bestowing on us an important office, without having conducted us to it by degrees, or without our being elevated to it by our hopes, it is almost impossible that we should sustain ourselves in it with propriety, and appear worthy of possessing it.

Our pride is often increased by what we retrench from our other faults.

There are no fools so troublesome as those who have some wit.

There is no man who thinks himself in any of his qualities inferior to the man he esteems the most in the world.

that it is insipid when they have once tasted of love.

In friendship, as in love, we are often more happy from the things we are ignorant of, than from those we are acquainted with.

We endeavour to make a merit of faults that we are unwilling to correct.

The most violent passions leave us some moments of relaxation, but vanity always agitates us.

Old fools are more foolish than young ones.

Weakness is more opposed to virtue than vice is.

What renders the pangs of shame and of jealousy so acute is, that vanity cannot help us to support them.

proofs of their friendship, but we always owe sensibility to their misfortunes.

Fortune and humour govern the world.

It is more easy to become acquainted with men in general, than with any man in particular.

We should not judge of a man's merit by his good qualities, but by the use he can make of them.

There is a certain lively gratitude which not only acquits us of the obligations we have received, but by paying what we owe them makes our friends indebted to us.

We should desire few things ardently if we had a perfect knowledge of what we were desiring.

What causes the majority of women to be so little touched by friendship is,

with friendship, and the generality of devotees disgust us with devotion.

We easily pardon in our friends those faults which do not concern ourselves.

Women who love more readily pardon great indiscretions than little infidelities.

In the old age of love, as in that of life, we still live for its evils, but no longer for its pleasures.

Nothing so much prevents our being natural as the desire of appearing so.

To praise good actions heartily is in some sort to take part in them.

The truest mark of being born with great qualities is being born without envy.

When our friends have deceived us, we owe nothing but indifference to the

cowards suffer themselves to be killed through fear of defending themselves.

Confidence contributes more than wit to conversation.

All the passions make us commit faults, but love makes us commit the most ridiculous ones.

Few people know how to be old.

We often take credit for faults opposite to those we have; when we are weak we boast of being obstinate.

Penetration has an air of divination, which flatters our vanity more than all the other qualities of the mind.

The grace of novelty, and long habit, however opposite they may be, equally prevent our perceiving the faults of our friends.

The generality of friends disgust us

Our wit sometimes enables us to commit follies with impunity.

The vivacity which augments with years is not far from folly.

In love, he who is earliest cured is always best cured.

Young women who do not wish to appear coquettes, and men of advanced age who do not wish to appear ridiculous, should never speak of love as a thing with which they can have anything to do.

We may appear great in an employment beneath our merit, but we often appear little in one too great for us.

We often fancy that we have constancy in our misfortunes, while we have nothing but depression of spirit; and we endure them without looking them in the face, as

The most dangerous weakness of old people who have been amiable is to forget that they are no longer so.

We should often be ashamed of our best actions if the world could see all the motives which produced them.

The greatest effort of friendship is not to show our own faults to a friend, but to make him see his own.

We have few faults which are not more excusable than the means we take to conceal them.

Whatever disgrace we have merited, it is almost always in our power to re-establish our reputation.

A man does not please long when he has only one species of wit.

Madmen and fools see only through their humour.

would be badly rewarded if we were not very glad to purchase their absence.

It seems that nature has concealed at the bottom of our minds talents, and abilities of which we are not aware. The passions alone have the privilege of bringing them to light, and of giving us sometimes views more certain and more perfect than art could possibly produce.

We arrive complete novices at the different ages of life, and we often want experience in spite of the number of our years.

Coquettes make a merit of being jealous of their lovers, to conceal their being envious of other women.

Those who are over-reached by our cunning are far from appearing to us as ridiculous as we appear to ourselves when the cunning of others has over-reached us.



more above them than birth, dignity, or even merit itself.

There is merit without elevation, but there is no elevation without some merit.

Elevation is to merit what dress is to a handsome person.

Fortune sometimes makes use of our faults in order to elevate us; and there are some troublesome people whose merit

The first lover is kept a long time—when a second is not taken.

We have not courage to say, as a general proposition, that we have no faults, and our enemies have no good qualities; but, in detail, we are not far from thinking so.

Of all our faults, that which we most readily admit is indolence. We persuade ourselves that it cherishes all the peaceful virtues; and that, without entirely destroying the others, it merely suspends their functions.

There is a kind of elevation which does not depend on fortune. It is a certain air which distinguishes us, and seems to destine us for great things; it is a price which we imperceptibly set on ourselves. By this quality we usurp the deference of other men; and it puts us, in general,

Men more easily renounce their interests than their tastes.

Fortune never appears so blind as she does to those on whom she confers no favours.

We should manage our fortune as we do our health—enjoy it when good, be patient when it is bad, and never apply violent remedies except in an extreme necessity.

Rusticity is sometimes got rid of in the camp, but never at the court.

A man may be more cunning than another, but not more cunning than all others.

We are sometimes less unhappy in being deceived by those we love than in being undeceived by them.

The desire of talking of ourselves, and of making our faults appear in the light we wish them, constitute a great part of our sincerity.

We ought only to be astonished that we are still able to be astonished.

Men are almost equally difficult to satisfy when they have very much love, and when they have scarcely any left.

There are few people who are more often in the wrong than those who cannot endure to be so.

A fool has not stuff enough to be good.

If vanity does not entirely overthrow the virtues, at least it makes them all totter.

What renders the vanity of others insupportable, is that it wounds our own.

condemn every thing which is beyond their range.

Envy is destroyed by true friendship, and coquetry by true love.

The greatest fault in penetration is not the not reaching the mark, but over-shooting it.

We give advice, but we do not inspire conduct.

When our merit gives way, our taste gives way also.

Fortune displays our virtues and our vices, as light makes all objects apparent.

The constraint we put on ourselves to remain faithful to a person we love is scarcely better than an infidelity.

Our actions are like 'bout rimes,' which every one makes refer to whatever he pleases.

like hidden treasures, only safe because they are not sought for.

The violence we do ourselves to prevent falling in love is often more cruel than the severity of the loved object.

There are few cowards who know the extent of their fear.

It is almost always the fault of the lover not to know when he is no longer loved.

The generality of young people fancy that they are natural, when they are only ill-bred and coarse.

There are certain tears which often deceive ourselves, after having deceived others.

If a man fancies he loves his mistress for her own sake, he is much mistaken.

Minds of moderate calibre ordinarily

to speak very little of our wives; but we do not sufficiently know that we ought to speak still less of ourselves.

There are some good qualities which degenerate into faults when they are natural, and others which are never perfect when they are acquired. It must be reason, for instance, that should render us careful of our property and our confidence; and, on the contrary, it must be nature that should bestow on us goodness and courage.

Whatever distrust we may have of the sincerity of those who converse with us, we always believe that they tell us more truth than they do to others.

There are few virtuous women who are not weary of their profession.

The generality of virtuous women are

Infidelities ought to extinguish love, and we should not be jealous, even when we have reason to be so; it is only persons who avoid causing jealousy who are worth being jealous of.

People suffer more in our opinion, from the smallest infidelities committed towards ourselves, than from the greatest towards others.

Jealousy is always born with love, but it does not always die with it.

The generality of women mourn the death of their lovers not so much from the love they bore them as to appear more worthy of being loved.

The violences that others do to us are often less painful than those we put on ourselves.

We know well enough that we ought

A man of sense may love like a madman, but never like a fool.

There are certain faults which, when turned to good account, gain more reputation than virtue itself.

There are some persons whom, when we lose, we regret more than we mourn; and others whom we mourn and scarcely regret.

In general we only praise heartily those who admire us.

Little minds are too much hurt by little things. Great minds perceive them all, and are not touched by them.

Humility is the true proof of Christian virtues: without it, we retain all our faults, and they are only hidden by pride, which conceals them from others, and often from ourselves.

Opportunities make us known to others, and still more to ourselvés.

There can be no regulation in the minds nor in the hearts of women, unless their temperament is in unison with it.

We think very few people sensible except those who are of our opinion.

In love we often doubt what we most believe.

The greatest miracle of love is the cure of coquetry.

What makes us so sore against those who practise artifices upon us, is that they fancy themselves cleverer than us.

It is very troublesome to come to a rupture when we no longer love.

We are almost always wearied in the company of persons with whom we are not permitted to be weary.

When our hatred is too keen, it places us beneath those we hate

We feel our good and our bad fortune solely in proportion to our self-love.

The intellect of the generality of women serves more to fortify their folly than their reason.

The passions of youth are scarcely more opposed to safety than the lukewarmness of age.

The accent of a man's native country dwells in his mind and in his heart as well as in his speech.

To be a great man one must know how to profit by the whole of one's fortune.

The generality of men have, like plants, latent properties, which chance brings to light.

We forgive so long as we love.

It is more difficult for a man to be faithful to his mistress when he is favoured than when he is ill-treated by her.

Women know not the whole of their coquetry.

Women never have a complete severity of demeanour except towards those whom they dislike.

Women can less easily surmount their coquetry than their passions.

In love deceit almost always goes further +han mistrust.

There is a certain kind of love the excess of which prevents jealousy.

It is with certain good qualities as with the senses; those who are entirely deprived of them can neither appreciate nor comprehend them.

It is only those who are despicable who fear being despised.

Our wisdom is not less at the mercy of fortune than our property.

In jealousy there is more self-love than love.

We often console ourselves through weakness for evils in which reason is powerless to console us.

Ridicule dishonours more than dishonour.

We confess our little faults only to persuade others that we have no great ones.

Envy is more irreconcilable than hatred.

We sometimes fancy that we hate flattery, but in reality we only hate the manner of flattering.

our friends is not so much any distrust we have of them as the distrust we have of ourselves.

Weak persons cannot be sincere.

It is not a great misfortune to oblige ungrateful people, but it is an unsupportable one to be under an obligation to a vulgar man.

We find means to cure folly, but none to reclaim a distorted mind.

We cannot long preserve the sentiment we should have for our friends and benefactors if we often allow ourselves the liberty of speaking of their faults.

To praise princes for virtues they do not possess is to speak evil of them with impunity.

We are nearer loving those who hate us than those who love us more than we like.

life from which it requires a degree of madness to extricate ourselves well.

If there are men whose weak point has never appeared, it is because it has never been properly sought for.

The reason why lovers and their mistresses are never weary of being together is, that they always talk of themselves.

Why must we have memory enough to retain even the minutest details of what has happened to us, and not enough to remember how many times we have told them to the same person?

The extreme pleasure we take in talking of ourselves should make us fear that we give very little to those who listen to us.

What commonly prevents us from exhibiting the bottom of our hearts to

Interest, which is accused of all our crimes, often deserves to be praised for our good actions.

We seldom find people ungrateful as long as we are in a condition to render them services.

It is as honourable to be boastful to ourselves as it is ridiculous to be so to others.

Men have made a virtue of moderation to limit the ambition of the great, and to console people of mediocrity, for their want of fortune and of merit.

There are some people fated to be fools, who not only commit follies from choice, but are compelled to commit them by fortune.

There happen sometimes accidents in



There are people enough who despise wealth, but few who know how to bestow it.

It is generally only in petty interests that we run the hazard of not trusting to appearances.

In whatever respect people may praise us, they never teach us anything new.

We often pardon those who weary us, but we cannot pardon those whom we weary.

The humours of the body have a stated and regular course, which impels and imperceptibly guides our will. They cooperate with each other, and exercise successively a secret empire within us; so that they have a considerable part in all our actions, without our being able to know it.

Gratitude in the generality of men is only a strong and secret desire of receiving greater favours.

Almost every one takes a pleasure in requiting trifling obligations; many people are grateful for moderate ones; but there is scarcely any one who does not show ingratitude for great ones.

There are follies as catching as contagious disorders.

The merit of men has its season, as fruits have.

It may be said of men's humours as of many buildings, that they have divers aspects—some agreeable, others disagreeable.

Moderation cannot have the credit of combating and subduing ambition—they are never found together. Moderation is the languor and indolence of the soul, as ambition is its activity and ardour.

We always love those who admire us, and we do not always love those whom we admire.

We are very far from being acquainted with the whole of our will.

It is difficult to love those whom we do not esteem; but it is not less so to love those whom we esteem more than ourselves.

It is impossible to love a second time what we have once really ceased to love.

It is not so much fertility of invention which presents us with several expedients for attaining the same object, as it is want of intelligence which causes us to hesitate at every thing which presents itself to the imagination, and prevents our discerning at a glance which is the best.

There are certain affairs and diseases, the remedies of which only aggravate them at particular times; and great ability consists in knowing when it is dangerous to apply these remedies.

Affected simplicity is a refined imposture.

There are more faults in the humour than in the mind.

The approbation bestowed on those who are entering the world often arises from a secret envy of those already established in it.

Pride, which inspires us with so much envy, serves also to moderate it.

Some disguised falsehoods represent the truth so well, that it would be bad judgment not to be deceived by them.

There is sometimes as much ability in knowing how to profit by good advice as in arriving at a correct opinion ourselves.

Some bad people would be less dangerous if they had not some goodness.

Magnanimity is well enough defined by its name: nevertheless, we may say that it is the good sense of pride, and the most noble way of earning praise.

and increases great ones, as the wind extinguishes tapers and adds fury to fire.

Women often fancy themselves in love even when they are not. The occupation of an intrigue, the emotion of mind which gallantry produces, the natural leaning to the pleasure of being loved, and the pain of refusing, persuade them that they feel the passion of love, when, in reality, they feel nothing but coquetry.

What makes us often discontented with negotiators is that they almost always abandon the interest of their friends for that of the success of the negotiation, which becomes their own, from the credit of having succeeded in their undertaking.

When we dilate upon the affection of our friends, it is often less from gratitude than from a desire to convey an opinion of our own merit.

Youth is perpetual intoxication; it is the fever of reason.

Nothing ought more to humiliate men who have deserved great praise than the care which they still take to derive consequence from trifles.

Some people obtain the approbation of the world, whose only merit consists in the vices which serve to carry on the commerce of life.

The charm of novelty is in love what the bloom is on fruits: it gives a lustre which is easily effaced, and which never returns.

Good nature, which boasts of so much sensibility, is often stifled by the most petty interest.

Absence diminishes moderate passions

Readiness to believe evil without sufficient examination is the result of pride and indolence. We wish to find people guilty, and we do not wish to give ourselves the trouble of examining into the crimes.

We take exceptions to judges who are in the least degree interested, and yet we are quite willing that our reputation and our fame should depend on the judgment of men who are all opposed to us, either from jealousy, or from prejudice, or from want of intelligence; it is only to induce them to decide in our favour that we peril in so many ways our repose and our lives.

Scarcely any man is clever enough to know all the evil he does.

Honour acquired is security for that which should be acquired.

misfortunes in those of others; it is a clever foresight of the evils into which we may fall. We succour others in order to engage them to succour us in similar circumstances; and the services we render them are, to speak properly, a good which we do to ourselves by anticipation.

Narrowness of mind is the cause of obstinacy—we do not easily believe what is beyond our sight.

It is deceiving ourselves to fancy that it is only the violent passions, such as ambition and love, which can triumph over the others. Indolence, all languid as it is, nevertheless is frequently their master; it spreads its dominion over all the designs and all the actions of life, and thus destroys and insensibly consumes the passions and the virtues.

Good taste springs more from judgment than from intellect.

The pleasure of love is in loving. We are happier in the passion we feel than in that we excite.

Civility is a desire to receive it in turn, and to be accounted well bred.

The education commonly given to the young is a second self-love with which they are inspired.

There is no passion in which self-love reigns so powerfully as in love; and we are often more disposed to sacrifice the peace of the loved object than to lose our own.

What is called liberality is most often only the vanity of giving, which we like better than the thing we give.

Pity is often a perception of our own

pride which abases in order to exalt itself; and though it transforms itself in a thousand different ways, it is never better disguised and more capable of deceiving than when it conceals itself under the garb of humility.

All the sentiments have a tone of voice, gestures, and countenances, peculiar each to itself: and this conformity, as it is good or bad, agreeable or disagreeable, causes people to be pleasing or displeasing.

In all the professions every one affects a particular look and exterior, in order to appear what he wishes to be thought, so that it may be said the world is made up of appearances.

Gravity is a mystery of the body, invented to conceal the defects of the mind.

Magnanimity despises everything to gain everything.

There is as much eloquence in the tone of voice, in the eyes, and in the air of a speaker, as in his choice of words.

True eloquence consists in saying all that is necessary, and nothing but what is necessary.

There are some persons on whom their faults sit well, and others who are made ungraceful by their good qualities.

It is as common to see a change of tastes, as it is uncommon to see a change of inclinations.

Interest brings into play every sort of virtue and every sort of vice.

Humility is often only a feigned submission, of which we make use to render others submissive. It is an artifice of

We often inconvenience others, when we fancy we can never possibly do so.

Nothing is impossible: there are ways which lead to every thing; and if we had sufficient will we should always have sufficient means.

The sovereign ability consists in knowing thoroughly the value of things.

It is a great ability to be able to conceal one's ability.

What appears to be generosity is often nothing but a disguised ambition, which despises petty interests in order to reach greater ones.

The fidelity shown by the generality of men is only an invention of self-love to attract confidence—it is a means of raising ourselves above others, and of becoming depositaries of the most important affairs.

It is not so dangerous to do evil to the generality of men as to do them too much good.

Nothing flatters our pride so much as the confidence of the great, because we regard it as the result of our merit, without considering that it most frequently arises merely from vanity or from inability to keep a secret.

We may say of agreeableness, as distinct from beauty, that it consists in a symmetry of which we know not the rules, and a secret conformity of the features to each other, and to the air and complexion of the person.

Coquetry is the essential characteristic, and the prevalent humour of women; but they do not all practise it, because the coquetry of some is restrained by fear or by reason.

with so much obstinacy the most received opinions. They find the best places taken in the good party, and do not like to put up with inferior ones.

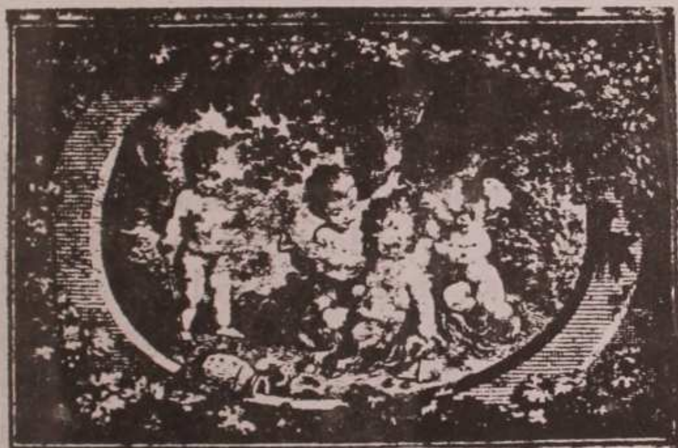
We easily console ourselves for the disgrace of our friends when it serves to signalise our affection for them.

It may seem that self-love is the dupe of good-nature, and that it forgets itself whenever we are labouring for the advantage of others. Nevertheless, it is taking the surest road to reach our objects; it is lending on usury under pretence of giving; it is in fact gaining over every one by a subtle and delicate method.

No man deserves to be praised for his goodness unless he has strength of character to be wicked. All other goodness is generally nothing but indolence or impotence of will.

really feel, they obstinately continue their tears, their complaints, and their sighs. They assume a doleful demeanour, and labour to persuade others by all their actions that their sorrow will only terminate with their lives. This miserable and fatiguing vanity is generally met with in ambitious women. As their sex bars them from all the paths of glory, they strive to render themselves celebrated by the display of inconsolable grief. There is yet another species of tears which have very petty sources, which flow easily, and as easily are dried: we weep to acquire the reputation of a tender heart; we weep to be pitied; we weep to be wept over; in fine, we weep to avoid the shame of not weeping.

It is more often from pride than from want of intelligence that people oppose



for the living. I call this a species of hypocrisy, because in this sort of grief we deceive ourselves. There is another hypocrisy which is not so innocent, inasmuch as it imposes on all the world. It is the affliction of certain persons who aspire to the distinction of a striking and perpetual grief. After time, which consumes all things, has put a stop to the sorrow they

Nothing is so contagious as example; and we never do any great good or great evil which does not produce its like. We imitate good actions from emulation, and bad ones from the depravity of our nature, which shame would keep prisoner, and example sets at liberty.

It is a great folly to wish to be exclusively wise.

Whatever pretext we may assign for our afflictions, it is often only interest or vanity which causes them.

There are divers sorts of hypocrisy in grief. In one, under pretext of lamenting the loss of a person who is dear to us, we lament ourselves, we lament the diminution of our advantages, of our pleasure, of our consideration. We regret the good opinion that was entertained of us. Thus the dead get the credit of tears which are only shed

It is not all who fulfil the duties of gratitude who can on that account flatter themselves that they are grateful.

What causes such a miscalculation in the amount of gratitude which men expect for the favours they have done, is, that the pride of the giver and that of the receiver can never agree as to the value of the benefit.

Too great eagerness to requite an obligation is a species of ingratitude.

Fortunate people never correct themselves. They always fancy they are in the right as long as fortune supports their ill conduct.

Pride does not like to owe, and self-love does not like to pay.

The good that we have received from any man should make us respect the evil that he does us.

enterprise for which they expose themselves.

Vanity, shame, and above all temperament, are often the causes of courage in men, and of virtue in women.

We are unwilling to lose our lives, and we wish to acquire glory. This is the cause of brave men having more tact and ability in avoiding death, than intriguing people have in preserving their fortunes.

There are very few persons who, in the first decline of life, do not let us see the points in which their bodies and minds will fail.

Gratitude is like the good faith of traders, it maintains commerce; and we often pay, not because it is just to discharge our debts, but that we may more readily find people to trust us.

Perfect valour is to do unwitnessed what we should be capable of doing before all the world.

Intrepidity is an extraordinary strength of mind, which raises it above the troubles, the disorders, and the emotions, which the sight of great perils is calculated to excite; it is by this strength that heroes maintain themselves in a tranquil state of mind, and preserve the free use of their reason under the most surprising and terrible circumstances.

Hypocrisy is the homage which vice renders to virtue.

The generality of men expose themselves in battle sufficiently to save their honour, but few are on all occasions willing to expose themselves as much as is necessary to insure the success of the

fears; others suffer themselves to be carried away by general panics; others go to the charge because they dare not remain in their posts. We find some in whom an acquaintance with petty dangers strengthens their courage, and prepares them to expose themselves to greater ones. Some are brave when sword in hand, and yet dread the fire of musketry; others are steady under fire, and fear the sword. All these different species of courage concur in this, that night, by augmenting fear and concealing good or bad actions, gives the privilege of being discreet. There is another species of discretion which is more general, for we never see a man perform as much in an encounter as he might do if he were sure of coming off safe; so that it is evident the fear of death subtracts something from courage.

others are often the causes of that valour so celebrated among men.

Valour in common soldiers is a dangerous trade which they have adopted to gain their livelihood.

Perfect bravery and thorough cowardice are two extremes which are seldom reached. The space between the two is great, and comprehends all other kinds of courage, between which there is as much difference as between countenances and dispositions. There are some men who expose themselves readily at the commencement of an action, and are disheartened and discouraged by its duration; some are content as soon as they have satisfied their reputation with the world, and do very little beyond this. We see some who are not at all times equally masters of their

If any one appears wise, it is only because his follies are proportioned to his age and fortune.

There are some silly people who know themselves, and make a clever use of their silliness.

He who lives without folly is not so wise as he thinks.

As we grow old we become more foolish and more wise.

Some people resemble ballads, which are only sung for a certain time.

The generality of people only judge of men by the fashion they are in, or by their fortunes.

Love of glory, fear of shame, the design of making a fortune, the desire of rendering our lives easy and agreeable, and the envious wish of lowering the fame of

is much mistaken; but he who thinks that others cannot do without him is still more mistaken.

Pretenders to virtue are those who disguise their faults from others as well as from themselves. The truly virtuous know their imperfections and confess them.

A truly virtuous man is he who prides himself upon nothing.

Severity of demeanour in women is a species of decoration and paint which they add to their beauty.

The virtue of women is often love of their reputation and of their quiet.

It is to be a truly virtuous man to wish to be always exposed to the view of virtuous people.

Folly pursues us in every period of life.

We easily forget our faults when they are only known to ourselves.

There are some people of whom we should never have believed evil unless we had seen it, but there are none at whom we ought to be surprised when we do see it.

We enhance the reputation of some with a view of depreciating that of others: and sometimes we should not praise the Prince de Condé and M. de Turenne so much, if we did not wish to blame them both.

The desire of appearing clever often prevents our becoming so.

Virtue would not travel so far if vanity did not keep her company.

He who thinks he can find in himself the means of doing without others

we must successively lodge; and I doubt whether experience would make us avoid them if we were to travel the same road a second time.

When our vices quit us we flatter ourselves with the belief that it is we who quit them.

There are relapses in the disorders of the soul as well as in those of the body. What we take to be our cure is most often nothing but an intercourse or a change of the disorder.

The faults of the soul are like wounds in the body. Whatever care we take to cure them the scar always appears, and they are every moment in danger of re-opening.

What often prevents our abandoning ourselves to a single vice is, our having more than one.

We do not despise all those who have vices, but we despise all those who have not a single virtue.

The name of virtue is as serviceable to interest as vice is.

The health of the soul is no more secure than that of the body; and though we may appear free from passions, we are in quite as much danger of being carried away by them as we are of falling sick when we are in health.

It would seem that nature has prescribed to every one from the moment of his birth certain limits for virtue and vice.

It belongs only to great men to have great faults.

It may be said that the vices await us in the journey of life like hosts with whom

There is a kind of inconstancy which arises from levity of mind, or from its weakness causing it to receive all the opinions of others. There is another kind, more excusable, which comes from satiety

The vices enter into the composition of the virtues, as poisons into that of medicines. Prudence collects and arranges them, and uses them beneficially against the ills of life.

For the credit of virtue it must be admitted that the greatest evils which befall mankind are caused by their crimes.

We confess our faults, to make amends by our sincerity for the harm they have done us in the opinion of others.

There are heroes in evil as well as in good.

ing in the loved person new subjects for love, the other arises from our making a merit of being constant.

Perseverance deserves neither blame nor praise, inasmuch as it is merely the duration of tastes and opinions, which we can neither give nor take away from ourselves.

What makes us like new acquaintances is not so much any weariness of our old ones, or the pleasure of change, as disgust at not being sufficiently admired by those who know us too well, and the hope of being more so by those who do not know so much of us.

We sometimes make frivolous complaints of our friends to justify beforehand our own fickleness.

Our repentance is not so much regret for the evil we have done, as fear of its consequences to us.

There are various sorts of curiosity: one is from interest, which makes us desire to know what may be useful to us; another is from pride, and arises from a desire of knowing what others are ignorant of.

It is better to employ our minds in supporting the misfortunes which actually happen, than in anticipating those which may happen to us.

Constancy in love is a perpetual inconstancy, which causes the heart to attach itself successfully to all the qualities of the person we love, giving the preference sometimes to one, sometimes to another; so that this constancy is nothing but an inconstancy, limited and confined to one object.

There are two sorts of constancy in love—one arises from continually discover-

The world more often rewards the appearance of merit than does it merit itself.

Avarice is more opposed to economy than liberality is.

Hope, deceitful as she is, serves at least to conduct us through life by an agreeable path.

Indolence and timidity often keep us to our duty, while our virtue carries off all the credit of doing so.

It is difficult to determine whether an open, sincere, and virtuous action is the result of probity or artfulness.

The virtues are lost in interest, as rivers are lost in the sea.

If we examine well the different effects of ennui, we shall find that it makes us neglect more duties than interest does.



often confers more reputation than real merit.

There is an infinity of modes of conduct which appear ridiculous, the secret reasons of which are wise and sound.

It is more easy to appear worthy of employments which we do not, than of those which we do possess.

Our merit gains us the esteem of the virtuous—our star that of the public.

useful manner, and they would spoil all if they changed their conduct.

The glory of men should always be proportioned to the means they have employed to acquire it.

Flattery is a false coin, which only derives its currency from our vanity.

It is not sufficient to have great qualities; we must be able to make proper use of them.

However brilliant an action may be, it ought not to pass for great when it is not the result of a great design.

There ought to be a certain proportion between actions and designs, if we would draw from them all the results they are capable of producing.

The art of being able to make a good use of moderate abilities wins esteem, and

A refusal of praise is a desire to be praised twice.

The desire of meriting the praise we receive fortifies our virtue; and that bestowed on talent, courage, and beauty, contributes to augment them.

It is more difficult to avoid being governed than it is to govern others.

If we did not flatter ourselves, the flattery of others would be very harmless.

Nature creates merit, and fortune brings it into play.

Fortune corrects us of more faults than reason is able to correct.

Some people with great merit are disgusting—others with great faults are agreeable.

The only merit of some people consists in saying and doing foolish things in a

for ourselves even when we seem to be praising them.

We are not fond of praising, and never praise any one except from interested motives. Praise is a clever, concealed, and delicate flattery, which gratifies in different ways the giver and the receiver. The one takes it as a recompense of his merit, and the other bestows it to display his equity and discernment.

We often choose envenomed praises, which, by a reaction, expose faults in those we are praising that we should not dare to discover in any other way.

We seldom praise but to be praised.

Few people are wise enough to prefer useful reproof to treacherous praise.

There are reproaches which praise, and praises which convey satire.

pleasing or persuading others, to be so studious of pleasing oneself; and that listening well and answering well is one of the greatest perfections that can be attained in conversation.

A man of wit would often be embarrassed without the company of fools.

We often boast that we are not weary of ourselves. We are such braggarts, that we do not like to allow that we are bad company for ourselves.

As it is the characteristic of great wits to convey a great deal in a few words, so, on the contrary, small wits have the gift of speaking much and saying nothing.

It is rather by estimation of our own sentiments that we exaggerate the good qualities of others, than by estimation of their merit; and we wish to attract praise

There are people who would never have been in love if they had never heard of love.

Men talk little when vanity does not prompt them.

We would rather speak ill of ourselves than not talk of ourselves at all.

One thing which makes us find so few people who appear reasonable and agreeable in conversation is, that there is scarcely any one who does not think more of what he is about to say than of answering precisely what is said to him. The cleverest and most complaisant people content themselves with merely showing an attentive countenance, while we can see in their eyes and minds a wandering from what is said to them, and an impatience to return to what they wish to say; instead of reflecting that it is a bad method of

Too great refinement is false delicacy, and true delicacy is solid refinement.

Coarseness is sometimes sufficient to protect us from being overreached by an artful man.

Weakness of mind is the only fault incapable of correction.

The least fault in women who have abandoned themselves to love is to love.

It is more easy to be wise for others than for ourselves.

The only good copies are those which exhibit the defects of bad originals.

We are never so ridiculous from the qualities we have, as from those we affect to have.

We are sometimes as different from ourselves as we are from others.

We often do good, in order that we may do evil with impunity.

If we resist our passions it is more from their weakness than from our strength.

We should have very little pleasure if we did not sometimes flatter ourselves.

The cleverest men affect all their lives to censure all artifice, in order that they may make use of it themselves on some great occasion, and for some great interest.

The ordinary employment of artifice is the mark of a petty mind; and it almost always happens that he who uses it to cover himself in one place, uncovers himself in another.

Treacheries and acts of artifice only originate in a want of ability.

The true method of being deceived is to think oneself more cunning than others.

repays the confidence shown in him by an ardent and disinterested zeal, though, in the advice he gives, he has generally nothing in view but his own interest or fame.

The most subtle of all artifices is the power of cleverly feigning to fall into the snares laid for us; and we are never so easily deceived as when we think we are deceiving others.

A determination never to deceive often exposes us to deception.

We are so much accustomed to disguise ourselves to others, that at length we disguise ourselves to ourselves.

Men are more often guilty of treachery from weakness of character than from any settled design to betray.

The more we love a mistress, the nearer we are to hating her.

The defects of the mind, like those of the countenance, augment with age.

There are some good marriages, but none that afford many delights.

We are inconsolable at being deceived by our enemies, and betrayed by our friends; and yet we are often content to be so by ourselves.

It is easy to deceive oneself without perceiving it, as it is difficult to deceive others without their perceiving it.

Nothing is less sincere than the method of asking and giving advice. The man who asks it appears to have a respectable deference for the opinion of his friend, while he intends to make him approve of his own; and he who gives the advice

near to be judged well of; others are never so well judged of as at a distance.

He is not a reasonable man who by chance stumbles upon reason; but he who derives it from knowledge, from discernment, and from taste.

To know things perfectly, we should know them in detail; but as this is almost infinite, our knowledge is always superficial and imperfect.

It is a species of coquetry to make a parade of never practising it.

The head cannot long play the part of the heart.

In youth the tastes are changed from heat of blood; in old age they are preserved from habit.

We give away nothing so liberally as advice.

produces all the effects attributed to judgment.

Every one speaks well of his heart, but no one dares to do so of his head.

Politeness of mind consists in the conception of honourable and delicate thoughts.

Gallantry of mind consists in saying flattering things in an agreeable manner.

It often happens that things present themselves to our minds in a more complete state than we could by much art make them arrive at.

The head is always the dupe of the heart.

It is not all who know their heads who know their hearts.

Men and things have both their proper points of view. Some require to be seen

to console themselves for being no longer in a position to give bad examples.

Great names debase, instead of elevating, those who cannot sustain them.

The mark of extraordinary merit is to see those most envious of it constrained to praise.

A man may be ungrateful, and yet less blameable for his ingratitude than he who conferred the favour.

We are mistaken in supposing that intellect and judgment are two different things. Judgment is merely the greatness of the light of the mind; this light penetrates into the recesses of things; it observes there every thing remarkable, and perceives what appears to be imperceptible. Thus it must be allowed that it is the greatness of the light of the mind which

proportion to the satisfaction we derive from them, and we judge of their merits by the kind of intercourse which they keep up with us.

Every one complains of his memory, and no one complains of his judgment.

In the intercourse of life we more often please by our faults than by our good qualities.

The greatest ambition has not the least appearance of it when it finds the absolute impossibility of reaching the height it aspires after.

To undeceive a man persuaded of his own merit is to do him as ill a service as that rendered to the Athenian madman, who fancied that all the vessels entering the harbour belonged to him.

Old men are fond of giving good advice,

an exchange of good offices; in fact, it is nothing but a system of traffic, in which self-love always proposes to itself some advantage.

It is more disgraceful to distrust one's friends than to be deceived by them.

We often persuade ourselves that we love people more powerful than we are; and yet it is interest alone which produces our friendship. We do not associate with them for any good that we wish to do them, but for that which we would receive from them.

Our mistrust justifies the deceit of others.

Men would not live long in society if they were not the dupes of each other.

Self-love increases or diminishes in our eyes the good qualities of our friends in

Silence is the safest course for any man to adopt who distrusts himself.

The reason we are so changeable in our friendships is, that it is difficult to know the qualities of the heart, while it is easy to know those of the head.

We can love nothing except with reference to ourselves; and we are merely following our own taste and pleasure when we prefer our friends to ourselves. It is, nevertheless, by this preference alone that friendship can be true and perfect.

Reconciliation with our enemies is only a desire of bettering our condition, a weariness of contest, and the fear of some disaster.

What men have given the name of friendship to is nothing but an alliance, a reciprocal accommodation of interests,



It is with true love as with apparitions. Every one talks of it, but few have ever seen it.

Love lends its name to an infinite number of connexions which are attributed to it, and in which it has no more part than the Doge has in what goes on at Venice.

Love ot justice in the generality of men is only the fear of suffering from injustice.

There is no disguise which can long conceal love where it does, or feign it where it does not, exist.

Almost everyone feels shame at being loved when they love no more.

If we judge of love by the generality of its effects, it resembles hatred rather than friendship.

It is impossible to meet with women who have never had an affair of gallantry; but it is rare to find any who have had only one.

There is only one sort of love, but a thousand different copies of it.

Love, like fire, cannot subsist without continual movement; as soon as it ceases to hope and fear, it ceases to exist.

A clever man should regulate his interests, and place them in proper order. Our avidity often deranges them by inducing us to undertake too many things at once; and by grasping at minor objects, we lose our hold of more important ones.

Grace is to the body what good sense is to the mind.

It is difficult to define love. All that we can say of it is, that in the soul it is a passion for reigning; in minds it is a sympathy; and in the body it is nothing but a latent and delicate desire to possess the loved object, after a good deal of mystery.

If there exists a love pure and exempt from the mixture of our other passions, it is that which lies hidden at the bottom of the heart, and of which we are ignorant ourselves.

depends as much on their humours as on fortune.

Sincerity is an opening of the heart: we find it in very few people; and that which we generally see is nothing but a subtle dissimulation to attract the confidence of others.

Aversion to lying is often an imperceptible desire to render our testimony important, and to give a religious respect to our words.

Truth does not do so much good in the world as its appearances do evil.

There is no kind of praise which has not been bestowed on prudence; nevertheless, however great it may be, it cannot assure us of the least event, because its subject is man—the most changeable in the world.

because we cannot deprive them of what attracts the respect of all the world.

In order to establish themselves in the world, men do all they can to appear established there.

Although men pride themselves on their great actions, these are often the result, not of any great design, but of chance.

It would seem that our actions are regulated by lucky or unlucky stars, to which they owe a great part of the praise or blame bestowed on them.

There are no circumstances, however unfortunate, that clever people do not extract some advantage from; and none, however fortunate, that the imprudent cannot turn to their own prejudice.

Fortune turns every thing to the advantage of her favourites.

The happiness or unhappiness of men

compensation of good and evil which renders them equal.

However great the advantages which nature bestows on us, it is not she alone, but fortune in conjunction with her, which makes heroes.

The contempt of riches among the philosophers was a hidden desire to revenge their merit for the injustice of fortune, by contempt of the very advantages of which she deprived them. It was a secret to secure themselves from the degradation of poverty: it was a by-road to arrive at that consideration which they could not obtain by riches.

Hatred of favourites is nothing else than the love of favour. The mortification of not possessing it is consoled and relieved by the contempt we show of those who do possess it; and we refuse them our respect,

Our humour sets its price on everything we get from fortune.

Happiness lies in the taste, and not in the things; and it is from having what we desire that we are happy—not from having what others think desirable.

We are never so happy, or so unhappy, as we imagine.

Men who fancy they have merit, take a pride in being unfortunate, to persuade others and themselves that they are worthy to be the butt of fortune.

Nothing ought so much to diminish the good opinion we have of ourselves as to see that we disapprove at one time what we approve at another.

Whatever may be the apparent difference between fortunes, there is a certain

We have not strength enough to follow all our reason.

A man often fancies that he guides himself when he is guided by others; and while his mind aims at one object, his heart insensibly draws him on to another.

Strength and weakness of mind are badly named—they are, in fact, nothing more than the good or bad arrangement of the organs of the body.

The capriciousness of our humour is often more fantastical than that of fortune.

The attachment or indifference which the philosophers had for life was nothing more than one of the tastes of their self-love, which we ought no more to dispute than the taste of the palate, or the choice of colours.

a view to our happiness, has also bestowed on us pride, to spare us the pain of being aware of our imperfections.

Pride has a greater share than goodness of heart in the remonstrances we make to those who are guilty of faults; we reprove not so much with a view to correct them as to persuade them that we are exempt from those faults ourselves.

We promise according to our hopes, and perform according to our fears.

Interest speaks all sorts of languages, and plays all sorts of parts, even that of disinterestedness.

Interest, which blinds some, opens the eyes of others.

Those who bestow too much application on trifling things become generally incapable of great ones.

We have more power than will; and it is often by the way of excuse to ourselves that we fancy things are impossible.

If we had no faults ourselves, we should not take so much pleasure in remarking them in others.

Jealousy lives upon doubts—it becomes madness, or ceases entirely, as soon as we pass from doubt to certainty.

Pride always compensates itself, and loses nothing, even when it renounces vanity.

If we had no pride ourselves, we should not complain of that of others.

Pride is equal in all men; and the only difference is in the means and manner of displaying it.

It seems that nature, which has so wisely disposed our bodily organs with

minds; and that, with the exception of a good deal of vanity, heroes are made just like other men.

It requires greater virtues to support good, than bad fortune.

Neither the sun nor death can be looked at steadily.

We often make a parade of passions, even of the most criminal; but envy is a timid and shameful passion which we never dare to avow.

Jealousy is in some sort just and reasonable, since it only has for its object the preservation of a good which belongs, or which we fancy belongs to ourselves, while envy, on the contrary, is a madness which cannot endure the good of others.

The evil which we commit does not draw down on us so much hatred and persecution as our good qualities.

cuted affect sometimes a firmness and a contempt of death, which is, in fact, only the fear of looking it in the face; so that it may be said that this firmness, and this contempt are to their minds what the bandage is to their eyes.

Philosophy triumphs easily over past, and over future evils, but present evils triumph over philosophy.

Few people know what death is. We seldom suffer it from resolution, but from stupidity and from habit; and the generality of men die because they cannot help dying.

When great men suffer themselves to be overcome by the length of their misfortunes, they let us see that they only supported them through the strength of their ambition, not through that of their

sometimes from indolence, often from fear, and almost always from all three together.

The moderation of fortunate people comes from the calm which good fortune gives to their tempers.

Moderation is a fear of falling into envy, and into the contempt which those deserve who become intoxicated with their good fortune; it is a vain ostentation of the strength of our mind; in short, the moderation of men in their highest elevation is a desire of appearing greater than their fortune.

We have all of us sufficient fortitude to bear the misfortunes of others.

The constancy of sages is nothing but the art of locking up their agitation in their hearts.

Those who are condemned to be exe-

Whatever pains we may take to disguise our passions under the appearances of piety and honour, they always discover themselves through these veils.

Our self-love endures with greater impatience the condemnation of our tastes, than of our opinions.

Men are not only prone to lose the remembrance of benefits and of injuries; they even hate those who have obliged them, and cease to hate those who have grievously injured them. The constant study to recompense good and avenge evil appears to them a slavery, to which they feel it difficult to submit.

The clemency of princes is often only a stroke of policy to gain the affections of their people.

This clemency, of which men make a virtue, is practised sometimes from vanity,

The passions are the only orators that always persuade: they are, as it were, a natural art, the rules of which are infallible; and the simplest man with passion, is more persuasive than the most eloquent, without it.

The passions have an injustice and an interest of their own, which renders it dangerous to obey them, and we ought to mistrust them even when they appear most reasonable.

There is going on in the human heart a perpetual generation of passions, so that the overthrow of one is almost always the establishment of another.

The passions often engender their contraries; avarice sometimes produces prodigality, and prodigality avarice; we are often resolute from weakness, and daring from timidity.

made in the territory of self-love, there still remain in it many unknown tracts.

Self-love is more artful than the most artful man in the world.

The duration of our passions no more depends on ourselves than the duration of our lives.

Passion often makes a madman of the cleverest man, and renders the greatest fools clever.

Those great and brilliant actions which dazzle our eyes, are represented by politicians as the effects of great designs, instead of which they are commonly the effects of caprice and of the passions. Thus the war between Augustus and Antony, which is attributed to the ambition they had of making themselves masters of the world, was, perhaps, nothing but a result of jealousy.



LA ROCHEFOUCAULD

What we take for virtues is often nothing but an assemblage of different actions, and of different interests, that fortune or our industry know how to arrange: and it is not always from valour and from chastity that men are valiant, and that women are chaste.

Whatever discoveries may have been

Maxims

La Rochefoucauld

London

Arthur L. Humphreys

1911

MAXIMS.

La Rochefoucauld



LONDON.
ARTHUR L. HUMPHREYS
M.DCCCC.XI.



THIS WISDOM OF THE ANCIENTS

From Aesop to Sa'di, to La Rochefoucauld, to the wise of our own times, the intellectuals of every age have been imparting the sum total of the accumulated wisdom sometimes in the form of Fables, and at other times in Maxims.

Khuda Bakhsh Library, in this age of explosion of information, is bent upon reviving the wisdom of the ancients. The Fables/Maxims are being offered afresh, to the reader of the age of information, with a hope that such efforts may help strike a balance in the minds of men breathing in the air of 1991 and onward, and thereby bringing them closer to the wisdom that is no more.

A. R. B.

MAXIMS

La Rochefoucauld

Contents

1993

Price Rs.75/-

Printer	: Liberty Art Press, 1528, Pataudi House, New Delhi
Publisher	: Mustafa Kamal Hashmi for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone 650109, Tlx. 22-430 KBL IN)
Editor	: Dr. A. R. Bedar
Annual Subscription	: Rs.300/- (Inland) US 60 (Asian Countries) US 120 (Other Countries) Price (this issue) Rs. 75/-.

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL



84-86

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL



84—86

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA